ماہنامہ
جاسوسی ڈائجسٹ کراچی
جنوری 2015
معراج رسول
پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام
WWW.PAKSOCIETY.COM

Copied From Web

جلد 45 • شمارہ 01 • جنوری 2015ء • زرِ سالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون: 35895313(021) فیکس 35802551(021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com
پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

مایا جال

امجد رئیس

مافیا کی ہوشیاریاں اور تباہ کاریاں... جہاں بہتا لہو پانی اور زر کی حکمرانی ہے... اول تا آخر خون... خوف... بے کنار تجسس اور پیہم کروٹ بدلتے پیچ و خم... ہر موڑ پر ایک نیا پیچ، سوال اور پر سوال، موڑ در موڑ ہوسِ زر میں اندھے اور خونی کرداروں نے ایک ایسا جال بچھایا جس کی بھول بھلیوں میں وہ زہرہ جمال و خوش خصال یوں گم ہوئی کہ سچ کی تلاش میں نڈھال ہو گئی... درد و غم اور خون آشام چیرہ دستیوں نے اسے گھائل کر دیا... انتظار و اسرار کی جاں کنی کے اس جان لیوا کھیل میں اس کے دل کی بات محتاجِ بیان رہی... اس کا پیار بھی تابِ غم آزماتا رہا... لیکن پندارِ حسن کو ٹھیس نہ پہنچائی۔ لہولہان لمحوں میں پروان چڑھتی خاموش رومان کی وہ پُراسرار داستان جہاں جواب کی امید میں ہر موڑ پر ایک نیا سوال ابھر آتا ہے... انٹرنیشنل بیسٹ سیلر گلین میڈ کی پُرتجسس تخلیق جو قدم قدم پر سلجھتی اور الجھتی ہوئی الجھنوں میں قارئین کو اپنے سحر میں جکڑ لیتی ہے...

مغرب کے خزانوں سے قارئین کے لیے نئے سال کا ایک پرفسوں تحفہ

نیویارک میں شب کے تین بج رہے تھے۔ تاریکی میں جینیفر بارج کی آنکھ کھل گئی۔ باہر طوفان بادوباراں مہیب دیو کی طرح گرج رہا تھا۔ رہ رہ کر بجلی کی کڑک اور خیرہ کن روشنی، بیرونی ماحول کے غضب میں اضافہ کر رہی تھی۔

جینیفر عرف جینی نے آنکھیں کھولیں۔ اس کا دل پسلیوں کے پنجرے میں زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑا رہا تھا۔ کوئی اور بھی اس کے قریب موجود تھا۔

جینی نے چادر ہٹا کر اٹھنا چاہا تو اسے کسی آدمی کی شبیہہ دکھائی دی۔ ''حرکت نہ کرو۔'' اسے حکم دیا گیا۔ تنبیہ کے باوجود جینی نے عالمِ سراسیمگی میں بستر سے اترنے کی کوشش کی۔ جواب میں اسے ایک اذیت ناک تھپڑ سہنا پڑا جس نے اس کے رخسار میں چنگاریاں بھر دیں۔

''حرکت مت کرو۔'' سابقہ حکم کا اعادہ کیا گیا۔ آسمانی بجلی کی کڑک نے لمحہ بھر کے لیے کمرا روشن کر دیا اور گھر میں گھسنے والے نامعلوم اجنبی کا چہرہ نمایاں ہو گیا۔

چہرے کی جگہ کوئی چہرہ نہ تھا۔ اس نے سیاہ رنگ کا اسکائی ماسک چڑھایا ہوا تھا۔ ماسک میں آنکھوں کی جگہ رخنے تھے، جہاں سے سیاہ آنکھیں جھانک رہی تھیں۔ ہاتھ پر چرمی دستانہ تھا۔ دستانے کی گرفت میں قصائی کا چھرا...

آسمانی بجلی کے معدوم ہوتے ہی سیاہ پوش نے جینی کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اس کی چیخ کا گلا گھونٹ دیا۔ اس کی گرفت مضبوط تھی۔ اس نے احتیاط سے چھرا ایک طرف رکھ دیا۔

اس کے ہاتھ کے دباؤ کے زیرِ اثر جینی دوبارہ لیٹ

گئی۔ وہ خود بھی بستر پر آگیا۔ جینی مچل رہی تھی۔ تاہم سیاہ پوش کے آگے اس کی مزاحمت بے سود تھی۔

"حرکت کی تو گلا کاٹ دوں گا۔" وہ پھنکارا۔ بعدازاں اس نے جس قسم کی پیش قدمی کا آغاز کیا، اس نے اس کے عزائم واضح کر دیے۔ جینی کو لگا کہ وہ اپنی زندگی کا بھیانک ترین سپنا دیکھ رہی ہے۔

☆☆☆

ہاں وہ سپنا ہی تھا۔ ایک دلخراش چیخ کے ساتھ اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے تکیہ اٹھا کر سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔ اس کا بدن لرز رہا تھا۔ اس بار وہ بھیانک خواب، حقیقت سے بہت قریب تھا۔ وہ فرطِ دہشت سے ہانپ رہی تھی۔

جینی نے تکیہ ہٹایا، چادر ایک طرف پھینکی اور سائڈ ٹیبل کا لیمپ روشن کر دیا۔ چند منٹ اسے خود کو سنبھالنے میں لگے پھر وہ اٹھ کر کھڑکی کے قریب آگئی۔ طوفانِ بادو باراں ابھی بھی جاری تھا۔

نیویارک خوابیدہ تھا۔ وہ بیدار تھی، ہمیشہ کی طرح خواب طوفان کے دوران میں دکھائی دیا تھا اور حسبِ سابق جینی کو خوف و دہشت کی عمیق کھائی کے کنارے تک لے گیا تھا۔

وہ کچن میں آگئی۔ سوئچ آن کیا اور ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال کر گلاس بھر لیا۔ وہ پورا گلاس پی گئی۔ اعصاب کو سکون کا احساس ہوا۔ وہ گلاس لیے ہوئے واپس بستر تک آگئی۔ یخ پانی کی وجہ سے گلاس اب تک ٹھنڈا تھا۔ سرد گلاس اس نے پیشانی سے لگا لیا۔

ڈیجیٹل کلاک پر سبز ہندسے 3:05 کی نشان دہی کر رہے تھے۔

وہ اپنے والدین کے خالی مکان سے اپارٹمنٹ میں منتقل ہو گئی تھی۔ تاہم اس کا یہ اقدام پُراسرار خواب سے پیچھا چھڑانے کے لیے ناکام ثابت ہوا تھا۔

ایک ہی ہستی تھی جس سے رات کے اس پہر وہ رابطہ کر سکتی تھی۔ جینی نے فون اٹھا لیا۔ سات میل دور اپلینڈ وِنٹ، واٹک آئی لینڈ میں فون کی گھنٹی نے شور مچانا شروع کیا۔ وقفے کے ساتھ ایک مردانہ خوابیدہ آواز نے جواب دیا۔ "ہیلو۔"

"میں ہوں۔" جینی نے محسوس کیا کہ اس کی آواز اب بھی مکمل طور پر نارمل نہیں ہوئی تھی۔

"جینی؟ کیا تم ٹھیک ہو؟ سب... سب کچھ ٹھیک تو ہے؟" مردانہ آواز کی خوابیدہ کیفیت یک لخت معدوم ہو گئی۔

"مارک میں معذرت خواہ ہوں۔ اس وقت تمہیں پریشان کیا۔ لیکن تمہارے سوا کوئی نہیں ہے، جسے میں کال کر سکتی۔"

"نہیں... نہیں... تمہیں معذرت کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہاری کال سے مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ میں ہر وقت تمہارے ساتھ ہوں۔"

"شکریہ لیکن میں نے تمہیں نیند سے اٹھا دیا۔"

"کوئی مسئلہ نہیں... تم ٹھیک تو ہو؟"

"ہاں، مارک میں نے پھر وہی خواب دیکھا ہے۔"

"اوہ، آئی سی... لیکن وہ صرف خواب ہے۔" مارک نے کہا۔

"مارک دو برس بیت گئے ہیں۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ "خواب" ہر مرتبہ حقیقت کی طرف بڑھ رہا ہے۔ آج یوں معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے وہ میری خواب گاہ میں موجود ہو۔ دو برس بعد بھی یوں لگا جیسے کل کی بات ہو... میں والدین کو بہت مس کرتی ہوں۔ آبائی رہائش کو دائیں بدلنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا۔"

"میں سمجھتا ہوں ڈیئر... اس خوفناک حادثے کو آسانی سے بھلایا نہیں جا سکتا۔ تاہم پلیز تم اس بات کو سمجھو کہ وہ شخص خوابوں سے نکل کر تم تک نہیں پہنچ سکتا۔ کبھی بھی نہیں۔ میرا یقین کرو۔ میں چاہتا ہوں کہ اب تم آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرو۔ میں تم سے زیادہ دور نہیں ہوں۔ اگر تم چاہو تو میں وہاں آ سکتا ہوں۔" مارک نے جینی کی ڈھارس بندھائی۔

مارک سے بات کر کے جینی بہت بہتر محسوس کر رہی تھی۔

"گڈ نائٹ جینی، آرام کرو۔"

"گڈ نائٹ مارک، اینڈ تھینک یو۔"

"دوست کو شکریہ نہیں کہتے۔" وہ دھیرے سے ہنسا۔

"مجھے تم پر فخر ہے۔" جینی نے کہا۔

☆☆☆

JFK انٹرنیشنل ائرپورٹ، نیویارک... نادیا دعا کر رہی تھی کہ اس کا کام جلد ختم ہو جائے۔ اسے محض چند منٹ گزارنے تھے، اگر اگلے چند منٹ خیریت سے نہ گزرے تو اس کا زندہ رہنا محال تھا۔ اس نے بے بی کو سینے سے لپٹا لیا اور دوسرے ہاتھ سے اپنی دو سالہ بیٹی تمارا کا ہاتھ تھام لیا۔ ائرپورٹ پُرشور اور پُرہجوم تھا اور نادیا خوف زدہ... اگرچہ اسے وہاں بھیجنے والوں نے اسے سب سمجھا دیا تھا۔

نادیا، نیلی آنکھوں والی معصوم صورت عورت تھی۔

اس کی عمر محض تیئس برس تھی۔ اسے منتخب کرنے والوں نے اس کی معصوم شکل کو خاص اہمیت دی تھی۔

ماسکو میں زندگی بہت تکلیف دہ تھی۔ نادیا کو خود سے زیادہ تمارا کے مستقبل کی فکر تھی اسی لیے اس نے بہتر زندگی اور اچھے مستقبل کے لیے یہ منصوبہ قبول کر لیا۔ اگرچہ ماسکو سے امریکا پہنچنے کے منصوبے میں چند خوفناک عنصر عیاں تھے جن کے انکشاف نے نادیا کو مجبور کر دیا کہ وہ خواب دیکھنا بند کر دے۔ چنانچہ اس نے منصوبے کا حصہ بننے سے انکار کر دیا۔ لیکن جو لوگ اسے گھیر چکے تھے، وہ اس کی طرح معصوم صورت تو کیا کردار کے اعتبار سے بھی بدشکل تھے۔ انہوں نے نادیا کی بیٹی تمارا کو قتل کرنے کی دھمکی دے کر اسے مجبور کر دیا کہ وہ امریکا کے سفر کی تیاری کرے۔

سب معاملات ٹھیک چلتے رہے۔ اب صرف چند منٹ رہ گئے تھے۔ پھر وہ خطرات سے دور چلی جاتی۔

نادیا نے نیلے کمبل میں لپٹی ہوئی بے بی کو جھلایا۔ وہ امیگریشن آفس کے سر پر تھی۔ اگلا نمبر اس کا تھا۔ امیگریشن آفیسر نے اسے آگے آنے کا اشارہ کیا۔ آفیسر نے پاسپورٹ اور ٹکٹ کا جائزہ لیا۔ آفیسر بھی نرم خو لگ رہا تھا۔

"ڈرنے کی ضرورت نہیں۔" نادیا نے خود کو سمجھایا۔ آفیسر نے دو سالہ بچی تمارا کی جانب مسکرا کر دیکھا۔ سرسری نظر بے بی پر ڈالی۔ پھر پاسپورٹ کے ایک صفحے پر مہر لگا کر ٹکٹ کے ساتھ نادیا کو واپس کر دیا۔

"تھینک یو میم، نیویارک میں خوش آمدید۔" آفیسر نے کہا۔ نادیا جواباً مسکرائی۔ چند مرحلے اب بھی باقی تھے۔

نادیا نے اپنا سوٹ کیس وصول کیا۔ لگیج ٹرالی کے لیے ادائیگی کی اور یو ایس کسٹم کاؤنٹر کی جانب چل پڑی۔ وہ ایک ہاتھ سے ٹرالی دھکیل رہی تھی۔ تمارا نے بھی ٹرالی کو تھام لیا۔

بیشتر مسافر آزادانہ گزرتے جا رہے تھے۔ کسٹم آفیسرز خال خال ہی کسی کو روکتے تھے۔ ایک آفیسر نے نادیا پر نگاہ ڈالی۔ نادیا بچی کو جھلاتے ہوئے بڑبڑائی۔ "سو جاؤ... ایلیکسی، سو جاؤ۔"

"میم یہ آپ کا سامان ہے؟" کسٹم آفیسر نے ٹرالی پر ہاتھ رکھ دیا۔

نادیا کا دل بے قابو گھوڑے کی طرح اچھلا۔

"ڈا، مائی (میرا سامان ہے)۔" نادیا نے جواب دیا۔

"پلیز اس طرف آ جائیے۔"

نادیا نے آفیسر کے اشارے کے مطابق ٹرالی کے ساتھ حرکت کی۔ گھٹنوں سے نیچے اس کی ٹانگیں برفاب جیلی کی طرح ہو گئیں۔

آفیسر نے ٹرالی سے بریف کیس اٹھا کر دھاتی ڈیسک پر رکھ دیا۔ "پلیز! آپ اسے کھولیں گی؟" اس کی آواز میں کوئی تاثر نہ تھا۔

نادیا کے اعصاب بغاوت کرنے لگے۔ وہ گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے بیگ کھولنے کی کوشش کرنے لگی۔ اول تو اسے صحیح چابی تلاش کرنے میں ہی مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ پھر وہ لاک سے الجھنے لگی۔ بچی کو اس نے اب بھی گود میں سنبھالا ہوا تھا۔

"میں آپ کی مدد کرتا ہوں۔" آفیسر نے شائستگی سے کہا۔

اس نے بیگ کھولا اور اس کے مشمولات کو ٹٹولنے لگا۔ عام سے کپڑوں کے نیچے ایک باکس تھا جس پر گفٹ پیپر چسپاں تھا۔ آفیسر نے اسے اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا۔ بیگ کی تلاشی مکمل کرنے کے بعد وہ ڈبے کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"میم! اس کے اندر کیا ہے؟" اس نے ڈبا ہلایا۔

"تحفہ، میری کزن کے لیے۔ اسکارف ہے۔" نادیا نے جواب دیا۔

آفیسر نے دلچسپی سے نادیا کے چہرے کا جائزہ لیا۔

"آپ کون سی فلائٹ سے آئی ہیں؟"

"فلائٹ فرام ماسکو۔" اس نے پھر بچی کو جھلانا شروع کر دیا۔ درحقیقت وہ اس عمل کے ذریعے اپنے اضطراب کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔

آفیسر کی پیشانی پر مبہم لکیر نمودار ہوئی۔ "کیا آپ کی بچی ٹھیک ہے؟"

"یہ ایک طویل سفر تھا۔ میرا نہیں خیال کہ وہ مکمل آرام دہ حالت میں ہے۔" نادیا نے کہا۔

آفیسر دوبارہ ہاتھ میں موجود ڈبے کی جانب متوجہ ہوا۔ "پلیز آپ کو ناگوار نہ گزرے تو ادھر آفس میں آ جائیں۔" اس نے ٹرالی کا رخ موڑا۔ دوسرے کسٹم آفیسر نے دروازہ کھولا۔ وہ ایک خوش شکل سیاہ بالوں والی عورت تھی۔

آدمی نے ڈبا میز پر رکھ دیا۔ اس کی ساتھی آفیسر میز کے ایک طرف کھڑی ہو گئی۔

"میں اس ڈبے کو کھولنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو؟" مرد آفیسر نے عندیہ دیا۔

نادیا نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بدن کی لرزش پر قابو

کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

خاتون آفیسر کی نظر بھی ڈبے پر تھی۔ مرد نے گفٹ پیپر کو نزاکت سے الگ کر کے ڈبا کھول دیا۔ اندر ایک عام سا نائلون اسکارف موجود تھا۔ اسکارف کی موجودگی آفیسر کی توقعات کے برخلاف تھی۔ اس کے چہرے پر بدمزگی کے تاثرات دکھائی دیے۔

''آپ کا پاسپورٹ دیکھ سکتا ہوں؟'' اس نے نادیا سے سوال کیا۔ نادیا نے پاسپورٹ اس کے حوالے کر دیا۔ آفیسر نے پاسپورٹ کے صفحات کو پلٹتے ہوئے سوال کیا۔

''یہ بچے آپ کے ہیں؟''

''ہاں۔''

''بچی کی عمر؟''

''تین ہفتے۔''

''میم، میں معذرت خواہ ہوں۔'' وہ پاسپورٹ واپس کرنے کے لیے میز کے عقب سے نکلا۔ پاسپورٹ واپس کرتے وقت اس کی نگاہ بچی پر پڑی۔ وہ نیلگوں کاٹن بلینکٹ میں لپٹی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ چہرے پر سکون کی گہری تہ تھی۔ آفیسر لمحہ بھر کے لیے ہچکچایا، معاً کسی اندرونی تحریک کے زیر اثر اس نے بچی کے رخسار کو چھوا۔ پھر وہ بری طرح چونک اٹھا۔ اس نے نادیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ آفیسر کی آنکھیں جو کچھ بول رہی تھیں، وہ نادیا پہلے سے جانتی تھی۔

''میڈم آپ کی بے بی زندہ نہیں ہے۔''

☆☆☆

سارجنٹ، مارک رائن موجود ہے؟'' جینی نے ڈیسک سارجنٹ سے استفسار کیا۔

سارجنٹ نے نگاہ اٹھائی۔ ''مس جینفر آخری بار میں نے ان کو آفس کی جانب جاتے دیکھا تھا۔''

جینی شکریہ ادا کر کے مارک کے آفس کی جانب چل پڑی۔

''کم اِن۔'' دستک کے جواب میں ایک مردانہ آواز آئی۔

جینی نے اندر قدم رکھا۔ اندر موجود آفیسر سادہ لباس میں تھا۔ وہ ایک وجیہہ شخص تھا۔ عمر تیس، چالیس کے درمیان تھی۔ آنکھوں کی رنگت سبزی مائل اور بال سیاہ تھے۔

''ہیلو جینی۔'' مارک خوش دلی سے مسکرایا اور ڈیسک کے گرد گھوم کر جینی کے قریب آگیا اور اس کے ہاتھ کی پشت پر بوسہ دیا۔

''بہت شائستگی کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔'' جینی نے اپنا چرمی بیگ میز پر رکھ دیا۔

''خادم ہوں۔'' مارک کے لبوں پر شرارتی مسکراہٹ تھی۔

''رات فون پر تو کہہ رہے تھے کہ دوست ہوں۔''

''آخر وکیل ہو نا۔'' مارک دھیرے سے ہنسا۔ ''بائی دی وے، یہاں کیسے؟ کوئی خاص بات یا مجھ سے ملنے کو دل کر رہا تھا؟''

''بڑی خوش فہمی ہے۔'' جینی کی آواز میں شرارت تھی۔

''چلو کچھ کم کر لو۔'' مارک نے پیشکش کی۔

جینی کی بے اختیار ہنسی نکل گئی۔

''ہائے۔'' مارک نے سینے پر بائیں جانب ہاتھ رکھا۔ ''ہنستی ہو یا دل لیے جاتی ہو۔''

''بس بہت ہو گیا۔'' جینی نے ہاتھ اٹھایا۔ ''نامراد عاشق کی اداکاری ختم کرو۔'' وہ سنجیدہ ہو گئی۔

''اول تو تم پر یہ موڈ طاری نہیں ہوتا، اور ہوتا ہے تو تم چند منٹ میں ختم کر دیتی ہو۔'' مارک نے شکوہ کیا۔ ''خیر اصل بات بتاؤ۔''

''نادیا فی ڈوکیس۔''

''آئی سی... تو تم اس کی وکالت کرو گی؟''

''فیڈرل ڈیفنڈرز ڈویژن (FDD) اسی کام کی مجھے ادائیگی کرتا ہے۔'' جینی نے جواب دیا۔ ''میں نادیا سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ اسے ملنے سے پیشتر تمہاری معلومات سے استفادہ کرنا ہے۔''

''کیوں نہیں، خادم ہوں۔'' اس نے فرمانبرداری کہا۔ ''جب کسٹم نے اسے گرفتار کیا تو میں JFK کی ٹاسک فورس میں قریب ہی تھا۔ نادیا، ویرڈفلوٹ کے ذریعے ماسکو سے پہنچی تھی۔ اس کی گود میں تین ہفتے کا بچہ تھا۔ مردہ بچہ... بچے کے پیٹ کو کاٹ کر دوبارہ بند کر دیا گیا تھا۔ اندر خالص ہیروئن تھی... پانچ پونڈ۔''

جینی کی گلابی رنگت میں زردی ابھر آئی۔

''تم ٹھیک تو ہو۔'' مارک کی آواز میں تشویش تھی۔

''ہاں، تم بولتے رہو۔''

''خادم...'' ادھورا جواب آیا۔ ''رپورٹ کے مطابق بچے کو مرے ہوئے سولہ گھنٹے گزر چکے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب نادیا نے ماسکو چھوڑا تو بچے نے آخری

سانس تقریباً دو گھنٹے قبل لی تھی۔'' مارک نے رک کر غور سے جینی کو دیکھا۔

''پانی یا کچھ اور؟'' مارک نے سوالیہ انداز اختیار کیا۔

''نہیں، میں ٹھیک ہوں۔'' جینی کے جبڑے بھنچ گئے۔ ''بچے کو قتل کیا گیا تھا؟''

''میڈیکل ایگزامنر کو شک ہے کہ موت طبعی تھی... لیکن مکمل رپورٹ ابھی موصول نہیں ہوئی۔''

شقاوت اور بے رحمی کی سرسری داستان نے جینی کی طبیعت پر منفی اثر ڈالا تھا۔ تاہم اس نے اگلا سوال نادیا کے بارے میں کیا۔

''عمر تیئس برس ہے اور روسی شہریت۔'' مارک نے بتایا۔ ''پاسپورٹ، اور یو ایس ویزا دونوں جعلی تھے۔ تاہم یہ پیشہ ورانہ مہارت کا نمونہ تھے۔''

''بچہ، نادیا کا تھا؟''

''نادیا کا کہنا تھا کہ بچہ اس کے حوالے ایک جوڑے نے ماسکو ائرپورٹ پر کیا تھا۔ وہ مذکورہ جوڑے سے پہلے کبھی نہیں ملی۔ تمارا نام کی کم سن لڑکی، نادیا کی حقیقی بیٹی ہے... تمارا کی دیکھ بھال اس وقت ویلفیئر آفس کے سپرد ہے۔''

''وہ کس حال میں ہے؟'' جینی نے سوال کیا۔

''لڑکی؟''

''دونوں۔''

''تمارا الجھن کا شکار ہے اور ماں کے پاس جانا چاہتی ہے جبکہ نادیا خوف زدہ اور نڈھال ہے۔ وہ جانتی ہے کہ وہ طویل عرصے کے لیے پھنس گئی ہے۔ درحقیقت اسے استعمال کیا گیا ہے۔''

''رقم؟''

''ہاں، اسے دس ہزار ڈالرز کی آفر تھی۔ تاہم وہ ماسکو سے بھی نکلنا چاہتی تھی۔''

''اور کچھ؟''

مارک نے شانے اچکائے۔ ''کچھ خاص نہیں۔ وہ بمشکل بات کے لیے آمادہ ہوئی ہے اور وکیل کا مطالبہ کیا ہے۔ وہ کسی بات سے سخت ڈری ہوئی ہے۔ میرا تجربہ کہتا ہے کہ اسے اس کام کے لیے مجبور کیا گیا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ وہ ماسکو سے نکلنا چاہتی تھی لیکن ایسی کسی بات کو کھولنے سے وہ خوف زدہ ہے۔''

''مارک، آگے کیا نظر آ رہا ہے؟''

''جینی، کیونکہ نادیا یو ایس شہری نہیں ہے۔ لہٰذا اس کی ضمانت تو ہو گی نہیں۔ ہم درحقیقت فیڈرل کرائم کی بات کر رہے ہیں۔ جعلی پاسپورٹ، جعلی ویزا اور لاش کے ذریعے خالص ہیروئن کی اسمگلنگ وغیرہ... میرے اندازے کے مطابق نادیا کو دس برس کے لیے اندر جانا پڑے گا۔ وہ بھی اگر اس کی قسمت ساتھ دے گی۔ درحقیقت نادیا کمائی میں کرنے جا رہی ہے... اگر وہ حقائق بیان کر دے تو شاید کچھ رعایت مل جائے۔'' مارک نے تبصرہ کیا۔

''اس کی بیٹی؟''

''اسے ماسکو اس کے رشتے داروں کے پاس بھیج دیا جائے گا... اگر کوئی رشتے دار ہوا؟''

جینی کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ وہ کچھ دیر خاموش رہ کر بولی۔ ''نادیا انگریزی جانتی ہے؟''

''تھوڑی، تم بہ آسانی اس کے ساتھ بات کر سکتی ہو۔'' مارک نے جواب دیا۔

''شکریہ مارک۔'' جینی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''خادم ہوں۔'' مارک نے سینے پر ہاتھ رکھا۔

جینی اسے گھور کر رہ گئی۔

☆☆☆

انٹرویو روم میں جینی نے نادیا سے ہاتھ ملاتے ہوئے تعارف کرایا۔ ''میرا نام جینفر مارچ ہے۔ مجھے تمہاری وکالت کے لیے متعین کیا گیا ہے۔''

نادیا بکھری ہوئی لگ رہی تھی۔ ہاتھ ملاتے ہوئے اس کی کپکپاہٹ عیاں تھی۔

''کیا تم ٹھیک ہو؟'' جینی نے نرمی سے سوال کیا۔

نادیا کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ''میری بیٹی؟'' وہ اتنا ہی کہہ سکی۔

''تمارا سے تمہیں بعد میں ملواؤں گی۔ پہلے ہم کچھ گفتگو کر لیں۔ تم بیٹھ جاؤ۔''

''میں تمہیں ادائیگی نہیں کر سکتی۔'' نادیا نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''یہ سرکار کا مسئلہ ہے، تمہارا نہیں۔''

نادیا نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تم سمجھ رہی ہو نا کہ تمہارے اوپر نہایت سنگین الزامات عائد ہیں؟''

''ہاں۔'' نادیا نے جواب دیا۔

جینی نے چند بنیادی سوالات پوچھنے کے بعد کہا۔

''کیا تم آغاز سے سب کچھ بتانا پسند کرو گی؟''

نادیا نے آنکھوں کو صاف کر کے بولنا شروع کیا۔ شروع میں اس کی آواز کھوئی کھوئی تھی۔ بعدازاں وہ کسی حد تک نارمل ہوگئی۔

''میں، ماسکو کے نائٹ کلب میں کام کرتی تھی۔ میرے پاس معاشیات کی ڈگری تھی۔ تاہم وہاں زندگی کڑی آزمائش کی طرح ہے۔ کلب کے سوا میں کوئی اور کام حاصل نہ کرسکی۔ وہاں اکثر دو افراد آتے تھے۔ میں ہر مرتبہ ان کی دلچسپی کو محسوس کرتی۔ ایک روز ان میں سے ایک آدمی میرے پاس آیا۔

''کیا تم دس ہزار ڈالرز کمانا پسند کرو گی؟'' اس نے مجھ سے سوال کیا۔ ظاہر ہے کہ میرا سوال تھا کہ یہ کیسے ممکن ہے؟ مجھے بتایا گیا کہ کوئی چیز مجھے امریکا پہنچانی ہے... مجھے امریکا کے جعلی ویزے کے ساتھ پاسپورٹ بھی دیا جائے گا۔ لیکن دونوں چیزیں بمطابق اصل ہوں گی۔ ''تمارا'' بھی میرے ساتھ ہوگی۔ دس ہزار ڈالرز ایک معقول رقم تھی، مستزاد یہ کہ میں ماسکو سے بھی نکل جاتی۔ میری دلچسپی فطری تھی۔ تاہم یہ سوال ناگزیر تھا کہ مجھے کیا لے کر جانا ہے؟

چند روز بعد بتایا گیا کہ مجھے ایک مردہ بچہ ساتھ لے جانا ہے۔'' نادیا کی آواز لڑکھڑا گئی۔ ایک بار پھر اس کے آنسو جاری ہوگئے۔ ''اس معصوم کے پیٹ میں ڈرگ رکھی گئی تھی۔'' نادیا سسک اٹھی۔

جینی خاموش رہی۔

کچھ دیر بعد نادیا نے سلسلۂ کلام پھر سے جوڑا۔

''میں نے صاف انکار کردیا۔ ان دونوں نے مجھے زدوکوب کیا اور تمارا کو قتل کرنے کی دھمکی دی... میں مجبور ہوگئی۔''

''نیویارک پہنچنے پر تمہیں بچے کے ساتھ کیا کرنا تھا؟''

''یہاں ان کا کارندہ موجود ہوتا، جو بچہ لے کر دس ہزار ڈالرز مجھے ادا کردیتا۔ لیکن ائرپورٹ سے نکلنے سے چند منٹ پیشتر اتفاقاً راز فاش ہوگیا۔'' وہ پھر آبدیدہ ہوگئی۔

''JFK پر تم کسٹم کو خود اطلاع دے سکتی تھیں؟''

''وہ اتنے کچے نہیں تھے۔ انہوں نے مجھے پہلے ہی دھمکا دیا تھا کہ اگر میں ان کے اشاروں کے برخلاف چلی تو وہ میری بیٹی کو ماردیں گے۔''

''ان کا نام کیا تھا؟''

''میں نہیں جانتی۔ اگر مجھے معلوم بھی ہوتا تو میں بتا نہیں سکتی تھی، ان کا کہنا تھا کہ وہ مجھے قید کے دوران میں بھی ہلاک کرسکتے ہیں اور ساتھ ہی ''تمارا'' کو بھی... کیا میں اپنی بیٹی کو دوبارہ دیکھ سکوں گی؟'' نادیا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر گریہ کناں تھی۔

جینی گھوم کر میز کے دوسری طرف پہنچی اور نادیا کے لرزیدہ شانے کو تھپکنے لگی۔

☆☆☆

مارک رائن کوریڈور میں جینی کا منتظر تھا۔

''کیا رہا؟''

''وہ استعمال ہوگئی، وہ مجبور تھی۔''

''مجبوروں اور بے کسوں کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔'' مارک نے جینی کی آنکھوں میں دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے گوشے سرخ ہورہے تھے۔ ''تم ٹھیک تو ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں، میں مردہ بچے کے خیالات سے پیچھا نہیں چھڑا پارہی اور نادیا کی بیٹی۔ کیا وہ دونوں دوبارہ مل سکیں گے؟'' جینی نے کہا۔

مارک نے اپنا ہاتھ جینی کے بازو پر رکھ دیا۔ ''میں دیکھوں گا کہ میں اس سلسلے میں کیا کرسکتا ہوں۔''

''شکریہ مارک۔''

''خ... خادم...'' مارک بولتے بولتے رک گیا۔

جینی بسورنے لگی۔

''سوری یار، دوست خادم بھی تو ہوتا ہے شاید؟ یا نہیں؟''

''پتا نہیں۔'' جینی نے کہا۔ ''بابی کا کیا حال ہے؟''

''فائن۔''

''مہینے سے اوپر ہوگیا۔ اس مرتبہ ''کلا ڈویل'' میں اسے دیکھنے نہیں جاسکی... مجھے وہاں جانا چاہیے۔''

''بابی خوش ہوگا۔'' مارک بولا۔

پھر مارک نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''میرے خیال میں یہ اچھا وقت نہیں ہے پوچھنے کا لیکن کیا اس ہفتے تم ڈنر کے لیے چلو گی؟''

''مارک! میں دل سے معذرت خواہ ہوں۔ اس ہفتے بہت مشکل ہے۔ کسی اور وقت سہی۔ کیا خیال ہے؟''

''کیوں نہیں۔ جب تم بہتر سمجھو۔'' مارک خوش دلی کے ساتھ مسکرایا۔ ''ہم تو...''

''خادم ہیں۔'' جینی نے ہنستے ہوئے فقرہ مکمل کردیا۔

☆☆☆

جینی، خواتین کے ریسٹ روم میں چلی گئی اور خود کو

نارمل کرنے کی کوشش میں مصروف ہوگئی۔ شقی القلب، شیطان صفت لوگ کتنی آسانی سے معصوم لوگوں کو تباہ کردیتے ہیں۔ ان کی جان لے لیتے ہیں۔

جینی کا پیشہ ایسا تھا کہ اسے عجیب کہانیوں سے واسطہ پڑتا تھا۔ لیکن بعض ایسی ہوتی تھیں کہ اس کی روح کانپ جاتی تھی۔ بے اختیار اسے خود اپنے ساتھ، چند برس قبل پیش آنے والا ہولناک حادثہ یاد آجاتا۔

اس نے واش روم میں جاکر چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے۔ اپنی نیلگوں آنکھوں میں جھانکا۔ ماں کے بعد وہ خود کو تنہا محسوس کرنے لگی تھی۔ اس کی سوشل لائف اتنی محدود نہیں تھی۔ وہ جم بھی اٹینڈ کرتی تھی۔ خاصی جان پہچان تھی لیکن اس کے حقیقی دوست بہت کم تھے۔ ماں کی موت کے بعد اس نے خود پر ایک خول چڑھا لیا تھا جس میں کوئی نہری کم ہی نمودار ہوتی تھی۔ سنجیدگی کے خول میں کریک عموماً مارک رائن کی رفاقت میں ظاہر ہوتے تھے۔

مارک سے اس کی جان پہچان بچپن سے تھی۔ اس وقت دونوں بہت چھوٹے تھے۔ اس نے تعلیم کے لیے قانون کا انتخاب کیا اور مارک نیویارک پولیس ڈیپارٹ کے سراغ رسانوں میں شامل ہوگیا۔

جینی اکتیس برس کی ہونے کے باوجود ابھی تک کسی بھی قسم کے افیئر سے دور تھی۔ مارک کے ساتھ اس کی دوستی مثالی تھی۔ تاہم اس رشتے میں رومان کی جھلک غیر واضح تھی۔ اگرچہ دونوں مہینے میں کم از کم ایک بار ڈنر ساتھ کرتے تھے اور شاید ہی کوئی ہفتہ ایسا گزرتا ہو جب وہ فون پر بات نہ کرتے ہوں۔ تاہم اس کے علاوہ قربت کا کوئی اور عنصر مفقود تھا۔ لہٰذا وہ اب تک اچھے دوستوں کی طرح ہی ایک دوسرے کی سنگت میں خوش تھے۔

شاید کہیں دور قلب کی گہرائیوں میں دونوں ہی کے دلوں میں پسندیدگی کی کوئی خفیف لہر ہلکورے لیتی ہو۔

دو سال قبل سنجیدگی کا خول جینی کی ذات کے گرد مزید دبازت اختیار کرگیا تھا۔ وہ اپنے اندرونی مسائل سے آگاہ تھی۔ یہ اس رات کا خوفناک صدمہ تھا۔ ڈراما تھا، شاک تھا۔ جب اس کی ماں نے غیر فطری انداز میں دنیا کو خیرباد کہا تھا۔

کھلی دوپہر میں لانگ آئی لینڈ کی آخری آرام گاہ میں مخصوص جگہ پر جینی نے فورڈ کو پارک کیا۔ آج اس کی ماں کی برسی تھی۔ وہ گلاب کے پھول لے کر گاڑی سے اتری۔

کچھ دیر بعد وہ ماں کی قبر پر تھی۔

سفید ماربل کی تختی پر لکھا تھا۔

''پال مارچ کی محبوب بیوی اینا مارچ کی نہ بھولنے والی پیار بھری یادوں کے نام''

ماں کی موت کے بعد وہ بھیانک منظر خواب بن کر اس کے لاشعور میں بیٹھ گیا تھا۔ اس رات بھی تند و تیز طوفان بادوباراں نے فضا کو تہ و بالا کیا ہوا تھا۔ دو سال میں جب بھی کوئی طوفان آیا، اس ڈراؤنے خواب نے جینی کی پُرسکون نیند میں خوف و دہشت کے رنگ بھر دیے۔ دو سال میں کوئی دن ایسا نہیں گزرا جب اس خواب نے اس کے شعور کی سطح کو نہ چھیڑا ہو۔ اگرچہ خوابیدہ حالت میں خواب صرف طوفانی راتوں میں ہی دکھائی دیتا تھا۔

ماں جان سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی اور باپ پُراسرار طور پر غائب تھا۔ وہ کیونکر بھول سکتی تھی۔ سفید سنگی کتبے کے اندر بہت کچھ پوشیدہ تھا لیکن وہ کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔ سنگ و آہن نہیں بولتے، نہ گور کے مکیں کچھ بتانے کے قابل ہوتے ہیں۔ حالانکہ دو برس قبل کے ماضی میں نسائی اسرار نہاں تھا۔

جینی کی نیلی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔ اس نے گلاب قبر پر رکھ دیے۔

☆☆☆

پال مارچ، دراز قامت اور ہینڈسم سرمایہ دار بینکر تھا۔ جینی نے ابتدائی چند برسوں میں باپ کو بہت کم دیکھا تھا۔ پال اکثر سفر میں رہتا۔ پیرس، لندن، زیورچ، روم وغیرہ۔ وہ کاروبار میں الجھا تھا اور جینی شدت سے باپ کی کمی محسوس کرتی۔ البتہ پال جب بھی کسی نئے ملک میں قدم رکھتا، نئی جگہ سے بیٹی کو کارڈ ضرور بھیجتا تھا۔

پھر وہ دن آتا جب پال گھر واپس آتا۔ دونوں باپ بیٹی خوب انجوائے کرتے۔ وہ مختلف ملکوں سے جینی کے لیے نت نئے تحفے لاتا۔ باپ کی آغوش میں وہ ہمیشہ خود کو انتہائی محفوظ خیال کرتی۔

جینی جب بارہ برس کی ہوئی تو پال نیویارک میں ایک پرائیویٹ انویسٹمنٹ بینک سے منسلک ہوگیا۔ یہ ادارہ ''پرائم انٹرنیشنل سیکیورٹیز'' تھا۔

جب وہ تیرہ برس کی ہوئی تو اس کے بھائی رابرٹ نے جنم لیا۔ حسبِ روایت والدین کی محبت تقسیم ہوگئی۔ سب رابرٹ کو پیار سے بابی کہتے تھے۔ محبت کی تقسیم نے جینی پر کوئی منفی اثر نہیں ڈالا۔ وہ بھی بابی سے محبت کرتی تھی۔ بابی ایک ہنس مکھ اور ذہین بچہ تھا۔ جینی کو جیسے جیتا جاگتا ایک کھلونا مل گیا۔

جینی جوں جوں بڑی ہورہی تھی، اس کا شعور بھی پختہ

ہورہا تھا۔ اسے احساس ہونے لگا تھا کہ مارچ فیملی متعدد اہم چیزوں سے محروم ہے۔ ان کے گھر میں کوئی ایسی تصویر نہیں تھی جو پال مارچ کے ماضی کی عکاس ہو۔ جبکہ جینی کی ماں کے معاملے میں ایسا نہیں تھا۔ جینی کی ماں کے والدین، آنٹی، انکل، کزنز... سب ہی تھے اور ان کی آپس میں ملاقاتیں بھی ہوتی تھیں۔ جبکہ باپ کا معاملہ قطعی متضاد تھا۔ نہ والدین، نہ کوئی رشتے دار۔

جینی کے باپ نے اس موضوع پر کبھی کوئی بات نہیں کی۔ حتیٰ کہ وہ اپنے کام کے بارے میں نہایت کم بولتا تھا۔ جینی کو احساس ہوتا کہ جیسے اس کے باپ کا کوئی ماضی نہیں ہے۔

وہ اس وقت چودہ برس کی تھی۔ جب اس کا باپ ایک بزنس ٹرپ پر گیا ہوا تھا۔ ماں بھی غیر حاضر تھی۔ جینی تنہائی میں بوریت محسوس کر رہی تھی۔ گھر پر تنہائی کے مواقع شاذ ہی آتے تھے۔

وہ یہاں وہاں بھٹکتی پھر رہی تھی۔ غیر ارادی طور پر وہ چوبی سیلنگ کی سیڑھی نیچے کر کے اوپر چڑھ گئی۔ لکڑی کے چوکور تختے کی چٹخنی کھول کر وہ بالائی چھت اور سیلنگ کے درمیانی خلا میں آگئی۔ یہ جگہ دوچھتی کی طرح تھی۔ وہ پہلی بار اس دوچھتی نما جگہ پر آئی تھی۔ کونے میں اسے ایک وزنی ٹرنک دکھائی دیا۔ ٹرنک میں ایک قفل جھول رہا تھا۔ معاً اس کے تجسس نے انگڑائی لی۔ لیکن قفل کھولے بغیر وہ ٹرنک کا جائزہ نہیں لے سکتی تھی۔ اسے یاد آیا کہ باپ کی اسٹڈی میں ایک چابیوں کا گچھا جھول رہا ہے۔

اس نے واپسی کی راہ اختیار کی اور تھوڑی دیر میں چابیوں کے ساتھ واپس آگئی۔ ٹرنک کا جائزہ لینے کے بعد اس نے یکے بعد دیگرے چابیاں آزمانا شروع کیں۔ بالآخر ایک چابی نے قفل کھول دیا۔

اتنے بڑے ٹرنک میں ایک فائل کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ اسے خیال آیا کہ کاروباری کاغذات ہوں گے۔ تاہم جب اس نے فائل کی ورق گردانی شروع کی تو پتا چلا کہ فائل میں موجود کاغذات کا معاملہ قطعی مختلف نوعیت کا ہے۔

کاغذات تو صحیح طرح اس کے پلّے نہیں پڑے لیکن چند تصاویر نے اس کے اوسان خطا کر دیے تھے۔

☆☆☆

چند برس بعد جینی کو ادراک ہوا کہ فائل میں قانونی نوعیت کے کاغذات تھے۔ وہ مختلف افراد کی جانب سے پولیس کو دیے گئے اعترافات تھے جو ایک ہی آدمی کے خلاف تھے۔ اس آدمی کا نام تھا جوزف ڈیلگاڈو (DELGADO)

''جوزف ڈیلگاڈو چور ہے۔ اس نے میری کمپنی کو لوٹا۔''

''جوزف ڈیلگاڈو قاتل ہے۔ اپنے جرائم کی وجہ سے وہ خود بھی اسی طرح مارا جائے گا۔''

''جوزف ڈیلگاڈو ایک خطرناک مجرم ہے اور اسے تاحیات سلاخوں کے پیچھے ہونا چاہیے۔''

جینی کو یاد تھا کہ اس روز فائل میں اس نے بلیک اینڈ وائٹ کرائم سین فوٹو بھی دیکھے تھے۔ ایک مردہ آدمی جس کے سینے میں چاقو پیوست تھا۔ چودہ برس کی کمسن بچی کے لیے یہ ایک بھیانک عکس تھا۔ مزید کاغذات دیکھنے کی اس میں سکت نہ تھی۔ چنانچہ اس نے کاغذات سمیٹ کر فائل میں رکھنے شروع کیے تاکہ فائل کو واپس ٹرنک میں رکھ دے۔

اسی وقت اس کی نگاہ ایک اور تصویر پر پڑی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے وہ تصویر کو گھور رہی تھی۔ وہ جس آدمی کا فوٹو تھا، اس نے قیدیوں کا مخصوص لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔ کسی نے سیاہ بال پوائنٹ سے نیچے قیدی کا نام لکھ دیا تھا۔ قیدی اس وقت جوان العمر تھا۔ نام، جوزف ڈیلگاڈو۔

تاہم بلاشبہ وہ اس کے باپ، پال کی تصویر تھی۔

☆☆☆

یہ ایک ناقابلِ یقین انکشاف تھا جس نے جینی کو مفلوج کر دیا۔ اس کا باپ بدی کی علامت نہیں تھا۔ وہ ایک اچھا آدمی تھا۔ اچھا باپ تھا۔ اس کا ناپختہ ذہن شدید الجھن کا شکار ہو گیا۔ کبھی اسے شک ہوتا کہ مشابہت بہت زیادہ تھی، تصویر کسی اور کی تھی۔

پال، وزٹ سے واپس آیا تو جینی نے ''جوزف ڈیلگاڈو'' کے بارے میں استفسار کیا۔ جینی کی توقعات کے برخلاف، پال کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

''تم... تم کو یہ نام کیسے معلوم ہوا؟''

جینی نے سادگی سے دوچھتی میں جانے کا ذکر کر دیا۔ اگلے ہی لمحے زندگی میں پہلی بار جینی کو طمانچے کا ذائقہ چکھنا پڑا۔ وہ سن ہو کر رہ گئی۔ پال کی آنکھوں میں غیظ و غضب کے ساتھ نامعلوم خوف بھی جھلک رہا تھا۔ وہ جینی کو گھورتا رہا پھر کمرے سے نکل گیا۔ جینی کی آنکھوں سے اشکوں کا سیل رواں جاری تھا۔ اس کی ماں اسے آغوش میں سمیٹے پیار کر رہی تھی۔

''ماما... ڈیڈی کیوں ناراض ہو گئے؟ انہوں نے مجھے کیوں مارا؟'' جینی سسک رہی تھی۔

''بیٹا! تمہیں ڈیڈی کے ذاتی معاملات میں نہیں جانا چاہیے۔ تمہیں ان کی اسٹڈی سے چابی نہیں لینی چاہیے تھی۔''

☆☆☆

جینی اب بیس برس کی ہو چکی تھی۔ وہ ایک بار پھر دوچھتی میں جا پہنچی۔ پال، پرائم انٹرنیشنل میں ترقی کر کے وائس پریزیڈنٹ بن چکا تھا۔ اس کی ذمے داریاں بڑھ گئی تھیں اور وہ ہمیشہ سے زیادہ کما رہا تھا۔ فیملی سے اس کے فاصلے بڑھ گئے تھے، اس کے مزاج میں بھی تبدیلی آئی تھی۔ وہ کافی موڈی ہو چکا تھا۔

پہلے جینی کو معمولی شک گزرا تھا کہ شاید اسے وہم ہوا ہے۔ تاہم اتنے برس بعد وہ پوری طرح باشعور ہو چکی تھی۔ اس نے بغور جوزف ڈیلگاڈو کی تصویر کا جائزہ لیا۔ وہ اس کے باپ کی ہی تصویر تھی۔ وہ خاموشی سے واپس آگئی۔ اس مرتبہ جینی نے باپ سے تذکرہ کرنے کی حماقت نہیں کی تھی۔

جینی مستقل بے چینی کا شکار رہنے لگی تھی۔ ایک روز وہ باپ کی اسٹڈی کے پاس سے گزر رہی تھی۔ اس کی نگاہ پڑی، باپ سر دونوں ہاتھوں میں لے کر بیٹھا تھا۔ جینی اندر چلی گئی۔ پال شاید کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ میز پر ایک دھاتی سیکیورٹی باکس کھلا پڑا تھا، باکس خالی تھا۔ لیکن اس کے قریب زرد رنگ کا لیگل نوٹ پیڈ رکھا تھا۔ پیڈ کے ساتھ ایک فلاپی ڈسک رکھی تھی۔

پیڈ پر ''اسپائنڈر ویب'' لکھا تھا۔ پال کی ہینڈ رائٹنگ میں چند پیراگراف بھی تحریر تھے۔ پال میز سے کچھ فاصلے پر بیٹھا تھا دفعتاً اسے وہاں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ مراقبے جیسی کیفیت سے باہر آگیا اور جھپٹنے والے انداز میں میز کی جانب آیا۔

''کیا تم میرے کاغذات پڑھ رہی تھیں؟''

''نہیں، میں اس طرف سے گزر رہی تھی۔ مجھے یوں لگا کہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ لہٰذا میں اندر آگئی۔'' جینی نے جواب دیا۔

پال نے نوٹ پیڈ اور ڈسک سیکیورٹی باکس میں محفوظ کی۔

''یہ میری نجی کاروباری اشیا ہیں۔'' پال نے جیب سے چاندی کی چابی برآمد کی اور باکس مقفل کر دیا۔ وہ خاموش تھا لیکن اس کے چہرے پر سرخی پھیلی ہوئی اور مزاج برہم تھا۔

جینی کو وہی غصہ یاد آگیا۔ جب وہ چودہ برس کی تھی اور اتفاقاً اس نے ٹرنک والی فائل اور فوٹو دریافت کر لیا تھا۔

''ڈیڈ! سب ٹھیک ہے نا؟'' اس نے سوال کیا۔

پال نے چابی والٹ میں رکھی اور بولا۔ ''مجھے تنہائی کی ضرورت ہے۔ اگر تم برا نہ مانو۔ دراصل ابھی مجھے بہت کام نمٹانا ہے۔'' قبل اس کے کہ جینی کچھ اور کہتی۔

''پلیز اب تم جاؤ۔'' پال نے کہا۔ جینی کو عقب میں اسٹڈی کا دروازہ لاک ہونے کی کلک سنائی دی۔ جینی کے لیے یہ سب کچھ غیر متوقع اور حیران کن تھا۔

ٹھیک ایک ماہ بعد جینی کی ماں کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا اور پال مارچ ایسے غائب ہوا جیسے دھواں ہوا میں تحلیل ہو جاتا ہے۔

☆☆☆

جس رات وہ روح فرسا واردات ہوئی، جینی بھلائے نہ بھول پائی تھی۔ اس رات پال کاروباری کام سے سوئٹزر لینڈ فلائی کر گیا تھا۔

طوفانِ باد و باراں بدمست ہاتھی کی طرح چنگھاڑ رہا تھا۔ باہر تاریکی تھی۔ تاہم جینی کی آنکھ لگ گئی تھی۔ وہ کیا آواز تھی جس نے جینی کو بیدار کر دیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تاہم گھر کے اندر کسی غیر کی موجودگی کا احساس شدید تھا۔

جینی نے کمرے میں روشنی کی اور بستر سے اتر گئی۔ گاؤن لپیٹ کر اس نے دروازہ کھولا۔ الجھے ہوئے ذہن کے ساتھ وہ باہر آگئی۔ یخ ہوا کے جھکڑ نے اسے بوکھلا دیا۔ ہوا گھر کے اندر داخل نہیں ہو سکتی تھی۔ سیڑھیوں کی دوسری لینڈنگ پر اسے کھڑکی کھلی دکھائی دی۔ ہوا کی شدت سے پردے پھڑپھڑا رہے تھے۔ جینی کو خیال آیا کہ شاید طوفانی ہوا کے باعث کھڑکی کھل گئی ہے۔ اس نے کھڑکی بند کر دی۔ اسی وقت روشنی نے آنکھ ماری پھر مکمل تاریکی چھا گئی۔ جینی کے ذہن میں خوف نے انگڑائی لی۔ ''ماما؟'' اس نے بلند آواز میں پکارا۔ مگر جواب ندارد۔

وہ اندازے سے اپنے والدین کی خواب گاہ تک گئی اور دروازہ کھول دیا۔ بجلی کڑکی اور اس کی تیز روشنی نے کمرے کا منظر اجاگر کر دیا۔ کمرا افراتفری کا شکار دکھائی دیا۔ اشیا بکھری پڑی تھیں۔ درازیں کھلی تھیں۔ جس چیز نے رگوں میں اس کا لہو منجمد کر دیا، وہ قالین اور دیوار پر خون کے دھبے اور چھینٹے تھے۔ بجلی کی کڑک پھر ٹمٹمائی تھی، بعدازاں پھر اندھیرا۔

وقفے سے آسمانی بجلی نے کھڑکی کے ذریعے کمرے کا منظر پھر قابلِ دید بنا دیا۔ جینی کی ماں بیڈ کے ساتھ لیٹی تھی، اس کے سینے میں ایک گہرا لہو رنگ زخم تھا۔ بالی بھی پیچھے ہی مڑا تڑا پڑا تھا۔ اس کی گردن سے خون بہہ رہا تھا۔ جینی کو چکر

آ گیا۔

گھر سے باہر پانی بہہ رہا تھا اور اندر خون... پھر اندھیرا۔

پھیپھڑوں سے ابلتی ہوئی بے اختیار چیخ حلق تک پہنچی تھی کہ ایک مضبوط مردانہ ہاتھ عقب سے اس کے منہ پر جم گیا۔ عالم خوف و دہشت میں جینی تڑپی لیکن طاقتور گرفت سے آزاد نہ ہو سکی۔ قاتل اسے گھسیٹتا ہوا دوسری خواب گاہ میں لے گیا۔

بیڈ سائڈ لیمپ میں روشنی چند سیکنڈ کے لیے ٹمٹما کر پھر غائب ہو گئی۔ تاہم اس مدھم روشنی میں جینی نے قاتل کو دیکھ لیا۔ اس کا چہرہ نہیں تھا۔ اس کی شیطانی آنکھیں ماسک کی جھریوں سے جھانک رہی تھیں۔ ہاتھ میں انسانی خون میں تر قصائی کا چھری نما چھرا تھا۔ پتلون کی بیلٹ میں پسٹل اٹکا ہوا تھا۔ جینی تڑپی اور چیخنے کی کوشش کی۔

"حرکت مت کرنا، ورنہ گلا کاٹ دوں گا۔" وہ حیوانی لہجے میں غرایا۔

لیمپ کی روشنی پھر پھڑپھڑائی۔ قاتل نے چھرا ایک طرف رکھ کر جینی کو بستر پر دھکیل دیا۔ جینی سسک رہی تھی۔ طوفانی رات کے بھیانک واقعات نے ویسے ہی اس کی قوتِ حرکت کو سلب کر لیا تھا۔

قاتل کی دست درازیوں نے اس کے عزائم کو عیاں کر دیا۔ بجلی کی کڑک نے کھڑکی کے ادھ کھلے پردوں سے تیز روشنی پھینکی۔ جینی کی نظر خون آلود چھرے پر پڑی۔ وہ اس کی ماں کا خون تھا۔ اس کے قلب نے معاً موجِ اشتعال کو اچھالا۔ آسمانی بجلی کی بے کراں روشنی نے اپنی چادر لپیٹ لی تھی۔ تاریکی میں ذرا سی کوشش کے بعد جینی کا ہاتھ چھرے تک پہنچ گیا۔ اس نے بلا تامل دھاری دار پھل کئی انچ تک قاتل کی گردن میں اتار دیا۔

سیاہ پوش تڑپ کر بے اختیار چلایا۔ اس کی توجہ جینی کے بدن سے ہٹ کر اپنی زخمی گردن کی طرف چلی گئی۔ قدرت نے ایک قلیل مہلت عطا کر دی تھی۔ جینی نے اسے ایک طرف دھکیلا اور دروازے کی جانب دوڑی۔ وہ اندھیرے میں بھی بہ آسانی باہر نکل گئی۔ ذرا دیر بعد وہ گھر سے باہر تھی۔

گاؤن اب بھی اس کے بدن پر تھا۔ اس نے دوڑتے ہوئے گاؤن کی موٹی ڈوری کو کسا۔ قریبی گھر سڑک کی دوسری جانب 60 گز کے فاصلے پر تھا۔ موسلادھار بارش جاری تھی۔ جینی کے ذہن میں یہ بات تھی کہ وہ پانی کی وجہ سے گر نہ جائے۔ ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ مکان کا بیرونی دروازہ سفید رنگ کا تھا۔ اس لیے تاریکی میں بھی جینی ٹھیک رخ پر دوڑ رہی تھی۔ دل حلق میں اچھل رہا تھا۔ اس نے ایک بار مڑ کر دیکھا، سیاہ پوش قاتل تعاقب میں تھا۔ اس کا ایک ہاتھ اپنی زخمی گردن پر تھا۔

سفید دروازے کے سامنے سیڑھیوں پر ورانڈے میں اندھیرا تھا۔ دروازہ چالیس گز دور رہ گیا تھا۔ بیس گز... دس گز... زندگی، موت کے آگے بھاگ رہی تھی۔ اب جینی اندھیری سیڑھیوں پر تھی۔ اس کی رفتار میں معمولی کمی آئی تھی۔ اس نے دروازہ پیٹتے ہوئے چیخنا شروع کیا۔ "کوئی مجھے بچاؤ... میری مدد کرو۔ وہ مجھے مارنے آ رہا ہے۔"

آنکھ کے کونے پر اسے روشنی محسوس ہوئی۔ جینی نے گردن موڑی۔ سڑک پر دو موٹی روشن آنکھیں رینگ رہی تھیں۔ شاید کوئی پٹرول کار تھی۔ جینی کی تمام حسیات کو گھور تاریکی نے نگل لیا۔ اس نے دروازے پر ہاتھ رکھ کر سنبھلنے کی کوشش کی۔ تاہم وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

☆☆☆
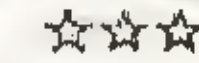
جینی کی آنکھ کھلی تو وہ اسپتال کے پرائیویٹ روم میں تھی۔ کچھ دیر بعد ایک شخص کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی عمر پچاس برس کے لگ بھگ تھی۔ سر کے بیشتر بالوں میں چاندی چمک رہی تھی۔ کمرے کا دروازہ بند ہونے سے قبل جینی نے دیکھ لیا تھا کہ باہر ایک باوردی گارڈ کھڑا ہے۔

"جینفر! کیسا محسوس کر رہی ہو؟" آنے والے نے سوال کیا۔

وہ ابھی تک شاک میں تھی۔ سوال پر اس کا بدن لرز اٹھا۔ "مجھے... مجھے نہیں معلوم۔"

"مس جینفر! مجھے نہیں معلوم کہ بات کس طرح شروع کروں۔" وہ شخص بھی اپ سیٹ تھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔ الفاظ گویا قوتِ گویائی سے بے وفائی پر تلے ہوئے تھے۔

"میرا نام جیک کیلسو ہے۔ میں پال کا دوست ہوں۔ شاید اس نے کبھی میرا ذکر کیا ہو؟" آخر وہ بولا۔

"نہیں۔" جینی نے کہا۔

"مجھے جیسے ہی علم ہوا، میں یہاں آ گیا۔ تمہاری ماں... وہ ایک بہترین خاتون..." وہ رک گیا۔

جینی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "میری ماں اب اس دنیا میں نہیں ہے؟ یہی کہنا چاہ رہے ہو؟"

جیک کیلسو لب بستہ رہا۔

اس کی خاموشی سے جینی کو جواب مل گیا۔ اذیت سے رگِ جاں تڑخ اٹھی۔

"اور بابی؟" وہ کچھ دیر بعد عالمِ یاس میں بولی۔

"بابی، شیفیلڈ اسپتال کے ICU میں ہے۔" جیک آہستہ سے بولا۔

"وہ ٹھیک ہے؟ بابی ٹھیک ہے؟" جینی کی آواز میں اضطراب ہی اضطراب تھا۔

جیک ہچکچایا۔ جینی امید و بیم کی کیفیت میں اسے گھور رہی تھی۔

"وہ... وہ زندہ رہے گا۔" یہ ایک مشکوک جواب تھا۔

"کیا مطلب؟ زندہ رہے گا؟" جینی کا رنگ پیلا پڑ گیا۔

"ریڑھ کی ہڈی کو گولی نے متاثر کیا ہے اور اس کے دماغ پر بھی منفی اثر ہے۔" جیک نے وضاحت کی۔ "اسے چلنے اور بات کرنے میں کسی حد تک پریشانی کا سامنا رہے گا لیکن وہ زندہ رہے گا۔"

"اوہ، گاڈ۔" جینی دکھ اور اطمینان کی ملی جلی کیفیت سے دوچار تھی۔

"کسی کو ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

جیک نے بے بسی سے سر ہلایا۔ "شاید تم پولیس کی کچھ مدد کر سکو۔ پولیس کا خیال ہے کہ اچانک بیدار ہو کر تمہاری ماں نے چور کو بدحواس کر دیا اور اس نے..."

"لیکن اس نے مجھے بھی ختم کرنے کی کوشش کی تھی۔"

جیک نے اثبات میں سر ہلایا اور ہمدردی سے جینی کا ہاتھ تھام لیا۔ "کمرے کے باہر چوبیس گھنٹے ایک مسلح آفیسر موجود رہے گا۔"

جینی شدید الجھن میں تھی۔ "ڈیڈ کہاں ہیں؟"

"پولیس انہیں تلاش کر رہی ہے۔"

"وہ زیورچ، سوئٹزر لینڈ میں ہیں۔"

"ہاں، پولیس کے علم میں ہے۔" جیک نے کہا۔ "تم آرام کرو۔ میں دوبارہ جلد آؤں گا۔"

"پھر کیا مسئلہ ہے؟" جینی نے پریشانی سے کہا۔

جیک نے گہری سانس لی۔ "میں نہیں جانتا۔ پولیس نے زیورچ کا ہر ہوٹل چیک کیا ہے۔ اس وقت پولیس کو یہ بھی یقین نہیں ہے کہ پال سوئٹزر لینڈ پہنچا بھی تھا یا نہیں۔ وہ کہاں ہے کسی کو نہیں پتا۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ انٹرپول پال کو ڈھونڈنے کی ہر ممکن کوشش کر رہی ہے۔"

"کیا مطلب ہے اس بات کا؟"

"جینفر! پال غائب ہے۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے وہ کبھی موجود ہی نہیں تھا۔"

☆☆☆
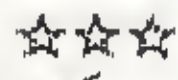
اسپتال میں پولیس نے کئی بار جینی کا بیان لیا۔ آخری بار دو سراغ رساں جینی سے سوال جواب کرتے رہے۔ جینی کو سن گن مل گئی کہ وہ دونوں یہ نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اس سنگین واردات کے پیچھے خود پال ملوث ہے یا اس نے کسی کے ذریعے یہ کام کروایا ہے۔

جینی کو یاد تھا کہ ان دونوں نے کئی بار دو سوال گھما پھرا کر پوچھے تھے۔ اول، کیا پال واردات سے قبل ڈپریشن کا شکار تھا؟ دوم، کیا جینی کی ماں سے پال کی کسی قسم کی بدمزگی ہوئی تھی؟

جینی کی نظر میں یہ تصویری پاگل پن کے سوا کچھ نہیں تھی۔ وہ خود ایک لمحے کے لیے بھی اس رخ پر سوچنے کے لیے تیار نہ تھی۔

چھ ہفتے بعد لانگ بیچ پر وہ اپنے گھر میں تھی۔ انٹرپول ناکام ہو چکی تھی۔ جینی گھر پر تنہا تھی۔ دو گارڈ اس کی حفاظت کے لیے وہاں تعینات تھے۔ بابی ابھی تک اسپتال میں تھا۔ اگرچہ اسے ICU سے نکال لیا گیا تھا۔

گھر میں جینی کو فوراً ہی احساس ہو گیا کہ وہاں کی تلاشی لی گئی ہے۔ یقیناً پولیس کی حرکت تھی۔ وہ اسٹڈی میں فرنچ ونڈوز کے سامنے والد کی پسندیدہ کرسی پر خاموش بیٹھی کھڑکی کے پار جیٹی اور بوٹ ہاؤس کو دیکھ رہی تھی۔ سمندر جیسے وحشی آواز میں نوحہ کناں تھا۔ سب کچھ جوں کا توں تھا مگر گھر کے مکین غائب تھے، وہ کئی روز تک بے چین روح کی طرح گھر میں بھٹکتی رہی۔ کب کسی سیڑھیوں سے شناسا قدموں کی چاپ ابھرے گی؟ سب وہم تھا۔ یاس آلود امید کی خطا کاریاں تھیں۔ کہیں سے کوئی قدم نہیں اٹھے۔ در و دیوار بھی جیسے خاموش انتظار میں مبتلا تھے۔ جینی اس دوران کئی مرتبہ روئی۔ اپنے باپ کو پکارا۔ آشفتہ سر، درماندہ حیرت... نم مژگاں سے غمِ پنہاں تک، کبھی آنسو باہر گرتے اور کبھی دلِ مضطر کو بھگو دیتے۔ یہ سزائے ناروا کیسی ہے... وہ بے اختیار بلک اٹھتی۔

ہر درد کا درماں ہے... ہر اک غم کا علاج ہے وقت۔ اس کا بکھرا وجود بھی سمٹنے لگا۔ لیکن باپ کے انتظار کی کربناک امید کو وہ کہاں لے جا کر لوری سنائے۔ یہ تو غمِ ہجراں کی چبھن تھی۔ اسرار کی آمیزش نے جسے ناسور بنا دیا تھا۔

ایک روز اس نے اسٹڈی کی تلاشی کا آغاز کیا۔ وہ لیگل پیڈ والا سیفٹی باکس اسے کہیں نہ ملا۔ چابیوں کا گچھا اپنی

جگہ پر تھا۔ وہ چابیاں لے کر تیسری بار دوچھتی پر چلی گئی اور ٹرنک کھولا۔ اندر کچھ بھی نہیں تھا۔

بابی زندہ تھا تاہم وہیل چیئر تک محدود ہو گیا تھا۔ وہ نہ چل سکتا تھا، نہ بول سکتا تھا۔ اس وقت اس کی عمر پندرہ سال تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات سلیٹ کی طرح سپاٹ تھے۔ وہ کسی اور ہی دنیا میں جا چکا تھا۔ صرف اس کے ہاتھوں میں کچھ جان تھی۔ بابی سے کوئی کلیو حاصل کرنے کی سرتوڑ کوشش کی گئی۔ ماہرین نفسیات کی خدمات بھی حاصل کی گئیں لیکن نتیجہ نہیں نکلا۔ ریڑھ کی ہڈی میں لگنے والی گولی نے بابی کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا تھا۔

جینی کئی ماہ بعد اس قابل ہو سکی کہ دوبارہ لاء کی اسٹڈی شروع کر سکے۔ بابی کو مستقل کیئر کی ضرورت تھی، لہٰذا اسے کلاڈویل ہوم میں داخل کر دیا گیا تھا۔ جینی روز اسے دیکھنے جاتی۔ لانگ بیچ والے گھر میں سکونت برقرار رکھنا اس کے بس میں نہ تھا۔ نہ وہ والدین کے گھر کو فروخت کر سکتی تھی جہاں اس کے بچپن کی قیمتی یادوں کا خزینہ مدفون تھا۔ وہ گھر سے دور بھی نہیں جانا چاہتی تھی کہ شاید کبھی اس کا باپ لوٹ آئے اور پھر بابی کے ساتھ مل کر نئے سرے سے زندگی کا آغاز کیا جائے۔ یہ خواب ہی لگتا تھا لیکن وہ یہ خواب دیکھنے پر مجبور تھی۔ کیونکہ پال مارچ غائب ضرور ہوا تھا، تاہم جینی کا دل کہتا تھا کہ وہ جہاں بھی ہے زندہ ہے۔ دل تو آخر دل ہے۔ دل کی خلش کو مٹانا کارِ دشوار ہے۔

جینی کے ہم جماعتوں نے بہت کوشش کی کہ وہ کچھ بتائے، کچھ شیئر کرے۔ جینی نے ان کوششوں کو ناممکن بنا دیا۔ اس نے ہر کسی کو ایک ہاتھ کے فاصلے پر رکھا ہوا تھا۔ کوئی بھی اس کے قریب پہنچنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

جیک کیلسو کبھی کبھی جینی اور بابی سے ملنے آتا۔ گزرتے وقت کے ساتھ اس کا آنا جانا بھی ختم ہو گیا۔ جینی نے کبھی اس سے زیادہ بات نہیں کی۔ وہ کبھی نہ جان سکی کہ جیک کون تھا؟ کب اور کیسے وہ اس کے باپ کا دوست بنا؟ جینی نے اسے پہلی بار اسپتال میں ہی دیکھا تھا۔

پولیس بھی مہینوں سر پٹختی رہی۔ تاہم وہ مکھی کے سر کے برابر بھی کوئی کلیو حاصل نہ کر سکی۔ حالانکہ جینی نے ٹرنک کے بارے میں انہیں بتایا تھا اور جوزف ڈیلگاڈو کی تصویر اور نام کے بارے میں بھی... پال اور ڈیلگاڈو کی مشابہت کے بارے میں بھی پولیس کو بتایا تھا۔ تاہم اپنے دل کی بات اس نے دل میں ہی رکھی کہ اس کے نزدیک وہ سو فیصد پال مارچ کی تصویر تھی۔

پولیس کی سرگرمیاں بھی کم ہوتے ہوتے نابود ہو گئیں۔ وقت کی گردش نے بہت سی چیزوں کو ڈھانپ لیا۔ تاہم گردشِ ایام جینی کے دل میں چبھی پھانس کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔

باپ واپس آیا اور نہ پولیس قاتل کو پکڑ سکی۔

☆☆☆

سوئس ایلپس۔

حفاظتی گرم لباس کے باوجود ٹھنڈ چک میکال کی ہڈیوں میں گھسی جا رہی تھی۔ وہ ویزن بارن گلیشیر تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس کی عمر اکیس برس تھی۔ مضبوط عضلات اور مکمل فٹ نس اسے آگے بڑھا رہی تھی۔

سخت برف پر گرفت قائم رکھنے کے لیے اس نے مخصوص اسپائیکس والے بوٹ پہنے ہوئے تھے۔ تیس منٹ بعد وہ گلیشیر کے انتہائی سرے سے پچاس گز کے فاصلے پر تھا۔ وہ سانس بحال کرنے کے لیے رکا۔ سامنے انتہائی شاندار نظارہ تھا۔ ایک جانب فاصلے پر اٹلی نیم دراز تھا۔ الپائن کے گاؤں خوب صورت تصویروں کی طرح تھے۔ سرخ چھتوں والے یہ گھر پہاڑ کی ڈھلوان پر اس طرح لیٹے ہوئے تھے، جیسے کششِ ثقل کا مذاق اڑا رہے ہوں۔

چک میکال نے نگاہ نیچے کی۔ چند قدم دور دراڑوں کا سلسلہ تھا۔ بعض اتنی تنگ تھیں کہ جھری یا رخنہ کہا جا سکتا تھا۔ کچھ چند گز گہری تھیں جبکہ چند گلیشیر کی تہ تک چلی گئی تھیں۔ یہ گہرائی تقریباً سو گز کے قریب تھی۔ چک میکال نے تین دراڑیں گنیں، جن کی چوڑائی ایک گز کے قریب تھی۔ ہر ایک کے درمیان تقریباً پانچ گز کا فاصلہ تھا۔

چک میکال نے یکے بعد دیگرے تینوں کو پھلانگا۔ اس کے لیے یہ کوئی بڑا کھیل نہیں تھا۔ پھر وہ رک کر احتیاط سے آگے بڑھا۔ ایک ہاتھ میں واکنگ اسٹک تھی۔ مخصوص بوٹ بتا رہے تھے کہ اس کے قدموں تلے ٹھوس برف ہے۔

ایک اور دراڑ راہ میں تھی۔ تقریباً دو فٹ چوڑی۔ چک میکال دو فٹ ایسے ہی عبور کر سکتا تھا۔ تاہم اپنی تربیت کے تحت اس نے دو کے بجائے تین فٹ کا فاصلہ ذہن میں رکھا اور حسبِ سابق کئی قدم پیچھے کی جانب ہٹا۔ پھر دراڑ عبور کرنے کے لیے اس نے دوڑ لگائی۔ ابھی اس نے اسٹارٹ ہی لیا تھا کہ مکا ور نہ نہیں بلکہ حقیقتاً اس کے قدموں تلے سے زمین (برف) نکل گئی۔ وہ خلا میں نیچے کی جانب جا رہا تھا۔ اس کے حلق سے بلا ارادہ چیخ بلند ہوئی۔

اس کی بے حسی کی کیفیت کا وقفہ طویل نہیں تھا۔ اس

کے ہیلمٹ اور تہ کی نرم برف نے اسے بچا لیا تھا۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو پہلی چیز جو اسے نظر آئی وہ آسمان تھا۔ اس کا بدن بری طرح دکھ رہا تھا۔ سر میں کھد بد ہو رہی تھی۔ تاہم وہ صحیح سلامت تھا۔ خوش قسمتی سے اچانک پیدا ہونے والے برفانی شگاف کی گہرائی آٹھ فٹ تھی۔ بصورت دیگر اس کی موت یقینی تھی۔ اس نے پڑے پڑے جائزہ لیا۔ ہاتھ پیر ہلا کر اطمینان کیا۔ پھر دھیرے دھیرے اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ ایک چیمبر نما برفانی قبر میں تھا۔ آٹھ فٹ کی گہرائی سے نکلنا اس کے لیے معمولی بات تھی۔ وہ باہر نکلنے کے لیے حکمتِ عملی ترتیب دے رہا تھا کہ اچانک اس کی نگاہ اپنے سامنے برفانی دیوار پر پڑی۔ منجمد برف میں کوئی چیز دفن تھی۔

اس نے قریب جا کر جائزہ لیا۔ پھر بیگ سے نوکدار ہتھوڑی نکالی اور برف ہٹانے لگا۔ پہلے اسے ایک رک سیک نظر آیا جو برف کا ہی حصہ بن چکا تھا۔ اس نے بدقت تمام رک سیک برف کی دیوار سے نکالا۔ تھکن اور ٹھنڈ اس پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ اس کے دل نے کہا کہ نکلو یہاں سے رک سیک کو کھولنا اتنا آسان نہیں تھا۔

اس نے اپنی پشت برفانی دیوار کے ساتھ جمائی اور ٹانگیں بالمقابل دیوار کے ساتھ لگا کر اوپر کی جانب کھسکنا شروع کیا۔ ابھی وہ چند فٹ اوپر گیا تھا کہ معاً اس کی سانس رک گئی۔ وہ گرتے گرتے بچا۔ سامنے دیوار میں سخت شفاف برف میں سے ایک چہرے کی جھلک نظر آ رہی تھی۔

☆☆☆

انالین، سوئس بارڈر۔

ہیلی کاپٹر نے زمین پر اترنے سے قبل فضا میں ایک دائرہ بنایا۔ اگستا ہیلی کاپٹر سے برآمد ہونے والا وکٹر کارسو تھا۔ وکٹر کارسو پستہ قد اور فربہ شخص تھا۔ فربہی کے باعث اس کا قد مزید کم محسوس ہوتا تھا۔ عمر لگ بھگ پچاس برس تھی۔ گھنی مونچھوں کا انداز سائیکل کے ہینڈل کی طرح تھا۔ وکٹر کی شخصیت میں نمایاں چیز اس کی براؤن آنکھیں تھیں۔ اس کی تیز نگاہ برمے کی طرح مقابل کے دماغ میں اتر جاتی تھی۔

وکٹر نے ادھ جلا سگریٹ ایک طرف اچھالا۔ تیز ہوا کے ساتھ ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ کچھ فاصلے پر نیلے اور سفید رنگ کی دو فیاٹ گاڑیاں کھڑی تھیں۔ وارزو کے مقامی کارابیزی اسٹیشن کے چھ اہلکار وردیوں میں گاڑیوں کے ساتھ کھڑے تھے۔

ان میں سے دراز قامت نے سارجنٹ کی وردی زیب تن کی ہوئی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر سیلیوٹ جھاڑا۔

وکٹر نے سر ہلایا۔ ”تم سارجنٹ بارٹی ہو؟“

”جناب۔“ سارجنٹ نے مصافحہ کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا اور بولا۔ ”گڈ مارننگ کیپٹن۔“

وکٹر نے سر اٹھا کر سیاہ بادلوں کو دیکھا۔ ”وہاٹ گڈ... کل میں ”ٹیورن“ میں تھا اور ایک آرام دہ دن گزارنے جا رہا تھا کہ ہیڈکوارٹر سے فون آ گیا۔“

بارٹی مسکرایا۔ ”سوری کیپٹن، لیکن ہمیں ایک ماہر آدمی کی مدد درکار تھی۔“

”کہاں جانا ہے؟“ وکٹر نے سوال کیا۔

بارٹی نے پہاڑوں کی جانب اشارہ کیا۔ ”وہاں، اوپر۔ ڈیڑھ گھنٹے کا سفر ہے۔ زیادہ تر پیدل چلنا پڑے گا۔ موسم ہیلی کاپٹر کے لیے ناموافق ہے۔“

وکٹر کا منہ بن گیا۔ ”کار استعمال نہیں کی جا سکتی؟“

”کار زیادہ اوپر تک نہیں جا سکتی ہے۔“ بارٹی نے جواب دیا۔

”اوپر کتنے افراد ہیں؟“

”وہ ہمارے آدمی ہیں۔ جن میں ایک مقامی ہے جو گلیشیر کے چپے چپے سے واقف ہے۔ دوسرا فارنسک چیتالوجسٹ وینوریما ہے۔“

”ٹھیک ہے، چلو۔“ وکٹر نے ایک فیاٹ کی جانب قدم بڑھائے۔

فیاٹ کے اندر قدرے گرمائش تھی۔

”کل شام سوئس پولیس کی کال آئی تھی۔“ بارٹی نے وکٹر کارسو کو بریف کرنا شروع کیا۔ ”ایک نوجوان امریکی کوہ پیما ویزن بارن گلیشیر پر تھا۔ جہاں وہ ایک دراڑ میں گر گیا۔ وہ خوش قسمت تھا۔ دراڑ زیادہ گہری نہیں تھی۔ اسے کوئی قابلِ ذکر نقصان نہیں اٹھانا پڑا۔ البتہ برفانی قبر میں اس نے ایک منجمد لاش دریافت کی۔“

”امریکی کا نام اور عمر؟“

”چک میکال۔ عمر 21 برس۔“

”کہاں ٹھہرا ہے؟“ وکٹر نے دوسرا سوال کیا۔

”سرلن کے برگوف ہوٹل میں۔“

”اور کچھ؟“

”لڑکے کو لاش کے ساتھ ایک رک سیک بھی ملا ہے۔“

وکٹر نے نگاہ اٹھائی۔ ”اس میں کیا تھا؟“

”لڑکے نے اسے وہیں چھوڑ دیا تھا۔ میں نے سوچا کہ وینوریما کے پہنچنے سے قبل رک سیک کو نہ چھیڑا جائے۔“

بارٹی نے کہا۔
"گڈ۔" وکٹر نے ستائش کی۔
"سوئس حکام نے ایک ٹیم گلیشیر پر بھیجی تھی۔ وہ خوش قسمت رہے۔ کیونکہ گلیشیر پر جہاں باڈی پڑی تھی وہ تمام علاقہ اٹلی کی حدود میں آتا ہے۔ اب یہ ہمارا کیس بن گیا ہے۔" بارٹی نے اچانک فیاٹ روک دی۔ "مزید پیش قدمی بذریعہ کار ممکن نہیں۔" اس نے بتایا اور گاڑی سے اتر گیا۔ عقبی سمت جا کر اس نے فیاٹ کا ٹرنک کھولا۔ ٹرنک سے اس نے چند ہیلمٹ، واکنگ اسٹکس اور ایک جیکٹ نکالی۔ دیگر افراد بھی گاڑی سے اتر گئے تھے۔ ایک اسٹک، ہیلمٹ اور جیکٹ اس نے وکٹر کے حوالے کر دی۔ وکٹر کو ملا کر وہ تین افراد تھے۔ کچھ دیر بعد تینوں جائے وقوعہ کی سمت گامزن ہوئے۔

بادل چھٹنے لگے تھے اور ہلکی بارش بھی برائے نام رہ گئی تھی۔ یہ پہاڑی سلسلہ جس کی چوٹیوں نے نقرئی ٹوپیاں پہنی ہوئی تھیں۔ سوئٹزرلینڈ اور اٹلی کے درمیان قدرتی سرحد کا کردار ادا کرتا تھا۔

ان کا رخ پہاڑی چوٹی ویزن ہارن کی جانب تھا۔ گلیشیر بھی چوٹی کے نام کی وجہ سے ویزن ہارن گلیشیر کے طور پر پہچانا جاتا تھا۔

"میں نے گزشتہ بیس برس کا ریکارڈ چیک کیا ہے۔" بارٹی نے بولنا شروع کیا۔ "ایلپس کے اس علاقے میں اس دوران جتنے لوگ غائب ہوئے، وہ تمام زندہ یا مردہ حالت میں بازیاب کیے جا چکے ہیں۔ سوئس ریکارڈ پر بھی یہی صورتِ حال ہے۔ اس کا مطلب جو باڈی ہم دیکھنے جا رہے ہیں، اس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا۔

☆☆☆

جائے وقوعہ پر دو افراد موجود تھے۔ دونوں نے وزنی بوٹ اور جیکٹ پہنی ہوئی تھیں۔ وہ ایک چھوٹے اسٹوو پر کافی بنا رہے تھے۔

وکٹر اس مقام کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی سانس بحال کر رہا تھا۔ وہاں ایک عدد مخصوص نیلا پہاڑی خیمہ نصب کیا گیا تھا۔ کوہ پیما جسے بوک (BIVOUAC) کہتے ہیں۔ برف میں چوکور شکل میں المونیم کے چھوٹے پول اس طرح لگائے گئے تھے کہ انہوں نے برفانی قبر نما مقام کو اپنے احاطے میں لے لیا تھا۔ زرد رنگ کا پلاسٹک ربن، پولز کے ساتھ چاروں طرف منسلک تھا۔

تعارفی کلمات کے بعد وکٹر نے باڈی دیکھنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ ویٹوریما نامی پیتھالوجسٹ دریافت شدہ باڈی کے ساتھ برفانی شگاف کے اندر تھا۔

آٹھ فٹ گہرائی کی وجہ سے بہ آسانی نیچے اترا جا سکتا تھا۔ بارٹی نے جسم کے ساتھ ہارنس (HARNESS) منسلک کی اور رسی کے سہارے نیچے اتر گیا۔ وکٹر نے اس کی تقلید کی۔ طاقتور ٹارچز کی مدد سے چیمبر نما قبر کو اچھی طرح روشن رکھا گیا تھا۔

ویٹوریما سے ہیلو ہیلو کے بعد وکٹر نے استفسار کیا۔
"کوئی اور چیز ملی؟"
"رک سیک کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔" ویٹوریما نے ایک جانب اشارہ کیا جہاں مخصوص بیگ برفانی دیوار کے ساتھ لگا ہوا تھا۔
"کھولا اسے؟" وکٹر نے کینوس کے بیگ کو دیکھا۔
"کوشش کی تھی پھر میں نے سوچا کہ متعلقہ آفیسر کے آنے کا انتظار کر لیا جائے۔" ویٹوریما نے جواب دیا۔ "ویسے بھی یہ بری طرح جام اور منجمد ہے۔ آسانی سے نہیں کھلے گا۔"

"کیا یہ حادثہ ہو سکتا ہے؟"
"ممکن ہے۔ تاہم حتمی جواب کے لیے باڈی کو یہاں سے نکال کر لیب تک پہنچانا ہوگا۔" ویٹوریما بولا۔
وکٹر کی نگاہ سوالیہ انداز میں خاص فولڈنگ چیئر پر پڑی جو برفانی چیمبر میں موجود تھی۔
"دراصل باڈی ... اس چیمبر کی تہ سے کچھ اوپر برف میں متوازی حالت میں پیوست ہے۔ برف کی وجہ سے اب تک محفوظ ہے۔ اسے دیکھنے کے لیے اس کرسی کی ضرورت پڑے گی۔" ویٹوریما نے ازخود وضاحت کی۔
وکٹر نے تفہیمی انداز میں سر کو جنبش دی۔
بارٹی نے کرسی سیدھی کر کے اس جگہ رکھی جہاں کچھ بلندی پر باڈی برف میں دبی ہوئی تھی۔
وکٹر نے احتیاط سے کرسی پر قدم جمائے اور سیدھا ہو گیا۔ اس کے بدن میں جھرجھری کی لہر دوڑ گئی۔ اس کا چہرہ باڈی کے چہرے کے عین سامنے تھا۔ خاصا دہشت ناک منظر تھا۔ دو بے نور کھلی آنکھیں وکٹر کو گھور رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد وکٹر نیچے اتر آیا۔
"کیا خیال ہے؟ یہ کب سے یہاں ہے؟" اس نے سوال کیا۔
"فی الحال صحت کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اندازے کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ کئی سال پرانی بات ہے۔ برف کاٹ کر اسے نکالنا پڑے گا۔ یہ کام ہم چین

سا" (CHAIN SAW) کی مدد سے کریں گے۔" ویٹوریما نے وضاحت پیش کی۔
"ٹھیک ہے۔ مناسب بندوبست کے ساتھ کام شروع کرو۔" وکٹر نے ہاتھ رگڑے اور بارٹی کی جانب رخ کیا۔ "رک سیک کو پلاسٹک بیگ میں ڈالو۔ اب میں امریکی لڑکے سے ملنا چاہوں گا۔"
"او کے۔"

☆☆☆

وکٹر، وارنڈو کے کارہینری اسٹیشن کے دفتر میں تھا۔ وہ کھڑکی کے قریب ایک ڈیسک پر تھا۔ پلاسٹک بیگ میں لائی گئی اشیا ایک جانب رکھی ہوئی تھیں۔
وکٹر نے ربر کے دستانے چڑھائے اور پلاسٹک بیگ سے رک سیک نکالا جس پر سے برف ہٹا دی گئی تھی۔ تاہم اس کا کینوس گیلا اور بوجھل تھا۔
وکٹر نے سوئس آرمی چین چاقو نکالا اور رک سیک دونوں گھٹنوں کے درمیان دبا کر چاقو کی مدد سے اس کا لاک کھولنے کی کوششوں میں مصروف ہو گیا۔ اسے اچھی خاصی تگ و دو کرنی پڑی تب کہیں جا کر وہ اسے کھولنے میں کامیاب ہوا۔

وکٹر نے اندر جھانکا۔ ایک سوٹ، ایک شرٹ، ٹائی اور چرمی جوتے، ان اشیا کے نیچے ایک چپٹا آٹومیٹک پسٹل اور ایک چرمی والٹ پڑا تھا۔ اس نے چاقو کی نوک پسٹل کے ٹریگر گارڈ میں اٹکائی اور ہتھیار باہر نکال کر ڈیسک پر ایک جانب رکھ دیا۔ ساتھ ہی چاقو بھی رکھ دیا پھر اس نے ہاتھ ڈال کر والٹ باہر نکالا۔
احتیاط سے چاقو کی نوک پھنسا کر اس نے والٹ کھولا۔ اسے حیرانی کا سامنا کرنا پڑا۔ جسے وہ والٹ سمجھ رہا تھا، وہ پاسپورٹ نکلا۔ چاقو سے اس نے پاسپورٹ کے صفحات کھولنے شروع کیے۔
اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ ایک کارپورل نے اندر جھانکا۔ "کیپٹن! چک میکال اِدھر ہیں۔" اس نے اطلاع دی۔
"پانچ منٹ بعد اسے بھیجو۔"

☆☆☆

انگریزی میں وکٹر نے چک میکال سے ابتدائی سوال کیا۔ جواب میں اس نے اتفاقیہ حادثے کے بارے میں شروع سے بتایا۔
"کیا تمہیں رک سیک کے علاوہ وہاں کوئی اور چیز ملی تھی؟"
"نہیں جناب۔"
"تمہیں یقین ہے؟"
"میرا باپ ایک پرائیویٹ ڈیٹیکٹیو ہے۔ میں پولیس ایوی ڈینس کے بارے میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔"
وکٹر نے سر ہلایا۔ "سوئٹزرلینڈ کب چھوڑ رہے ہو؟"
"چار دن بعد۔"
"رائٹ۔"
کمرے میں خاموشی تھی۔ چک میکال میز پر رکھی اشیا کو دیکھ رہا تھا۔
"کیا میں جا سکتا ہوں؟" اس نے سوال کیا۔ مثبت جواب ملنے پر وہ کھڑا ہو گیا۔
"اگر آپ خیال نہ کریں تو ایک سوال ہے؟"
"نو پرابلم، پوچھو۔"
"معاملہ کیا ہے؟ اور وہ باڈی کس کی ہے؟"
"معاملے کا فی الحال کچھ نہیں پتا۔" وکٹر نے کہا۔ "البتہ پاسپورٹ کے مطابق وہ باڈی کسی امریکی باشندے کی ہے جس کا نام پال مارچ ہے۔"

☆☆☆

نیویارک...
جینی، نرس لی کے ہمراہ کالنڈویل ہوم میں بابی کے پاس تھی۔ بابی اب سترہ برس کا ہو چکا تھا لیکن بظاہر چودہ برس کا معلوم ہوتا تھا۔ وہ اب بھی وہیل چیئر پر تھا۔ تاہم اس کی حالت میں کچھ بہتری آئی تھی۔ وہ اشاروں کی زبان میں لکھ بھی لیتا تھا۔ تاہم اس کی قابلِ فخر یادداشت قتل کی بھیانک رات سے آگے جانے سے قاصر تھی۔
کچھ دیر بعد نرس لی رائے نے جینی کو ملاقاتی کے بارے میں اطلاع دی۔ وہ مارک رائن تھا۔
جینی کمرے سے باہر آ گئی۔
"ہیلو جینی۔" مارک نے کہا۔
"تم نے حیران کر دیا ہے۔" جینی نے جواباً کہا۔
"بابی کا کیا حال ہے؟" مارک نے سوال کیا۔
"وہ ٹھیک ہے۔ تم سے مل کر خوش ہوگا۔" جینی نے مارک کے چہرے پر ہلکا سا تناؤ محسوس کیا۔ "کوئی مسئلہ ہے؟" جینی نے سوال کیا۔
"میرا؟ نہیں کچھ نہیں۔"
"سچ بول رہے ہو؟" جینی نے بغور مارک کو دیکھا۔
مارک نے شانے اچکائے۔ "او کے، شاید وہ معاملات

ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے فیڈرل پراسیکیوٹر نادیا کیس میں زیادہ سے زیادہ سزا کے لیے زور لگا رہا ہے۔"

"یہ زیادتی ہے۔" جینی نے کہا۔ "وہ تو عمر ہے۔ مارک تم کچھ کر سکتے ہو؟"

"مجھے افسوس ہے، جینی! میں نے کوشش کی تھی۔"

جینی کے چہرے پر تکدر کے اثرات ظاہر ہوئے۔ "وہ اپنی زندگی کے بہترین سال اپنی دو سالہ بچی کی جدائی میں گزارے گی۔ جن سفاک جرائم پیشہ افراد نے اس سے یہ جرم زبردستی کرایا، انہیں صرف پانچ پونڈ ہیروئن کا نقصان ہوگا۔ وہ صاف بچ جائیں گے اور پھر سے اپنے مکروہ دھندے میں ملوث ہو جائیں گے۔" جینی کی آواز میں تلخی تھی۔

مارک خاموش تھا۔

"تم دو معاملات کی بات کر رہے تھے؟" جینی کو اچانک خیال آیا۔

مارک نے نگاہیں چرائیں۔ وہ کچھ بے کل دکھائی دیا۔

"خادم صاحب! تم دو معاملات کی بات کر رہے تھے؟" جینی نے اسے پھر یاد دلایا۔

مارک کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ معاً جینی کو کسی گڑبڑ کا احساس ہوا۔

"مارک خیریت ہے؟" اس مرتبہ جینی کی آواز میں تفکر کی آمیزش تھی۔

مارک نے بیرونی جانب سبزہ زار اور تالاب کی جانب اشارہ کیا۔ "وہاں بیٹھیں کیا؟"

"میری طرف دیکھو۔" جینی نے مطالبہ کیا۔

مارک نے اس کی خوب صورت آنکھوں میں جھانکا۔ جینی بغور اسے دیکھتی رہی۔ تاہم خاموش رہی۔ مارک بھی کچھ نہ بولا۔

"چلیے جناب۔" جینی نے ایک گہری سانس لی۔ دونوں باہر آ کر ایک بنچ پر بیٹھ گئے۔

"جینی، درحقیقت میں بالی سے ملنے نہیں آیا تھا۔" مارک نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ پھر کیا بات ہے؟"

مارک نے ایک لفافہ نکال کر جینی کے حوالے کیا۔ جینی خاموشی سے لفافے کو گھورتی رہی۔ اس کے ذہن میں گھنٹی بجنے لگی۔ لفافہ کھلا ہوا تھا۔ جینی نے اندر موجود شیٹ باہر نکالی۔

یہ انٹرپول کی جانب سے پولیس رپورٹ تھی۔ ایلپس کے گلیشیئر سے ایک امریکی شہری کی باڈی دریافت ہوئی تھی۔ جینی نے نام دیکھا۔ اس کی سانس رک سی گئی۔ نگاہ دھندلا گئی۔ وہ نام اس کے لاپتا باپ کا تھا۔ برسوں سے امید کا شعلہ، جینی نے محض چنگاری کی صورت میں دل کی گہرائیوں میں روشن رکھا ہوا تھا۔ یہ چنگاری بھی گزرتے وقت کے ساتھ اندیشوں، وسوسوں کی راکھ تلے دبتی جا رہی تھی۔ آج وہ چنگاری یک لخت بجھ گئی۔ موہوم آس نے آخری ہچکی لے کر دم توڑ دیا۔ البتہ بے یقینی کی پھانس بھی ساتھ ہی نکل گئی جس کے ساتھ بے کلی کی چبھن بھی معدوم ہو گئی تھی۔

مارک بے بسی سے جینی کے دھواں دھواں چہرے کو تک رہا تھا۔

دفعتاً لفافہ اور کاغذ جینی کے ہاتھ سے پھسل گیا۔ اس نے بے اختیار اپنا سر مارک کے فراخ سینے میں چھپا لیا۔ جینی کا بدن کپکپا رہا تھا۔ وہ دونوں کبھی اتنے قریب نہیں ہوئے تھے۔ مارک کو سینے اور شرٹ پر نمی کا احساس ہوا۔ وہ چپکے چپکے رو رہی تھی۔ مارک نرمی سے اس کا سر سہلا رہا تھا۔

سکوت طاری تھا۔ ہوا بھی جیسے ساکن ہو گئی تھی۔ مارک نے بھیگی ہوئی آواز میں بولنا شروع کیا۔ "میں... میں تم سے رابطے کے لیے سارا دن کوشش کرتا رہا۔ تمہارا سیل فون آف تھا۔ آفس سے معلوم ہوا کہ تم دوپہر میں چلی گئی تھیں۔ میرے اندازے کے مطابق تمہیں یہاں ہونا چاہیے تھا۔"

"کیا یہ سچ ہے؟" جینی نے معاً سر اٹھا کر سرخ بھیگی آنکھوں سے سوال کیا۔

"ہاں، یہ رپورٹ سچ ہے۔" مارک نے چک میکال سے شروع کر کے مختصر احوال بتایا۔

"کیا میں دیکھ سکتی ہوں؟"

مارک نے سر ہلایا۔ "باضابطہ طور پر تمہیں ان کی شناخت کرنی ہوگی۔"

مارک نے اٹالین، سوئس بارڈر، وارزو ٹاؤن اور دیگر معلومات فراہم کیں۔ وکٹر کے بارے میں بتایا۔

"وہ گلیشیئر میں کیسے پہنچے؟ کیا ہوا تھا ان کے ساتھ؟"

"فی الوقت جو معلومات میرے پاس تھیں۔ تمام گوش گزار کر دی ہیں۔ مزید معلومات غالباً وکٹر کا رسوا ب تک دریافت کر چکا ہوگا۔" مارک نے گھڑی دیکھی۔ "مجھے

جاتا ہوگا۔ تاہم میں پالی سے مل کر جاؤں گا۔"

"لیکن مارک، ابھی تم اسے ڈیڈ کے بارے میں کچھ نہ بتانا۔" جینی نے درخواست کی۔

"میں سمجھتا ہوں۔" وہ بولا۔ "کیا تم ٹھیک ہو؟"

"ہاں۔" جینی نے مضبوط آواز میں کہا۔ وہ دل ہی دل میں فیصلہ کر چکی تھی کہ اس کا کام باپ کی شناخت کے بعد ختم نہیں ہوگا بلکہ شروع ہوگا۔ اس کے سامنے دو سوالات منہ پھاڑے کھڑے تھے... پہلا یہ کہ برسوں پہلے اس خونی رات کے بعد سے گلیشیر والے واقعے کے درمیانی عرصے میں کیا ہوا اور کیسے ہوا؟ اصل قاتل کون ہے؟ اور کہاں ہے؟ دوسرا سوال ٹرنک والی تصویر اور "جوزف ڈیلگاڈو" کا نام تھا؟ باقی ضمنی سوالات کے جوابات از خود سامنے آجاتے، اگر وہ اولین دو سوالات کے جوابات تلاش کر لیتی۔

اگر یہ واقعہ نہ ہوتا تو وہ ساری زندگی خلش کا شکار رہتی اور باپ کی واپسی کی امید کا دیا جلائے رکھتی۔ اب وہ اپنے باپ کو ماں کے پہلو بہ پہلو رکھ تو سکے گی۔

مارک کی آواز نے اسے خیالات کی دنیا سے باہر نکال لیا۔

"تمہیں کہیں بھی میری ضرورت پڑے تو بغیر کسی ہچکچاہٹ کے کال کر لینا۔"

جینی نے اداس مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلایا۔

☆☆☆

درمیانی شب کا وقت ہو چلا تھا جب مارک کام نمٹا کر دفتر سے نکلا۔ اپلمونٹ میں وہ اپنے دو کمروں کے مکان تک پہنچا تو گہری تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ اسٹریٹ لائٹس بند تھیں۔ پورچ کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس نے گہرے رنگ کی بیوک سیڈان کی جھلک دیکھی۔ سڑک پر بیوک پچاس گز دور پارک کی گئی تھی۔ دراصل جب وہ بیوک کے قریب سے گزر رہا تھا، اسی وقت بیوک سیڈان اس کے نوٹس میں آگئی تھی۔ بظاہر اس میں دو افراد موجود تھے۔

تاہم تھکن کے باعث اس نے خاص دھیان نہیں دیا اور سیڑھیاں طے کر کے داخلی دروازے کے ذریعے مکان میں داخل ہو گیا۔ تنہائی کا خیال آتے ہی اس کا ذہن پیچھے چلا گیا۔ اس کی پینتیسویں سالگرہ چند ماہ بعد تھی۔ کرسٹی اچھی بیوی تھی۔ تاہم اس کی پیشہ ورانہ غیر یقینی اوقات کار نے کرسٹی کو پریشان کر دیا۔ مارک اپنی جگہ مجبور تھا۔ لہٰذا باہمی رضامندی سے یہ رشتہ طلاق پر ختم ہو گیا۔ کئی برس سے وہ اکیلا ہی تھا۔

مارک کے والدین جینی کے گھر کے سامنے رہتے تھے۔ اس روز واردات والی طوفانی رات میں جینی بھاگ کر وہیں پہنچی تھی۔

اس خونی واقعے نے اسے جذباتی طور پر شدید صدمہ پہنچایا تھا۔ وہ سب سے دور ہوتی چلی گئی۔ اپنے اطراف میں اس نے ایک ان دیکھا خول بنا لیا تھا۔ جب اس نے فیڈرل ڈیفنس ڈویژن میں کام کرنا شروع کیا تو وہ نارمل زندگی کی طرف لوٹنے لگی۔ مارک کے ساتھ اس کی دوستانہ ملاقاتیں پھر شروع ہو گئیں۔ مارک اسے پسند کرتا تھا، اس نے آگے بڑھنے کی کوشش بھی کی۔ تاہم اندرونی طور پر وہ دوستی سے کچھ آگے نکل گئے تھے، اظہار باقی تھا۔

مارک نے خیالات ایک طرف جھٹکے اور صوفے سے اٹھ کر واش روم کی طرف چلا گیا۔ وہاں سے نکل کر کچن میں آیا۔ کافی کے لیے کیتلی چڑھائی۔ پھر ریفریجریٹر سے پنیر کے ٹکڑے، بیئر اور کوک (کوکا کولا) کے ساتھ ایک ٹماٹر نکالا۔ دودھ کا ہاف کارٹن لیا۔ وہ "چیز" سینڈوچ بنا رہا تھا۔ تب اس کا دھیان سڑک پر موجود بیوک سیڈان کی جانب چلا گیا۔

وہ رک گیا۔ یہ شاید اس کے پیشہ ورانہ ذہن کی کارستانی تھی۔ اس نے لیونگ روم کی بتیاں بجھا دیں اور کھڑکی سے باہر جھانکا۔ بیوک ابھی تک وہیں تھی۔ وہ کھڑکی سے ہٹنے والا تھا کہ اسے ایک سیاہ پونٹیاک نظر آئی۔ پونٹیاک رکی تو اس میں سے ایک دراز قامت شخص برآمد ہوا۔ بیوک کا دروازہ کھلا۔ دو آدمی اس میں سے باہر آگئے۔ وہ ہیولوں کی طرح لگ رہے تھے۔

تینوں نے فٹ پاتھ پر چلنا شروع کر دیا۔ چلنے کی سمت وہی تھی جس طرف مارک کا مکان تھا۔ مارک کی چھٹی حس نے کہا کہ وہ یہیں آرہے ہیں۔ مارک کھڑکی سے ہٹ گیا اور دھیرے سے پردہ برابر کر دیا۔ پھرتی سے اس نے گلاک (ہینڈ گن) اٹھا کر واپس ہپ ہولسٹر میں لگائی۔

پورچ کی لائٹ روشن تھی۔ وہ خاموشی سے دروازے کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر بعد ڈور بیل کی چیخ سنائی دی۔ مارک کا خدشہ ٹھیک نکلا تھا۔ اس کا ہاتھ از خود گلاک کے دستے پر آ گیا۔ اس نے دروازے کے ہول میں سے باہر دیکھا۔ دراز قامت کی عمر ساٹھ برس کے لگ بھگ ہوگی۔ سر کے زیادہ تر بال سفید تھے۔ بظاہر وہ ایک معزز شخص دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن مارک خطرہ مول لینے پر آمادہ نہ تھا۔ اس نے گلاک ہولسٹر سے کھینچ لیا اور باقی دونوں آدمیوں

کو دیکھا۔ وہ جوان اور خوش لباس تھے۔ گھنٹی پھر بجی۔

"کون ہے؟" مارک نے آواز بلند کی۔

"مسٹر مارک رائن! میرا نام جیک ہے، جیک کیلسو کیا ہم بات کر سکتے ہیں؟" جواب دراز قامت نے دیا تھا۔

"اس وقت آدھی رات ہے اور ہم لوگ موسیقی سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ نہ میں تمہیں جانتا ہوں اور نہ ہی موسیقی کی زبان سمجھتا ہوں۔" مارک کی آنکھ بدستور ویو ہول کے ساتھ لگی تھی۔ باہر سے کسی بھی جارحانہ حرکت کا ردعمل پیش کرنے کے لیے وہ بالکل تیار تھا۔ تینوں کے ہاتھ خالی تھے لیکن یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ غیر مسلح ہوں۔ پھر اس نے دراز قامت یعنی جیک کو دیکھا۔ جس نے اپنی "شناخت" ویو ہول کے سامنے کر دی تھی۔ مارک نے غور سے کارڈ کو دیکھا اور گن پیچھے کر لی۔

"مسٹر مارک، میں سی آئی اے کی جانب سے ہوں۔"

مارک نے دروازہ کھول دیا۔ بعد ازاں بتیاں بھی روشن کر دیں۔ ان کو بٹھا کر وہ کچن میں گیا اور کافی کیتلی نیچے رکھ کر واپس آ گیا۔

وہ اب آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ مارک نے اندازہ لگایا کہ جیک کے ساتھی بھی سی آئی اے سے تعلق رکھتے تھے۔

جیک نے پہلے غلط وقت پر آنے کی معذرت پیش کی۔ اور ایک بار پھر اپنا آئی ڈی بیج پیش کیا۔ مارک نے بالاکلف اسے جانچا۔ ایک جانب سی آئی اے کا مخصوص نیلا لوگو بنا ہوا تھا۔ پس منظر میں امریکی عقاب کی شبیہ تھی۔ دوسری جانب جیک کی تصویر تھی۔ تصویر میں اس کے بال اتنے سفید نہیں تھے۔

مارک نے بیج واپس کر کے سوالیہ نظروں سے تینوں کو دیکھا۔

"یہ ایجنٹ گراہم اور ایجنٹ فیلوز ہیں۔" جیک نے ساتھیوں کا تعارف کرایا۔ "دراصل معاملے کی نوعیت کے پیش نظر ہم ملاقات کو کل پر نہیں ٹال سکتے تھے۔"

مارک نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ جیک کے اشارے پر ان دونوں نے بھی اپنے بیج پیش کیے جنہیں دیکھنے کے بعد مارک نے واپس کر دیا۔

"کافی یا...؟"

"کافی ٹھیک ہے، شکریہ۔" جیک نے کہا۔

کافی کا دور شروع ہوا تو جیک نے مدعا بیان کیا۔

"میں جینفر مارچ کے متعلق کچھ بات کرنا چاہ رہا تھا۔"

"اوہ، نادیا ڈرگ کیس؟" مارک نے استفسار کیا۔

"نہیں، نادیا کیس کی بات نہیں ہے۔" جیک نے تردید کی۔

مارک نے الجھن محسوس کی۔ جینی کے بارے میں اور کیا بات ہو سکتی ہے؟ تاہم وہ خاموش رہا۔

"میرا خیال ہے کہ آپ دونوں قریبی دوست ہیں۔"

"کہہ سکتے ہیں۔" مارک کی الجھن میں اضافہ ہو گیا۔

"اس کو تم پر اعتماد ہے؟"

"یقیناً۔" مارک ہچکچایا۔ "دیکھو میں سوالات کی نوعیت سمجھنے سے قاصر ہوں۔"

"دراصل معاملے کا تعلق پال مارچ سے ہے۔ اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو تم جینفر کو اس کے باپ کے بارے میں بتا چکے ہو؟" جیک نے کہا۔

"یقیناً میں نے جینفر کو بتایا ہے۔" مارک نے لفظ "جینی" بولنے سے احتراز کیا۔

"مسٹر مارک تھوڑی دیر میں آپ کا ذہن صاف ہو جائے گا۔ تاہم تفصیل میں جانے سے پہلے یہ بتانا بہت ضروری ہے کہ یہ معاملہ حد درجے خفیہ نوعیت کا ہے۔ لہٰذا مجھے آپ کی جانب سے یقین دہانی درکار ہے کہ یہاں ہونے والی گفتگو کہیں اور نہیں جائے گی۔" جیک نے کہا۔

مارک نے پہلے جیک کو نظر بھر کے دیکھا۔ پھر دونوں ایجنٹس پر نگاہ ڈالی۔

"او کے، میری جانب سے لیک نہیں ہوگی۔ کیا معاملہ ہے؟ مجھے کچھ حیرانی بھی ہے۔" مارک نے جواب دیا۔

"سی آئی اے کو اور تمہارے ملک کو تمہاری مدد چاہیے۔"

مارک بے اختیار ہنس پڑا۔ "میں ہی کیوں؟"

"تم جانتے ہو کہ دو برس قبل جینفر کے والد لاپتا ہو گئے تھے۔ تمہیں یہ بھی پتا ہوگا کہ پال مارچ کے گھر پر حملہ ہوا تھا۔ حملے سے متعلق اسے بھی تمہارے علم میں ہوں گے۔"

مارک نے سر ہلایا۔ "پھر؟"

"جب مسز مارچ کا قتل ہوا۔ اس وقت پال سی آئی اے کے ایک خفیہ مشن پر تھا۔"

مارک کی پیشانی پر لکیریں ابھر آئیں۔ "جینفر نے کبھی کوئی ایسی بات نہیں بتائی۔ پال تو ایک سرمایہ کار بینکر

تھا۔"

"جینیفر کو پتا ہی نہیں تھا۔ درحقیقت پال سی آئی اے کا انڈر کور ایجنٹ تھا۔"

"تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ وہ ایک جاسوس تھا؟"

جیک نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ پال ایک خطرناک خفیہ بین الاقوامی آپریشن کا حصہ تھا۔ اس کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ اور میں ظاہر نہیں کر سکتا۔"

"کیا تم یہ اشارہ نہیں دینا چاہ رہے ہو کہ پال ہی جینیفر کی ماں کا قاتل تھا؟" مارک نے چبھتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

"مارک، ایمانداری کی بات یہ ہے کہ اس بارے میں، میں اب تک کسی حتمی رائے تک نہیں پہنچ سکا ہوں۔"

مارک کو یہ مبہم جواب پسند نہیں آیا۔ "میں کچھ بھی نہیں سمجھا۔" اس نے بھی دو ٹوک انداز اختیار کیا۔

اس مرتبہ ایجنٹ گراہم نے دخل اندازی کی۔

"تم اتنا سمجھو کہ پال مارچ کی باڈی کے منظرِ عام پر آنے سے کئی زندگیوں کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔"

"کون سی زندگیاں؟ خطرہ کس طرف سے؟" مارک چڑ سا گیا۔

جیک نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ "ہم ان سوالات کے جواب دینے سے معذور ہیں۔"

"بہت خوب۔" مارک کا انداز استہزائیہ تھا۔ "تم لوگ بہت کم بتا کر مجھ سے بہت زیادہ کی توقع کر رہے ہو۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن جینیفر کو تمہاری مدد کی ضرورت ہے... اور ہمیں بھی۔"

"کس قسم کی مدد؟"

"مجھے یقین ہے کہ جینیفر، باپ کی شناخت کے لیے یورپ کا سفر کرے گی۔ میں چاہتا ہوں کہ تم چند روز کی چھٹی لے کر اس کی نگرانی کرو۔"

"مطلب، میں اس کا تعاقب کروں؟" مارک نے اپنی جھلاہٹ پر قابو پانے کی کوشش کی۔

"بہتر ہوگا کہ تم اس کے ہم سفر کی حیثیت میں رہو۔ تاہم اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر تم 'تعاقب' کا لفظ استعمال کر سکتے... اس کی نظر میں آئے بغیر۔"

"کیوں؟" مارک نے یک لفظی سوال کی ہتھوڑی ماری۔

"اس کی حفاظت کے لیے۔" جیک نے جواب دیا۔

"وہ تمہیں جانتی ہے اور تم پر بھروسا کرتی ہے۔ جب کوئی مصیبت میں ہوتا ہے تو سب سے زیادہ ضرورت اسے دوست کی ہوتی ہے۔"

"اسے کیا خطرہ ہے؟ وہ کیسی مصیبت میں ہے؟"

"کوئی اس پر قاتلانہ حملہ کر سکتا ہے۔"

"کیوں؟ کون؟" مارک ضبط کھونے لگا۔ وہ بچہ نہیں تھا کہ سی آئی اے کا کارڈ دیکھ کر ان کے کہنے پر چل پڑتا۔

جیک نے انکار میں سر ہلایا اور جواب کے لیے معذوری کا اظہار کیا۔ مارک کی برداشت ختم ہو گئی۔

"مجھے بھی معذور سمجھو۔" اس نے ٹکا سا جواب دیا۔

تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا یا، دونوں نے تیسرے کی طرف دیکھا۔ مارک نے تینوں کی جانب دیکھا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا۔

"مسٹر جیک! تم درحقیقت کون ہو؟ اور سی آئی اے میں کیا کرتے ہو؟" مارک نے سوالات کا رخ موڑتے ہوئے براہِ راست جیک کو دیکھا۔

"میں اسپیشل آپریشنز میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر ہوں۔" جیک نے بتایا۔

"کس قسم کے اسپیشل آپریشنز؟"

جیک نے پھر نفی میں سر ہلایا۔ "یہ معلوم ہونا چاہیے، لیکن فی الوقت یہ جاننے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیا تم ہماری مدد کرو گے؟ کیا تم جینیفر کی مدد کرو گے؟"

"مجھے محض ایک کلیو چاہیے، کوئی ایسی بات کہ مجھے یہ احساس ہو کہ میں اندھے کنوئیں میں تو کودنے نہیں جا رہا۔ جہاں تک میں نے دیکھا اور سمجھا ہے، وہ یہ ہے کہ سی آئی اے اس طرح کسی عام شہری کے تحفظ کے لیے سرگرداں نہیں ہوتی۔ اگر وہ کوئی اہم یا وی آئی پی شخصیت نہ ہو۔ کیوں؟" مارک نے صاف گوئی سے تحفظات کا اظہار کر دیا۔

تینوں نے پھر آپس میں نگاہیں چار کیں اور جیک نے جواب دیا۔

"میں ایک حد تک سمجھوتا کرتے ہوئے کچھ بتانے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن صرف اس امید پر کہ تمہارے خدشات دور ہو جائیں گے۔" جیک نے توقف کیا۔ پھر دوبارہ گویا ہوا۔ "جینیفر وہ 'چابی' ہے جو اس معمے کو حل کرنے میں مدد دے سکتی ہے کہ وہ کمپیوٹر ڈسک کہاں ہے، جو اس کے فادر کے ساتھ ہی غائب ہو گئی تھی اور جس کی ہمیں تلاش ہے۔"

"لیکن وہ ڈسک میں کیا ہے؟"

"سی آئی اے کی اہم تفتیش سے متعلق اطلاعات ہیں۔"

"کیا جینیفر کو ایسی کسی ڈسک کے وجود کا علم ہے؟" وہ [illegible] کے لیے "جینی" کا لفظ استعمال کرنے سے پرہیز کر رہا تھا۔

"میرے خیال میں وہ لاعلم ہے۔"

"تو پھر وہ کیسے مددگار ثابت ہو سکتی ہے؟"

"میرا قیاس ہے۔ کیونکہ ڈسک پال کے ساتھ ہی غائب ہوئی تھی اور جینیفر اب سوئٹزرلینڈ جائے گی تو اس بات کا امکان ہے کہ ہمیں کوئی اشارہ ہاتھ آ جائے۔ جس کے سہارے ہم ڈسک تک پہنچ سکیں۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ کچھ اور لوگ بھی ڈسک کی تلاش میں ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ [illegible] جینیفر پر حملہ کریں گے۔" جیک نے وضاحت کی۔

"معذرت کے ساتھ، میں اب بھی خود کو اندھیرے میں ٹٹولتا پاتا ہوں۔ ڈسک میں کیسی اطلاعات ہیں؟" [illegible] طول پکڑ گئی تھی۔ مارک خود کو مطمئن نہیں کر پا رہا تھا۔

جیک نے گہری سانس لے کر شانے اچکائے۔ "مارک! میرے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔"

"اچھا تو یہ بتا دو کہ تم لوگ اپنا آدمی اس کام کے لیے کیوں استعمال نہیں کر رہے ہو؟ میں ہی کیوں؟"

"جو لوگ ڈسک کے پیچھے ہیں، وہ جینیفر کے لیے واضح خطرہ ہیں۔ سی آئی اے کو بھی ڈسک کی تلاش ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات ان لوگوں کے علم میں ہے۔ اگر ہم اپنا آدمی درمیان میں ڈالتے ہیں تو وہ لوگ ایک میل دور سے سی آئی اے کی بو پا لیں گے۔" جیک نے حتی الامکان مارک کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "تم اس کے قریبی دوست ہو۔ تم پر کوئی شک نہیں کرے گا۔ تم اتنی صلاحیت رکھتے ہو کہ آس پاس رہتے ہوئے جینیفر کی حفاظت کر سکو۔ میں اپنے آدمی بیک اپ میں رکھوں گا لیکن تم سے دور۔ تاہم کسی غیر یقینی صورت حال سے نمٹنے کے لیے میرے آدمی کال کرنے پر قلیل مدت میں تم تک پہنچ سکیں گے۔ اب میں آخری بار پوچھ رہا ہوں کہ تم ہماری مدد کرو گے؟" اس مرتبہ جیک کا لہجہ حتمی تھا۔ وہ بھی شاید اکتا گیا تھا۔

مارک نے محسوس کر لیا کہ وہ فیصلہ کن موڑ پر ہے اور جیک اس سے زیادہ مزید کچھ نہیں بتائے گا۔ مارک کو اقرار کرنا تھا یا انکار۔

"میں کئی کیسز پر کام کر رہا ہوں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھے چھٹی مل جائے گی۔" اس نے نیم آمادگی ظاہر کی۔

"بیماری کا بول دو۔ کوئی بھی بہانہ بنا لو۔" جیک نے کہا۔ "پھر بھی مسئلہ ہو تو مجھے بتانا، میں اوپر سے فون کروا دوں گا۔ بس ایک بات کا خیال رکھنا کہ اصل وجہ کسی کو پتا نہ چلے۔ میں نے شروع میں بتایا تھا کہ یہ انتہائی خفیہ اور حساس آپریشن ہے۔"

"میں سمجھ گیا۔"

"تو تم تیار ہو؟"

"میں جینیفر کی خاطر تیار ہوں۔" مارک نے کہا۔

"شکریہ، مارک۔ میں تمہارے تعاون کا دل سے قدر کرتا ہوں۔"

"کیا مجھے اسلحہ ساتھ رکھنا ہوگا؟"

"یقیناً، تم مسلح حالت میں رہو گے۔"

"کیا مجھے براہِ راست جینیفر سے پوچھنا چاہیے ساتھ جانے کے لیے؟" مارک نے سوال کیا۔

"ہاں تم بات کر سکتے ہو۔ کہہ سکتے ہو کہ مورل سپورٹ کے لیے تم ساتھ رہنا چاہتے ہو۔ لیکن بات نہ بنے تو زور مت دینا اور دوسرا راستہ اختیار کرنا۔" جیک نے سمجھایا اور ایک لفافہ نکال کر اسے پکڑا دیا۔

"یہ کیا ہے؟"

"بزنس کلاس کے اوپن ائر ٹکٹ۔"

"تو تمہیں یقین تھا کہ میں آمادہ ہو جاؤں گا؟"

"مجھے خود کو تیار حالت میں رکھنا تھا۔ تمہاری طرف سے انکار کا امکان بھی تھا۔" جیک نے کہا۔ "میرا اسٹیل نمبر بھی اندر موجود ہے۔ پانچ ہزار ڈالرز ہیں۔ ایک ویزا کارڈ ہے تمہارے نام کا۔ بس پیچھے دستخط کرنا۔ جتنا استعمال کرو، کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ البتہ رسید رکھتے جانا۔ "انکل سام" (سرکار) کو بھی خوش رکھنا ضروری ہے۔" جیک مسکرایا۔

"پوری منصوبہ بندی کر رکھی ہے۔"

"تاخیر سے بچنے کے لیے۔ سوئٹزرلینڈ دیکھا ہے تم نے؟"

"ہاں۔" مارک نے کہا۔ "خوابوں میں۔"

☆☆☆

سوئٹزرلینڈ۔

چک میکال نے رینالٹ کار ہائر کی تھی۔ اس وقت وہ فرکا پاس (Furka) پر نظاروں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

سفید رنگ کی آوڈی (AUDI) کب رینالٹ کے پاس آ کر رکی، پتا ہی نہیں چلا۔ دروازہ کھل کر بند ہوا تو چک میکال نے پلٹ کر رینالٹ کی جانب دیکھا۔

آوڈی سے اترنے والے شخص کے شانے سے کیمرا جھول رہا تھا۔ وہ چک کی جانب ہی آ رہا تھا۔

''ہیلو، مسٹر میکال۔ میرا نام ہارٹ ہے۔'' اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

''ہیلو۔'' چک نے ہاتھ ملایا۔

ہارٹ نے اپنا تعارف زیورچ ایکسپریس کے نمائندے کے طور پر کرایا۔ وہ اچھی انگریزی بول رہا تھا۔ اس نے فون پر چک میکال سے ''فرکا پاس'' پر معاوضے کے عوض وقت لیا تھا۔

ہارٹ، پال مارچ کی اسٹوری پر کام کر رہا تھا۔ وہ ایک لمبے قد کا گھنے سیاہ بالوں والا شخص تھا۔ آنکھیں چشمے کے عقب میں چھپی تھیں۔ بال یوں لگ رہے تھے جیسے اس نے ڈھیلی ڈھالی وگ لگائی ہوئی ہے۔

''تم مجھ سے کیا چاہتے ہو، مسٹر ہارٹ؟''

''میں چاہتا ہوں کہ یہ اسٹوری بہتر سے بہتر انداز میں پیش کروں۔ اس کے لیے تمہارے تعاون کی ضرورت ہے کیونکہ تم نے ہی پال مارچ کی لاش دریافت کی تھی۔''

''وہ تو ٹھیک ہے۔ تم معاوضے کی بات کر رہے تھے؟'' میکال نے تصدیق چاہی۔

''بالکل، معقول معاوضہ تمہارا حق ہے لیکن تم کسی اور صحافی کے ساتھ تعاون نہیں کرو گے۔'' ہارٹ نے پابندی لگائی۔

''ٹھیک ہے۔ لیکن تم نے مجھے یہاں کیوں بلایا ہے؟ اس سلسلے میں ہمیں ویزن ہارن پر نہیں ہونا چاہیے تھا؟''

''رائٹ، ہم وہاں بھی جائیں گے۔ دراصل میں اپنی اسٹوری کو خوب صورت مناظر سے مزین کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے لیے یہاں کے مناظر طلسم جیسے ہیں لیکن ان مناظر میں تم دکھائی نہ دو تو تصاویر بے معنی ہو جائیں گی۔'' ہارٹ نے اپنا ارادہ ظاہر کیا۔

''ٹھیک ہے شروع کرو۔'' میکال نے کہا۔

''وہاں سے شروع کرتے ہیں۔'' ہارٹ نامی صحافی نے گلیشیر کے کنارے کی جانب اشارہ کیا جہاں گلیشیر کی اختتامی ڈھلان تھی۔ ڈھلوان کے اختتام پر گلیشیر سپاٹ دیوار کی طرح گہری کھائی میں چلا گیا تھا۔

''جناب اُدھر خطرہ ہے۔ میں اپنا حفاظتی سامان بھی نہیں لایا ہوں۔'' چک ہچکچایا۔

''گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ یہ قارئین کے لیے بڑا ڈرامیٹک شاٹ ہوگا اور میں تمہیں خطرے سے دور ہی رکھوں گا۔''

میکال نے کچھ سوچا اور شانے اچکائے۔ ''او کے۔''

''کیا تم لاش کے بارے میں کوئی غیر معمولی بات بتا سکتے ہو؟''

''نہیں، کوئی خاص نہیں۔ اس کا بیشتر حصہ برف میں دبا تھا۔'' میکال نے بتایا۔

''کوئی چیز ملی ہو تمہیں... جیسے کاغذات، کوئی دستاویز، یا پاسپورٹ وغیرہ؟'' ہارٹ نوٹ بک میں لکھتا جا رہا تھا۔

''نہیں۔ اس معاملے میں شاید کیپٹن وکٹر تمہاری مدد کر سکے۔''

''رک سیک، اسی کے پاس ہوگا؟''

''ہاں۔''

''مسٹر میکال! تمہاری عمر؟''

''21 برس۔''

''پتا؟'' ہارٹ نے سوال کیا۔ ''تم امریکا چلے جاؤ گے۔ میرے پاس پتا ہوگا تو میں اپنے آرٹیکل کی نقول تمہیں بھیج سکوں گا۔'' ہارٹ نے تشریح کی۔ بعدازاں اس نے چند سوال اور کیے اور فوٹو شوٹ کے لیے تیار ہو گیا۔

اس نے اپنی پسند کے چند فوٹو لیے۔ پھر وہ میکال کو گلیشیر کی خطرناک اختتامی ڈھلوان پر لے آیا۔

''اس سے آگے جانا حماقت ہوگی۔'' میکال نروس ہو گیا۔ اس نے پلٹ کر عمیق کھائی کو دیکھا اور ساکت کھڑا رہا۔ اس کی تصویر پہلی بار اخبار کی زینت بننے والی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ اتنا بھی بہت ہے۔'' ہارٹ نے کیمرا سنبھالا۔ ہارٹ نے زاویے بدل بدل کر چند شاٹ لیے۔ اس عمل کے دوران میں وہ میکال سے قریب ہو گیا۔

''شاندار مزہ آجائے گا۔ اس نے کیمرا بند کر کے شانے سے لٹکا لیا۔

''ہم نے ابھی تک رقم کی بات نہیں کی۔'' میکال نے سوال کیا۔

''ہاں، ویزن ہارن جانے سے پہلے مجھے کچھ ادائگی کرنی چاہیے۔'' ہارٹ جیب میں ہاتھ ڈال کر میکال کے قریب پہنچ گیا۔ ''ایک بار اس نے پلٹ کر دیکھا۔ دور دور

تک سناٹا تھا۔ ہارٹ نے سوچ سمجھ کر ہی امریکی لڑکے کو ''فرکا پاس'' پر بلایا تھا۔

ہارٹ نے ہاتھ جیب سے نکالا اور میکال نے دیکھا کہ اس کا ہاتھ خالی تھا۔ اس نے حیرت سے ہارٹ کو دیکھا۔ ہارٹ کی آنکھوں کا تاثر بدلا ہوا تھا۔

''مجھے نہیں پتا تھا کہ تم اس حد تک احمق ثابت ہو گے۔'' ہارٹ نے سرد آواز میں کہا۔

یک لخت میکال کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی زور شور سے بجی۔ تاہم بہت دیر ہو گئی تھی۔ ہارٹ بس ایک قدم آگے گیا اور پھرتی سے دایاں ہاتھ لڑکے کے سینے پر رکھ کر دھکا دیا۔ لڑکے کی آنکھیں وحشت سے پھیل گئیں۔

وہ ڈھلوان پر لڑھک گیا۔ سنبھلنے کی ناکام کوشش کی لیکن برف ٹھوس شیشے کی طرح چکنی اور سخت تھی۔ ایک تو وہ ڈھلوان پر کھڑا تھا۔ سخت برف کے علاوہ باقی کام دھکے نے کر دیا۔

اس کی دل دوز چیخ پہاڑوں سے ٹکرا کر پلٹی اور پلٹ کر بازگشت کی صورت میں کسی اور سمت میں جا کر سر پٹختی رہی۔ ذرا دیر میں بازگشت مدھم پڑ کر معدوم ہو گئی۔

ہارٹ کے لبوں پر سفاک مسکراہٹ رینگ رہی تھی۔

☆☆☆

نیویارک۔

جینی دن کے گیارہ بجے کے قریب مارک کی رہائش گاہ پر پہنچی۔

''کچھ جلدی نہیں آگئیں؟'' مارک نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

''واپس چلی جاؤں؟''

''نہیں، نہیں۔ ٹھیک تو ہے، ہاں گیارہ بجے۔ بالکل ٹھیک وقت پر آئی ہو۔ آجاؤ، آجاؤ۔'' مارک نے فوراً بیان بدلا۔

جینی نے مسکراتے ہوئے اندر قدم رکھا۔ مارک نے دروازہ بند کر دیا۔ لیونگ روم بکھرا ہوا تھا۔

''تم نے وعدہ کیا تھا؟'' جینی نے منہ بنایا۔

''اوہ یہ سب، یہ... یہ کبھی کبھی ہوتا ہے۔ مجھے وعدہ یاد ہے۔ میں بڑا اسیٹ رکھتا ہوں۔ ہر چیز جگہ پر ہوتی ہے۔'' مارک نے صوفے پر سے ایش ٹرے اٹھائی۔

''خود کو تو بہت سیٹ رکھتے ہو۔''

مارک کے دل میں پھلجھڑی سی چھوٹی۔ وہ رک گیا۔

''کیا کہا؟ پھر سے کہنا۔''

''دوالٹ ادا کرنا پڑے گا۔''

''خادم ہوں۔ کتنے پیسے؟'' اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔

''اوہ... ہو... وہ... وہ اتنی سی بات دوبارہ سننے کے لیے اتنی سخاوت؟'' جینی بیٹھ گئی۔

''اتنی سے نہیں، یہ ''بڑی'' بات ہے۔''

''وہ کیسے؟''

''تم نے جو کہی ہے۔'' مارک نے جینی کی نیلی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے جسارت کر ہی ڈالی۔

''اپنی تعریف کر رہے ہو یا میری؟''

''تمہارے سامنے تو صرف تمہاری تعریف ہی کی جا سکتی ہے۔'' دوسری جسارت۔

''کیوں؟'' جینی نے لطف لیا۔ اسے یہ بندہ کبھی کبھی مقناطیس کی طرح لگتا تھا لیکن وہ زیرِ کشش آتے آتے، ہر بار خود کو روک لیتی تھی اور دونوں جانب سے دل کی بات دل میں ہی رہ جاتی تھی۔

''آئینہ نہیں دیکھتی ہو؟''

''وہاں تو کوئی اور ہی شکل نظر آتی ہے۔'' جینی نے بے اختیار بات آگے بڑھا دی۔ مارک کو سماعت کا دھوکا لگا۔ شوق نے دل پر دستک دی۔ بے تابیِ قلب نے مہمیز لی۔ وہ درماندۂ حیرت، دعویٰ الفت کرتے کرتے تھم گیا۔ اور اک دو یقین اور وہم و گمان میں گم صم محوِ نظارہ تھا۔ دل اپنا، نگاہ اپنی، جلوے اپنے۔

''کس کی شکل؟'' اس کی آواز بھی ڈوب سی گئی۔ حشرِ تمنا، سینے میں بپا تھا لیکن اس نے باگ تھامے رکھی۔ جرأتِ اظہار کہاں سے لاؤں؟

''ہے کوئی تمہارے جیسا۔'' جینی کو اپنی ہی قوتِ گویائی اجنبی لگی۔ جینی نے خود سے سوال کیا۔ پسپا ہونا چاہیے لیکن تیر کمان سے نکل گیا تھا۔ جواب ذو معنی تھا۔ بس یہی ایک ڈھال بچی تھی ورنہ شوق سپردگی نے تو جیسے سپر ڈال دی تھی۔

''یعنی میں؟'' اس نے جینی کے جواب کو معنویت کا مفہوم دینے کی آس میں سوال گرایا۔ بس یہی آخری لغزش تھی۔ حسن کو راستہ ملا اور سرمستی شوق پلٹ گئی۔ پھر وہی ایذا رسانی۔

''تم کیا گیری کو پر ہو؟''

''نہیں۔ سڈنی پوئیٹر۔'' مارک نے لٹکی ہوئی آواز میں کہا اور دھم سے بیٹھ گیا۔ ''بلکہ جیری لوئیس۔'' اسے لغزش

کا احساس ہو گیا تھا۔ اسے اپنے آپ پر غصہ آیا۔ ''جیری لوئیس نہیں بلکہ اُلو... کا...'' جینی کو گھورتے دیکھ کر تھم گیا اور بات بدلی۔

''ہاں، اُلو کا پر ہوں۔''

جینی بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ دل کی بات، محتاجِ بیان ہی رہ گئی۔ موقع تھا جو اندیشہ و احتمال کی نذر ہوا۔ اخلاق و اعتدال کی نذر ہوا۔

دونوں پامالیِ دل پر بے کیف تھے۔ ایک کا انداز تھا، دوسرے کی ادا ٹھہری۔

''تم کافی بناؤ۔ میں کپڑے بدل کر آتا ہوں پھر بات کرتے ہیں۔'' مارک کھڑا ہو گیا۔

''ٹھیک ہے۔'' جینی نے اتفاق کیا۔ اس کی نگاہ دوسرے کمرے کی جانب جاتے ہوئے مارک کی پشت پر تھیں۔ جینی نے ہلکا سا ملال محسوس کیا۔ وہ گہرا سانس لے کر اٹھی اور کچن کی طرف چلی گئی۔

اسے مارک نے صبح فون کر کے بلایا تھا۔ وہ کچھ بات کرنا چاہ رہا تھا۔ جینی کو کچھ حیرت ہوئی تھی کہ کیا بات ہو سکتی ہے؟ تاہم اس کو آنا ہی تھا۔ دروازے پر بس اچانک ہی بات اس موضوع کی طرف نکل گئی جسے جینی نے عرصے سے سرد خانے میں رکھا ہوا تھا۔

کافی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے مارک نے بڑی احتیاط سے جینی کے متوقع سفر کا ذکر چھیڑا اور ساتھ چلنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ جینی کو حیرت ہوئی۔ اسے اس بات کا خیال نہیں آیا تھا۔

''دیکھو جینی، تم جس مقصد سے وہاں جا رہی ہو، وہ مقصد ایک دردناک حقیقت سے جڑا ہے۔ شاید وہاں تم خود کو سنبھال نہ سکو۔ ایک دوست کی حیثیت سے مجھے تمہیں ان حالات میں اکیلا نہیں چھوڑنا چاہیے۔'' مارک نے وجہ بتائی۔

''یعنی تم ایک سنجیدہ خادم ہو؟'' جینی کا لہجہ خوش گوار تھا۔

''درست فرمایا آپ نے۔'' مارک نے سر کو خم دیا۔ وہ دل میں سوچ رہا تھا کہ خادم نہیں 'امیدوار' ہوں۔

جینی الجھ گئی۔ وہ کچھ اور کہنا چاہ رہی تھی۔ مارک کی خواہش نے اسے مشکل میں ڈال دیا۔ ''مارک میں نے ہمیشہ تمہاری سوچ کی قدر کی ہے۔'' اس نے ناپ تول کر الفاظ چنے۔ ''تمہاری یہ پیشکش میرے لیے باعثِ طمانیت ہے لیکن... میرے ذہن میں ایک اور بات تھی۔''

''کیا؟''

''میرے جانے کے بعد بابی اکیلا ہو گا۔ ترس لی رائے مرفی اسے سنبھال تو لیتی ہے لیکن وہ تم سے زیادہ مانوس ہے۔ میں... سوچ رہی تھی کہ...'' جینی نے مارک کے چہرے پر یاس کا واضح رنگ دیکھا اور مشکل سے اپنی بات پوری کی... ''کہ تم اس دوران میں بابی سے ملتے رہو اور... اور...'' معاً وہ رک گئی۔ مت کر نادانی، دل پھر مچلا۔ یہ محض دوستی نہیں۔ دوست تو بدل جاتے ہیں اور مل جاتے ہیں لیکن دلدار... وہ چند لمحے کشمکش کا شکار رہی، بہرحال اس کے جوان بدن میں کوئی بوڑھی روح نہیں تھی۔ دھڑکنوں نے دھیما سا نغمۂ الفت چھیڑ دیا اور وہ مغلوب ہو کر مارک کے قریب جا بیٹھی۔

مارک چونک اٹھا۔ جینی نے اس کا ہاتھ اپنے ریشمی ہاتھ میں لے لیا۔ مارک کی جمالیاتی حس نے اسے جینی کی نیم وارفتگی کا احساس دلایا۔ یوں لگا جیسے جینی کا مہکتا ہوا وجود نرم خوش رنگ بادل میں تبدیل ہو گیا ہے اور وہ خود اس نرم، مہکتے ہوئے بادل میں کہیں گم ہو گیا ہے۔

جینی نے اس کے ہاتھ کی پشت پر اپنے یاقوتی لبوں کی تپش منتقل کر دی۔ مارک ان دیکھے ابر رنگیں میں قلابازیاں کھانے لگا۔

''یہ... یہ... کیا ہے؟'' اس کی آواز میں سرشاری تھی۔ سرشاری میں بے قراری اور بے قراری میں بے یقینی تھی۔

''قرضہ اتارا ہے۔'' جواب ملا۔ جینی کی نیلگوں آنکھوں میں ایک اور ہی رنگ تھا جو دل کی آنکھ ہی دیکھ سکتی تھی۔ مارک نے وہ رنگ دیکھ لیا۔

''کم سے کم دو قسطیں تو اتارو۔''

''دیکھو مارک چند روز کی تو بات ہے۔ چلو مسکرا دو۔ اتنی سنجیدگی میں تمہارا چہرہ اُلو کی طرح ہو جاتا ہے۔''

مارک نے دانت نکالے۔

''خادم ہوں۔ تو کیا واپس آنے تک ایک گولڈ رنگ خرید کر رکھوں؟''

''پھر پٹڑی سے اترے۔'' جینی نے آنکھیں دکھائیں۔

''ارے فتنہ ساز، فتنہ گر، ستم پیشہ... تم پٹڑی پر آنے کب دیتی ہو۔'' مارک نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارا۔

جینی نے اس کا کان مروڑا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

''یہ ایک اور بھی ہے؟'' مارک نے گردن گھما کر

دوسرا کان دکھایا۔

''بس دو ہی ہیں؟'' جینی کی آنکھوں میں پھر شرارت تھرکنے لگی۔

''نہیں دو اور بینک میں پڑے ہیں۔'' مارک نے خود ہی اپنا کان مروڑا۔

''تمہیں کسی اسٹیج پر ہونا چاہیے تھا۔'' وہ ہاتھ لہرا کر جلدی سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

اڑتیس سالہ ''گاردا'' لانگ بیچ پولیس ڈپارٹمنٹ میں اب تک کا ڈیٹیکٹیو تھا۔ مے نوشی کی عادت نے اسے خاصا نقصان پہنچایا تھا۔ مارک نے جب اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونکا اور مارک کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔

''ہیلو، کافی دنوں بعد آئے۔'' وہ بولا۔

''ہاں۔'' مارک نے بے تکلفی سے اس کے سامنے رکھا گلاس اٹھا کر سونگھا۔ ''باز نہیں آئے ابھی تک۔''

''کیا فرق پڑتا ہے؟''

''بہت فرق پڑتا ہے۔'' مارک نے سرزنش کی۔

''دوست اب لیکچرز کا وقت گزر گیا ہے۔'' گاردا نے جواب دیا۔ ''تم کہو بہت دنوں بعد چکر لگایا۔ کوئی خاص بات؟''

''ہاں ایک کام تھا۔ دو سال پیشتر مسز پال مارچ کا قتل ہوا تھا۔ یاد ہے؟''

''کس کو یاد نہیں۔ مجھے تو یہ بھی یاد ہے کہ تم نے خود نجی طور پر اس کیس پر کافی وقت خراب کیا تھا۔'' گاردا نے تبصرہ کیا۔

''ہاں، جینیفر کی وجہ سے۔ حالانکہ وہ میرا نہیں تمہارا کیس تھا۔ جینیفر جان بچا کر میرے والدین کے در پر پہنچی تھی۔'' مارک نے وضاحت کی۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن اب دو سال بعد کیا یاد آ گیا؟''

''مجھے کچھ یاد نہیں آیا، شاید تمہیں کوئی نئی بات یاد آ جائے۔'' مارک نے کہا۔ پھر اس نے گاردا کو بتایا کہ پال کی لاش کہاں اور کیسے دریافت ہوئی۔ نیز یہ کہ جینیفر، سوئٹزر لینڈ جا رہی ہے۔

''یہ بات ہے لیکن میں کیا نئی بات بتا سکتا ہوں۔ بہت کچھ تو تم خود جانتے ہو۔'' وہ بولا۔

''سوچو، شراب سے دھیان ہٹا کر سوچو۔'' مارک نے اس کا گلاس اٹھا لیا۔ جواب میں گاردا نے مسکرانے پر اکتفا کیا۔ کچھ دیر بعد اس نے بولنا شروع کیا۔ تاہم مارک کی معلومات میں کوئی نیا اضافہ نہیں ہوا۔

''ہو سکتا ہے پال نے یورپ روانہ ہونے سے پہلے اپنی ہی فیملی کو کسی کے ہاتھوں خود ہی مروانے کا بندوبست کر دیا ہو؟'' گاردا نے قیاس آرائی کی۔

''محرک؟'' مارک نے پوچھا۔

''مختلف مفروضے ہیں۔ ان میں ایک یہ بھی ہے کہ کوئی راز ہے جس کا علم فیملی یا کسی فیملی ممبر کو ہو گیا تھا جسے اندھیرے میں دفن کرنے کے لیے سب کچھ خود اسی نے کیا یا کروایا اور خود غائب ہو گیا۔ تاکہ ایک نئی شناخت کے ساتھ نئی زندگی کا آغاز کرے۔''

''خود وہ یہ کام کرے، یہ ناممکن ہے۔'' مارک بڑبڑایا۔ ''پال کے علاوہ کوئی اور مشکوک؟''

''نہیں۔ کوئی نہیں۔ ہم نے بہت زور لگایا۔ سب بے سود۔ وہ سوئٹزر لینڈ اترا تو تھا۔ نیویارک سے اس نے فلائٹ بھی پکڑی تھی۔ تاہم سوئٹزر لینڈ اترنے کے بعد سے وہ غائب رہا۔''

''تم کسی راز کی بات کر رہے تھے؟''

''یہ ایک مفروضہ تھا۔ تاہم کوئی سیکرٹ ہے جو ہم سے پوشیدہ ہے۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ پال کا کوئی فیملی بیک گراؤنڈ نہیں تھا۔ وہ خود ایک اسرار تھا۔ پُراسرار انداز میں ظاہر ہوا اور پُراسرار انداز میں غائب ہو گیا۔ ایف بی آئی بھی اس کے فیملی بیک گراؤنڈ کے بارے میں ہماری کوئی مدد نہ کر سکی۔ کوئی ریکارڈ نہیں تھا۔ پال مارچ ''مسٹری مین'' تھا۔''

کچھ سوچ کر وہ بولا۔ ''اس کی بیٹی نے گھر میں کسی قیدی کی تصویر دیکھی تھی، جس کا نام جوزف ڈینگاڈو تھا لیکن اس نام کے کسی قیدی کا وجود ہمیں نہیں ملا۔''

''تم نے تصویر دیکھی تھی؟''

''تصویر کسی نے نہیں دیکھی۔'' گاردا نے کہا۔

''جینیفر کا کیا کہنا تھا؟''

''اس کے مطابق، گھر کی تلاشی لی گئی تھی۔ وہ سمجھی کہ پولیس کا کام ہے۔ اور تصویر بھی وہی لے گئے ہیں۔'' گاردا نے بتایا۔

''اور پرائم انٹرنیشنل سیکیورٹیز؟''

''وہاں بھی ناکامی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔''

''تمہارا ایک دوست تھا سی آئی اے میں؟''

''لینگلے، ہیڈ کوارٹر کی بات کر رہے ہو؟''

''ہاں۔'' مارک نے تصدیق کی۔

''کوئی کام؟''

''اس کے ذریعے ''جیک کیلسو'' کے بارے میں معلوم کرو۔ نہایت احتیاط سے۔ میرا نام آئے نہ کسی اور کا۔ تمہارے پاس جواز ہے کہ وہ تمہارا کیس تھا اور تمہاری دلچسپی کیس سے ہٹنے کے بعد بھی ذاتی حیثیت میں برقرار تھی۔ پال مارچ کی لاش منظرِ عام پر آگئی ہے تو تم زیادہ پُرجوش ہو اور اس راز سے پردہ اٹھانا چاہتے ہو۔ جیک کے بارے میں تمہارے دوست کو بھی احتیاط برتنی پڑے گی۔ تمہیں زیادہ سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارا ریکارڈ اچھا تھا اور دماغ اب بھی کام کر رہا ہے۔ تم سمجھ رہے ہو کہ میں کیا چاہتا ہوں اور تمہیں کیا کرنا۔ راز معلوم کرنے کے لیے رازداری ضروری ہے۔'' مارک نے اختصار کے ساتھ اسے سمجھایا۔

''میں سمجھ رہا ہوں۔ لیکن میرا کافی عرصے سے اس سے رابطہ نہیں ہوا۔ بہرحال میں کچھ کرتا ہوں۔ کوئی خاص بات معلوم ہوئی تو تمہیں کال کروں گا۔''

''جیک کیلسو، سی آئی اے میں کسی اسپیشل آپریشنز سیکشن میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر ہے، احتیاط کرنا۔''

''بے فکر رہو۔ میں ان خودسروں کو خوب جانتا ہوں۔ لاؤ گلاس اِدھر پکڑاؤ۔''

''آخری بات۔ تم مجھے فون مت کرنا۔ میں خود کروں گا۔ نمبر دو۔'' مارک نے گلاس واپس کیا اور اس کا دیا ہوا نمبر لے کر اٹھ گیا۔ چلتے چلتے وہ شکریہ ادا کرنا نہیں بھولا تھا۔

☆☆☆

شام کے وقت جیک اس کے گھر میں تھا۔ مارک نے اسے بتا دیا تھا کہ جینی کا ہم سفر بننے کی اس کی کوشش ناکام ہو گئی ہے۔ جیک نے مارک کو تفصیلی بریفنگ دی اور ایک بریف کیس اس کے حوالے کرتے ہوئے مزید معلومات فراہم کیں۔ بریف کیس میں موبائل فون، چارجنگ یونٹ، فالتو بیٹریز، سونی ٹرانسمیٹر، ٹی وی ریموٹ کنٹرول جتنا ایک ہینڈی ڈیوائس جس میں سگنل ٹریس کرنے والا ننھا سا ایریل موجود تھا۔ اس کے علاوہ ..... دوربین کی چھوٹی جوڑی۔ ..... متعدد روڈ میپس (نقشے) ایک کار کا فوٹو، جس میں لائسنس پلیٹ صاف نظر آ رہی تھی۔ یہ ٹویوٹا فور وہیل ڈرائیو تھی۔ نائٹ ویژن بھی مہیا کی گئی تھی۔ ٹرانسمیٹر اور اس کا ریسیور الیکٹرونک تھا۔ نقشے اٹلی اور سوئٹزرلینڈ کے متعلقہ علاقوں اور سڑکوں کے تھے۔

''ہتھیار؟'' مارک نے سوال کیا۔

''وہیں ائرپورٹ پر ملے گا۔ آٹومیٹک گلوک اور ایمونیشن کے تین فالتو کلپ۔''

''وہاں کیسے گلوک کے ساتھ ائرپورٹ سے نکل سکوں گا؟''

''روانہ ہونے سے پہلے بتا دیا جائے گا۔''

جیک زیادہ دیر نہیں بیٹھا تھا۔ اس کے جانے کے بعد مارک سوچ میں ڈوب گیا تاہم اسے جیک کی پھرتی اور وسائل پر کوئی خاص حیرت نہ تھی۔ اسے سی آئی اے کی پہنچ کا ادراک تھا۔ بات کوئی اور ہی تھی جو اس کے ذہن میں چبھ رہی تھی۔ رات گاردا کو فون کرنے کا ارادہ اس نے ملتوی کر دیا۔

فون اس نے صبح کیا۔ وہ بھی پبلک بوتھ سے۔ احتیاطاً وہ بابی کے نرسنگ ہوم چلا گیا تھا اور وہاں سے فون کیا تھا۔ اگر اس کی نگرانی ہوئی بھی تو نگراں کو یہی خیال آئے گا کہ وہ بابی سے ملنے گیا ہے۔

گاردا نے اسے بتایا کہ اس کا دوست ریٹائرڈ ہو چکا ہے اور ورجینیا میں موجود ہے۔ تاہم اس نے ''آدی'' کا نام سنا ہے۔ ''آدی'' بالائی نشستوں کا حصہ ہے۔ بارسوخ ہے۔

وہ مارک کی ہدایت کے مطابق جیک کا نام نہیں لے رہا تھا۔ ''آدی'' کا تبادلہ ''اسپیشل پروجیکٹس'' میں کر دیا گیا تھا۔ میرا دوست ''اسپیشل پروجیکٹس'' کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکا۔'' گاردا نے بات ختم کی۔

''شکریہ ڈیئر، ایک احسان اور کر دو۔'' مارک نے درخواست کی۔

''کیا؟''

''بابی کلاڈویل ہوم میں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کوئی آئندہ چند روز تک بذریعہ کال اس کی خیریت کے بارے میں آگاہ رہے۔ کیا تم یہ کام کر دو گے؟''

''کیوں نہیں۔ اگر برا نہ مانو تو کچھ پوچھ لوں؟''

''ہاں کیوں نہیں۔'' مارک نے جواب دیا۔

''یہ کام تم بھی کر سکتے ہو؟''

''جینفر یورپ جا رہی ہے۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اس دوران میں بابی کو دیکھتا رہوں گا لیکن اچانک مجھے شہر سے نکلنا پڑ رہا ہے تو اگر تم.....''

''کہاں جا رہی ہو جینفر؟''

''مشکل ہے بتانا۔''

''تو میں رابطہ کیسے کروں گا؟''

''رابطہ میں کروں گا۔''

دوسری جانب کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی پھر گاردا کی آواز سنائی دی۔ ''مارک مجھے تم پر اعتماد ہے۔ میں نہیں جانتا تم کیا کرنے جا رہے ہو۔ لیکن اگر کھیل میں ''یہ لوگ'' ملوث ہیں تو دوست یہ اچھا اشارہ نہیں۔ ان مکاروں کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ ان کی ...موجودگی خطرے کی علامت ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ ایک آنکھ چوبیس گھنٹے کھلی رکھنا۔''

''خیال رکھوں گا۔ تمہاری تشویش کی قدر کرتا ہوں۔ ایک بار پھر شکریہ۔'' مارک نے کہا۔

☆☆☆

گاردا سے بات کرنے کے بعد مارک نے تمام صورتِ حال کا نئے سرے سے تنقیدی جائزہ لیا۔ اس کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ بالآخر اس نے فیصلہ کیا کہ جینی کے روانہ ہونے سے پہلے ایک ملاقات ضروری ہے۔ وہ تھوڑی دیر بابی کے ساتھ رہا اور وہیں سے جینی کو فون کیا۔ بعدازاں لباس تبدیل کر کے جینی سے ملنے چل پڑا۔ جینی اس کی منتظر تھی۔

''خیریت؟ اس وقت توقع نہیں تھی؟'' جینی نے کہا۔

''چلا جاؤں؟'' اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

''میری نقل کر رہے ہو؟'' وہ مسکرائی۔ اسے گزشتہ ملاقات یاد آ گئی۔ جینی نے اسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔

''نقل نہیں کر رہا، شاید سیکھ رہا ہوں۔'' وہ بولا۔

پچھلی ملاقات میں دونوں کے تعلقات میں دفعتاً ایک خوش گوار تبدیلی آ گئی تھی۔ اگرچہ دونوں ہی احساس آگاہی کے باوجود اعتراف سے گریزاں تھے۔

''کیا سیکھ رہے ہو؟'' جینی نے دروازہ بند کر کے اندرونی جانب قدم بڑھایا۔

''بتا دوں گا۔'' مارک نے دل کی آواز کو دبایا۔ وہ کسی اور مقصد سے آیا تھا اور اسی پر بات کرنا چاہتا تھا۔

''کیا پیو گے؟''

''کچھ نہیں۔ تم یہاں آ کر بیٹھ جاؤ۔''

جینی چونکی۔ ''ارے، خیریت... کیا ناراض ہو؟''

''نہیں ڈیئر ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ تم یہاں بیٹھ جاؤ۔'' مارک کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔

جینی بیٹھ گئی۔ تھوڑی تشویش کے ساتھ وہ بھی سنجیدہ نظر آنے لگی۔ مارک نے بے دھڑک اس کا ملائم ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ جینی کا دل زور سے دھڑکا۔

''مجھ پر بھروسا ہے؟'' مارک کی آواز میں سنجیدگی تھی۔

''خود سے زیادہ...''

''شکریہ۔'' مارک نے کہا۔ ''جینی تمہیں معلوم ہے کہ ایک دوست کی حیثیت سے دو سال پہلے میں اس دردناک کیس کی تفتیش ذاتی حیثیت میں کرتا رہا۔ کیس کسی اور کے پاس تھا۔ جتنا کر سکتا تھا، کیا... مجھے یہ بتاؤ کہ جوزف ڈیلگاڈو کے بارے میں کیا تم نے پوری بات بتائی تھی؟''

جینی کو جھٹکا سا لگا۔ یہ سوال اس کے لیے قطعی غیر متوقع تھا۔

''پلیز۔'' مارک نے اس کا ہاتھ دبایا۔ ''کوئی سوال نہ کرنا۔ وقت آیا تو بتاؤں گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''نہیں۔ سب کچھ نہیں بتایا تھا۔''

''مطلب؟'' مارک نے سنسنی محسوس کی۔

''مارک، جوزف ڈیلگاڈو کی تصویر دراصل..... دراصل میرے والد کی تھی۔'' جینی نے دھیرے سے کہا۔

اب مارک کے چونکنے کی باری تھی۔

''کیا یہ مذاق ہے؟''

''حقیقت بتا رہی ہوں۔ البتہ میں نے کسی حل کی امید میں تصویر اور جوزف کے بارے میں بتا دیا تھا۔ وہ ایک بہترین باپ اور شوہر ثابت ہوئے۔ میں آج تک تسلیم نہیں کر سکی کہ ان کا کوئی مجرمانہ پس منظر ہو سکتا ہے۔'' وہ خاموش ہو گئی۔

''پولیس تک تصویر نہیں پہنچی تھی۔'' مارک نے بتایا۔

''جب میں گھر پہنچی تو وہ فائل غائب تھی جس میں چند کاغذات اور وہ تصویر تھی۔ گھر کی بھی تلاشی لی گئی تھی۔ میں سمجھی کہ یہ پولیس کی حرکت ہے۔'' جینی نے کہا۔ ''وہ قدرے پرانی تصویر تھی۔ اس لیے شباہت محسوس ہوئی تھی لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ میرے والد کی تصویر تھی۔''

مارک بھی مہر بہ لب تھا۔ اس کا ذہن برق رفتاری سے کام کر رہا تھا۔

''کیا کوئی ایسی بات اور بھی ہے جو صرف تمہارے یا پھر بابی یا مسز مارچ کے علم میں ہو... کوئی غیر معمولی، کوئی عجیب بات؟''

''اور تو کوئی بات نہیں، ایسی۔''

''سوچو پلیز... ممکن ہے کوئی ایسی بات ہو جو تمہاری

سوچ کے مطابق غیر اہم ہو لیکن درحقیقت بہت سارے سوالات کے جواب دے سکے؟"

جینی کی شفاف پیشانی پر سوچ کی لکیریں ابھر آئیں۔ مارک پُرامید نظروں سے اسے تک رہا تھا۔

جینی کو وہ دن یاد آیا جب باپ نے اسے اپنی اسٹڈی سے باہر نکال دیا تھا۔ اس روز جو کچھ ہوا، وہ واقعی معمول سے ہٹ کر تھا۔

"مجھے نہیں پتا کہ یہ کوئی اہم بات ہے۔" جینی الجھی ہوئی آواز میں بولی پھر اس نے اس روز والا پورا واقعہ من و عن بتا دیا۔

مارک نے بمشکل اپنی ہیجانی کیفیت پر قابو پایا۔ "وہ "ڈسک" کہاں ہے۔ اور وہ سیکیورٹی باکس، چاندی کی کنجی...؟"

"میں نے پھر کبھی ان اشیا کو نہیں دیکھا۔ آخر بات کیا ہے؟" جینی پریشان دکھائی دی۔

"ابھی بتانے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ لیکن امید ہے کہ کچھ نیا سامنے آ سکتا ہے۔ کچھ پتا چلا تو بتاؤں گا۔ وہ ڈسک بہت اہم ہے۔ ان باتوں کا کسی سے ذکر نہیں کرنا۔ بہت احتیاط کرنا۔ فی الحال پریشان ہونے والی بات نہیں۔ پُرسکون ہو جاؤ اور اپنے سفر پر دھیان دو۔" مارک نے اس کا ہاتھ تھپتھپا کر چھوڑ دیا۔

"تم کچھ چھپا تو نہیں رہے؟"

"چاہوں بھی تو تم سے نہیں چھپا سکتا۔" مارک بولا۔ "ہاں صرف ایک بات چھپی ہے۔" وہ مسکرایا۔

"کیا؟" جینی نے بے اختیار پوچھا۔

"بتا دوں؟"

جینی فوراً سمجھ گئی۔ "نہیں، نہیں۔ مت بتاؤ۔"

"یعنی جانتی ہو؟" مارک نے دوستی انداز برقرار رکھا۔

"نہیں جانتی۔"

"جھوٹ بول رہی ہو۔"

"ہاں۔" وہ بے اختیار کہہ اٹھی۔ چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ وہ جلدی سے کافی کے بہانے اٹھی۔

مارک عالم سرخوشی و سرمستی میں تھا۔ اسے شیوۂ چرخِ فتنہ گر صاف بدلا بدلا لگا۔ دوسری جانب وہ آشفتہ مزاج، آشفتہ سر... حجاب آلود سوچتی ہی رہ گئی کہ وہ کیا بول گئی۔

"کہاں چلیں۔ اب کافی کی ضرورت نہیں رہی۔" مارک نے نعرۂ ہائے مستانہ بلند کیا۔

"کیوں؟" وہ پلٹی۔

"ہاں، کر دی، اب کسی چیز کی ضرورت نہیں۔" اس مرتبہ مارک چوکنے پر آمادہ نہ تھا۔

"کسی دھوکے میں مت رہنا۔" جینی نے انگوٹھا دکھایا۔

"یوں تابِ غم آزما رہی ہو یا دانستہ فریب کھا رہی ہو؟" وہ خود بھی اپنے اندازِ تکلم پر حیران تھا۔

جینی نے کسی چیز کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھا۔

"کیا تلاش کر رہی ہو، سینڈل ہے نا۔"

"سینڈل تو ہے۔ ترس آ جاتا ہے۔" جینی نے خود پر قابو پا لیا تھا۔

"ہائے، ترس ہی تو نہیں آتا۔" مارک کھڑا ہو گیا۔ ایسی خود بینی و پندارِ خودی... ہم بھی جرأتِ شوق آزمانے جائیں گے۔ چلتا ہوں۔"

مارک بے خبر تھا کہ وہ عقب میں دل آویز انداز میں مسکرا رہی تھی۔ وہ دروازہ کھول کر نکل گیا۔

☆☆☆

زیورچ، سوئٹزرلینڈ۔

جینفر، زیورچ ائرپورٹ "کار ہائر ڈیسک" پر تھی۔

"میرا نام جینفر مارچ ہے۔ میں نے ریزرویشن کرائی تھی۔" اس نے تعارف کرایا۔

ڈیسک کلرک نے خوش آمدید کہنے کے بعد کاغذات کی پڑتال کی۔ "آپ نے وضاحت نہیں کی کہ آپ کو گاڑی کتنے عرصے کے لیے چاہیے؟" کلرک نے ایک شیٹ برآمد کی۔

"میں یقین سے نہیں کہہ سکتی۔ شاید تین چار روز یا اس سے کچھ زیادہ۔" اس نے جواب دیا۔

"یقیناً، جیسے آپ سہولت محسوس کریں۔ تاہم ایک چھوٹا سا مسئلہ ہے۔ آج ڈیمانڈ زیادہ رہی ہے۔ اس لیے ہم آپ کو اسی ریٹ پر فور وہیل ٹویوٹا جیپ دے رہے ہیں۔ کیا آپ کو سوٹ کرے گی؟"

"ٹھیک ہے۔ فی الحال مجھے اٹالین بارڈر کے قریب "دارزو" جانا ہے۔ پھر ویزن ہارن۔ اس میں کتنا وقت لگے گا؟"

ڈیسک کلرک نے ایک نقشہ منتخب کیا۔

"چار گھنٹے خرچ ہوں گے۔ آپ یہ نقشہ بھی ساتھ رکھ سکتی ہیں۔"

"شکریہ۔" جینفر نے کاغذات پُر کر کے دستخط کیے۔

"یہاں آپ بہت لطف اندوز ہوں گی۔" کلرک

نے چابیاں اس کے حوالے کر دیں۔ جینفر اس بات سے بے خبر تھی کہ ڈیسک کلرک کی نگاہ اس کی روانگی پر تھی۔ اس کے نکلتے ہی اس نے فون اٹھایا۔

☆☆☆

مارک پروگرام کے مطابق صبح آٹھ بجے زیورچ پہنچ چکا تھا۔ اسے چند گھنٹے کی نیند نصیب ہوئی تھی اور آٹھ گھنٹے کی فلائٹ نے اسے تھکا دیا تھا۔ جہاز میں اس نے ایجنٹ گراہم اور ایجنٹ فیلوز کو دیکھ لیا تھا۔ لیکن تینوں آپس میں لاتعلق رہے۔

جہاز کے لینڈ کرنے کے بعد وہ دونوں غائب ہو گئے تھے۔ اسے پروگرام کے مطابق جینی سے تین گھنٹے قبل پہنچنا تھا۔ کسٹم سے وہ بہ آسانی نکل گیا۔ جیک کی ہدایت کے مطابق وہ انفارمیشن ڈیسک پر پہنچا۔ جہاں "چارلس ونسٹ جونز" کے نام کا لفافہ اس کا منتظر تھا۔ جب اس نے بائیں جانب لگیج ڈیسک پر ٹکٹ حوالے کیا تو کینوس کا ایک ہولڈال اس کے حوالے کر دیا گیا جو چارلس ونسٹ جونز کی جانب سے تھا۔

مارک مردانہ آرام گاہ میں گیا اور ایک کیبن میں خود کو لاک کر لیا۔ چابی، جیک نے فراہم کی تھی۔ اس نے ہولڈال کو ان لاک کیا۔ اندر گلاک AMM موجود تھی۔ ساتھ ایمونیشن کے تین کلپ بھی تھے۔

وہاں سے نکل کر وہ ائرپورٹ کے ٹورسٹ اسٹور پر پہنچا۔ اس نے زیتونی رنگ کا سبزی مائل ہیٹ خریدا۔ یہ جھکے ہوئے کناروں والا کاؤبوائے ٹائپ ہیٹ تھا۔

اس نے ایک ریئل کوٹ پہنا ہوا تھا جس کی لمبائی گھٹنوں تک تھی۔ دھوکا دینے کے لیے اسے پلٹ کر بھی پہنا جا سکتا تھا۔ اس طرح رنگ اور ڈیزائن تبدیل ہو جاتا۔ یہ ٹو اِن ون کوٹ اس نے نیویارک میں ہی خرید لیا تھا۔

اب اس کی ظاہری حالت میں مناسب تبدیلی آ گئی تھی۔ مارک نے مطمئن ہو کر آنے والی فلائٹس کے بورڈ پر نظر ڈالی۔ جینی کی فلائٹ کا وقت 10:55 تھا۔ کلائی کی گھڑی 9:15 بجا رہی تھی...... ڈیسک پر نظر رکھنے سے پیشتر اس نے ناشتے کا فیصلہ کیا۔

پیٹ پوجا کے دوران میں وہ جیک اور جینی کے انکشافات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ڈسک کے بارے میں جیک کی بات کی تصدیق ہو گئی تھی۔ جوزف ڈیلگاڈو کی تصویر پولیس تک کیونکر نہیں پہنچی؟ کوئی اور ہاتھ صاف کر گیا تھا یا پھر سی آئی اے کی حرکت تھی؟ وہ تصویر درحقیقت پال مارچ کی تصویر تھی۔ یہ دو نام پہلے ہی معما بنے ہوئے تھے۔ مارک اتنا تو سمجھ گیا کہ یہ دونوں نام ایک ہی آدمی کے تھے... تاہم قدرے آسان ہونے کے باوجود "کیس" مزید پیچیدگی اختیار کر گیا تھا۔ متعدد نئے سوالات جنم لے چکے تھے۔ ان سوالات کے جوابات کون دے گا؟ پال مارچ ہاتھ آ گیا تھا لیکن مردہ حالت میں۔ یعنی کیس سرد خانے سے باہر آ گیا تھا۔

مارک کی سوچوں کا رخ جیک کی جانب چلا گیا۔ اب تک بظاہر جیک کی شخصیت اور باتوں میں کوئی قابلِ ذکر الجھاؤ اسے نظر نہیں آیا تھا۔

وہ سی آئی اے کا بندہ تھا۔ ڈسک والی بات ٹھیک تھی۔ اگرچہ یہ راز ہی تھا کہ ڈسک میں کیا تھا؟

سوئس پولیس، اٹالین پولیس اور انٹرپول، سی آئی اے کو پتا لگنا ہی تھا کہ پال مارچ مردہ حالت میں کہاں ہے۔ لیکن مخالف گروپ، بقول جیک کے وہ بھی ڈسک کے پیچھے تھا۔ اسے فوراً کیونکر پتا چل گیا۔ پال مارچ کا ڈسک سے تعلق؟ وہ غائب ہوا یا غائب کیا گیا؟ دو سال پہلے کا خون خرابا کیا ڈسک کی وجہ سے تھا؟ فیملی کو مارنے کی وجہ؟ پھر اس کام کو مکمل کیوں نہیں کیا گیا۔ جینی اور بابی آج بھی زندہ تھے۔ اگر یہ کسی وجہ سے غیر ضروری تھا، شاید پال کے غائب ہونے کی وجہ سے تو بقول جیک اب پھر سے جینی کی جان کو خطرہ کیوں ہے؟

اہم سوال یہ تھا کہ دو سال پہلے قاتل پکڑا کیوں نہیں گیا؟ نیویارک میں اتنی بڑی واردات ہو جائے تو تاخیر ممکن ہے لیکن قاتل کا ہاتھ نہ آنا ایک غیر معمولی بات تھی۔ کیا اندر کالی بھیڑیں موجود ہیں؟ اگر ہاں تو کہاں؟ سی آئی اے میں یا ایف بی آئی میں؟ یا پھر پولیس میں؟

اگر یہ مفروضہ صحیح ہے تو پھر جیک بھی جھوٹ بول سکتا ہے کہ کوئی اور گروپ "ڈسک" کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ مارک کا ذہن تھک گیا۔ اس نے دماغ کو آزاد چھوڑ دیا۔

"انکار کرو اور چوکس رہو۔" مارک نے دو نکاتی پالیسی ترتیب دی اور سوچنا بند کر دیا۔

گہرے رنگ کی اوپل اومیگا، مارک کے نام بک تھی۔ کریڈٹ کارڈ استعمال کر کے اس نے فارم بھرا اور اوپل کی چابیاں وصول کیں۔ مارک نے سامان عقبی نشست پر ڈالا اور نقشہ جات اگلی نشست پر رکھے۔ چند منٹ میں وہ ایک "گیس اسٹیشن" پر تھا۔

اسٹیشن سے نکل کر اس نے بریف کیس سے ٹرانسمیٹر

اور ٹریکنگ ڈیوائس نکالی۔ جیک کی اطلاع کے مطابق فور وہیل ٹویوٹا میں "بگ" موجود تھا۔ اطلاع کے مطابق جیپ سفید رنگ کی تھی۔

ڈیوائس کے مطابق ٹویوٹا حرکت میں نہیں تھی۔ مارک نے اندازہ لگایا کہ جینی ابھی "کارمائر لاٹ" میں ہی موجود ہے۔ مارک نے مانیٹر آف کر دیا۔

☆☆☆

جینی کا رخ جنوب کی سمت تھا۔ وہ مختلف راستوں سے ہوتے ہوئے قدیم سوئس گیٹ وے پر پہنچی۔ جہاں سے اٹلی کی حدود میں داخل ہوا جا سکتا تھا۔ وہ کچھ دیر کے لیے الپائن کیفے میں رکی۔ لنچ کر کے وہ اٹلی میں داخل ہو گئی۔ سرحدی گاؤں کے قریب سبز یونیفارم میں اٹالین کسٹم پولیس موجود تھی۔ انہوں نے پاسپورٹ کا سرسری جائزہ لیا اور جینی بہ آسانی آگے بڑھ گئی۔ دس منٹ بعد نیم خوابیدہ ٹاؤن "وارزو" میں تھی۔

بنا کسی پریشانی کے اسے مقامی کارابینری اسٹیشن مل گیا۔ جینی اٹالین زبان سے نا آشنا تھی۔ وہاں موجود کارپورل کو اپنی بات سمجھانے میں اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ بالآخر کارپورل نے اسے ایک دراز قامت سے ملوایا۔

"سیکورینا۔"

"کیا تم انگریزی جانتے ہو؟" جینی نے سوال کیا۔

"کچھ کچھ......" اس نے جواب دیا۔ "میرا نام سرجنٹ بارٹی ہے۔ بارٹی، جینی کو آفس میں لے آیا۔

جینی کا مقصد جاننے کے بعد بارٹی نے اسے کیپٹن ڈکٹر سے ملنے کا مشورہ دیا۔

"کیپٹن سے میں کہاں مل سکتی ہوں؟"

"اس کا دفتر ٹیورن ہیڈ کوارٹر میں ہے۔ شومئی قسمت وہ اس وقت کیس کے سلسلے میں سوئٹزر لینڈ میں موجود ہے۔" سارجنٹ بارٹی نے اطلاع فراہم کی۔

"ٹھیک ہے۔ میں کیپٹن سے کل کس وقت بات کر سکتی ہوں؟"

"کل دو بجے مناسب رہے گا۔" بارٹی نے جواب دیا۔ "اس دوران میں اسے تمہارے بارے میں بتا دوں گا کہ تم ٹیورن پہنچ رہی ہو۔"

"شکریہ، وہاں قیام کی کیا صورت ہوگی؟"

"وہاں دو ہوٹل ہیں۔ سوئس بارڈر کے قریب "برکوف ہوٹل"۔ "سملن بہتر رہے گا۔"

جینی کھڑی ہو گئی۔ جاتے جاتے اسے ایک خیال آیا۔

"باڈی دریافت کرنے والا ایک امریکن تھا؟"

"ہاں، ایک امریکی نوجوان۔ اس کا نام چک میکال تھا۔" سارجنٹ بارٹی نے جواب دیا۔

"تھا؟ کیا مطلب؟ کیا وہ چلا گیا؟ میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔"

"یہ ممکن نہیں ہے۔"

"کیوں؟" جینی نے الجھن محسوس کی۔

"ہی از ڈیڈ۔" جواب آیا۔

☆☆☆

پندرہ منٹ بعد جینی سوئس بارڈر کراس کر رہی تھی۔ سارجنٹ بارڈر چک میکال کی موت کے بارے میں تفصیلات بتانے سے گریزاں تھا۔ اتنا ہی پتا چل سکا کہ وہ "فرکا پاس" پر حادثے کا شکار ہوا تھا اور سوئس پولیس تفتیش کر رہی ہے۔

سامنے سڑک دو شاخہ ہو رہی تھی۔ بائیں جانب مڑنے کا مطلب تھا کہ جینی سملن پہنچ جاتی۔ معاً اس کی نگاہ "مرر" پر گئی۔ پچاس گز کے فاصلے پر گہرے رنگ کی ایک اوپل کار، ٹویوٹا کے عقب میں موجود تھی۔ جینی کو اوپل کئی بار نظر آئی تھی۔ "وارزو" میں بھی جینی نے اسے دیکھا تھا اس مرتبہ جینی کو ہلکی سی تشویش ہوئی۔

اوپل کے شیشے ٹینٹڈ تھے۔ لہٰذا وہ ایک بار بھی اندازہ نہ لگا سکی کہ گاڑی کے اندر کون ہے۔ تاہم اسے اتنا یقین ہو چلا تھا کہ اوپل اس کے تعاقب میں ہے۔

سملن ایک چھوٹا سا گاؤں نما علاقہ تھا۔ برکوف ہوٹل تلاش کرنے میں جینی کو کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

اوپل، ہوٹل کے پاس سے گزرتی ہوئی مرکزی سڑک پر آگے بڑھتے ہوئے غائب ہو گئی۔

"استقبالیہ پر موجود خاتون نے جینی کو خوش آمدید کہا۔

"مجھے آج رات کے لیے ایک کمرے کی ضرورت ہے۔"

خاتون نے رجسٹریشن فارم بھروایا اور ایک کمرے تک جینی کی راہنمائی کی۔ یہ ایک کشادہ کمرا تھا۔ بالکونی سے سملن ویلی کا پورا نظارہ نگاہوں کی دسترس میں تھا۔ قدرتی حسن کا وہ ایک بے حد دلکش منظر تھا۔

خاتون نے جینی سے کھانے کے متعلق معمول کی باتیں کیں۔ جینی نے مسکرا کر شکریہ ادا کیا۔ کچھ دیر بعد وہ

کمرے میں تنہا تھی۔ کمرے کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ اس نے اپنا مختصر سامان ایک طرف رکھا۔ پھر "سملن ویلی" کے مسحور کن نظارے سے لطف اندوز ہونے لگی۔ بعدازاں واش روم میں تر و تازہ ہونے کے بعد اس نے لباس تبدیل کیا اور ڈائننگ ہال کا رخ کیا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد اس نے نوٹ کیا کہ بار کاؤنٹر پر دس بارہ لوگ موجود تھے۔ ان میں سے ایک شخص جینی کی طرف متوجہ تھا۔

جینی نے اسے اپنی پرکشش شخصیت کا جادو سمجھ کر کوئی خاص اہمیت نہیں دی لیکن جب وہ آدمی اس کی ٹیبل کی جانب بڑھا تو وہ سنبھل گئی۔

اجنبی نے سفید سیال سے لبریز گلاس ٹیبل پر رکھا۔

"تہنیتی جذبات کے ساتھ مہمان نوازی کے نام۔"

اس کی انگریزی رواں تھی۔ "مقامی مشروب ہے، اگر تم تیزی سے پیو گی تو تمہیں پہلی بار بھی خوش گوار لگے گا۔ مجھے یقین ہے کہ تم امریکن ہو؟"

اس کی عمر تیس کے لگ بھگ تھی۔ شخصیت بھی معقول تھی۔ جینی نے گلاس ہاتھ کی جنبش سے ایک طرف کر دیا اور حتی الامکان شائستگی سے کہا۔ "ہاں، میں امریکن ہوں۔ پیشکش کا شکریہ...... لیکن میں تنہائی کی متمنی ہوں اور معذرت خواہ ہوں۔ یقیناً تم برا نہیں مناؤ گے۔"

اجنبی نے مسکراتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھایا۔ "یقیناً اس میں برا منانے کی کوئی بات نہیں ہے لیکن بطور ایک میزبان کے میں نے یہ انداز اپنایا۔ میرا نام "اینٹن ویبر" ہے۔ یہ ہوٹل میں چلاتا ہوں۔"

جینی نے دلچسپی محسوس کی۔ "آئی ایم سوری۔"

"نہیں، کوئی بات نہیں۔ کیا تم چند روز قیام کا ارادہ رکھتی ہو؟"

"میرا نام..."

"ہاں، نام میں نے رجسٹریشن کارڈ پر دیکھ لیا تھا۔"

"میں ٹھہروں گی نہیں۔ شاید بس آج کی رات رکوں گی۔" جینی نے اس کے اندازے کی تردید کی۔

"افسوس کی بات ہے۔ یہ علاقہ بہت خوب صورت ہے۔" ویبر نے بتایا۔

"ہاں مجھے اندازہ ہے۔" جینی نے اقرار کیا لیکن میری یہاں آمد کا مقصد کچھ اور ہے۔"

ویبر کی آنکھوں میں سوال دیکھ کر وہ بولی۔

"دراصل آس پاس میں چند روز قبل ایک امریکن باڈی گلیشیئر کی برف میں دریافت ہوئی ہے۔"

ویبر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔ "کیا تم صحافی ہو؟"

"نہیں، بس تجسس کا احساس ہے۔ میں روم جاتے جاتے عارضی طور پر یہاں رک گئی۔ یوں لگتا ہے کہ یہ کوئی راز ہے۔ کوئی غیر متوقع اور غیر معمولی بات۔"

"جس امریکی لڑکے نے حادثاتی طور پر اسے دریافت کیا تھا، وہ اسی ہوٹل میں ٹھہرا تھا لیکن وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ تین روز قبل وہ "فرکا پاس" پر حادثے کا شکار ہو گیا۔ میری معلومات کے مطابق پولیس فی الحال حادثے کے بارے میں پُریقین نہیں ہے۔"

جینی کو تناؤ کا احساس ہوا۔ "کیا تمہارا مطلب یہ ہے کہ لڑکے کو قتل کیا گیا ہے؟"

"میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتا۔ لیکن تفتیش بدستور جاری ہے۔ کل ہی دو سراغ رساں یہاں وہ کمرا دیکھنے آئے تھے جہاں چک میکال ٹھہرا ہوا تھا۔" ویبر نے انکشاف کیا۔

جینی کے بدن میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ سوچ میں ڈوب گئی۔ "کیا میں وہ گلیشیئر دیکھ سکتی ہوں جہاں امریکی باشندے کی باڈی دریافت ہوئی تھی؟"

"کیوں نہیں۔ وہ ویزن بارن گلیشیئر ہے۔ تاہم تمہیں گائڈ کی ضرورت پڑے گی۔"

"غالباً وہ بھی ایک خوب صورت مقام ہوگا؟"

"یہاں بیشتر مقامات قدرتی حسن سے مالا مال ہیں۔"

"تو گائیڈ کہاں سے مل سکتا ہے؟"

ویبر ہنسا۔ "تم کافی پُرجوش دکھائی دیتی ہو۔ ہوٹل شروع کرنے سے پیشتر میری گزر بسر اسی کام پر تھی۔"

"کس کام پر؟" جینی نے سوال کیا۔

"گائیڈ۔"

"یہ تو اچھی بات ہے۔ کیا تم میری راہنمائی کر سکتے ہو؟ میں تمہارا معاوضہ ادا کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"اوہ تو میرا کام اچھا چل رہا ہے۔" ویبر مسکرایا۔ "معاوضے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے خوشی ہوگی تمہارے کام آ کر۔ لیکن تمہارے پاس غالباً حفاظتی سامان نہیں ہے۔ دراصل تمہیں کلائمبنگ کی ضرورت نہیں بلکہ یہ ہائیکنگ ہوگی پھر بھی کچھ سامان ضروری ہے۔"

"نہیں، میرے پاس تو ایسا کوئی سامان نہیں ہے۔"

ویبر نے شانے اچکائے۔ "خیر میں گریٹا کا سامان لے لوں گا۔ گریٹا، وہ جو تمہیں ریسپشن ڈیسک پر ملی تھی۔ ہم

صبح ساڑھے چھ بجے ملیں گے، اوکے؟"

"اوکے، اینڈ تھینکس۔" جینی نے تشکر کا اظہار کیا اور ویبر کا پیش کردہ سفید سیال سے بھرا گلاس اٹھا لیا۔

☆☆☆

مارک نصف گھنٹے بعد دوبارہ ولیج میں داخل ہوا اور برگوف ہوٹل کے سامنے سے گزرا۔ ٹویوٹا کی موجودگی کا یقین کرنے کے بعد اس نے اوپل کا رخ دوسرے ہوٹل کی جانب پھیر دیا۔ ہوٹل سڑک کے مخالف سمت، جینی والے ہوٹل کے بالمقابل تھا۔ یہ بھی کوئی بڑا ہوٹل نہیں تھا۔ مارک نے احتیاط سے ایک مناسب جگہ منتخب کر کے گاڑی پارک کی اور ہوٹل میں داخل ہو گیا۔

آف سیزن کی وجہ سے جینی کی طرح اسے بھی بہ آسانی کمرا مل گیا۔ اس نے جو کمرا منتخب کیا، وہ ہوٹل برگوف کے رخ پر تھا۔ ریسپشن پر موجود نوجوان حیران تھا کیونکہ وہاں آنے والوں کی بڑی تعداد وہ کمرے بک کرتی تھی جو الپس کے سامنے تھے۔ مجبوری میں وہ سڑک کی جانب والے کمرے بک کرتے تھے۔ بہرحال یہ اس کا مسئلہ نہیں تھا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے کھڑکی سے دوربین کے ذریعے سڑک کی دوسری جانب ہوٹل برگوف کا جائزہ لیا۔ تمام دن کی سرگرمیوں کے بعد وہ تھکن محسوس کر رہا تھا۔

جس وقت مارک سونے کے لیے بستر میں گھسا، تکیے پر سر رکھتے ہی اسے نیند نے آن دبوچا۔

صبح کے تین بج رہے تھے۔ تاریکی اور سناٹا۔ وہ آدمی اپنی کار میں برگوف ہوٹل کے قریب رکا۔ کچھ دیر وہ کار میں ہی رہا۔ ہوٹل اور اطراف کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد وہ گاڑی سے نکلا۔

چند منٹ بعد وہ فور وہیل ٹویوٹا جیپ کے قریب نمودار ہوا۔ اس نے رین کوٹ پہنا ہوا تھا۔ کوٹ کی جیب سے اس نے چند اوزار نکالے اور ٹویوٹا پر مصروف عمل ہو گیا۔ اس نے اپنے کام میں زیادہ وقت نہیں صرف کیا اور اپنی گاڑی میں جا بیٹھا۔ پُراسرار آدمی جس خاموشی سے آیا تھا اسی خاموشی کے ساتھ اپنا کام کر کے ولیج سے نکل گیا۔

☆☆☆

نیویارک۔

گاردا سے مارک کی اچانک ملاقاتوں اور گفتگو نے اس کا تجسس بیدار کر دیا۔ ورنہ مارچ کیس سے وہ تقریباً لاتعلق ہو گیا تھا۔ وہ اب فورس میں بھی نہیں تھا۔ اسے یہ سب کچھ عجیب اور پُراسرار سا لگ رہا تھا۔ اسے مارک پر اعتماد تھا لیکن تین حروف نے اس کے کان کھڑے کر دیے تھے۔ وہ تین حروف تھے: CIA۔

اس نے کیس کے پرانے کاغذات پھر سے نکال لیے تھے۔ اسی اثنا میں JFK ائرپورٹ پر اس نے ڈیبی سے رابطہ کیا۔ ڈیبی سے اس کی شناسائی تھی۔

گاردا بھونرا صفت تھا اور عورتوں کے معاملے میں بھی اعتدال سے ہٹا ہوا تھا۔ ڈیبی کے علاوہ متعدد عورتیں اس امر سے آگاہ تھیں۔ تاہم اس کے باوجود ڈیبی نے اس کے ساتھ تعاون کیا اور اس کی مطلوبہ معلومات فراہم کر دیں۔

آخر میں وہ بولی۔ "ملو گے نہیں؟"

"کیوں نہیں۔ تمہارا یہ قرض تو اتارنا پڑے گا۔"

گاردا نے فون رکھ دیا۔ یہ کیا ماجرا ہے؟ اس نے خود سے سوال کیا۔ جینفر نے سوئٹزرلینڈ کے لیے پرواز کی تھی اور مارک بھی نیویارک چھوڑ گیا تھا۔ گاردا متعجب تھا کہ دونوں الگ الگ فلائٹ کے ذریعے کیوں روانہ ہوئے تھے؟ اسے کوئی شک نہیں تھا کہ کسی نئی گڑبڑ کا آغاز ہو چکا ہے۔

☆☆☆

سوئٹزرلینڈ۔

جینی چھ بجے سے قبل ہی اٹھ گئی تھی۔ رات کسی وقت معمولی نوعیت کا طوفان آیا ہو گا۔ باہر سڑکوں پر جگہ جگہ پانی کھڑا تھا۔ وہ غسل کے بعد تیار ہو کر نیچے ڈائننگ ہال میں آ گئی۔

کریٹا اسے دیکھ کر مسکرائی۔ "نیند اچھی آئی ہو گی؟"

"ہاں پُرسکون نیند تھی۔"

"ویبر نے مجھے بتایا تھا کہ تم دونوں گلیشیر کی طرف جا رہے ہو؟" کریٹا نے ایک بیگ نکال کر کاؤنٹر پر رکھ دیا۔

"ہاں، میں اس کے تعاون کی شکر گزار ہوں اور تمہاری بھی مشکور ہوں۔" جینی نے خوش دلی سے کہا۔ اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ بیگ میں ہائیکنگ کا ضروری سامان ہے۔ چند منٹ میں ویبر بھی پہنچ گیا۔ ہائے ہیلو کے بعد دونوں نے ناشتا کیا۔ روانگی کے لیے ویبر نے فور وہیل ڈرائیو کی وجہ سے ٹویوٹا جیپ کو ہی ترجیح دی۔

وہ دونوں جیسے جیسے آگے بڑھتے رہے، موسم بہتر ہونے لگا۔ ویبر، جینی کو آس پاس کے مناظر اور پہاڑی چوٹیوں کے بارے میں بتا رہا تھا۔ ہر منظر دلکش و دل پذیر تھا۔ دیکھنے والا خود کو ایک نئی دنیا میں پاتا تھا۔

پہاڑ کی چڑھائی کے ایک طرف کھائی تھی۔ ٹریک کی چوڑائی اتنی تھی کہ ٹویوٹا جیپ کے ساتھ محض ایک فٹ کی جگہ ہی بچی تھی۔ کہیں کہیں جیپ کے چوڑے وہیل پھسل پھسل جاتے۔

"احتیاط سے، اسپیڈ کم کرو۔ آگے اور مشکل درپیش ہے۔" ویبر نے مشورہ دیا۔ ایک موڑ مڑتے ہی ایک شاندار منظر نے دل موہ لیا۔ "ویزن ہارن" تمام تر سحر انگیزی کے ساتھ اچانک ان کے سامنے آ گیا تھا۔

ویبر کے اشارے پر جینی نے ٹویوٹا روک دی۔ ویبر اتر گیا۔ "آگے پیدل جانا پڑے گا۔ اسٹک لے لو اور "پارکا" کا ہڈ سر پر کر لو۔" ویبر نے ہدایت کی۔

☆☆☆

مارک اچانک ہڑبڑا کر اٹھا تھا۔ اس نے فوراً گھڑی پر نظر ڈالی۔ آٹھ بج کر پانچ منٹ۔ اسے سمجھ نہ آیا کہ اتنا بے خبر کیسے سو گیا۔ پہلا خیال "گاردا" کی وارننگ تھی کہ اگر سی آئی اے ملوث ہے تو سوتے ہوئے بھی ایک آنکھ کھلی رکھنا۔ دوسرا خیال... اسے تاخیر ہو گئی تھی۔ گھڑی دیکھنے کے بعد دوسرا کام اس نے یہ کیا کہ کھڑکی سے سامنے ہوٹل برگوف کا جائزہ لیا۔ اس وقت دوربین کی ضرورت نہیں تھی۔ جلد ہی اسے یقین ہو گیا کہ جینی کی ٹویوٹا غائب ہے۔

مارک نے نئی الیکٹرانک ٹریکنگ ڈیوائس نکالی۔ آن کرنے کے بعد اس نے مونیٹر کو دیکھا۔ ٹویوٹا شمالی سمت میں تھی۔ سگنل کی کمزوری ظاہر کر رہی تھی کہ جینی شمال کی سمت میں کافی فاصلے پر ہے۔ یعنی وہ صبح ہی صبح روانہ ہوئی تھی۔

☆☆☆

وہ، ویبر کی ہمراہی میں گلیشیر پر پہنچی تو ہلکے نیلے رنگ کے سمندر نے اسے مبہوت کر دیا۔ یہ برف کا سمندر تھا۔ جس پر تنگ اور چوڑی دراڑوں نے جیسے جھریاں ڈال دی تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ نیلاہٹ مائل سطح کا ایک مہیب انڈا ہے، جس میں سے بچہ باہر آنے کے لیے اندرونی سطح کے ساتھ تگ و تاز میں مصروف ہے۔ اس کشمکش کے نتیجے میں انڈے کی بیرونی سطح جابجا چٹخ رہی ہے۔ اوپر نیلا آسمان تھا جہاں بادلوں کے منتشر ٹکڑے پھٹتے ہوئے روئی کے گالوں کی طرح تیرتے پھر رہے تھے۔

"محتاط رہنا۔" ویبر کی آواز جینی کو حسین مناظر کی دنیا سے باہر لے آئی۔ "برف سخت ہے، تاہم میرے عقب میں رہنا اور میرے قدموں کی پیروی کرنا۔"

"اوکے میں تیار ہوں۔" جینی نے خالص فضا میں گہری گہری سانسیں لیں۔

ویبر نے اسٹک کے اشارے سے بتایا کہ ان کی مطلوبہ دراڑ کون سی ہے۔

کچھ دیر بعد دونوں چیمبر نما برفانی قبر کے منہ پر تھے۔ جینی اور آگے جانا چاہتی تھی۔ اس کی دھڑکنیں از خود بے ترتیب ہونے لگیں۔ تاہم ویبر نے خطرے کا احساس دلاتے ہوئے ایک بار پھر اسے محتاط رہنے کی تلقین کی۔

جینی نے احتیاط سے قدم جما کر اندر جھانکا۔ اندر مدھم روشنی کم تھی۔

"کیا تمہارے پاس رسی اور ٹارچ ہے؟"

"ہاں، میرے "بیگ پیک" میں ہے۔ کیوں؟"

"میں اسے اندر سے دیکھنا چاہتی ہوں۔ یہ زیادہ گہری نہیں ہے۔" جینی نے مدعا بیان کیا۔

"مس جینفر! کیا حماقت ہے۔" ویبر نے عالم حیرت میں پہلی بار اس کا نام لیا۔

جینی پُرعزم تھی۔ "پولیس اندر جا سکتی ہے۔ اس کا مطلب یہاں ایسی کوئی خطرے والی بات نہیں ہے۔"

ویبر نے آہ بھری۔ "میں تمہیں ایک متلون مزاج امریکی سیاح سمجھتا رہا۔ تم صحافی بھی نہیں ہو۔ تو پھر مہم جو ہو گی۔"

"شاید۔" جینی نے گول مول جواب دیا۔

ویبر نے بیگ اتار کر نائلون کی رسی نکالی اور اس کے بل کھولنا شروع کیے۔ میخ نما آہنی ٹکڑا، دستی ہتھوڑے سے برف میں ٹھونکا اور رسی کا ایک سرا اس کے ساتھ باندھ دیا۔

"میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گا۔" وہ بولا۔ "میرے خیال میں پولیس ایک اور لاش اپنے ہاتھوں میں دیکھنے کی خواہش مند ہے۔"

☆☆☆

مارک نے عجلت میں ہوٹل سے چیک آؤٹ کیا تھا۔ وہ نقشے کی مدد سے راہ متعین کر چکا تھا۔ ڈیٹیکٹر بتا رہا تھا کہ جینی کی ٹویوٹا، ویزن ہارن گلیشیر کے آس پاس ہے۔

وہ تقریباً دوڑتا ہوا پارکنگ لاٹ میں پہنچا تھا۔ اوپل کا دروازہ کھول کر بیگ اس نے اندر پھینکا۔ چند لمحات گزرے تھے کہ اوپل کا انجن غرا کر بیدار ہوا۔

دوسری جانب جینی اور ویبر گویا ڈیپ فریزر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ چاروں طرف برف، نیچے بھی برف۔ صرف اوپر خلا تھا۔ جہاں سے آسمان نظر آ رہا تھا۔ اگر یہ واحد خلا بھی برف سے بند ہو جائے تو کیا ہو گا۔ یہ خیال اچانک ہی جینی کے ذہن میں سرایت کر گیا تھا۔ وہ جھرجھری لے کر رہ

گئی۔

اس کے باپ کے ساتھ ایسا ہی کچھ ہوا تھا۔ اس کے دل میں ٹیس اٹھی۔ اس کا ذہن پھر ماضی کی جانب لوٹ گیا۔

''کیا سوچ رہی ہو؟''

ویبر کے سوال نے اسے چونکا دیا۔

''کچھ نہیں۔ آؤ دیکھتے ہیں۔''

ویبر نے ٹارچ روشن کی۔ جینی نے برفانی دیوار میں ایک جانب کٹاؤ دیکھا۔ یقیناً یہاں سے پال مارچ کی باڈی کو برف کاٹ کر نکالا گیا تھا۔ وہ اس مقام کو پلک جھپکائے بغیر گھور رہی تھی۔

''طبیعت ٹھیک ہے؟ تمہارا چہرہ زرد ہو رہا ہے؟''

ویبر کے سوال میں تشویش تھی۔

''میں... میں ٹھیک ہوں۔ سوچ رہی تھی کہ اس قسم کی ہلاکت کا مرحلہ کیسا دردناک ہوتا ہوگا۔''

''میری رائے ہے کہ اب یہاں سے نکلنا چاہیے۔''

جینی کے ذہن میں یادوں اور سوالات کی یلغار تھی۔ وہ چاہتے ہوئے بھی وہاں رک نہیں سکتی تھی۔

''ہاں، ٹھیک ہے۔'' جینی نے اثبات میں سر ہلایا۔

واپسی کے سفر میں جینی زیادہ تر خاموش رہی۔ ایک مقام پر ویبر یاددہانی کیے بغیر نہ رہ سکا۔

''یاد رکھو یہ ٹریک قابلِ بھروسا نہیں ہے۔''

''میں نے رفتار کم رکھی ہے۔'' جینی نے جواب دیا۔

جواب دیتے ہی راہ گزر دفعتاً ڈھلوان میں تبدیل ہو گئی۔ جینی نے جبلتاً بریک پیڈل پر دباؤ بڑھایا۔ تاہم کچھ بھی نہیں ہوا۔ اسے لگا کہ پیڈل ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح برتاؤ کر رہا ہے۔ جینی نے گھبرا کر دباؤ بڑھایا تو بریک پیڈل معمولی مزاحمت بھی پیش نہ کر سکا اور سیدھا جیپ کے فرش سے جا لگا جبکہ رفتار کم ہونے کے بجائے بڑھ گئی۔ پیڈل کی جنبش نے سیکنڈ سے پیشتر جینی کو سمجھا دیا کہ بریک فیل ہو چکے ہیں۔ پھر بھی اس نے مایوسی کے عالم میں پیڈل کو بار بار پمپ کیا لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

عام سڑک پر ڈرائیو کرتے ہوئے گاڑی کا کنٹرول قطعی طور پر ناکارہ ہونے کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ بریک فیل ہو جائیں یا ٹائی راڈ ٹوٹ جائے۔ دونوں صورتوں میں ڈرائیور پر پہلا ردِعمل یہ ہوتا ہے کہ دل اپنی مستقل قیام گاہ چھوڑ کر حلق میں دھڑکنے لگتا ہے۔ تیسری صورت ٹائر برسٹ کی ہوتی ہے۔ جہاں کنٹرول مکمل بیکار نہیں ہوتا۔ ڈرائیور کے پاس تھوڑی بہت بچت ہوتی ہے۔ یہاں عام سڑک بھی

نہیں تھی بلکہ ایک خطرناک برفانی ٹریک اور وہ مع گلیشیئر کے تمام علاقہ برفانی... جینی کا دل بھی اپنی قیام گاہ سے نکل چکا تھا۔ تیز جیپ برفانی ڈھلوان پر رفتار بڑھتی جا رہی تھی۔

''تم تیز جا رہی ہو، بریک استعمال کرو۔'' ویبر کی آواز بلند اور چیختی ہوئی تھی۔

''بریک فیل...'' وہ اتنا ہی کہہ سکی۔ اس کے ہاتھ پیر پھولنے لگے۔ بریک فیل کی صورت میں، واحد ٹرک گیئر کم کرنا ہوتا ہے پھر ہینڈ بریک... یہ رفتار و حالات پر منحصر ہوتا ہے۔ جینی نے ایک گیئر لگایا۔ ٹویوٹا جیپ کی رفتار میں چند سیکنڈ کے لیے کمی واقع ہوئی اور رفتار دوبارہ بڑھنے لگی۔

جینی کی تمام توجہ سامنے مرکوز تھی اور ہاتھوں نے پوری قوت سے اسٹیئرنگ جکڑا ہوا تھا۔

''ہینڈ بریک کھینچو۔'' وہ گویا چلا اٹھی۔

ویبر نے فوراً ہی ردِعمل ظاہر کیا لیکن کوئی فرق نہیں پڑا۔ ویبر کا جسم بھی اس غیر متوقع صورتِ حال پر سنسنا رہا تھا۔

جینی نے پھر گیئر کم کیا۔ جیپ فرسٹ گیئر میں آ گئی۔ ٹویوٹا نے جھٹکا کھایا اور رفتار کم ہو گئی۔ معاً جینی کی نگاہ سامنے نمودار ہونے والی برفانی پہاڑی کے تنگ موڑ پر پڑی۔ وہ موڑ کاٹ بھی لیتی تو اطراف میں گہری کھائی تھی۔ بچنے کا امکان مفقود تھا۔ جینی کے کانوں میں سیٹیاں بجنے لگیں۔ ویبر آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر چیخا۔ پتا نہیں کیا بولا تھا۔ اطالوی زبان تھی یا سوئس۔

جینی نے اسٹیئرنگ دائیں جانب کاٹا۔ جیپ ڈھلوانی ٹریک چھوڑ کر ٹھوس برفانی میدان میں داخل ہو گئی لیکن اس حرکت کے بعد ٹویوٹا برف پر اسکڈ (SKID) کرنے لگی۔ برفانی قطعہ کا طول و عرض زیادہ وسیع نہیں تھا۔ ٹویوٹا جس رخ پر پھسل رہی تھی، وہاں گہری کھائی منہ پھاڑے اسے نگلنے کے لیے تیار تھی۔

جینی کے ذہن کو مایوسی کے اندھیرے نے لپیٹ میں لے لیا۔ اس نے سر جھٹک کر اسٹیئرنگ گھمایا۔ پہیے چونکہ برف پر گرپ چھوڑ چکے تھے لہٰذا کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ ٹویوٹا بدستور کھائی کی جانب پھسل رہی تھی۔

ویبر شاک سے باہر آ گیا اور ہاتھ بڑھا کر اسٹیئرنگ سے لڑنے لگا۔ مگر بے سود تھا۔ زیادہ سے زیادہ ایک منٹ کی گنجائش تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ فرشتۂ اجل کو جلدی ہے۔ وقت اور فاصلہ گویا برق رفتاری کا مظہر بن گئے تھے۔

جینی کے ہاتھ پیر بے جان ہو گئے۔ خیالات نے

روشنی کی رفتار سے ماضی میں سفر کیا۔ اور وہ اپنے بچپن تک جا پہنچی۔ پس منظر میں دو چہرے نمایاں تھے۔ مارک اور بالی۔

وہ جان گئی کہ کل تک اچانک زندگی میں جو نئے رنگ ابھرنے شروع ہوئے تھے، وہ نمایاں ہونے سے قبل ہی اتھاہ تاریکی میں ڈوب چکے تھے۔ سٹ تھیں سیکنڈوں کی گنجائش بچی تھی۔ اتنی دیر میں زندگی کتنے سانس مزید لے سکتی تھی؟

''آئی ایم سوری بالی، سوری مارک۔'' کاش وہ مارک کی بات مان لیتی تو وہ بھی ساتھ ہوتا۔ شاید وہ کچھ کر لیتا۔ ورنہ دونوں مرتے مرتے دل کی بات ہی کہہ دیتے۔ اسے یقین تھا کہ مارک اس حال میں بھی خوش ہوتا اور اسے باہوں میں لے کر اس دنیا سے جاتا۔ ''آئی لو یو مارک، آئی لو یو۔''

تمام واقعات نہایت تیزی سے چند منٹ میں رونما ہوئے تھے۔ جینی اور ویبر دونوں کے دماغ ماؤف ہو چکے تھے۔ کسی کو بھی خیال نہ آیا کہ وہ دروازے کھول کر کودنے کا رسک لے لیتے... پہلے یہ خیال رہا کہ سنبھل جائیں گے اور اب تو وقت ہی نہیں تھا۔ کوئی لمحہ جاتا تھا...

پندرہ فٹ... بارہ... دس... جینی کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ دو زندگیاں موت کی گود میں تھیں۔ بلند و بالا پہاڑ... برفانی میدان، کھائیاں... برف پوش چوٹیاں صدیوں سے اسی طرح زندگیوں کا خراج وصول کرتی چلی آ رہی تھیں۔ کبھی کسی بہانے، کبھی کسی بہانے... کبھی کبھی ہی ان سے منہ کا نوالہ چھینا جاتا تھا۔ قدرت کے کھیل تھے۔

اس وقت بھی قدرت کو منظور نہیں تھا۔ یک لخت ایک دھماکے کی آواز آئی۔ نیلے رنگ کی فور وہیل نسان، کب اور کہاں سے نمودار ہوئی۔ دھماکا ٹویوٹا اور نسان کے تصادم کا تھا۔

ٹویوٹا جھٹکے کے ساتھ رگڑ کھا کر گھومی اور رک گئی۔ گہری کھائی تین فٹ دور رہ گئی تھی۔ اجل نے گویا کھلا ہوا منہ بند کر لیا۔

جینی نے سیٹ بیلٹ باندھی ہوئی تھی۔ تاہم تصادم کی قوت نے اسے اچھالا اور سر چھت سے جا ٹکرایا۔

ویبر نے اطالوی یا سوئس میں کچھ کہا۔ اس کا چہرہ لٹھے کی طرح سفید ہو رہا تھا۔

جینی نے دھندلی آنکھوں سے نسان کے ڈرائیور کو گاڑی سے نکلتے دیکھا۔ نسان کا بونٹ مڑ گیا تھا اور دھواں

نکلتا دکھائی دے رہا تھا۔ جینی کا سر چکرا رہا تھا۔

نسان کا ڈرائیور قریب آ گیا۔ وہ خوش شکل اور مضبوط جسم کا مالک تھا۔ عمر 50 برس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔

''کیا تم ٹھیک ہو؟'' اس نے قریب آ کر سوال کیا۔ لہجہ امریکی تھا۔ اس نے جینز اور مخصوص بوٹ پہنے ہوئے تھے۔ جینی پلکیں جھپک رہی تھی۔ نگاہوں میں دھند بڑھنے لگی۔ نسان کے ڈرائیور کا چہرہ عجیب انداز میں لہرا رہا تھا جیسے دھوئیں کا بنا ہو۔ دھند نے ہر شے کو لپیٹ میں لے لیا... جینی بے ہوش ہو چکی تھی۔

☆☆☆

تھوڑی دیر میں ہی اس کے اوسان پھر بحال ہو گئے۔ سر میں رہ رہ کر ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ اس نے سر پر ہاتھ پھیر کر گومڑ کو محسوس کیا اور کراہ اٹھی۔

''حرکت مت کرو۔'' نسان والا بولا۔ اس نے ٹویوٹا کے دونوں دروازے کھول کر ڈرائیونگ سیٹ احتیاط سے پیچھے گرا دی۔ جینی اب نیم دراز حالت میں تھی۔ سیٹ بیلٹ وہ پہلے ہی کھول چکا تھا۔ اس نے جینی کے پپوٹے اٹھا کر آنکھوں کا معائنہ کیا۔ پھر اس نے دو انگلیاں موڑ کر ہاتھ بلند کیا۔ ''یہ کتنی انگلیاں ہیں؟''

''تین۔'' جینی نے جواب دیا۔

''جسم کی کیا حالت ہے؟''

''پیٹ میں دکھن ہے۔''

''وہ سیٹ بیلٹ کی وجہ سے ہے۔'' وہ بولا اور جینی کے سر کی چوٹ کا نرمی سے جائزہ لیا۔

''سب ٹھیک ہے۔ کچھ دیر لیٹی رہو۔'' یہ کہہ کر وہ گاڑی کے گرد گھوم گیا۔ دونوں گاڑیوں کا جائزہ لینے کے بعد واپس آیا۔

''تمہاری ٹویوٹا تو کافی حد تک ناکارہ ہو چکی ہے۔ نسان پھر بھی قابلِ استعمال ہے۔ تم بہت خوش قسمت ہو۔ میں بھی اس علاقے میں تھا۔ بروقت میری نظر پڑ گئی۔ اب بتاؤ تم دونوں خودکشی کے لیے جا رہے تھے؟''

جینی سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ اسے یقین نہیں تھا کہ وہ واقعی زندہ ہے۔

''ٹویوٹا کے بریک فیل ہو گئے تھے۔'' جینی نے زبان کھولی۔

''تمہارے دوست نے تو نہیں بتایا۔'' یہ کہہ کر اس نے ٹانگ اندر کی اور بریک پیڈل کو پمپ کر کے دیکھا۔ اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ وہ ایک جہاندیدہ اور برف لف

قسم کا آدمی تھا۔ بریک آزمانے کے بعد وہ ٹویوٹا کے نیچے گھس گیا۔

چند سنٹ بعد وہ پھر نمودار ہوا۔ ہاتھ صاف کرنے کے بعد بولا۔ ”بریک ٹیمپر کیے گئے تھے۔“ اس نے انکشاف کیا۔

”کیا مطلب؟“ جینی کو یقین نہیں آیا تھا۔

”ہائیڈرولک پائپ ڈھیلے کیے گئے تھے۔ بریک آئل آہستہ آہستہ لیک ہوتا رہا۔ تم جب بھی بریک پیڈل دباتیں، تھوڑا سا آئل بہہ نکلتا۔ ٹویوٹا پرانی بھی نہیں ہے کہ فرض کرلیا جائے کہ وقت کے ساتھ وہ خود ہی آہستہ آہستہ ڈھیلے ہوگئے۔ یہ حرکت کسی نے قصداً کی ہے۔“ اس نے وضاحت کی۔

”لیکن... لیکن کیوں؟“ وہ واضح طور پر پریشان نظر آئی۔ ”ویبر کہاں ہے؟“

”کون ویبر؟“

”میرا ساتھی۔“

”وہ پیدل ہی مدد حاصل کرنے چل پڑا۔ شاید وہ سمجھا کہ دونوں گاڑیاں بیکار ہوگئی ہیں۔ تاہم میں تسان کو اسٹارٹ کراؤں گا۔ انجن کو خاص نقصان نہیں پہنچا ہے۔ ایک فینڈر مڑ کر وہیل میں پھنس گیا ہے۔ اسے میں سیدھا کرلوں گا۔“ اس کے لہجے سے اعتماد جھلک رہا تھا۔ جینی بہت حد تک سنبھل گئی تھی۔ اس نے اندازہ لگایا کہ وہ شخص کوئی عام آدمی نہیں ہے۔ پھر اسے خیال آیا کہ ان دونوں کی زندگی بچانے والے سے وہ نہ صرف اب تک ناآشنا ہے بلکہ اس نے شکریہ تک ادا نہیں کیا۔ حقیقتاً اسے دوسری زندگی ملی تھی۔

”آئی ایم سوری، میں نے ابھی تک تمہارا شکریہ ادا نہیں کیا اور شاید کر بھی نہیں سکتی۔ تم نے اجنبی ہوتے ہوئے اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالا اور اپنی گاڑی کو بھی نقصان پہنچایا۔“ جینی نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ ”میرا نام جینیفر مارچ ہے۔“

”فرینک میکال۔“ اس نے جینیفر کا ہاتھ تھام لیا۔

جینی نے صاف دیکھا کہ اس کا نام سنتے ہی فرینک کی آنکھیں سکڑ گئی تھیں۔ چہرے پر ناراضی کا تاثر بھی ابھر آیا۔

”تم پال مارچ کی بیٹی ہو، میں جانتا ہوں۔ یہاں سے نکلو، پھر بات کریں گے۔“

جینی الجھ گئی۔ ”تم... تم کون ہو؟“

”فرینک میکال۔ چک میکال میرا بیٹا تھا۔“

جینی کو بات سمجھنے میں چند لمحات خرچ کرنے پڑے۔

”چک میکال؟ جس نے پال مارچ کی باڈی دریافت کی تھی اور جو ”فرکا پاس“ پر حادثے میں مارا گیا تھا؟“

”وہ حادثہ نہیں تھا۔ میرے بیٹے کو قتل کیا گیا تھا۔“ فرینک کی آواز ترش ہوگئی تھی۔

☆☆☆

جینی، ہوٹل روم کے بیڈ پر پیر لٹکائے بیٹھی تھی۔ مقامی ڈاکٹر اس کے قریب تھا۔ سر کی ڈریسنگ کردی گئی تھی۔ درد کی شدت کم تھی۔ ڈاکٹر نے گریٹا سے جرمن زبان میں کچھ کہا۔

گریٹا نے جینی کے لیے ترجمہ کیا۔ ”اس کا کہنا ہے کہ اگر تمہیں اشیا دھری دکھائی دینے لگیں یا سر کا درد شدت اختیار کرنے لگے تو فوراً رابطہ کرنا۔“ گریٹا نے تھم کر پھر کہا۔ ”شکر ہے کہ تم دونوں زندہ ہو۔ میرے خیال میں تمہیں آرام کرنا چاہیے۔“

جینی نے اتفاق کیا۔ ان دونوں کے جانے کے بعد وہ لیٹ گئی۔ تاہم کچھ دیر بعد اسے اکتاہٹ ہونے لگی۔ اس کی حالت بہتر تھی۔ اگرچہ اندر سے وہ ہل گئی تھی۔ سویٹر چڑھا کر وہ نیچے بار میں پہنچ گئی۔ بار خالی پڑا تھا۔ ویبر اور گریٹا بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ لیکن پھر اس نے فرینک میکال کو دیکھا۔ وہ اکیلا بیٹھا تھا۔ سامنے اسکاچ کی بوتل دھری تھی۔

اس نے سر اٹھایا۔ ”کیا کیفیت ہے؟“

”بہتر ہے، ویبر نظر نہیں آرہا؟“

”اسے جب میں نے بریکس کے بارے میں بتایا تو وہ مقامی پولیس سارجنٹ کو دیکھنے نکل گیا۔“ فرینک اسکاچ کی طرف متوجہ ہوا۔ ”چلے گی؟“ اس کا اشارہ اسکاچ کی جانب تھا۔

”شکریہ۔“ جینی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”مجھے تمہارے بیٹے کا دلی افسوس ہے۔“ اسے سمجھ نہیں آیا کہ اس کے علاوہ وہ اور کیا کہہ سکتی ہے۔ احساسِ رنج کے باعث فرینک کے تاثرات مزید سخت ہوگئے۔ اس کے جبڑے بھنچ گئے تھے۔

جینی نے پھر اظہارِ افسوس کرنا چاہا۔ تاہم رک گئی۔ کچھ دیر خاموشی چھائی رہی پھر وہ بولی۔ ”تمہیں میرے متعلق کیسے معلوم ہوا؟“

”کیونکہ یہ میرا کام ہے۔ یہاں تو میرے بیٹے کا معاملہ تھا۔“ اس کی آواز میں غصے کا عنصر شامل ہوگیا۔

جینی اس کا جواب پوری طرح نہیں سمجھ سکی۔ اس نے دوسرا سوال کیا۔ ”تم قتل کے بارے میں اتنے پُریقین کیوں ہو؟“

فرینک نے گلاس نیچے رکھ دیا۔ ”اس نے نیویارک میں آخری فون مجھے کیا تھا۔ بقول اس کے زیورچ ایکسپریس کا رپورٹر اس کا انٹرویو کا متمنی تھا۔ رپورٹر کا نام میرے بیٹے نے ایمیل ہارٹ بتایا تھا۔ ہارٹ، پال مارچ کی اسٹوری پر کام کررہا تھا۔ میرے بیٹے نے ”فرکا پاس“ کا بھی ذکر کیا تھا۔“ فرینک نے وقفہ لیا۔

جینی ہمہ تن گوش تھی۔

”فرکا پاس پر اس کی موت کی اطلاع فون پر سوئس پولیس کی جانب سے مجھ تک پہنچی... میں نے زیورچ میں اخبار کے دفتر فون کیا تو تصور کرو کیا جواب ملا ہوگا؟“ فرینک نے جینی کو دیکھا۔ فرینک کی آنکھوں میں اداسی اور غصے کا ملا جلا تاثر تھا۔

”کیا؟“ جینی نے انجانا ہراس محسوس کیا۔

”زیورچ ایکسپریس میں ایمیل ہارٹ نام کا کوئی رپورٹر کام نہیں کرتا۔ ہارٹ نامی جعلی رپورٹر نے میرے بیٹے کو معاوضے کی پیشکش بھی کی تھی۔ انتظامیہ کا موقف تھا کہ یہ ان کا طریقہ کار نہیں ہے۔“

فرینک کی وضاحت نے جینی کو چونکا دیا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ ہونے لگی۔

”کیا تم نے یہ معلومات سوئس پولیس کو فراہم کی؟“

”یقیناً، تاہم کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ میں نے خود ہی تفتیش کا فیصلہ کیا۔ اسی ضمن میں وہاں گلیشیر تک پہنچا تھا۔“

”تم کون ہو؟“

”پرائیویٹ انویسٹی گیٹر۔“

جینی کا اندازہ ٹھیک تھا۔ اسے شروع سے یقین تھا کہ فرینک کوئی سیاح یا عام آدمی نہیں ہے۔ تاہم وہ اس کی حقیقت کا تعین نہیں کرسکی تھی۔

”میرا جوان بیٹا مارا گیا۔ میرے لیے آرام سے بیٹھنا ممکن ہی نہیں تھا۔ شاید تم مزید کچھ مجھے بتاسکو؟“

”میں تو خود تمہارے بیٹے سے ملنا چاہتی تھی۔ کہیں تم اس معاملے میں مجھے تو ملوث نہیں سمجھ رہے؟“

”نہیں، ابھی میں اندھیرے میں ہوں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ جو کچھ اندھیرے میں ہے، اس کا براہِ راست تعلق پال مارچ کی باڈی سے ہے جو حادثاتی طور پر میرے بیٹے نے دریافت کی تھی اور فوراً بعد اسے مار دیا گیا۔“

جینی نے گلاس نیچے رکھ دیا۔ ”یوں لگتا ہے کہ تم مجھے بھی ملوث ہونے کا احساس دلا رہے ہو۔ مجھے چلنا چاہیے۔“

جینی کے پلٹتے ہی فرینک نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

”مجھے اپنے کام میں دس برس گزر چکے ہیں۔ دس سال قبل میں پولیس میں تھا۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ مچھلی سڑتی ہے تو بو آتی ہے۔ یہ سب کچھ خاصا مشکوک اور پُراسرار ہے۔ پہلے کئی سال پرانی باڈی دریافت ہوئی۔ پھر چک مارا گیا اور اس کے بعد تم پر قاتلانہ وار کیا گیا۔ کوئی بات ہے، جو تم مجھے نہیں بتا رہی ہو؟“

جینی کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ ”میرا بازو چھوڑو۔ تم میرے محسن ہو۔ تمہارے بیٹے کا بھی مجھے دکھ ہے لیکن میرے علم میں ابھی تک ایسی کوئی بات نہیں آئی کہ میں تمہاری معلومات میں اضافہ کرسکوں۔“

فرینک نے اس کا بازو چھوڑ دیا۔ ”کیا تم محسوس نہیں کرتیں کہ تمہیں میری مدد کرنی چاہیے؟“

”کیسے؟“ جینی نے سوال کیا۔

”میرے علم میں ہے کہ کار ریز کی اسٹیشن تک، اپنے والد کی شناخت کے لیے تمہیں جانا ہے۔ میں تمہارے ساتھ جانا چاہتا ہوں۔“ وہ بولا۔

”میں معذرت خواہ ہوں لیکن یہ ایک ذاتی مسئلہ ہے۔“

”میرے ساتھ بھی ذاتی مسئلہ ہے۔“ فرینک اسے براہِ راست گھور رہا تھا۔

”پھر تمہیں چاہیے کہ اٹالین پولیس سے رابطہ کرو۔ میری نیک خواہشات تمہارے ساتھ ہیں۔ گڈلک مسٹر فرینک۔“

☆☆☆

مارک نے جینی کو کھو دیا تھا۔ ناامیدی کے عالم میں اس نے تین مختلف پہاڑی ٹریک چیک کر ڈالے۔ اسے فکر تھی کہ سگنل کیوں نہیں مل رہے؟ آخر اس نے ریڈیو کے ذریعے گراہم سے رابطہ کیا لیکن اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ سیل فون بھی کام نہیں کررہا تھا۔ وہ چیک سے بھی رابطہ نہ کرسکا۔ صورتِ حال مزید ابتر ہونے لگی، جب دھند نے اترنا شروع کیا۔ ٹریکر کام کیوں نہیں کررہا۔ کیا ٹویوٹا میں بگ نہیں ہے؟

مارک نے گاڑی اسٹارٹ کی اور سمت تبدیل کرکے احتیاط اور اندازے سے تلاش کا پھر سے آغاز کیا۔ اچانک

ہی اس کی کھوجتی نگاہوں نے ٹویوٹا کو دیکھ لیا۔ اسے احساسِ کامیابی کے ساتھ تشویش بھی ہوئی۔

انجن بند کر کے وہ گاڑی سے اتر گیا۔ دور دور تک کسی ذی نفس کا وجود نہیں تھا۔ ٹویوٹا خطرناک حد تک کھائی سے قریب تھی۔ جیپ کی حالت ابتر تھی۔ چیسس تک متاثر تھا۔

مارک بغور جیپ اور اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔ تصادم زوردار تھا۔ ٹویوٹا جیپ کی باڈی پر نیلے پینٹ کی رگڑ واضح تھی۔ یقیناً دوسری گاڑی کا رنگ نیلا تھا۔ جینی غائب تھی... وہ امکانات کا تصور کرتے ہوئے اگلے دائیں پہیے کے قریب موجود بھورے دھبے کو گھور رہا تھا۔ پھر وہ سامنے کی جانب سے جیپ کے نیچے رینگ گیا۔ ہائیڈرولک پائپ ڈھیلا تھا جس کی وجہ سے بریک آئل رس رس کر نکلتا رہا تھا۔

مارک جیپ کے نیچے سے نکل آیا۔ اس کی پیشانی سلوٹوں سے پُر تھی۔ گاڑی کی آواز سن کر اس نے گردن گھمائی۔ وہ پولیس کار تھی جو قریب آ کر رک گئی۔ ایک سوئس آفیسر نے قدم باہر رکھا۔ اس نے پہلے اوپل کار، پھر مارک کو دیکھا۔ مارک نے اندازہ لگایا کہ اس نے جرمن زبان میں کچھ کہا ہے۔

''سوری، میں جرمن زبان نہیں جانتا۔''

''تم انگلش ہو؟''

''نہیں، امریکن۔'' مارک نے جواب دیا۔

''میں سارجنٹ کلاسن ہوں۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''میں موسم خراب ہوتا دیکھ کر واپس جا رہا تھا کہ جیپ کو دیکھ کر رک گیا۔ ایکسیڈنٹ لگ رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ شاید میں کسی کام آ سکوں۔ لیکن یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔ کیا تم کچھ جانتے ہو؟'' مارک نے جواب دیتے ہوئے سوال کر ڈالا۔

سارجنٹ نے سر کھجایا۔ ''ٹھیک ہے۔ ایکسیڈنٹ تو ہوا ہے۔ ایک امریکن لیڈی تھی جو ایکسیڈنٹ کی وجہ سے بال بال بچ گئی۔ ٹویوٹا جیپ کنٹرول سے باہر ہو گئی تھی۔''

''کیا وہ خاتون ٹھیک ہے؟'' مارک نے گھبراہٹ کو چھپاتے ہوئے سرسری انداز میں استفسار کیا۔

سارجنٹ نے شانے اچکائے۔ ''دوسری گاڑی کا ڈرائیور اسے سٹلن لے گیا تھا۔ تھوڑی بہت چوٹ لگی ہے لیکن میرے خیال میں وہ ٹھیک ہے۔''

''رائٹ۔'' مارک واپس اوپل کی جانب چل پڑا۔ اس نے دیکھا کہ سارجنٹ ٹویوٹا کے نیچے جھانک رہا ہے۔ مارک تجسس کے تحت پلٹ گیا۔

''میرا خیال ہے کہ میں کچھ مدد کر سکتا ہوں۔''

''کیا تم مکینک ہو؟''

''نہیں۔ لیکن تھوڑا بہت جانتا ہوں۔'' مارک نے کہا۔ اس نے بریک آئل کی جانب اشارہ کیا۔ ''بریک لائن سے آئل لیک ہوا ہے۔''

''جس آدمی نے ٹویوٹا کو ٹکر ماری تھی۔ اس کا کہنا ہے کہ ہائیڈرولک سسٹم کو ارادتاً ڈھیلا کیا گیا تھا۔''

مارک نے ٹویوٹا پر موجود نیلے پینٹ کے نشانات دیکھے۔ ''یقیناً اس کی گاڑی کا رنگ نیلا تھا۔ کون سی گاڑی تھی؟'' مارک نے سارجنٹ کی آنکھوں میں شک کا سایہ دیکھا اور اپنی بے پروائی برقرار رکھی۔

''نسان... فور وہیل ڈرائیو...... تم کیوں پوچھ رہے ہو؟'' سارجنٹ نے بیک وقت سوال جواب کیے۔

''ایسے ہی نیلا رنگ دیکھ کر خیال آ گیا۔'' اس سے پیشتر سارجنٹ کچھ بولتا مارک واپس جا کر اپنی کار میں بیٹھ گیا۔

☆☆☆

جینی، بیڈروم کی کھڑکی سے ایلپس پر دھند اترتے دیکھ رہی تھی۔ فرینک نے بریکس کے بارے میں جو خیال ظاہر کیا تھا۔ اس چیز نے اسے اپ سیٹ کر دیا تھا۔ اس کی بات میں وزن تھا اور وہ تھا بھی ایک سراغ رساں...

جینی کو گہری رنگت کے شیشوں والی اوپل یاد آئی جو جینی کا تعاقب کرتی رہی تھی۔ غالب امکان تھا کہ کوئی اسے ہلاک کرنا چاہتا ہے لیکن کیوں؟

پھر وہ فرینک کے بارے میں سوچنے لگی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ جوان بیٹے کی موت نے اسے دل گرفتہ کر دیا ہے۔ اس نے تقریباً ثابت کر دیا تھا کہ یہ قتل ہو سکتا ہے۔ اسی چیز نے اسے مزید سنجیدہ کر دیا تھا۔

جینی کو اپنی ماں کا قتل یاد آیا۔ وہ محسوس کر سکتی تھی کہ فرینک کس کیفیت سے گزر رہا ہے۔ خود اسے بھی پہلے بے یقینی نے گرفت میں لیا تھا، پھر رنج اور غصہ اور بعد ازاں انتقام۔ یہی کچھ فرینک کے ساتھ ہو رہا تھا۔ جینی کو اپنے رویے پر افسوس ہوا۔ اس نے دوبارہ فرینک سے ملنے کا فیصلہ کر لیا اور سیڑھیاں طے کر کے واپس بار میں چلی گئی۔

فرینک ایک کھڑکی کے پاس کھڑا دور پہاڑوں کو تک رہا تھا۔ ہونٹوں میں دبی سگریٹ کو ہاتھ لگائے بغیر وہ کش پر کش لے رہا تھا۔

''آئی ایم سوری۔'' جینی نے قریب جا کر کہا۔ ''میں کچھ بدزبان ہو چکی تھی۔''

فرینک نے سر ہلایا۔ ''نہیں، میں ہی کچھ تہذیب سے ہٹ گیا تھا۔'' اس نے کہا۔ ''دراصل مجھے جوابات حاصل کرنے کی عجلت تھی۔'' اس نے سگریٹ بجھا دی۔ ''تم مجھے فرینک کے نام سے مخاطب کر سکتی ہو۔''

دونوں ایک میز کے قریب کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

''کیا تمہیں یقین ہے کہ کسی نے بریک خراب کیے تھے؟'' جینی اب تک تحیر کا شکار تھی۔

''میرے تجربے کے مطابق اس بات کا بھاری امکان ہے لیکن ثابت کرنا شاید مشکل ہو۔'' فرینک نے جواب دیا۔

''شاید یہ میرا وہم ہو کہ ایک گاڑی میرا تعاقب کرتی رہی ہے۔'' جینی نے فرینک کو اوپل کے بارے میں بتایا۔

''کیا تم نے اوپل کی لائسنس پلیٹ دیکھی تھی؟''

''نہیں، میں نوٹ نہیں کر سکی۔''

فرینک خاموشی سے سوچتا رہا۔

جینی نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''تم چاہو تو میرے ساتھ چل سکتے ہو۔''

''تمہارا ذہن کیوں بدل گیا؟'' فرینک نے اس کی طرف مشکوک انداز میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ میں تمہاری مقروض ہوں۔ مجھے انکار نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

''اونہہ۔ تم برا نہ مانو تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تمہارے والد گلیشیر پر کیوں گئے تھے؟''

''ایمان داری کی بات ہے کہ میں قطعی بے خبر ہوں۔ وہ دو سال قبل اچانک لاپتا ہو گئے تھے۔ تب سے میں نے انہیں نہیں دیکھا، نہ سنا۔''

''کوئی شک نہیں کہ یہ تمہارے لیے بہت اذیت کا باعث رہا ہوگا۔'' فرینک نے اظہارِ ہمدردی کیا۔

جواب میں جینی نے سکوت اختیار کیا۔

☆☆☆

اوپل، برگوف ہوٹل کی پارکنگ میں تھی۔ مارک کو نیلے رنگ کی نسان کہیں نظر نہیں آئی۔ اسے دو پریشانیاں لاحق تھیں۔ ایک تو وہ جینی پر نظر رکھنے میں ناکام رہا تھا۔ دوسرے اس کا رابطہ جیک اینڈ کمپنی سے نہیں ہو رہا تھا۔ مارک کا شک پختہ تھا کہ وہ لوگ خود رابطے میں نہیں آ رہے... اس نے آخری بار کوشش کی پھر لعنت بھیج کر سے خطوط پر غور کرنے لگا۔ ٹویوٹا کو اس نے جہاں اور جس حالت میں دیکھا تھا، اسے شک تھا کہ کسی نے جینی کو ہلاک کرنے کی کامیاب کوشش کی تھی جو محض نیلی نسان کی وجہ سے ناکام ہو گئی۔ یعنی جیک کی یہ بات بھی درست ثابت ہوئی تھی کہ کوئی اور پارٹی بھی ڈسک کی تلاش میں ہے جو جینی کو ختم کرنے کی کوشش کر سکتی ہے... نسان والا کون ہے؟ ڈسک کی کیا حقیقت ہے اور سی آئی اے کے مخالف جینی کو کیوں ختم کرنا چاہتے ہیں؟ یہ گتھی زیادہ ہی الجھی ہوئی تھی۔

مارک نے اپنے طور پر قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ جیک کا کردار شروع سے اس کے ذہن میں چبھ رہا تھا۔ گارڈا کی تنبیہ نے مارک کو مزید محتاط کر دیا تھا۔ اگرچہ اب تک جیک کی جانب سے سب کچھ بظاہر ٹھیک لگ رہا تھا۔ اب رابطے کا نہ ہونا پہلا اشارہ تھا جو مارک کے شک کو تقویت دے گیا۔ لیکن شک کی نوعیت سمجھنے سے وہ اب بھی قاصر تھا۔ اس کے تمام فیصلے اور سرگرمیاں ایک نکتے پر مرکوز تھیں کہ جینی محفوظ رہے۔

خیالات کو لگام دے کر وہ گاڑی سے اترا اور دندناتا ہوا ہوٹل میں گھس گیا۔

استقبالیہ پر اس نے خود کو جینیفر مارچ کا دوست ظاہر کیا (یہ جھوٹ بھی نہیں تھا) اور اپنا مدعا بیان کیا۔

''مس مارچ تیس منٹ قبل ٹیورن کی جانب گئی ہیں۔'' جواب ملا۔

''لیکن پولیس کے مطابق کوئی ایکسیڈنٹ...''

''ہاں۔'' استقبالیہ پر موجود لڑکی نے مارک کی پوری بات نہیں سنی۔ ''وہ بہت خوش قسمت ہے۔ اسے میکال نے موت کے منہ سے نکالا۔''

مارک سوچ میں پڑ گیا۔ میکال؟ وقتی طور پر یہ نام اس کے ذہن سے پھسل رہا تھا۔ ''کون میکال؟''

''تمہاری طرح کوئی امریکن ہے۔ اس کا بیٹا 'فرکا پاس' پر جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ وہاٹ اے ٹریجڈی! تقدیر کے کھیل بھی نرالے ہیں۔'' لڑکی نے فلسفہ بگھارا۔ ''وہ خود بھی اسی ہوٹل میں ٹھہرا تھا۔''

''میں نہیں سمجھ پا رہا۔'' مارک نے سوالیہ نظروں سے لڑکی کو دیکھا۔

''اس کا پورا نام چک میکال تھا۔ بے چارہ! اس کی عمر ہی کیا تھی۔ اسی نے ویزن ہارن پر وہ باڈی دریافت کی تھی۔ بعد میں جس کی شناخت پال مارچ کے نام سے ہوئی۔ بدقسمتی سے چک میکال امریکا واپسی سے قبل ایک حادثے کا

شکار ہوکر ''فرکا پاس'' پر مارا گیا۔''
مارک کے دماغ میں گھنٹی بجی۔ یہ اس کے لیے نئی اور چونکا دینے والی اطلاع تھی۔
''ابھی تم کہہ رہی تھیں کہ میکال نے مس جینفر کو بچایا؟'' لڑکی بھی باتونی تھی۔ ''وہ فرینک میکال ہے۔ چک میکال کا باپ۔ اسی نے اپنی گاڑی ٹویوٹا سے ٹکرائی تھی۔ ورنہ ٹویوٹا کھائی میں گر ہی چکی تھی۔''
''فرینک میکال۔'' مارک نے نام یادداشت میں محفوظ کیا۔ ''اچھا، اچھا... تم نیل نسان کی بات کر رہی ہو؟''
''ہاں، اب تم سمجھے ہو۔ اس کی نسان کو بھی کافی نقصان پہنچا ہے۔''
مارک کے ذہن میں کئی سوالات نے بیک وقت سر اٹھایا۔ تاہم وقت کی کمی کے پیش نظر وہ شکریہ ادا کر کے گھڑی دیکھتا ہوا ہوٹل سے نکل گیا۔

☆☆☆

ٹیورن۔ کاربیزی ہیڈ کوارٹرز چار منزلہ جدید طرز کی عمارت تھی۔ پارکنگ زیرِ زمین تھی۔ فرینک نے نسان سڑک پر ہی لگائی اور دونوں عمارت میں استقبالیہ تک پہنچے۔
چند منٹ بعد وہ دونوں گھنی مونچھوں والے ایک موٹے آفیسر کے سامنے تھے۔
جینفر سے ہاتھ ملاتے ہوئے وہ بولا۔ ''آئی ایم کیپٹن وکٹر کارسو۔'' اس ملاقات سے پہلے وہ دونوں فون پر بات کر چکے تھے۔
جینفر نے فرینک کا تعارف کرایا۔
''تمہارے بیٹے کا سن کر مجھے افسوس ہوا۔'' وکٹر تھوڑا سا مترود تھا۔ اس نے جینفر کو دیکھا۔ ''معاف کرنا، تم دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہو؟''
جینی نے مختصر احوال گوش گزار کیا۔
''تم نے چک میکال کے بارے میں سوئس پولیس سے بات کی تھی؟'' فرینک نے سوال کیا۔
''یس۔''
''کیا کہنا ہے اُن کا؟''
''انہیں یقین ہے کہ وہ ''فرکا پاس'' پر حادثاتی طور پر کھائی میں گر گیا تھا۔''
فرینک نے غصے سے کہا۔ ''بکواس، یہ قتل تھا۔''
وکٹر نے ضبط سے کام لیتے ہوئے ایک ابرو پیشانی پر چڑھائی۔ ''اس یقین کی وجہ؟''
فرینک نے اپنا کارڈ میز پر رکھا پھر اپنے خدشات اور تفتیش کے بارے میں بتایا۔
وکٹر نے اس کا کارڈ دیکھا۔ ''زیورچ ایکسپریس'' کے رپورٹر کے بارے میں فرینک کی بات میں وزن تھا۔ تاہم اس نے تبصرہ کیا۔ ''فرکا پاس'' کافی خطرناک علاقہ ہے، مسٹر۔ وہاں حادثات ہو جاتے ہیں۔ اب تک کئی سیاح جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔''
''چک کا معاملہ مختلف ہے۔ وہ تربیت یافتہ تھا اور ویزن ہارن والے حادثے کے بعد مزید محتاط ہو گیا تھا۔ مزید یہ کہ ''زیورچ ایکسپریس'' کی اطلاع کو بہ آسانی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ آخر یہ ''ہارٹ'' ہے کون؟ ممکن ہے اس نے فرضی نام استعمال کیا ہو... ایک اور مشکوک بات یہ ہے کہ مس جینفر پر بھی قاتلانہ حملہ ہو چکا ہے۔'' فرینک نے تجزیہ پیش کیا۔
وکٹر نے سوالیہ نظروں سے جینفر کو دیکھا۔ اس نے مختصر احوال گوش گزار کیا۔
وکٹر نے نوٹ بک میں کچھ لکھا۔ اس کا چہرہ سنجیدگی کا مظہر تھا۔ ''کسی پر شک؟'' اس نے جینفر کو دیکھا۔
''نہیں۔''
''سوئس علاقے میں جو کچھ ہوا، وہ میرے اختیار سے باہر ہے۔ بارڈر سے ادھر میں پوری تندہی سے اس معاملے کو دیکھوں گا۔'' وکٹر نے یقین دہانی کرائی۔
اس نے سامنے پڑی سرخ فائل اٹھائی۔ ''ہماری آج کی میٹنگ کا اصل مقصد کچھ اور تھا۔'' اس نے فائل کھولی۔ جینفر کی نگاہ پاسپورٹ پر پڑی۔
''کیا تم یہ پاسپورٹ پہچانتی ہو؟''
جینفر نے تھوک نگلا۔ پاسپورٹ کی تصویر کو دیکھا۔ سیاہ بال، نیلی آنکھیں، نرم مسکراہٹ، وجیہہ چہرہ... وہ پاسپورٹ کی خستہ حالت میں بھی نمایاں تھا۔ اس کا ذہن ماضی کی جانب سفر کر رہا تھا۔
''مس جینفر؟''
''ہاں یہ میرے والد کا پاسپورٹ ہے۔'' وہ حال میں واپس آ گئی۔
وکٹر کھڑا ہو گیا۔ ''کیا تم شناخت کے لیے تیار ہو؟''
''یس۔'' جینی نے مضبوط لہجے میں کہا۔
کچھ دیر بعد وہ ''آٹوپسی'' روم میں کھڑے تھے۔ اسٹین لیس اسٹیل کی ٹیبل پر وہائٹ شیٹ کے نیچے باڈی موجود تھی۔ وہاں ایک اور آدمی تھا جس کا تعارف وکٹر نے ''ویٹوریا'' کی حیثیت سے کرایا۔

''میرے والد کی موت کی اصل وجہ کیا سامنے آئی ہے؟''
''ڈیتھ بائے فریزنگ۔'' ویٹوریا نے مختصر جواب دیا۔ ''تاہم آٹوپسی کے بعد مزید معلومات کا امکان موجود ہے۔''
''موت کو کتنا وقت گزرا ہوگا؟''
''باڈی کے ساتھ جو اشیا ملی ہیں... فارنسک ٹیسٹ کے مطابق موت تقریباً دو سال قبل ہوئی تھی۔''
''میں بعد میں سمجھاتا ہوں۔'' وکٹر نے مداخلت کی۔ ''پہلے ہم بنیادی کام سرانجام دے ڈالیں۔''
ویٹوریا نے سرجیکل گلوز اتار دیے اور سفید رنگ کی شیٹ کا کونا پکڑ کر جینفر کی آنکھوں میں دیکھا۔
جینی نے اثبات میں سر ہلایا۔
ویٹوریا نے شیٹ ہٹانی شروع کی۔ جینی نے آنکھیں بند کر لیں۔ اچانک اس کے اعصاب نرم پڑنے لگے۔ ذہن پھر ماضی کو پکار رہا تھا۔ فرینک نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے حوصلہ دیا۔
جینی نے پلکیں یوں اٹھائیں جیسے وہ سیسے کی بنی ہوں۔ چہرے کے نقوش ظاہر ہے خاصے متاثر تھے لیکن وہ اس کا باپ تھا۔ اس کی نیلی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور چھت کو گھور رہی تھیں۔ جینی کی آنکھیں فرطِ استعجاب سے پھٹی رہ گئیں۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹ گئی۔
کیپٹن وکٹر کی آواز آئی۔ ''میں فارمل اسٹیٹمنٹ فائل کرنے کے لیے تمہارے جواب کا محتاج ہوں۔ کیا یہ تمہارے والد پال مارچ کی باڈی ہے؟''
جینی کے نقوش اور نگاہ دونوں پتھرائے ہوئے تھے۔
''سینورینا! کیا یہ جسم تمہارے والد کا ہے؟'' وکٹر نے سوال دہرایا۔
جینی کا بدن ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ اس کی آواز ٹوٹی ہوئی تھی۔
''اپنی زندگی میں اس آدمی کو میں نے کبھی نہیں دیکھا۔''

☆☆☆

اب تم کیسا محسوس کر رہی ہو؟'' وکٹر نے سوال کیا۔ وہ تینوں وکٹر کے دفتر میں بیٹھے کافی پی رہے تھے۔
''شاک، بٹ او کے۔'' جینی نے جواب دیا۔ ''لیکن وہ آدمی میرے والد کے پاسپورٹ کے ساتھ...''
''مسٹری، سینورینا! اس وقت میں مسٹری کا لفظ ہی استعمال کر سکتا ہوں۔ میرے گمان میں نہ تھا کہ تم باڈی کو اجنبی کی حیثیت سے شناخت کرو گی۔'' وکٹر کی آنکھوں میں سوچ کی گہری پرچھائیاں تھیں۔
''پاسپورٹ کہاں تھا؟'' جینی نے پوچھا۔
''رک سیک میں۔ بیگ میں ایک آٹومیٹک پسٹل بھی تھا۔''
''کیا میں دیکھ سکتی ہو کہ بیگ میں اور کیا کیا تھا؟''
''بالکل، چند اشیا نے مجھے بھی حیران کر دیا تھا۔''

☆☆☆

سفید رنگ کی ٹیلی کمیونیکیشن وین، کاربیزی ہیڈ کوارٹر سے 100 گز دور رک گئی۔ یہ فیاٹ گاڑی تھی۔ دو آدمی نیلے رنگ کے اوورکوٹ میں اگلی نشستوں پر بیٹھے تھے۔ پسنجر سیٹ والے کا سیل فون گنگنایا۔ اس نے بمشکل دس سیکنڈ بات کی اور فون بند کر دیا۔ ڈرائیور نے گاڑی ہیڈ کوارٹر کی جانب بڑھائی اور فیاٹ وین کو انڈر گراؤنڈ پارکنگ میں لے گیا۔ جہاں ایک کارپورل ڈیوٹی پر موجود تھا۔
ڈرائیور نے کمپنی آئی ڈی اور ورک شیٹ کا جائزہ لیا۔
''کس نے شکایت کی ہے؟'' کارپورل نے سوال کیا۔
ٹیکنیشن نے شانے اچکائے۔ ''کوئی نامعقول کیپٹن تھا۔ خوامخواہ کی پریشانی ہے۔''
کارپورل نے مسکرا کر آئی ڈی اور شیٹ واپس کی۔ پھر بیریئر اٹھا دیا۔

☆☆☆

کیپٹن وکٹر نے ربر کے سرجیکل دستانے چڑھائے اور ایویڈنس باکس میں سے اشیا نکالنی شروع کیں... ہر آئٹم علیحدہ علیحدہ شفاف پلاسٹک میں رکھا گیا تھا۔ وزنی نیلے رنگ کا پارکا، سفید اونی اسکارف، سبز سویٹر، موٹا اونی پاجامہ، برفانی بوٹس، ویسٹ اور انڈرگارمنٹس... اشیا کی رنگت متاثر شدہ تھی۔
''یہ اشیا کسی کاروباری آدمی سے تعلق رکھتی ہیں۔'' وکٹر نے کہا۔ ''وہ آدمی نفیس ذوق رکھتا ہے۔ سوٹ امریکن ہے۔ جوتے ہاتھ کے بنے ہوئے اور اٹالین ہیں۔ ریشمی شرٹ انگلش ہے۔'' کیپٹن وکٹر نے نگاہ اٹھا کر جینفر کو دیکھا۔
جینی کپڑوں کو گھور رہی تھی۔ وہ انہیں چھونے کے لیے اندرونی طور پر مزاحمت کر رہی تھی۔
''میں... میرا خیال ہے کہ چند کپڑے بلاشک و شبہ میرے والد کے ہیں۔''

"اور باقی اشیا؟"
جینی نے نفی میں سر کو جنبش دی۔ وکٹر سوچ میں پڑ گیا۔
"میں چاہوں گا کہ تم پاسپورٹ کے فوٹو کو پھر سے دیکھو۔" وکٹر نے سرخ فائل سے میں پاسپورٹ نکالا۔
جینی نے رسماً فوٹو کا جائزہ لیا۔ "تصویر کے بارے میں مجھے رتی بھر شک نہیں ہے۔"
"یعنی تصویر سو فیصد پال مارچ کی ہے؟"
"بے شک۔" جینی نے کہا۔ "پاسپورٹ جعلی تو نہیں ہے؟"
"نہیں، ہم لیب میں بہت باریک بینی سے تجزیہ کر چکے ہیں۔" وکٹر نے جواب دیا اور پلاسٹک کا دوسرا چھوٹا بیگ نکالا... جینی اس میں سے نکلنے والی اشیا کو تک رہی تھی۔ وکٹر نے سرجیکل گلوز کی دو جوڑیاں جینی اور فریڈرک میں تقسیم کیں۔ "اب تم لوگ ان میں سے کسی چیز کو چھو سکتے ہو۔"
بدرنگ ٹکٹوں کے دو ٹکڑے تھے اور ایک پھٹی ہوئی سلپ۔ جینی نے پھٹی ہوئی سلپ اٹھائی۔ جس کا کچھ حصہ ناقابلِ مطالعہ تھا۔ چند الفاظ پڑھنے میں آرہے تھے۔
ایچ، دوگل، برگ، ایڈلیوس 705۔
"اس کا کیا مطلب ہوا؟" جینی کی آواز میں الجھن تھی۔
وکٹر نے شانوں کو جھٹکا۔
"ایچ، دوگل نام ہو سکتا ہے اور جرمن زبان میں "برگ" کا مطلب ہے پہاڑ۔ تاہم سوئٹزرلینڈ میں ایڈلیوس نام کا کوئی پہاڑ نہیں ہے۔ جہاں تک نمبر کا تعلق ہے۔ چند نمبر غائب ہیں۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ کوئی فون نمبر یا اکاؤنٹ نمبر..."
جینی نے سلپ فریڈرک کے سپرد کر دی۔
وکٹر نے ٹکٹ کے ٹکڑے دکھائے۔ "یہ باڈی کی پتلون کی جیب میں تھے۔ کاغذ کا پرزہ بھی جیب سے برآمد ہوا تھا۔ زیورچ سے برگ تک کے دو یکطرفہ ٹکٹوں کے ٹکڑے ہیں۔ اپریل کی پندرہ تاریخ، دو سال قبل۔ ٹکٹ سیکنڈ کلاس کے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ حادثے کا شکار ہونے والے نے کسی کے ساتھ "برگ" تک ریل کے ذریعے سفر کیا تھا۔"
جینی نے ٹکٹ ہاتھ میں لے کر دیکھے۔ "اس کے علاوہ بھی کچھ ملا ہے؟"
وکٹر نے پلاسٹک کا ایک لفافہ ...... اور چاندی کی ایک چابی برآمد کی۔ "یہ چابی ان کپڑوں کی جیب سے برآمد ہوئی تھی۔ جن کو تم نے پال مارچ کے لباس کے طور پر پہچانا تھا۔ کیا تم نے یہ چیز پہلے کبھی دیکھی ہے؟"
جینی کو لگا کہ اس کا دل ایک دھڑکن چھوڑ گیا ہے۔ ایک جھماکا ہوا اور ذہن میں ماضی کا وہ منظر روشن ہو گیا جب وہ باپ کی اسٹڈی میں داخل ہوئی تھی۔
"شاید۔" اس نے مختصر جواب دیا۔
"وضاحت کرو۔" وکٹر کا سوال بھی مختصر تھا۔
جینی نے وہ منظر دہرایا۔ زرد رنگ کا پیڈ، سیکیورٹی باکس اور فلاپی ڈسک۔ پیڈ پر جو کچھ لکھا تھا، اسے صرف "اسپائڈر ویب" ہی سمجھ آیا تھا۔ جینی کے ذہن میں معاً ایک خیال چمکا کہ وہ مارک کو زرد رنگ کے پیڈ کے بارے میں بتانا بھول گئی تھی۔
"اسپائڈر ویب؟" وکٹر اور فریڈرک دونوں یک آواز بولے۔ "کیا مطلب؟"
جینی نے بے بسی کا اظہار کیا۔ "البتہ دھاتی سیکیورٹی باکس، فائبر پروف تھا۔ وہ کسی بھی بزنس سپلائی اسٹور سے خریدا جا سکتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ اس کے ساتھ نقرئی چابی بھی تھی۔"
"باکس اب کہاں ہے؟" وکٹر کا سوال تھا۔
"ان کے غائب ہونے کے بعد میں نے باکس تلاش کیا تھا۔ لیکن وہ بھی غائب ہو چکا تھا۔"
وکٹر نے نچلا ہونٹ چبایا۔ "عجیب بے حد عجیب۔" پھر وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "انٹرپول کے ذریعے میں دو سال قبل کی خوفناک واردات سے واقف ہوں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ قانون سے بھاگ رہا ہے۔ گلیشیر پر اس اجنبی شخص کو جو اس کا ساتھی بھی ہو سکتا ہے۔ قتل کر کے اپنے کپڑے اور پاسپورٹ باڈی کے ساتھ چھوڑ دیے کہ اگر کبھی باڈی دریافت ہوئی تو پال مارچ کو مردہ سمجھا جائے گا۔"
جینی کا گلابی چہرہ سرخ ہو گیا۔ دونوں کی نظریں چار تھیں۔ "کیپٹن، میں اپنے والد کو خوب جانتی ہوں۔ وہ کسی کو قتل نہیں کر سکتے۔"
اسی وقت دستک ہوئی اور دیوریما اندر داخل ہوا۔
"کیپٹن، موت فریزنگ کے باعث ہوئی تھی۔ اسے فائنل سمجھو۔"
"شکریہ۔"
"دیکھا، یہ مرڈر نہیں تھا۔" جینی نے کہا۔
"ایسا معلوم ہوتا ہے۔" وکٹر نے اعتراف کیا۔ "لیکن مسٹری اپنی جگہ پر ہے۔ تم دونوں کہاں ٹھہرے ہو؟"
"سملن میں، برگوف ہوٹل۔"

وکٹر نے سرخ فائل بند کی اور اشیا کو پلاسٹک بیگس میں واپس رکھنے لگا۔ اس کی پیشانی پر سوچ کی گہری سلوٹیں تھیں۔ اس نے پلاسٹک بیگ اکٹھے کر کے ایک باکس میں رکھے۔ اسے خیال ہی نہیں رہا کہ چاندی کی چابی جینیفر کے پاس ہے۔ وکٹر نے سوچتے سوچتے جیب سے کارڈ نکالا۔ اس کی پشت پر اپنے گھر کا نمبر لکھ کر جینیفر کے حوالے کیا۔
"اگر تم ضرورت محسوس کرو تو مجھے کال کر سکتی ہو۔"
"شکریہ۔" جینی نے کچھ سوچ کر چابی اپنے بیگ کی سائڈ پاکٹ میں ڈال دی۔
جاتے جاتے وکٹر پلٹا اور فریڈرک سے مخاطب ہوا۔ "میری رائے میں تم اپنے حصے کی تفتیش متعلقہ اتھارٹی کے سپرد کر دو۔"
"وہ میں خود کروں گا۔ جب تک قانون سے متصادم ہونے کی نوبت نہ آئے۔" فریڈرک کی آواز سے غم و غصہ جھلک رہا تھا۔ "میں اپنے بیٹے کے قاتل کو جہنم واصل کر کے چھوڑوں گا۔"
وکٹر نے سکون سے اس کا ردِعمل برداشت کیا۔ وہ فریڈرک کے جذبات کو سمجھ رہا تھا۔

☆☆☆

فیاٹ بہ آسانی انڈر گراؤنڈ پارکنگ میں پہنچ چکی تھی۔ دونوں تیزی سے اپنے کام میں مصروف تھے۔ انہوں نے وین کو مہیب اسٹوریج ٹینک کے قریب کھڑا کر دیا۔ ٹینک سے ایک موٹا پائپ فیول ٹینک سے نکل کر بلڈنگ میں داخل ہو رہا تھا۔ جو بوقتِ ضرورت عمارت کو "ہیٹنگ فیول" مہیا کرتا تھا۔
ایک آدمی نے اپنے لیب کوٹ میں سے ریموٹ کنٹرول ڈیوائس نکالی۔ انتہائی دھماکا خیز سو پونڈ سیمٹکس (SEMTIX) وین کے فرش کے نیچے پوشیدہ تھا۔ ریموٹ کنٹرول کا رابطہ اس نے ڈیٹونیٹر کے ساتھ بنایا۔ دوسرا آدمی پارکنگ ایریا پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اس کا ایک ہاتھ جیب میں "بریٹا" کے دستے پر تھا۔ پانچ منٹ بعد انہوں نے وین کو لاک کیا اور لیب کوٹ اتار دیے۔ نیچے دونوں نے بزنس سوٹ زیب تن کیے ہوئے تھے۔
بعدازاں دونوں پیدل چلتے ہوئے بہ آسانی زیرزمین پارکنگ کے ریمپ کے مخالف سمت سیڑھیاں طے کر کے باہر نکل گئے۔ دونوں بریٹا سے مسلح تھے۔ لیکن صد درجہ تباہ کن ہتھیار وہ ریموٹ کنٹرول تھا جو ایک آدمی کی پتلون کی جیب میں محفوظ تھا۔

☆☆☆

مارک نے ہیڈ کوارٹر عمارت کے آس پاس نیلے رنگ کی نسان دیکھتے ہی اطمینان کی سانس لی۔
مارک نے اوپل کی رفتار کم کرتے ہوئے جائزہ لیا۔ وہ چار منزلہ کاربیزی ہیڈ کوارٹر کی عمارت کے قریب تھا۔ زیرزمین پارکنگ کی سہولت بھی اس کی نظر میں تھی۔ اسے تو پارکنگ میں جانا نہیں تھا۔ وہ دوبارہ جینی کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ مارک کو باہر ہی رک کر نظر رکھنی تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ جینی وہاں کیوں آئی ہے۔ تاہم وہ اس بات سے لاعلم تھا کہ وہ ہیڈ کوارٹر میں کتنی دیر رکے گی... اسے یہ بات کچھ عجیب لگی کہ نسان پارکنگ میں کیوں نہیں گئی۔ وہ باہر سڑک پر کھڑی تھی اور عمارت کے عین سامنے بھی نہیں تھی۔ فریڈرک میکال، مارک نے نسان کو دیکھتے ہوئے ذہن میں نام دہرایا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ فریڈرک، جینی کے ساتھ یہاں کیوں آیا ہے؟ کیا یہ شخص "لفٹ" ہے کیونکہ جینی کی ٹویوٹا تو عارضی طور پر ناکارہ ہو چکی تھی۔
اس نے مناسب جگہ دیکھ کر عمارت کے قریب گاڑی لگائی۔ عمارت کے سامنے ایک اٹالین ریسٹورنٹ تھا۔ جہاں سے وہ کافی پیتے ہوئے بہ سہولت نگرانی کر سکتا تھا۔ وہ انجن بند کر کے اتر گیا۔ گاڑی لاک کرنے کے بعد اس نے نگاہ ہیڈ کوارٹر کی بلڈنگ پر ڈالی اور ٹھٹکا کے رہ گیا۔ جینی کسی شخص کے ہمراہ سیڑھیاں اتر کے عمارت سے باہر قدم رکھ رہی تھی۔ اس کے ہمراہ یقیناً فریڈرک تھا۔ گڑبڑ یہ ہوئی کہ جس لمحہ مارک نے اس طرف دیکھا، عین اس وقت جینی کی نگاہ بھی اوپل کی جانب تھی۔ مارک نے کافی پینے کا ارادہ ترک کیا اور بے نیازی سے منہ پھیر کر سیدھا چل پڑا۔ وہ اندر ہی اندر پریشان تھا کہ کیا جینی نے اسے دیکھ لیا ہے؟

☆☆☆

وکٹر زیرزمین پارکنگ میں اپنی سفید لانسا کی جانب بڑھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ پارکنگ سے نکل کر ٹریفک میں شامل ہو گیا۔ اس کی سفید کار ابھی بلڈنگ سے زیادہ دور نہیں گئی تھی۔ سڑک پر ٹریفک کم تھا، معاً اس کی نظر سیاہ رنگ کی کار پر پڑی۔ دو آدمی کار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں نے بزنس سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا۔ ایک چھریرے بدن اور بھورے بالوں والا تھا۔ دوسرا پستہ قد اور گٹھے ہوئے مضبوط بدن کا مالک تھا۔ اس کا گول سر شفاف انڈے کی طرح چمک رہا تھا۔ اس نے سر کو شیو کیا ہوا تھا۔ کانوں کے آس پاس یا گردن پر کہیں کوئی بال نہیں تھا۔ ابرو بھی نہیں کیوں

چھوڑ دیے تھے اس نے۔

لمحہ بھر کے لیے وکٹر کی پیشانی پر سلوٹ ابھری۔ اسے خیال آیا کہ پارکنگ کی سیڑھیوں پر بھی شاید اس نے دونوں کو دیکھا تھا۔ ہوسکتا ہے، اسے مغالطہ ہوا ہو۔ وہ سیاہ کار کے قریب سے گزر گیا۔ پندرہ منٹ بعد وہ گھر کی جانب نصف فاصلہ طے کرچکا تھا۔

☆☆☆

ریسٹورنٹ تقریباً ویران ہی تھا۔ فرینک نے دونوں کے لیے ریڈ وائن کا آرڈر دیا۔ "تم پریشان لگ رہی ہو؟" فرینک نے جینی کو دیکھا۔

جینی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ "نہیں... لیکن میں نے ایک آدمی کی جھلک دیکھی تھی۔ وہ آدمی میرے ایک دوست سے بے حد مشابہت رکھتا تھا۔"

"کون؟"

"مارک، میں تو اسے آواز دینے والی تھی لیکن مجھے پاگل پن لگا کیونکہ وہ تو نیویارک میں ہے۔" جینی نے جواب دیا۔

"میرے خیال میں HQ بلڈنگ میں تم نے جو باڑی دیکھی ہے، اس نے تمہیں ذہنی خلجان میں مبتلا کردیا ہے۔" فرینک بولا۔ "معاف کرنا میں ایک فون کال کر آؤں۔" فرینک اٹھ کھڑا ہوا۔ جینی اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی پھر دوبارہ کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی۔ اس کی نظر اوپل کار پر تھی۔ جس میں سے وہ آدمی نکل کر آگے بڑھ گیا تھا۔ اوپل کی کھڑکیوں کے شیشے بند تھے۔

کیا یہ وہی کار ہے جسے وہ "مسلن" میں بھی دیکھ چکی تھی۔ جینی سوچ میں پڑ گئی۔

"کیا بات ہے؟" فرینک کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

جینی نے کھڑکی کو نظرانداز کیا اور بولی۔ "پتا نہیں... میں اس یقین کے ساتھ یہاں آئی تھی کہ مجھے اپنے مرحوم والد کے جسدِ خاکی کی شناخت کرنی ہے۔" وہ چند لمحات کے لیے خاموش ہوئی پھر گویا ہوئی۔ "لیکن... وہ جو کوئی بھی تھا، اس کے پاس میرے والد کا پاسپورٹ اور کپڑے...؟ یہ سب کیا چکر ہے اور وہ اوپل! مجھے محسوس ہوتا کہ..." اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ وہ دھماکا اتنا ہی زوردار تھا۔ ریسٹورنٹ کی کئی کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ گئے۔ تیز ہوا کا ایک جھکڑ اندر در آیا۔

فرینک نے جینی کو دھکیلا۔ "نیچے، نیچے ہو جاؤ۔" وہ چلایا۔ ایک اور دھماکا ہوا جیسے بادل گڑگڑاتے ہیں۔

☆☆☆

مارک کچھ دور جا کر واپس اوپل میں آ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کی نظر اسی اٹالین ریسٹورنٹ پر تھی۔ دفعتاً تیز چمک کے ساتھ ایک خوفناک دھماکے نے جیسے اسے بہرا کردیا۔ اوپل سڑک سے کئی فٹ اوپر ہوا میں بلند ہوئی۔

دھماکے کی شدت اور اس سے پیدا ہونے والی ان دیکھی لہروں کو مارک نے براہِ راست محسوس کیا۔ اوپل واپس آ کر پہلو کے بل گری۔ اس کے حواس پہلے ہی عارضی طور پر معطل ہوگئے تھے۔ کار واپس گرنے کے بعد اس کا سر کسی چیز سے ٹکرایا۔ ابھی وہ سنبھلنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا کہ ایک اور مختلف قسم کا دھماکا ہوا۔ جیسے آسمان ٹوٹ پڑا ہو۔ یہ چار منزلہ HQ بلڈنگ کے انہدام کا دھماکا تھا۔ فضا گرد و غبار اور چیخوں سے آلودہ ہوگئی۔ مارک کا ذہن تاریکی میں ڈوب چکا تھا۔

☆☆☆

اچانک ہونے والے دھماکوں کے مابعد اثرات زائل ہوچکے تھے لیکن لوگوں کے اوسان اب تک خطا تھے۔ ہر کوئی "ٹراما" جیسی کیفیت سے گزر رہا تھا۔ جینی لڑکھڑاتی ہوئی کھڑی ہوگئی۔

HQ بلڈنگ تمام تر زمین بوس ہوچکی تھی۔ ملبے میں شعلوں کی سرخ زبانیں لپلپا رہی تھیں۔ اونچائی پر گرد و غبار کا بادل نظر آرہا تھا۔ متعدد کاروں کو آگ لگی ہوئی تھی۔

"بم بلاسٹ، شاید..." فرینک کے چہرے پر بھی زلزلے کے اثرات تھے۔ وہ اتنا ہی بول سکا۔ لوگ جائے حادثہ سے دور ہٹ رہے تھے۔ کچھ زخمیوں کی مدد کر رہے تھے۔ جینی منہ پر ہاتھ رکھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے سب دیکھ رہی تھی۔ دور سے سائرن کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"فرینک نے جینی کا بازو تھاما۔ "ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ نکلو یہاں سے۔"

نسان نے موٹر وے کا رخ کیا۔ دس منٹ بعد انہوں نے ہائی وے کو چھوڑا اور ایک گاؤں میں داخل ہوگئے۔ پتھریلی سڑک پر چرچ اور ایک بار نظر آرہا تھا۔ فرینک نے نسان فٹ پاتھ کے ساتھ لگائی اور بار میں داخل ہوگیا۔ فرینک نے وھسکی منگوائی اور جینی کو لے کر کھڑکی کے قریب والی نشست پر آگیا۔

"تم ٹھیک ہو؟"

"ہاں شاید..." جینی نے جواب دیا۔ "تم نے بم والی بات اتنے یقین سے کیسے کہی تھی؟" وہ ابھی تک غیر محسوس انداز میں کپکپاہٹ کا شکار تھی۔

"خاصی بڑی عمارت تھی۔ میں سوچ رہا ہوں کہ یہ بم سے زیادہ طاقتور کوئی سیٹ اپ تھا۔ جس نے آناً فاناً عمارت کو پیوندِ خاک کر دیا۔" فریئنک نے کہا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"یہ بامقصد تخریب کاری معلوم ہوتی ہے۔"

"کیسے؟" جینی نے سوال کیا۔

"ذرا سوچو۔ میرے بیٹے کے مرڈر کے بعد تمہاری ٹویوٹا کے بریک خراب کیے گئے۔ ریسٹورنٹ میں تم اوپلیا کا ذکر کرنے جا رہی تھیں جب دھماکا ہوا۔ تم نے پہلے بھی سرسری انداز میں اوپلیا کا ذکر کیا تھا۔ یعنی کسی نے تم پر نگاہ رکھی ہوئی ہے۔" فریئنک نے وسکی کی چسکی لی۔ "اور اب سب سے بڑھ کر یہ HQ بلڈنگ کی انتہائی واردات۔ تمام پیپر ورک، ایویڈنس، باڈی... سب کچھ عمارت میں تھا۔ سب تباہ ہو گیا۔ اب وکٹر تفتیش آگے بڑھانے سے قاصر ہے۔ اگر تم مجھ سے پوچھو تو میں یہی کہوں گا کہ "کوئی" اس کیس کی تفتیش کے تمام راستے بند کرنا چاہتا ہے اور یہ کسی ایک آدمی کا کام نہیں ہے۔" فریئنک خاموش ہو گیا۔

"لیکن کیوں؟ یہ کیا گورکھ دھندا ہے؟"

فریئنک سوچ میں گم تھا۔ وہ جینی کی بات نہیں سن رہا تھا۔ "مجھے وکٹر کا کارڈ دکھاؤ۔" اس نے فرمائش کی۔

جینی نے کارڈ اس کو دے دیا۔

"ابھی آیا۔" فریئنک کارڈ لے کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے کئی بار نمبر ملایا پھر بارٹینڈر سے فون ڈائریکٹری طلب کی اور ذرا دیر بعد واپس آ گیا۔

"اس کے گھر سے جواب نہیں مل رہا ہے۔" فریئنک نے واپس آ کر بتایا۔ "یہ اس کا پتا ہے۔" اس نے .... ایک سلپ جینی کی طرف بڑھائی۔ "اب اسے یقین آ جائے گا کہ معاملہ اتنا سادہ نہیں ہے۔"

☆☆☆
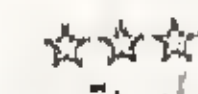
وکٹر اوسوریا ٹاؤن میں مقیم تھا۔ نسان کا رخ اوسوریا کی جانب تھا۔

وکٹر کی قیام گاہ تک پہنچنے میں دونوں کو خاص دشواری نہیں ہوئی۔ وکٹر کی سفید گاڑی ڈرائیو وے میں موجود تھی۔ لائسنس پلیٹ سے دونوں کو اندازہ ہوا کہ گاڑی وکٹر کی ہے اور وہ گھر پہنچ چکا ہے۔

فریئنک نے چھ مرتبہ رک رک کر گھنٹی بجائی۔ جینی اس کے عقب میں تھی۔ جواب ندارد۔ دونوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ فریئنک نے ہینڈل پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کی توقع کے برخلاف دروازہ مقفل نہیں تھا۔ دونوں نے پھر حیرانی سے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔

"کوئی ہے؟" فریئنک نے بلند آواز میں پکارا۔

سکوت... فریئنک نے دروازہ کھول دیا۔ چند لمحے وہ اپنی جگہ کھڑا رہا پھر اندر داخل ہو گیا۔ جینی نے بھی تقلید کی۔

دونوں وسیع لیونگ روم میں تھے۔ انہوں نے احتیاط اور الجھن کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کچھ کے بعد دیگرے مختلف کمروں، لابی، کچن وغیرہ کو دیکھنا شروع کیا۔

کچن بھی بڑے سائز کا تھا۔ دونوں کچن میں ایک ساتھ پہنچے اور جینی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کچن ادھڑا پڑا تھا۔ ٹوٹی ہوئی کراکری یہاں وہاں بکھری ہوئی تھی۔ کرسیاں الٹی پڑی تھیں۔ جس چیز نے جینی کا خون خشک کر دیا، وہ درمیانی عمر کی عورت کی لاش تھی جو خون کے چھوٹے سے تالاب میں لت پت تھی۔ اسے سر میں گولی ماری گئی تھی۔

فریئنک نے جھک کر ہاتھ کی پشت سے لاش کو چھوا۔ وہ ابھی پوری طرح سرد نہیں ہوئی تھی۔ جینی نے منہ پھیر لیا۔

"وکٹر... وکٹر کہاں ہے؟" جینی کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔

فریئنک دروازے کی جانب بڑھا۔ "تم یہیں رکو۔ کسی چیز کو ہاتھ نہ لگانا۔"

"نن نہیں میں اکیلے نہیں رہ سکتی۔" جینی کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔

فریئنک نے سر ہلایا۔ دونوں نے سیڑھیوں کے ذریعے اوپری منزل کا رخ کیا۔ فریئنک نے گن نکال لی تھی۔

بیڈ روم خالی تھے۔ وکٹر کا کہیں پتا نہیں تھا۔ باتھ روم سے فریئنک کو ربر کے دستانے ملے جو اس نے ہاتھوں پر چڑھا لیے اور ایک بار پھر جینی کو تنبیہ کی کہ کسی چیز کو نہ چھوئے۔

اسٹڈی میں اسے وکٹر کا بریف کیس ملا۔ تاہم اس میں سے سرخ رنگ کی فائل غائب تھی۔ فریئنک نے احتیاط سے تلاشی لینی شروع کی۔ تاہم کوئی چیز ہاتھ نہ آئی۔

ایک دراز سے بریٹا آٹومیٹک برآمد ہوا۔ فریئنک نے چیک کیا۔ سات راؤنڈ کا میگزین فل تھا۔ لوڈڈ بریٹا فریئنک نے جیب میں رکھ لیا۔

تعجب تھا، وکٹر اوپری منزل پر بھی کہیں نہیں تھا۔ فریئنک نے گیرج کا جائزہ لینے کا فیصلہ کیا۔

گیرج میں تاریکی کا راج تھا۔ فریئنک نے اندازے سے سوئچ تلاش کیا۔ روشنی ہوئی تو انہیں سرخ رنگ کی فیاٹ دکھائی دی۔ جینی نے اندازہ لگایا کہ فیاٹ، وکٹر کی بیوی کے زیرِ استعمال رہتی ہوگی۔

ڈرائیونگ سیٹ پر کوئی موجود تھا۔ جینی نے پہچان لیا۔ وکٹر کا منہ خون آلود تھا۔ فریئنک نے دروازہ کھول کر وکٹر کی نبض چیک کی۔ اس کے تجربے کے مطابق، وکٹر کی موت تیس منٹ کے دوران میں کسی وقت ہوئی تھی۔

جینی کے پیٹ میں آنتیں ایک دوسرے سے الجھنے لگیں۔ اس کا دماغ ماؤف تھا۔

وکٹر کے ہاتھ میں آٹومیٹک پسٹل تھا۔ پسٹل گود میں تھا۔ منظر نامہ کہہ رہا تھا کہ وکٹر نے اپنے ہی منہ میں پسٹل رکھ کر فائر کیا اور ڈسچارجنگ فورس نے پسٹل کو دھکیل کر گود میں گرا دیا۔

"صفائی سے کام کیا گیا ہے۔" فریئنک بڑبڑایا۔

"کک... کیا کہہ رہے ہو؟" جینی نے وکٹر کی جانب دیکھنے سے اجتناب برتا۔

"یہ کچھ اور ہی معاملہ ہے۔ شاید میں غلطی پر ہوں۔" فریئنک فیاٹ کے پاس سے ہٹ گیا۔ "کسی نے دونوں کو ہلاک کر کے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ وکٹر نے اپنی بیوی کو مارنے کے بعد خود کو بھی ہلاک کر لیا۔"

جینی کے ذہن میں ہولناک خیال سرسرایا... جس نے وکٹر اور اس کی بیوی کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ وہی لوگ ہوں جنہوں نے اس کی ماں کو قتل کیا تھا بلکہ اس کی پوری فیملی پر حملہ کیا تھا۔ پرانے غم نے پھر اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ وہ نڈھال سی ہو گئی۔

فریئنک نے اس کا بازو تھام لیا۔ "خود کو سنبھالو۔" وہ اسے لے کر واپس مکان کی جانب پلٹا۔ وہ گیرج کی روشنی گل کرنا نہیں بھولا تھا۔

وہ جیسے ہی لیونگ روم میں پہنچے۔ فریئنک نے کھڑکی کی جانب اشارہ کیا۔ "کوئی آ رہا ہے۔"

"پولیس۔" جینی کے منہ سے نکلا۔ پولیس کار کی چھت پر گردش کرتی ہوئی روشنی درختوں کے عقب میں اوجھل ہو گئی۔ ذرا دیر بعد پھر نمودار ہوئی۔

"یا تو کسی نے پولیس کو اطلاع دی ہے یا پھر وہ HQ بلاسٹ کے بارے میں بتانے آ رہے ہیں۔" فریئنک نے قیاس آرائی کی۔

"کیا ہمیں ان کا انتظار نہیں کرنا چاہیے؟"

"نہیں، صورتِ حال دھماکا خیز ہے۔ نہ صرف ہمیں شک کی لپیٹ میں لیا جا سکتا ہے بلکہ آس پاس کوئی بھی نہیں بچے گا۔ شاید پولیس کے اندر بھی چھان بین ہو۔ ہم اس وقت تک پولیس کے پاس نہیں جا سکتے جب تک خود کسی نتیجے پر نہ پہنچ جائیں۔ ہمیں خود ہی کچھ کرنا ہے۔ آخر یہ ہو کیا رہا ہے؟" فریئنک نے خدشات کا اظہار کیا۔

قبل اس کے کہ جینی کچھ کہتی، وہ اسے لے کر نسان تک پہنچ گیا۔ ہیڈلائٹس آف رکھتے ہوئے اس نے نسان وہاں سے نکالی اور اوسوریا کی مخالف سمت میں حرکت پذیر ہوا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" جینی نے سوال کیا۔

"مجھے بھی نہیں معلوم۔ فی الحال یہاں سے نکلو۔" فریئنک نے جواب دیا۔

☆☆☆
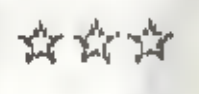
اٹلی۔

اوسوریا سے روانہ ہونے کے تیس منٹ بعد نسان ایک نامعلوم مقام پر تھی۔ شام کا جھٹپٹا اترنے کے لیے پر تول رہا تھا۔ بادل بھی سازش پر تلے بیٹھے تھے۔

فریئنک نے گاڑی روک دی۔ گلو کمپارٹمنٹ میں سے اس نے ٹورسٹ میپ اور پنسل ٹارچ نکالی۔

"کیا ہمیں آگے نہیں بڑھنا چاہیے؟" جینی نے استفسار کیا۔

"ہم اندھا دھند سفر جاری نہیں رکھ سکتے۔ ہمیں یہ جاننا ضروری ہے کہ اس وقت ہم ہیں کہاں؟"

جینی خاموش تھی۔ وہ اندر سے بری طرح ہل گئی تھی۔ ذہن میں خیالات و خدشات کی یورش تھی۔

"میں نے اپنے کیریئر میں کئی ایک مشکل ترین کیسز حل کیے ہیں لیکن یہ معاملہ انتہائی پیچ دار ہے۔ کسی بڑے "جگ سا پزل" کی طرح۔" فریئنک نے نقشے سے سر اٹھایا۔ "جینی کی باڈی ملنے کے بعد سے پے در پے غارت گری کا بازار گرم ہے اور ہم ابھی تک خالی ہاتھ کھڑے ہیں۔ ابتدائی ایک آدھ واقعات کو شک کا فائدہ دیا جا سکتا ہے لیکن نامعلوم دشمن کھل کر اور وسیع پیمانے پر کارروائیاں کر رہا ہے۔ یہ پروفیشنل لوگ ہیں۔" فریئنک لب بستہ ہو کر کسی سوچ میں گم ہو گیا۔ کچھ دیر بعد وہ پُرسوچ انداز میں پھر گویا ہوا۔

"مجھے اسی فیصد یقین ہے کہ اس الجھے ہوئے معاملے کا کوئی نہ کوئی تعلق تمہارے والد کے ماضی سے ہے۔ ممکن ہے تمہاری والدہ کا ماضی اپنے اندر کوئی اشارہ رکھتا ہو جو ہمیں صحیح سمت میں ڈال دے۔ ہنگامہ آرائی باڈی کی دریافت کے بعد ہی شروع ہوئی ہے۔"

"کیا جاننا چاہتے ہو؟"

''بیشتر ہر چیز... ہر بات جو تم یاد کر سکو۔''
جینی سر جھکا کر یادوں میں کھو گئی۔ یادیں اسے اذیت کے ریگزار میں گھسیٹ لے گئی تھیں۔
اس نے رک رک کر چھلے والی رات کے واقعات، اس سے پیشتر اور بعد کی یادوں کے بارے میں اپنی جانب سے سب کچھ بتا دیا۔ ڈسک والی بات وہ گول کر گئی۔ عین وقت پر اسے مارک کی ہدایت یاد آ گئی تھی کہ ''ڈسک'' کا ذکر کسی سے مت کرنا۔
فرینک نے تاسف کا اظہار کیا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی مایوسی کا عکس تھا۔ کچھ دیر بعد وہ بولا۔ ''کیا رخ اختیار کیا جائے۔ کسی نے تمہارے والد کا پاسپورٹ استعمال کیا اور گلیشیئر تک سفر کیا۔ امکان ہے کہ وہ غیر قانونی طریقے سے سرحد پار کرنا چاہتا ہو۔ وکٹر نے بھی کچھ ایسی ہی خیال آرائی کی تھی۔ تاہم اس کے ساتھی نے بظاہر دغابازی کی اور پاسپورٹ اس کی باڈی کے ساتھ چھوڑ دیا۔ ممکن ہے کہ برفانی طوفان کی وجہ سے یہ حادثہ ہی رہا ہو اور پال مارچ کسی طرح بچ گیا ہو... لیکن پال کا پاسپورٹ اور کپڑے نامعلوم باڈی کے ساتھ کیوں تھے...؟'' یہ ذہن میں رہے کہ نامعلوم باڈی کے بال اور چہرے کی ساخت تمہارے والد سے بہت مشابہت رکھتی تھی۔ پاسپورٹ اور کپڑوں نے اسے پال مارچ ثابت کر دیا تھا۔ حتیٰ کہ تم نے یہاں آ کر سارا گیم الٹ دیا کہ دریافت شدہ باڈی تمہارے والد کی نہیں ہے۔ معاملہ گمبھیر صورت اختیار کر گیا۔ بعد کے ناقابلِ یقین تباہ کن واقعات نے گمبھیرتا میں اضافہ کر دیا۔ مجھے اب کوئی شک نہیں رہا کہ تم خطرے میں ہو اور شاید میں بھی۔ یہ کوئی بڑا گیم ہے اور کھلاڑی بھی معمولی نہیں ہیں۔'' فرینک چپ ہو گیا۔ وہ اپنی کنپٹی سہلا رہا تھا۔ وہ پھر گویا ہوا۔
''میرا اندازہ ہے کہ پولیس سمیت، معلوم اور نامعلوم افراد جو اس پُراسرار معاملے میں ملوث ہیں۔ ان میں سے کسی کو اندازہ نہ ہوگا کہ تم ''باڈی'' کو اجنبی قرار دے دو گی۔''
''لیکن یہ بات تو چند افراد کو پتا ہے۔ ان میں سے صرف وہ، یعنی ہم زندہ ہیں۔'' جینی نے اعتراض کیا۔
''نہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ بات ''لیک'' ہو گئی ہے۔''
''کیسے؟''
''جنہوں نے وکٹر کو قتل کیا ہے اور سرخ فائل غائب کی ہے۔ انہوں نے یہ بات وکٹر سے اگلوائی ہوگی یا پھر سرخ فائل سے انہیں معلوم ہو گیا ہوگا۔''
''کیا وکٹر نے میری شہادت کا ذکر فائل میں کیا ہوگا؟''
''یقیناً'' فرینک نے جواب دیا۔ ''سوچنے والی بات یہ ہے کہ وہ دونوں افراد گلیشیئر کی راہ کہاں جانے کا ارادہ رکھتے تھے اور کیا تمہارے والد زندہ ہیں؟ وہ دونوں کہاں جا رہے تھے؟''
جینی کی رفتارِ نبض بڑھ گئی۔ ''برگ ہٹ'' اس کی یادداشت نے نام اچھالا۔
''وہ برگ ہٹ تو نہیں جا رہے تھے؟'' وہ بول پڑی۔
''کیا؟''
''میں جب ویبر کے ساتھ ویزن ہارن گئی تھی تو وہ مجھے علاقے کے بارے میں بتاتا جا رہا تھا۔'' جینی نے تشریح کی۔ ''ویزن ہارن پر چند مقام ایسے ہیں جہاں سے غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث افراد سرحد پار کر کے اٹلی کی حدود میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ویبر نے مجھے ''برگ ہٹ'' بھی دکھایا تھا۔ یہ ایک پہاڑی ہٹ ہے۔ ہٹ کے قریب ایک کیتھولک چرچ ہے جو ''کراؤن آف تھارن'' کہلاتا ہے۔ کوہ پیما اور دیگر افراد خراب موسم کی صورت میں چرچ میں پناہ لیتے ہیں۔ ہمیں دونوں مقام دیکھنے چاہئیں۔''
''یہ میرے علم میں تھا کہ غیر قانونی طور پر سرحد پار کرنے کے لیے گلیشیئر کا سہارا لیا جاتا ہے۔'' فرینک کی آنکھوں میں چمک دکھائی دی۔ ''لیکن برگ ہٹ اور چرچ کے بارے میں مجھے پتا نہیں تھا اور ویبر وہی شخص ہے جو تمہارے ساتھ تو ویونا میں تھا جب تم خودکشی کرنے جا رہی تھیں۔''
''میں خودکشی کرنے نہیں جا رہی تھی۔''
''میرا مطلب ہے کہ اسے خودکشی یا حادثہ ہی سمجھا جاتا۔ بہرحال یہ اطلاع اچھی ہے۔ ہماری اگلی منزل چرچ ہے۔ اٹھو، بارش کسی بھی لمحے شروع ہو سکتی ہے۔''
''ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ دو افراد تھے؟''
''وکٹر نے ریل ٹکٹ کے دو ٹکڑے دکھائے تھے۔'' فرینک نے کہا۔
''کیا یہ ضروری ہے کہ دوسرا فرد میرے والد ہی ہوں؟ کوئی اور وجہ نہیں ہو سکتی؟'' جینی الجھ رہی تھی۔
''کیا وجہ ہو سکتی ہے؟'' فرینک سوچ میں پڑ گیا۔
''نیز کیا یہ ممکن ہے کہ میرے والد زندہ سلامت ہوں؟''
''بہت مشکل سوال ہے۔ فی الحال اگر ہم امید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں تو فقط ''غیاب'' کا لفظ استعمال کر سکتے ہیں۔'' فرینک نے قیاس آرائی کی۔

(جاری ہے)

عادتوں اور خصلتوں کے تضادات کے باوجود دو فریقین ایک دوسرے کے قریب آ جاتے ہیں... ان دونوں میں مزاجی ہم آہنگی نہ ہونے کے برابر تھی... پھر بھی وہ یک جان دو قالب تھے... دوستی اور یگانگت کے اس سمندر میں اچانک ہی ایک بھونچال آ گیا...

چونکا دینے والے انجام سے لبریز ایک مختلف مزاج کی کتھا...

مُراد

سلیم انور

''تم نے اسے کتنی رقم ادا کی تھی؟'' میں نے ڈیوڈ سے پوچھا۔ ساتھ ہی اپنی فلیش لائٹ کی روشنی کے حلقے کو آگے کی جانب کر دیا تاکہ ہم اندھیرے میں درختوں کی لٹکی ہوئی ان شاخوں میں الجھ کر لڑھک نہ جائیں جو زمین پر پڑی ہوئی تھیں۔
''دو سو ڈالر۔'' ڈیوڈ نے جواب دیا۔ ''لیکن جب ملی نے یہ اندازہ لگا لیا کہ وہ اب بیدار نہیں ہوگی تو میں نے وہ رقم واپس لے لی۔''
ہم اس وقت جنگل کے اندر سے گزر رہے تھے۔ ہمارے چاروں طرف پتلے اور نازک درخت تھے۔ سوکھے پتے ہمارے قدموں تلے سیلوفین کی طرح چیخ رہے تھے۔ ہم وہ بڑا سا بھاری مضبوط بیگ اٹھا کر چل رہے تھے جس کا اگلا حصہ میں نے پکڑا ہوا تھا اور پچھلا سرا ڈیوڈ کے ہاتھوں میں تھا۔ بیگ کے اندر ایک عورت کی لاش تھی۔
''کیا واقعہ پیش آیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔
''تم تو میرے لیونگ روم کی اس جگہ سے واقف ہو

جہاں قالین سمٹ کر ایک گچھا سا بن گیا ہے اور ہر کوئی اس میں الجھ کر لڑھک جاتا ہے؟"

"ہاں۔"

"وہ اس میں الجھ کر لڑھک گئی تھی۔ اس کا سر کافی کی میز سے ٹکرا گیا تھا۔"

"تمہیں اس قالین کو ٹھیک کرا لینا چاہیے۔"

"میں اب ٹھیک کرا لوں گا۔"

میں ڈیوڈ کا اس ٹائپ کا دوست ہوں جسے وہ رات تین بجے بھی نیند سے اس لیے بیدار کر سکتا ہے کہ اس کے ہاتھوں میں ایک طوائف کی لاش ہے اور اسے اس لاش کو ٹھکانے لگانے کے لیے میری مدد درکار ہے۔

گو اس وقت آدھی رات سے زیادہ کا وقت گزر چکا تھا لیکن دوستی کی خاطر میں نے فوراً ہی اس کی مدد کی حامی بھر لی۔

"وہ مقام یہ رہا۔" میں نے ڈیوڈ سے کہا۔

اب ہم درختوں کے درمیان ایک کھلی جگہ پہنچ چکے تھے۔ وہ کنواں اسی جگہ پر تھا۔ کنواں پلائی ووڈ کے ایک پرانے ٹکڑے سے ڈھکا ہوا تھا۔ پلائی ووڈ کے اوپر سوکھے پتے اور چھوٹے پتھر رکھ کر اسے بھی چھپا دیا گیا تھا۔

ہم نے لاش کا بیگ زمین پر رکھ دیا۔ لاش جس طوائف کی تھی اس کا نام ایریکا تھا۔ میں خود بھی دو تین بار اس کی خدمات سے مستفید ہو چکا تھا۔

میں نے پلائی ووڈ کے اوپر سے پتھر ہٹانے شروع کر دیے۔

"تمہیں اس جگہ کا پتا کس طرح چلا؟" ڈیوڈ نے پوچھا۔

"بس اتفاق سے پتا چل گیا۔ بعض اوقات میں لمبی سیر کرنے کہیں بھی نکل جاتا ہوں۔ اسی طرح کی ایک سیر کے دوران مجھے اس مقام کا پتا چلا تھا۔"

"یہ مقام تو شہری زندگی سے بہت دوری پر ہے۔"

"یہ لوگوں سے دور رہنے کے لحاظ سے ایک عمدہ جگہ ہے۔" میں نے جواب دیا۔

ڈیوڈ اور میں ایک دوسرے سے اس وقت سے واقف تھے جب ہم ہائی اسکول میں ایک ساتھ پڑھتے تھے۔ لیکن ہمارے درمیان دوستی کا آغاز ہمارے گریجویشن کرنے کے بعد سے ہوا تھا۔ اس کے تقریباً تمام ساتھی کالج میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے باہر چلے گئے تھے اور میں نے ہائی اسکول میں کوئی خاص ساتھی نہیں بنائے تھے۔

چونکہ قصبے میں اب ہم دونوں ہی پیچھے رہ گئے تھے اس لیے ایک دوسرے کی طرف کھنچتے گئے۔ اگلے دس برسوں میں ہماری دوستی گہری ہو گئی۔ ڈیوڈ کی اور لوگوں سے بھی دوستی تھی جن کے ساتھ وہ گاہے بگاہے وقت گزارا کرتا تھا لیکن مجھے زیادہ لوگوں سے میل جول پسند نہیں تھا۔ اگر میرا دل کسی کے ساتھ وقت گزارنے کو چاہتا تھا تو میرا انتخاب ڈیوڈ ہی ہوتا تھا۔

اس بات کا سبب کیا تھا، یہ تو مجھے خود بھی معلوم نہیں تھا لیکن اگر ڈیوڈ اپنے دیگر دوستوں کے ساتھ ہوتا تھا اور اتفاق سے ہمارا آمنا سامنا ہو جاتا تھا تو اس کا رویہ تقریباً ایسا ہوتا تھا جیسے کہ وہ مجھے جانتا تک نہیں ہے۔ وہ سر کی خفیف جنبش کے ساتھ بس اتنا کہتا تھا۔ "اور کیا ہو رہا ہے؟" اس کے علاوہ ہمارے درمیان کوئی بات چیت نہیں ہوتی تھی۔

مجھے اس کی یہ بات بری بھی نہیں لگتی تھی کیونکہ عام طور پر میں خود بھی سوشل ہونے اور فضول گپ شپ لڑانے کو پسند نہیں کرتا تھا۔

ہم نے کنویں کا ڈھکن اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا۔ میں نے کنویں میں جھانک کر دیکھا۔ کنویں میں سرد سی ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ڈیوڈ کو اشارہ کیا۔

پھر ہم دونوں نے اس بڑے سے بیگ کو اٹھایا جس میں ایریکا کی لاش بندھی ہوئی تھی۔ ہم اس بیگ کو کنویں کے منہ کے پاس لے آئے۔ کنویں میں سے عجیب نمی کی سی بو ابھر رہی تھی۔

"ہو سکتا ہے کہ یہ مرادیں مانگنے کا کنواں ہو؟" ڈیوڈ نے جاننا چاہا۔

"مجھے شبہ ہے۔"

"میں تو بہرحال اپنی مراد مانگوں گا۔ تمہیں اس پر کوئی اعتراض تو نہیں؟"

"بے شک تم مانگ سکتے ہو۔"

ہم نے لاش کے بیگ کو ایک جھٹکے سے اوپر اٹھایا اور اسے کنویں کے اندر تاریکی میں پھینک دیا۔ میں ابھی تین تک گنتی ہی گن پایا تھا کہ ہمیں چھپاکے کی آواز سنائی دی۔

ہم نے پلائی ووڈ دوبارہ کنویں کے منہ پر رکھ دی اور اس پر پتھر بھی جما دیے۔ پھر اس پر سوکھے پتے ڈالنے کے بعد واپس کار کی جانب چل دیے۔

"تم نے کیا مراد مانگی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"آئندہ مجھے کوئی بے ڈھنگی طوائف نہ ملے۔" ڈیوڈ نے بتایا۔

☆☆☆

اگلی رات لگ بھگ اسی وقت ڈیوڈ نے مجھے پھر فون کیا۔ میں اس وقت "فرینڈز" نامی پروگرام کا ری رن دیکھ رہا تھا اور مجھے بالکل بھی لطف نہیں آ رہا تھا۔

"یہاں میرے پاس ایک شخص موجود ہے۔" ڈیوڈ نے فون پر کہا۔

"کون؟"

"ایریکا کا دلال۔"

"کیا؟ ہمارے یہاں کیوری ویلی میں تو کوئی دلال نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔

"میرا بھی یہی خیال تھا۔" ڈیوڈ نے جواب دیا۔ "لیکن یہاں ایک شخص موجود ہے اور وہ یہ جاننا چاہتا ہے کہ ایریکا کہاں ہے؟"

"میں اس معاملے کا حصہ نہیں بننا چاہتا۔" میں نے کہا۔

اتنے میں فون پر ایک نئی آواز سنائی دی۔ "کیا تم کارسے وائٹ بول رہے ہو؟"

"تمہیں میرا نام کیسے پتا چلا؟"

"تمہارے دوست نے بتایا ہے۔"

میں چپ رہا۔

"اب تم یہاں آ جاؤ تاکہ ہم اس معاملے کو سلجھا سکیں۔" اس آواز نے کہا۔

مجھے اندازہ ہو گیا کہ میں چاہوں یا نہ چاہوں، میں اس معاملے کا ایک حصہ ہوں اور اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

میں اپنی کار میں سوار ہو کر ڈیوڈ کے نئے اپارٹمنٹ کی جانب چل دیا۔ ہر سال جب بھی ڈیوڈ کی رہائش گاہ کی لیز ختم ہو جاتی تھی تو وہ یہ فیصلہ کرتا تھا کہ اسے اس سے بہتر رہائش گاہ چاہیے۔ وہ عام طور پر ایسے اپارٹمنٹ کا انتخاب کرتا تھا جو لگ بھگ پچھلے اپارٹمنٹ کے مشابہ ہوتا تھا ساتھ ہی وہ عمارت کی تیسری یا چوتھی منزل پر رہنا پسند کرتا تھا اور اس عمارت کو ترجیح دیتا تھا جس میں لفٹ نہیں ہوتی تھی اور سیڑھیوں کے راستے آنا جانا ہوتا تھا۔

اور میں ہی وہ واحد فرد تھا جو اس کی نئی رہائش گاہ میں منتقل ہونے میں اس کی مدد کیا کرتا تھا۔

جب میں ڈیوڈ کے اپارٹمنٹ میں داخل ہوا تو میرا پیر بھی فرش پر پڑے ہوئے قالین کے اس گچھے میں الجھ گیا جس سے ٹکرانے کے بعد ایریکا لڑھک گئی تھی اور کافی کی میز سے سر ٹکرانے کے باعث اس کی موت واقع ہو گئی تھی۔

میں نے بروقت خود کو سنبھال لیا اور ڈیوڈ سے کہا۔ "میرا خیال ہے تم نے کہا تھا کہ تم اسے ٹھیک کرا دو گے۔"

"مجھے ابھی وقت نہیں ملا۔"

ڈیوڈ کے ساتھ کاؤچ پر بارنی آرمسٹرانگ بیٹھا ہوا تھا۔ بارنی ہائی اسکول میں ہم سے دو سال آگے تھا۔ وہ مختصر سیاہ بالوں والا ایک لمبا تڑنگا شخص تھا۔

"میرا خیال تھا کہ تم روٹ چھتیس پر واقع فیڈ اسٹور میں کام کرتے ہو؟" میں نے بارنی سے کہا۔

"میں وہیں کام کرتا ہوں۔" بارنی نے جواب دیا۔ "لیکن تنخواہ بہت تھوڑی ہے۔ اس لیے سائڈ میں لڑکیوں سے دھندا کراتا ہوں۔"

ڈیوڈ کی رہائش گاہ ہمیشہ کی طرح ابتر حالت میں تھی۔ اپارٹمنٹ میں ایک تیخ ناگوار سی بو رچی ہوئی تھی جو اس دودھ سے بھرے پیالے کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی جو دو ماہ قبل ڈیوڈ سے قالین پر گر گیا تھا اور ڈیوڈ نے آج تک اسے صاف کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔

"ایریکا کہاں ہے؟" بارنی نے پوچھا۔

"کیا تم نے اسے بتا دیا؟" میں نے ڈیوڈ سے دریافت کیا۔

"میں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔" ڈیوڈ نے جواب دیا۔

"کیوں؟"

"مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے۔" ڈیوڈ نے کہا۔ "گاڑی تم چلا کر لے گئے تھے۔ اس مقام سے تم ہی واقف ہو۔"

"کیا تم نے اسے بتا دیا کہ کیا واقعہ پیش آیا تھا؟" میں نے ڈیوڈ سے کہا۔

"وہ قالین میں الجھ کر گر گئی تھی۔" بارنی نے خود ہی جواب دے دیا۔ "اب وہ کہاں ہے؟"

"جنگل میں۔"

یہ سن کر بارنی کاؤچ پر سے اٹھ گیا۔ "مجھے اس کے پاس لے چلو۔"

"لیکن وہ....."

"مجھے اس کے پاس لے چلو۔" بارنی کا لہجہ سخت تھا۔

میں نے بہادر بننے کا فیصلہ کیا۔ "ہم کیوں لے چلیں؟" میں نے پوچھا۔ ساتھ ہی مجھے اپنے سینے میں جھنجھناہٹ سی محسوس ہونے لگی۔ "تمہارے پاس کوئی ہتھیار تو نہیں ہے نا؟"

بارنی سرد نگاہوں سے مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

"کیا یہ جاننا چاہتے ہو کہ میرے پاس گن ہے یا نہیں؟"
میرے سینے کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔
"آؤ اسے وہیں لیے چلتے ہیں۔" ڈیوڈ نے میری مشکل آسان کرتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

میں ایک بار پھر اپنی کار میں جنگل کی جانب چل پڑا۔ بارنی میرے برابر کی نشست پر بیٹھا ہوا تھا۔ ڈیوڈ عقبی نشست پر تھا۔ فارم لینڈ کا علاقہ خاموشی میں گزر گیا۔ جب ہم نے نصف فاصلہ طے کرلیا تو بارنی نے گردن گھماتے ہوئے ڈیوڈ کی طرف دیکھا اور بولا۔ "کیا تم نے اس کے ساتھ رغبت کی تھی؟"
"کیا؟"
"کیا تم نے ایریکا کے ساتھ رغبت کی تھی؟"
ڈیوڈ نے قدرے توقف کیا۔ پھر بولا۔ "ہاں۔"
"تو پھر پیسے کہاں ہیں؟"
ڈیوڈ نے اپنا بٹوا نکالا اور اس میں موجود تمام کی تمام رقم بارنی کو دے دی۔
"یہ تو کچھ کم ہے۔" بارنی نے کہا۔
"میرے پاس آتو فی الوقت یہی رقم ہے۔" ڈیوڈ نے جواب دیا۔ پھر کچھ یاد آنے پر بولا۔ "لیکن یہ دھیان رہے کہ اب تمہیں ایریکا کو اس کا حصہ نہیں دینا پڑے گا۔"
بارنی نے ایک لمحے کے لیے ڈیوڈ کی بات پر غور کیا، پھر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے واپس سامنے کی سمت گردن گھمالی۔
چند منٹ بعد ہم دوبارہ جنگل میں پہنچ گئے۔
میں نے کار پارک کردی اور فلیش لائٹ اٹھالی پھر میں ان دونوں کو اپنی رہبری میں کنویں کی جانب لے کر چل دیا۔
جب ہم کنویں کے پاس پہنچے تو اس کا منہ بدستور ڈھکا ہوا تھا۔ اطراف میں خشک پتے چرمرا رہے تھے۔
"وہ وہاں نیچے ہے۔" ڈیوڈ نے کنویں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
بارنی کنویں کی جانب بڑھا اور بولا۔ "اس کا ڈھکن ہٹادو۔"
ڈیوڈ اور میں نے وہی کیا جیسا کہ ہم سے کہا گیا تھا۔ اس بار کنویں سے اٹھنے والی نمی کی بو میں ایک عجیب سی مٹھاس بھی تھی۔ جب ہم نے پلائی ووڈ ہٹادی تو بارنی کنویں کے منہ کے پاس چلا گیا اور کنویں کے اندر جھانکتے ہوئے بولا۔ "اس کی گہرائی کتنی ہے؟"
میں بارنی کے عقب میں پہنچا اور اسے دھکا دے دیا۔
بارنی نے اپنے ہاتھ لہرائے جیسے کسی شے کا سہارا لینا چاہتا ہو لیکن اسے کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ میں اور ڈیوڈ ایک ساتھ کنویں کے منہ پر جا پہنچے۔ میں نے ایک بار پھر تین تک گنتی گنی کہ مجھے نیچے چھپاکے کی آواز سنائی دی۔
ہم دونوں کے درمیان ایک منٹ تک خاموشی چھائی رہی۔ پھر ڈیوڈ بولا۔ "تمہیں یہ کہنا چاہیے تھا کہ تم خود دیکھ لو۔"
"کیا؟"
"جب اس نے پوچھا تھا کہ اس کی گہرائی کتنی ہے تو اسے نیچے دھکا دینے سے پہلے تمہیں یہ کہنا چاہیے تھا کہ تم خود دیکھ لو یا یہ کہ تم ہی بتادو۔"
"اگلی مرتبہ میں اس بات کا دھیان رکھوں گا۔" میں نے جواب دیا۔
تب ڈیوڈ نے ایک بار پھر کنویں میں جھانکا اور بولا۔ "میں ایک اور مراد مانگنا چاہتا ہوں۔"
"اس مرتبہ تم کیا مراد مانگنے جا رہے ہو؟"
"مزید کسی دلال سے واسطہ نہ پڑے۔"
اپنی مراد مانگنے کے بعد ڈیوڈ کے چہرے پر فکرمندی کے تاثرات ابھر آئے۔ "شٹ۔" اس نے کہا۔ "اگر کوئی اور مجھے ڈھونڈتا ہوا آگیا تو پھر کیا ہوگا؟" پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "کیا تمہارے خیال میں مجھے کہیں اور منتقل ہوجانا چاہیے؟"
تب بنا سوچے سمجھے اچانک میرا داہنا ہاتھ آگے بڑھا اور میں نے ڈیوڈ کو نیچے اندھے کنویں میں دھکا دے دیا۔
ڈیوڈ نے بازو نہیں لہرائے۔ بس اس نے حیرت اور تعجب..... بھری نگاہوں سے میری طرف یوں دیکھا جیسے میں نے اس کے ساتھ کوئی ہمدردی کی ہے۔
مجھے کنویں کے اندر سے چھپاکے کی آواز نہیں سنائی دی۔ میرا اندازہ یہی تھا کہ وہ بارنی کے اوپر گرا ہوگا جب ہی کوئی چھپاکا نہیں ہوا۔
اپنی کار کی جانب واپس جاتے ہوئے میں نے بھی ایک مراد مانگی۔ وہ مراد یہ تھی:
"مجھے زندگی میں اشتعال دلانے والے مزید کوئی دوست نہ ملیں۔"

بونس

عبدالقدیر

بظاہر صاف نظر آنے والے منظر کے پیچھے کوئی نہ کوئی کہانی ضرور چھپی ہوتی ہے... کھوجنے اور دریافت کرنے والی نگاہ کا ہونا ضروری ہے... ایک سراغ رساں کو پیش آنے والا واقعہ... سب کچھ اس کی نظروں کے سامنے رونما ہوا... اس کے باوجود وہ تنہا تھا... کوئی اس کی تصدیق کرنے پر تیار نہ تھا... ہر شخص اس کے خلاف بیان دے رہا تھا...

سیدھے سادے گروپ کی کارروائیاں... جو ہر جگہ کامیاب و کامران تھے...

جولائی کے آخری جمعے کو ایوریٹ اسپرلنگ نے اپنی تیاریوں کو آخری شکل دیتے ہوئے پانی سے بھری ہوئی اسٹین لیس اسٹیل کی بوتل اپنی خاکی پتلون کی بائیں جانب والی پچھلی جیب میں رکھی اور اطمینان کرلیا کہ بائیں جانب والی سائڈ پاکٹ میں اس کی گولیوں کی ڈبیا اور آلۂ سماعت کی بیٹری موجود ہے پھر اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی کمر پر بندھی ہوئی چوڑی بیلٹ کو درست کیا۔ کوکہ اس نے کیس لگا رکھے تھے اور اسے پٹی باندھنے کی

ضرورت نہیں تھی لیکن اس کے اندرونی حصے میں احتیاطاً بیس ڈالر رکھ لیے تھے تاکہ اگر اسے کسی ایسی دکان سے خریداری کرنی پڑ جائے جہاں کریڈٹ کارڈ نہ چلتا ہو تو یہ رقم اس کے کام آسکے۔ آج کے سفر میں انہیں کیلو آؤٹ لیٹ مال اور ٹائم اٹیسن اسٹیکو جانا تھا۔

اسپرلنگ تین بلاک کا فاصلہ طے کر کے کارنی کاؤنٹی کمیونٹی سروسز سینٹر پہنچا جہاں ایک چارٹرڈ ٹور بس تیار کھڑی ہوئی تھی۔ اس ٹور کی آرگنائزر سوزیل لیس ویڈ نے اسے دیکھ کر اپنی فہرست میں اس کے نام پر نشان لگایا اور وہ پہلے سے وہاں موجود دو ساتھیوں سے مصافحہ کر کے لوہے کی بینچ پر بیٹھ گیا۔ نو بجے تک سفر پر جانے والے تمام چودہ افراد بس میں اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ چکے تھے۔ لیس ویڈ اپنی کار میں بس کے آگے چل رہی تھی۔ بس کا ڈرائیور میک رائیڈ بہت پرانا اور تجربہ کار شخص تھا اور کئی بار اس قسم کے ٹور پر جاچکا تھا۔

دو گھنٹے سے بھی کم وقت میں گروپ کے سب لوگ کیلو آؤٹ لیٹ مال میں گھوم پھر کر تھک چکے تھے۔ وہاں صرف دو ریستوران تھے جو کافی مہنگے تھے۔ لہٰذا یہ طے پایا کہ دوپہر کا کھانا آربو شاپنگ سینٹر میں کھایا جائے۔ وہاں کے ریستوران میں ہر فرد کے ذوق کے مطابق اشیائے خورونوش دستیاب تھیں اور وہ نسبتاً سستا تھا۔ چونکہ کھانے کے وقت میں ابھی کچھ دیر تھی۔ اس لیے کچھ لوگ دواؤں کی دکان اور دوسرے بینک میں چلے گئے۔

بہت سوچ بچار اور طویل غور و فکر کے بعد سراغ رساں لیفٹیننٹ سارنس اوبرن نے نئی کار خریدنے کا فیصلہ کیا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو اپنی کمائی کا زیادہ حصہ بینک میں رکھتے تھے چنانچہ جمعے کے روز کھانے کے وقفے میں وہ پیپلز پرائڈ سیونگ اینڈ لون کی ہارلو ہال برانچ میں پہنچا تاکہ نئی کار کی ڈاؤن پیمنٹ کے لیے کچھ رقم نکال سکے۔

بینک میں ہمیشہ کی طرح چہل پہل نظر آرہی تھی۔ کاؤنٹر پر موجود دونوں کیشیئر کام میں مصروف تھے اور ہر کھڑکی پر تین سے چار افراد قطار باندھے کھڑے تھے۔ ان میں زیادہ تر بوڑھی خواتین ہاتھوں میں شاپنگ بیگ لیے اپنی باری کی منتظر تھیں۔ اچانک سامنے والی کھڑکی پر ہونے والی گڑبڑ نے اوبرن کو چونکا دیا۔ ایک گٹھے ہوئے جسم کے بوڑھے اور گنجے شخص جس نے آلۂ سماعت لگا رکھا تھا اور خاکی پتلون کو کمر پر جمائے رکھنے کے لیے گیلس لگائے ہوئے تھے کیشیئر سے بلند آواز میں کچھ کہا۔ اوبرن کے کانوں تک وہ الفاظ نہ پہنچ سکے لیکن اس کے لہجے میں جو دھمکی پوشیدہ تھی اسے سمجھنے میں اس سے کوئی غلطی نہیں ہوئی۔

اوبرن نے دیکھا کہ اس شخص نے دوسری کھڑکی پر بیٹھے ہوئے کیشیئر پر پستول تان لیا ہے۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ شخص دھمکی نہیں دے رہا بلکہ اس کا ارادہ گولی مارنے کا ہے۔ وہ عدالتوں میں بینک ڈکیتی کے مقدمات کی سماعت کے دوران اس طرح کی کئی ویڈیو ٹیپس دیکھ چکا تھا لیکن اس طرح کا لائیو شو وہ پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ ایسی صورت میں اس کا ردعمل فطری تھا۔ اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ دیوار پر لگا ہوا وارننگ الارم بجائے کیونکہ اسے یقین ہو چلا تھا کہ یہ شخص کسی وقت بھی گولی چلا سکتا ہے۔ اس نے ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر اپنا ریوالور نکالا اور اس شخص کے کندھے کی پشت کا نشانہ لیتے ہوئے فائر کر دیا تاکہ اس کا پستول والا بازو ناکارہ ہو جائے۔

بینک کی بند چار دیواری میں فائر کی آواز ایک زوردار دھماکے میں تبدیل ہوگئی۔ اس شخص کے حلق سے ایک بھیانک چیخ نکلی اور وہ فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ بینک میں بھگدڑ مچ گئی اور لوگ چیختے چلاتے ہوئے وہاں سے باہر نکلنے کی کوشش کرنے لگے۔ دو عورتیں تیزی سے اس شخص کی مدد کے لیے آگے بڑھیں اور ایک اسکارف کی مدد سے اس کا خون روکنے کی کوشش کرنے لگیں۔

اوبرن اس وقت اپنی یونیفارم کے بجائے سمر سوٹ میں ملبوس تھا اس لیے جن لوگوں نے زخمی شخص کو کاؤنٹر پر دھمکیاں دیتے نہیں دیکھا تھا وہ اسے ہی حملہ آور سمجھ رہے تھے۔ دو آدمیوں نے عقب سے اس پر حملہ کیا اور اسے زمین پر گرا دیا۔ ان میں سے ایک نے اس کا سروس ریوالور چھین لیا تاکہ وہ دوسرا فائر نہ کر دے۔ اس نے اپنا شناختی کارڈ نکالنے کی کوشش کی لیکن بازو پر پڑنے والی لات کی وجہ سے وہ ایسا نہ کر سکا۔

ایمبولینس کا عملہ اور دو پولیس والے تقریباً ساتھ ساتھ پہنچے۔ اس سے پہلے ہی برانچ منیجر اپنے کیبن سے باہر آکر بینک کے دروازے بند کر چکا تھا۔ طبی عملے کے ایک فرد نے قینچی کی مدد سے زخمی شخص کے گیلس کاٹے اور زخم کی جگہ پر ڈریسنگ کر دی۔ ان میں سے ایک فرد دوڑتا ہوا ایمبولینس تک گیا اور اس میں سے پہیوں والا اسٹریچر لے کر آ گیا۔ انہوں نے مریض کا بلڈ پریشر چیک کیا اور تین منٹ کے اندر اسے لے کر اسپتال کے لیے روانہ ہوگئے۔

وہاں آنے والے پولیس آفیسرز، سراغ رساں

لیفٹیننٹ کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ انہوں نے اسے لوگوں کے نرغے سے نکالا۔ ان سے ریوالور لیا اور اسے سیدھا کھڑا کر کے اس کے کپڑوں کی گرد جھاڑنے لگے۔ جب انہیں ہنگامے کی وجہ معلوم ہوئی جس کا سارا الزام اوبرن پر آرہا تھا تو انہوں نے اپنی مدد کے لیے مزید دو افسر بلا لیے۔ ان میں سے ایک نے گواہوں کے بیان لیے اور دوسرا اوبرن سے پوچھ گچھ کرنے لگا۔ کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھے ہوئے دونوں کیشیئرز سے بات کرنے کے بعد آفیسر میلانی وائٹ نے اوبرن کی آنکھوں کی پتلیاں دیکھیں کہ کہیں وہ نشے کی حالت میں تو نہیں ہے۔

اوبرن کو اس کے زخموں کی مرہم پٹی کے لیے اسپتال لے جانے کے بجائے واچ کمانڈر سے ملاقات کے لیے سیکنڈ ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر لانے کی ہدایت کی گئی۔ اوبرن کا باس کیپٹن مانگ ایک ہفتے کی چھٹی پر تھا۔ لہٰذا اسے واچ کمانڈر کیپٹن مارک جوڈی کے روبرو پیش کیا گیا جو کہ تنگ نظر اور بدمزاج شخص تھا۔ اوبرن نے بینک میں پیش آنے والا واقعہ من و عن اسی طرح بیان کیا جو وہ اس سے پہلے پولیس والوں کو بتا چکا تھا۔

کیپٹن جوڈی نے مداخلت کرتے ہوئے جارحانہ انداز میں کہا۔ ”تمہارا خیال ہے کہ تم نے اسے پستول نکالتے ہوئے دیکھا تھا لیکن پولیس والوں کو تمہارے ریوالور کے سوا وہاں سے کوئی ہتھیار نہیں ملا اور کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھے ہوئے کیشیئرز کا بھی یہی کہنا ہے کہ انہوں نے کوئی ہتھیار نہیں دیکھا۔“

اوبرن کے جسم میں غصہ اور نفرت کی لہر دوڑ گئی۔ اس کے جسم سے پسینا بہنے لگا۔ ”یہ سراسر بکواس ہے۔“ وہ پھٹ پڑا۔ ”یہ میں نے کیسے تصور کر لیا کہ مجھ سے پانچ چھ فٹ کے فاصلے پر کھڑا شخص کیشیئر پر پستول تان رہا ہے۔ انہوں نے کیا بتایا کہ وہ کیا کر رہا تھا؟“

”میرے پاس ان کے تحریری بیانات نہیں ہیں لیکن ہمارے آدمیوں نے بینک میں موجود جتنے لوگوں سے بات کی، ان میں سے کسی نے بھی تمہارے گولی چلانے تک بینک میں کوئی غیر معمولی سرگرمی نہیں دیکھی تھی۔“

”کیا وہ بہت زیادہ زخمی ہے؟“ اوبرن نے پوچھا۔

”ابھی اس بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے لیکن پولیس والوں کے وہاں سے آنے تک وہ بے ہوش تھا اور یہ کوئی حیرت کی بات نہیں۔ اس کے جسم سے اچھا خاصا خون بہہ گیا ہے۔“

اوبرن کو جبری رخصت پر بھیج کر تمام اختیارات سے محروم کر دیا گیا۔ اس کا شناختی کارڈ اور سرکاری ریوالور بھی ضبط ہو گیا۔ شناختی کارڈ تو جوڈی نے اپنی دراز میں رکھ لیا جبکہ ریوالور کو معائنے کے لیے پہلے ہی لیبارٹری میں بھیجا جا چکا تھا۔

اوبرن گھر چلا گیا۔ اس افراتفری میں وہ دوپہر کا کھانا بھی بھول گیا تھا۔ سہ پہر کے وقت اسے ٹی وی کی خبروں سے معلوم ہوا کہ ہنگامی آپریشن کے بعد بھی ایوریٹ اسپرلنگ کی حالت خطرے سے باہر نہیں ہے۔ ٹی وی کی خبروں میں بھی اسے ہی حملہ آور قرار دیا جارہا تھا۔ اس کے ریوالور سے نکلی ہوئی گولی نے بڑی شریان کو متاثر کیا تھا۔ ویسے بھی اسپرلنگ دل کا مریض تھا۔ اسی لیے کئی بوتل خون چڑھائے جانے کے باوجود وہ ہوش میں نہیں آیا تھا اور اس کے بچنے کی بہت کم امید تھی۔

پبلک سیفٹی آفیسر کی حیثیت سے سترہ سال کی ملازمت کے دوران اوبرن نے اپنے ہتھیار سے کسی انسان کی جان نہیں لی تھی۔ چھوٹے موٹے مقابلے بہت ہوئے۔ ان میں لوگ زخمی بھی ہوئے لیکن ایسا واقعہ کبھی پیش نہیں آیا۔ اگر اسپرلنگ مر گیا تو اوبرن کی روح زخمی ہو جائے گی اور کبھی وہ اپنے ذہن کو اس بوجھ سے آزاد نہیں کر سکے گا کہ اس نے اپنی طاقت کا غلط استعمال کیا اور اس کے دامن پر لگا یہ داغ کبھی نہیں مٹ سکے گا۔

ہفتے کی صبح نو بجے تک اسپرلنگ زندہ تھا جب اوبرن ڈائریکٹر انٹرنل افیئرز لانس کیلٹن کے دفتر میں بیانِ حلفی کے لیے پیش ہوا۔ ”یہ کوئی عدالتی کارروائی نہیں ہے۔“ اس نے اوبرن کو مطلع کیا۔ ”لیکن تم حلف لو گے اور تمہارا بیان ڈی وی ڈی پر ریکارڈ کیا جائے گا۔“

اس دوران ایک ٹیکنیشن آلات نصب کرتا رہا اور جیسا کہ اوبرن کو امید تھی۔ یہ بیانِ حلفی سوال جواب میں تبدیل ہوگیا۔ اوبرن نے اپنا بیان شروع کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے واضح طور پر تین انچ لمبی لوہے کی نال باہر نکلتی دیکھی اور وہ اس پوزیشن میں تھی کہ اس سے کسی انسانی جان کو خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔“

کیلٹن بولا۔ ”تم نے جو چیز دیکھی، وہ تین انچ کا نیلے رنگ کا پلاسٹک پین تھا جو مسٹر اسپرلنگ دوسرے کاؤنٹر پر کھڑے شخص کو دے رہے تھے کیونکہ اس کاؤنٹر پر رکھے ہوئے پین کی سیاہی ختم ہو چکی تھی۔“

”یہ اس نے کہا۔“ اوبرن نے پوچھا۔

”اس کے علاوہ پانچ گواہوں کا بھی یہی کہنا ہے۔“ کیلٹن نے جواب دیا۔ ”میں نے دونوں کیشیئرز اور بینک

کے تین مستقل گاہکوں کے بیانات لیے ہیں۔ ان میں سے کسی نے بھی اس کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار نہیں دیکھا۔“

اوبرن کو موہوم سی امید تھی کہ بینک میں لگے ویڈیو کیمروں نے یہ سارا منظر ریکارڈ کرلیا ہوگا اور یہ ٹیپ دیکھنے کے بعد اس کی بات سچ ثابت ہو جائے گی۔ جب اس نے ویڈیو ٹیپ کے بارے میں پوچھا تو کیلٹن نے کہا۔ ”ہم نے بینک میں لگے ہوئے چھ کیمروں کی ویڈیو دیکھی ہے۔ ان میں سے صرف دو نے اس جگہ کی عکاسی کی ہے۔ یہ دونوں کیمرے ایسے زاویے سے لگے ہوئے ہیں کہ کھڑکی پر کھڑے شخص کے چہرے کی پوری تصویر لے سکیں۔ لیکن کاؤنٹر کی کھڑکیوں کے درمیان لگے ہوئے تختوں کی وجہ سے اطراف میں ہونے والی کوئی سرگرمی ریکارڈ نہیں ہوسکتی۔ کسی بھی ٹیپ میں ایوریٹ اسپرلنگ کی جانب سے کوئی غیر معمولی بات دیکھنے میں نہیں آئی البتہ تمہاری گولی لگ کر گرنے والا منظر ضرور محفوظ ہوگیا۔“

اوبرن کو لگا جیسے زمین اس کے قدموں سے نکلی جارہی ہے اور وہ خلا میں معلق ہو کر رہ گیا ہے۔ دس بجے کارروائی ختم ہوئی تو وہ واپس گھر کی جانب چل دیا۔ اس کی قمیص پشت کی جانب پسینے سے بھیگ گئی تھی اور سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا اگر اوبرن کی گولی نے اسپرلنگ کو ایک قتل کرنے سے روک دیا تھا تو ظاہر ہے کہ اسپرلنگ اس حقیقت کا اعتراف کبھی نہ کرتا لیکن کیا وہ پانچوں گواہ بھی جھوٹ بول رہے تھے۔ ان میں سے دو بہت ہی ذمے دار پوزیشن پر کام کررہے تھے۔ وہ کیوں اس سچ کی تردید کریں گے۔

اوبرن کی سابق ایک مقامی فرم میں معاون وکیل کی حیثیت سے کام کرتی تھی۔ اس نے اس بارے میں اس کے مالکان سے مشورہ کرنے کے بارے میں سوچا لیکن پھر اس نے فیصلہ کیا کہ ایسا وہ اس وقت کرے گا جب اس پر باقاعدہ الزام عائد کیا جائے گا۔ تب تک وہ خود ہی اپنا وکیل ہے اور اسے خود ہی اپنے اوپر لگے ہوئے الزامات کو دھونا ہوگا جو غیر ذمے دارانہ رویے کے حوالے سے اس پر عائد کیے جارہے تھے۔ اس کے اختیارات سلب ہوگئے تھے اور وہ ایک عام شہری کی طرح تھا جس کے لیے پولیس معلومات کے ذریعے تک رسائی ممکن نہیں تھی۔ اس لیے اسے خود ہی اپنا پرائیویٹ سراغ رساں بھی بننا ہوگا۔

گھر پہنچ کر اس نے ایک پروگرام ترتیب دیا۔ اس نے اپنے لیے دو اصول طے کرلیے۔ پہلا یہ کہ وہ کسی بھی گواہ اور اس شخص سے ذاتی رابطہ کرنے سے گریز کرے گا جس پر اس نے گولی چلائی تھی اور دوسرا یہ کہ وہ اس تحقیقات میں اپنے دفتر کے کسی بھی ساتھی کو شامل نہیں کرے گا۔ اس پروگرام کے تحت اسے بینک میں ہونے والے واقعے کا تفصیلی منظرنامہ تیار کرنا تھا اور اس کے ساتھ ہی متاثرہ شخص کے علاوہ ان پانچوں افراد کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرنا تھیں جن کے بیانات نے اس کے کیریئر اور زندگی دونوں کو داؤ پر لگا دیا تھا۔ اس نے ان گواہوں کے بیانات دیکھنے کی درخواست کی جسے کیلٹن نے ٹھکرا دیا۔ ان کی شناخت اور بیانات کی تفصیل اس وقت تک خفیہ رکھی جائے گی جب تک کیس عدالت میں نہیں جاتا۔

لیکن مقامی ٹی وی نے اس رازداری کو برقرار رکھنے کی کوششوں کو متعلقہ افراد کے انٹرویوز کرکے ناکام بنادیا۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے بینک میں ہونے والی کارروائی کی ویڈیو بھی بار بار چلائی۔ اوبرن نے ان تمام حصوں کو بڑی احتیاط سے محفوظ کرلیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے وقوعے کے بارے میں شائع ہونے والی مختلف معلومات بھی جمع کرلیں۔ اس نے ایک فائل بنائی جس میں تمام معلومات جمع کرلی گئیں۔ اس طرح اتوار کی رات تک جو منظرنامہ تشکیل پایا، وہ کچھ یوں تھا۔

تقریباً سوا گیارہ بجے کئی مستقل گاہک تقریباً ایک ساتھ بینک میں داخل ہوئے۔ اس وقت ہیڈ کیشیئر گریگوری کولینز اسٹاف لاؤنج میں لنچ کررہا تھا جہاں سے وہ عمارت کے بقیہ حصے میں ہونے والی کوئی بھی کارروائی دیکھ اور سن نہیں سکتا تھا۔ برانچ منیجر اینڈریو جے ہانن اپنے دفتر میں اکیلا بیٹھا کسی سے ٹیلی فون پر باتیں کررہا تھا۔ دفتر کی ایک کھڑکی بینک کی لابی میں کھلتی تھی لیکن ہانن نے پرائیویسی کی غرض سے کھڑکی کا پردہ کھینچ رکھا تھا لہٰذا اسے بھی فائر ہونے تک باہر کے بارے میں کچھ خبر نہیں تھی۔

بینک میں موجود دونوں کیشیئرز گاہکوں کو نمٹانے میں مصروف تھے۔ گیری سیورن، اسمتھل شومیکر کا چیک کیش کررہا تھا جبکہ لنڈسے ڈورنس یہی خدمت ایوریٹ اسپرلنگ کے لیے انجام دے رہی تھی۔ اسپرلنگ، شومیکر، دونوں کیشیئرز اور دو دوسرے گاہکوں کے کہنے کے مطابق شومیکر کو کاؤنٹر پر رکھا ہوا پین نہیں ملا تو اسپرلنگ نے اسے اپنا پین پیش کردیا۔ اس کے فوراً بعد اسے پیچھے سے گولی لگی اور وہ وہیں ڈھیر ہوگیا۔ دونوں کیشیئرز یہ منظر دیکھ کر خوف زدہ ہوگئے اور کاؤنٹر کے عقب میں گھٹنوں کے بل جھک گئے۔ اس

کے ساتھ ہی انہوں نے الارم کا بٹن بھی دبا دیا جو سیکنڈ ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر سے منسلک تھا۔ بینک منیجر بھی اپنی کرسی سے نیچے جھک گیا اور اس نے بھی اپنے کمرے میں لگا ہوا الارم کا بٹن دبا دیا۔

کچھ دیر دوسری گولی چلنے کا انتظار کرنے کے بعد وہ کمرے کا دروازہ کھول کر باہر آیا تو اس وقت بھی دونوں کیشیئرز خوف کے مارے کاؤنٹر کے نیچے جھکے ہوئے تھے۔ ہیڈ کیشیئر گریگوری کو البتہ اس وقت تک کچھ معلوم نہیں ہوا جب تک کہ پولیس وہاں نہیں پہنچ گئی۔

اس واقعے کے بعد آنے والے بدھ کو اوبرن نفسیاتی انٹرویو کے لیے ڈاکٹر البرٹو کے دفتر میں پیش ہوا۔ اس انٹرویو کا اہتمام لانس کیلٹن نے کیا تھا۔ ڈاکٹر البرٹو ایک معروف نفسیات داں تھا اور کافی عرصے سے ملزمان کی ذہنی کیفیت جانچنے کی خدمت انجام دے رہا تھا۔ اوبرن جانتا تھا کہ اس انٹرویو کا کیا نتیجہ نکلے گا۔ وہ ڈاکٹر البرٹو کی حکمتِ عملی سے بھی واقف تھا جس کے تحت وہ ملزم کو ناراض ہونے پر اکساتا تھا تاکہ غصے میں آکر وہ اپنے جرم کا اعتراف کرلے تاہم اس نے اسے بھی ایک معمول کی کارروائی سمجھ کر برداشت کرلیا۔

اس کے لیے اخبارات میں شائع ہونے والے اداریوں اور قارئین کے خطوط کو نظر انداز کرنا آسان نہیں تھا جس میں اوبرن کے غیر ذمے دارانہ رویے اور سرکاری اسلحہ کے نامناسب استعمال پر نکتہ چینی کی جارہی تھی۔ ادھر دوسری جانب ٹی وی کی خبروں میں روزانہ اسپرلنگ کی حالت کے بارے میں عوام کو باخبر رکھا جارہا تھا۔ چوتھے روز اس کی حالت میں بہتری کے آثار نمودار ہوئے لیکن اخبارات کے مطابق وہ اب بھی خطرے سے باہر نہیں تھا۔ اس بات کا امکان تھا کہ صحت یاب ہونے کے بعد وہ اوبرن اور پبلک سیفٹی ڈپارٹمنٹ کے خلاف مقدمہ دائر کرے گا اور اگر وہ جانبر نہ ہوسکا تو یہ فریضہ شہریوں کا ایک گروپ سرانجام دے سکتا ہے۔

اوبرن کو سگریٹ اور شراب نوشی کی عادت نہیں تھی لیکن کافی کے بغیر وہ نہیں رہ سکتا تھا۔ خاص طور پر کام کے دوران کافی کا استعمال زیادہ بڑھ جاتا۔ ان دنوں اس کی یہی کیفیت تھی۔ وہ اپنے پسندیدہ مشروب کے سہارے گھنٹوں کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا رہتا۔ اس نے انٹرنیٹ سے ان پانچ گواہوں کے پتے معلوم کیے پھر پبلک ریکارڈ سے ان گھروں کے مالکان کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔

ان گواہوں میں پہلا نام گیری سیورن کا تھا۔ اس کی عمر تینتیس سال تھی اور وہ پرائیڈ سیونگز اینڈ لون میں گزشتہ سات سال سے کام کررہا تھا۔ وہ فونیکس ڈسٹرکٹ کے ایک اپارٹمنٹ میں تنہا رہتا تھا۔ اس کے مشاغل میں رگبی، کک باکسنگ اور کھانا پکانا شامل تھے۔ اوبرن نے اس کے انٹرویو کی ریڈیو ٹیپ چلا کر دیکھی۔ دیکھنے میں وہ غیر مہذب اور گستاخ نظر آرہا تھا اور اس کی باتوں میں بھی اس کی شخصیت کی جھلک نظر آرہی تھی۔

دوسری گواہ لنڈسے ڈورنس کی عمر پچیس سال تھی۔ اس کی چھوٹی عمر میں شادی ہوگئی تھی جو نا کام رہی۔ اس کے بعد سے وہ اپنے والدین کے ساتھ رہ رہی تھی۔ اس نے فنانس میں ڈگری حاصل کر رکھی تھی اور بینک میں لون آفیسر کے عہدے پر فائز تھی۔ اس کے مشاغل میں رومانی کتابیں پڑھنا، کوہ پیمائی اور واٹر اسپورٹس شامل تھے۔ اختتامِ ہفتہ وہ بے گھر افراد کے ہوسٹل میں جا کر بستر درست کرتی اور کھانا بناتی۔

ایوریٹ اسپرلنگ اور وہ تینوں عورتیں جنہوں نے حلفیہ بیان دیا تھا کہ اسپرلنگ نے گیری سیورن پر پستول نہیں نکالا، وہ سب بریڈن کی رہائشی تھیں اور وہ سب ایک ساتھ اس قصبے میں نوادرات کی خریداری کرتے آتے تھے۔ اس لیے شبہ کیا جاسکتا تھا کہ وہ سب مل کر جھوٹ بول رہے تھے۔ کئی روز تک اوبرن اس خیال سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ دونوں کیشیئر اور بریڈن سے آئے ہوئے چاروں افراد بینک لوٹنے کی سازش میں ملوث تھے جو اس کی مداخلت سے ناکام ہوگئی۔ بظاہر یہ ایک بعید از قیاس تصور تھا لیکن اگر اسے ثابت کردیا جائے تو اس کی تمام مشکلات ختم ہوجائیں گی۔

پولیس والوں کو بھی یقیناً یہ شبہ نہیں ہوا ہوگا کہ وہ مجرموں کے گروہ سے باتیں کررہے ہیں۔ انہوں نے ان لوگوں کے تحریری بیانات حاصل کرنے سے پہلے ان سے کچھ سوالات بھی کیے تھے اور اس طرح انہیں موقع مل گیا کہ وہ اوبرن کے دعوے کو جھٹلا سکیں۔ ان سب نے اپنے بیانات میں ایک ہی بات کہی کہ اسپرلنگ کے ہاتھ میں ہتھیار نہیں بلکہ پین تھا۔ جہاں تک ہتھیار کا تعلق ہے تو غالباً اسے کسی عورت کے شاپنگ بیگ میں چھپا دیا گیا ہوگا جس کی تلاشی لینے کا کسی کو موقع پر خیال نہیں آیا اور جب اسپرلنگ آپریشن کے بعد ہوش میں آیا تو ان میں سے کم از کم ایک عورت اس کے پاس یہ سمجھانے کے لیے موجود ہوگی کہ اسے پولیس کو کیا بیان دینا ہے۔

اوبرن کی تصویریں تمام اخبارات اور ٹی وی پر آچکی تھیں لہٰذا باہر نکلتے وقت اسے اپنے حلیے میں تبدیلی کرنا

پڑی۔ وہ آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ اور سر پر ٹوپی لگا کر نکلا تاکہ کوئی اسے آسانی سے نہ پہچان سکے۔ پبلک لائبریری میں دو طویل سیشن گزارنے کے بعد وہ ان چاروں گواہوں کے بارے میں مکمل تفصیلات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا جس میں ان کے سابقہ پتے، گزشتہ دہائیوں میں ہونے والی سرگرمیاں، شادی اور ملازمت کی تفصیلات اور گھر کے دیگر افراد کے بارے میں معلومات شامل تھیں۔

تہتر سالہ ایوریٹ اسپرلنگ ایک کمپنی کا مالک تھا جو بنی بنائی کھڑکیاں اور دروازے نصب کیا کرتی تھی۔ یہ کمپنی اسے اپنے بھائی سے ورثے میں ملی تھی جس کا انتقال ہو چکا تھا۔ گو کہ وہ عملی طور پر اس کاروبار میں شامل نہیں تھا لیکن اسے وہاں سے معقول آمدنی ہو رہی تھی۔ دیگر تینوں عورتیں اڑسٹھ سالہ ہیرینا ہیلن، اکہتر سالہ میری روز اور چوہتر سالہ اتھل شومیکر، بیوہ تھیں اور بریڈان میں ہی رہائش پذیر تھیں۔

اوبرن کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ بوڑھے لوگوں کا یہ گروپ کسی بینک کو لوٹنے کی منصوبہ بندی کر سکتا ہے لیکن اخبار میں شائع ہونے والی ایک خبر نے اسے چونکا دیا۔ گزشتہ چند روز سے وہ تمام اخبارات کا باقاعدگی سے مطالعہ کر رہا تھا۔ اس واقعے کے ایک ہفتے بعد مقامی اخبار میں خبر شائع ہوئی کہ کیلو آؤٹ لیٹ مال کی انتظامیہ نے رپورٹ درج کرائی ہے کہ ان کی کچھ دکانوں میں چوری کی وارداتیں اچانک بڑھ گئی ہیں۔ اسٹاک کا جائزہ لینے پر معلوم ہوا کہ کئی اشیا غائب ہیں جن میں ہاتھ سے رنگے ہوئے پورسلین کے مجسمے، چاندی کے شمع دان، چمڑے کی بنی ہوئی اشیا اور ایسی دیگر چیزیں شامل ہیں جنہیں بآسانی پرس یا ہینڈ بیگ میں رکھ کر لے جایا جا سکتا ہے۔ رپورٹ میں حیرت ظاہر کی گئی تھی کہ ویڈیو کیمروں، سیکیورٹی تنصیبات اور سادہ لباس میں سیکیورٹی اہلکاروں کے ہوتے ہوئے ان اشیا کے غائب ہونے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ پیشہ ور چوروں کا کارنامہ ہے جو غالباً گروپ کی شکل میں کام کرتے ہیں۔

آخری پیراگراف پڑھ کر اوبرن کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا جس میں شبہ ظاہر کیا گیا تھا کہ ان میں سے کچھ گروپ خود کو شاپنگ ٹور کا ممبر ظاہر کرتے ہیں۔

وہ اپنی ڈائننگ ٹیبل پر گیا جس پر اخبارات کے تراشے فائلوں میں رکھے ہوئے تھے۔ اس کی نظر اخبار میں شائع ہونے والی ایک تصویر پر گئی جس میں کیپٹل ٹرانسپورٹیشن کمپنی کی ایک بس بینک کے برابر والے فاسٹ فوڈ ریسٹوران کے باہر کھڑی ہوئی تھی۔ یہ کمپنی سات مختلف شہروں میں ہلکے اور درمیانے ٹرک، اسکول بس، معذوروں کے لیے ویَن اور ٹور بس کرائے پر چلاتی تھی۔ اوبرن نے کمپنی کی مقامی برانچ کو فون کیا اور اپنے آپ کو اسٹیٹ ہائی وے پیٹرول کا افسر ظاہر کر کے مذکورہ بس کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ اسے بتایا گیا کہ یہ بس موریل لیس ویڈ نے پورے دن کے لیے بک کروائی تھی۔ البتہ اس بس کے لیے اس نے اپنے ڈرائیور جارج میک رائیڈ کو ترجیح دی جس کے لائسنس کی نقل دفتر کے ریکارڈ میں محفوظ تھی اور کسی روز بھی دفتری اوقات میں اسے دیکھا جا سکتا تھا۔

اگلے پندرہ منٹ میں اس نے لیس ویڈ اور میک رائیڈ کے بارے میں تفصیلی معلومات جمع کرنا شروع کر دیں۔ کاؤنٹی کی مقامی لائبریری میں ان دونوں کے بارے میں برائے نام ہی تفصیل مل سکی جبکہ وہ ان تمام لوگوں کے بارے میں گہری ریسرچ کرنا چاہتا تھا چنانچہ وہ مزید وقت ضائع کرنے کے بجائے بریڈان روانہ ہو گیا جہاں کے ریکارڈ آفس سے اسے مطلوبہ معلومات ملنے کی امید تھی۔ وہاں موجود کلرک دیکھنے میں ہائی اسکول کا طالب علم لگتا تھا۔ اس نے اوبرن کو بتایا کہ اسے مقامی اخبار کے دفتر جانا ہوگا۔ شاید اس کی پرانی فائلیں کھنگالنے سے اسے مطلوبہ معلومات مل جائیں۔ اس اخبار میں زیادہ تر خبریں اور مضامین زرعی سرگرمیوں سے متعلق تھے۔ اس نے اتوار کے ایڈیشن کھنگالنے شروع کیے جن میں سوسائٹی اور چرچ سے متعلق صفحات شامل کیے جاتے تھے۔ ان صفحات کا باریک بینی سے جائزہ لینے کے بعد صرف یہ معلوم ہو سکا کہ ہیرینا ہیلن ایک ریٹائرڈ اسکول ٹیچر تھی جو گزشتہ موسم خزاں میں کاؤنٹی بورڈ آف ایجوکیشن کے لیے دوبارہ منتخب ہوئی جبکہ مارچ میں اسپرلنگ نے خرابیٔ صحت کی بنا پر بزنس منیجر کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ ہیلن اور شومیکر دونوں ہی چار جولائی کی تقریب منانے کی منصوبہ بندی میں شامل تھیں۔

تاہم اوبرن کو ان صفحات میں دو ہفتے پہلے ہونے والے اس ٹور کے بارے میں کوئی خبر نظر نہیں آئی جس میں ان سب لوگوں نے شرکت کی تھی۔ قصبے کے واحد اخبار میں اس خبر کی عدم اشاعت سے اوبرن کے اس شبے کو تقویت ملی کہ اس ٹور میں عام لوگوں کو شامل کرنے سے غالباً اس لیے احتراز کیا گیا کیونکہ یہ ذاتی کاروباری مہم تھی جس میں جرم کا پہلو پوشیدہ تھا۔

اس ٹور کی منتظم موریل لیس ویڈ، ریڈنگ بائیک میں ایک چھوٹے سے پھلوں کے فارم کی مالک تھی جہاں وہ دکھاوے کے لیے تنہا رہتی تھی۔ نہ جانے اوبرن کو یہ نام کچھ جانا پہچانا لگ رہا تھا۔ اس نے یادداشت پر زور دیا لیکن کچھ یاد نہ آیا۔ رات کو بستر پر لیٹتے وقت بھی اس کے ذہن میں یہی نام گھوم رہا تھا۔ پھر نصف شب کے قریب اس کی آنکھ کھل گئی اور بالکل اچانک اس کے ذہن کے پردے پر میریم لیک میڈ کا نام روشن ہو گیا۔ اسے یاد آیا کہ گیارہ سال قبل اس نے ایک ایسے گروہ کے خلاف تحقیقات میں حصہ لیا تھا جو پوری ریاست میں بوڑھے اور ریٹائرڈ لوگوں کو فریب دہی کے ذریعے لوٹنے میں مصروف تھا۔ اس گروہ کے کرتا دھرتا گرینگر فوسٹر اور اس کی سوتیلی بہن میریم لیک میڈ ایک آپریشن کے نتیجے میں گرفتار ہوئے اور انہیں کئی سال کی سزا سنائی گئی۔ اوبرن کو یاد آ گیا کہ لیک میڈ ایک زبان دراز اور مردانہ صفات رکھنے والی لڑاکا عورت تھی جس کی بھویں گھنی اور ناک طوطے کی چونچ کی طرح مڑی ہوئی تھی۔

میریم لیک میڈ اور موریل لیس ویڈ یہ دونوں نام کافی ملتے جلتے تھے جس سے اوبرن کو شبہ ہوا کہ کہیں یہ ایک ہی شخص کے نام تو نہیں اور اس بات کے ذہن میں آتے ہی وہ بے چین ہو گیا۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ لیک میڈ اپنی سزا پوری کرنے کے بعد اس دیہاتی علاقے میں رہائش پذیر ہو گئی ہو اور اس نے ایک نئے نام سے اپنی مجرمانہ سرگرمیاں دوبارہ شروع کر دی ہوں۔ جیل سے باہر آنے کے بعد وہ قانونی طور پر اپنا نام تبدیل کر سکتی تھی۔

صبح آٹھ بجے اوبرن دوربین اور کیمرے سمیت ریڈنگ بائیک کے لیے روانہ ہو گیا۔ لیس ویڈ کا احاطہ ایک سفید کاٹیج اور پھلوں کے فارم پر مشتمل تھا جس کے سامنے سڑک کے ساتھ تقریباً نصف درجن کاریں کھڑی کرنے کی گنجائش تھی۔ جب اوبرن وہاں سے گزرا تو اس وقت پارکنگ میں کوئی کار موجود نہیں تھی اور نہ ہی فارم کے بیرونی حصے میں واقع اسٹال پر کوئی شخص موجود تھا لیکن ٹماٹر، بلیک بیری، خربوزہ اور دیگر اشیا پر ہاتھ سے لکھی ہوئی قیمتیں آویزاں تھیں جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ پھلوں اور سبزیوں کی فروخت شروع ہو چکی ہے۔ اوبرن نے ایک یوٹرن لیا اور کار اس جگہ سے بیس گز کے فاصلے پر مشرق میں کھڑی کر دی اور خود کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔

دو گھنٹے بعد پہلی کار اسٹینڈ کے پاس آ کر رکی۔ ہارن کی آواز پر ایک فربہ اندام عورت ڈھیلے ڈھالے لباس میں فارم سے باہر آئی اور اسٹال کی جانب بڑھ گئی۔ اوبرن نے دوربین کے ذریعے پہلی ہی نظر میں اندازہ لگا لیا کہ یہ عورت بلاشبہ میریم لیک میڈ ہے۔ اس نے اپنے طاقتور کیمرے کی

مدد سے اس کی کئی تصویریں لے ڈالیں۔ اگلے روز صبح ساڑھے تین بجے کے قریب وہ انٹرنیٹ پر ایک ویب سائٹ دیکھ رہا تھا۔ اس میں نقب زنی، ڈاکے، جسمانی تشدد، بینک ڈکیتی اور زخمی کرنے کے واقعات سے متعلق ہزاروں ویڈیو کلپس موجود تھیں۔ اوبرن اس ویب سائٹ کو باقاعدگی سے دیکھنے لگا تھا۔ شاید اسے ایک موہوم سی امید تھی کہ وہ کبھی چیلز پرائیڈ سیونگز اینڈ لون میں ہونے والے واقعے کی ویڈیو بھی دیکھ پائے گا جس تک لانس کیلٹن نے اس کی رسائی نہیں ہونے دی تھی۔ اسی کوشش کے دوران اس نے ایک بلیک اینڈ وائٹ ویڈیو کلک کی اور اس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ اس کے سامنے اسکرین پر ایک ناقابلِ یقین منظر چل رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ کیلکس لگائے ہوئے ایک اوسط عمر کے تیم تیم شخص نے ہینڈ گن نکالی اور کاؤنٹر پر بیٹھے شخص کو نشانہ بنایا۔

اوبرن نے اس ویڈیو کو ایک دو نہیں بلکہ کئی مرتبہ دیکھا اور اسے یقین ہو گیا کہ ویڈیو میں نظر آنے والا شخص ایوریٹ اسپرلنگ ہی ہے۔ اس کے کیلکس، بھاری بھر کم کندھے، گول سر، موٹی گردن اور سب سے بڑھ کر وائیں بازو کو حرکت دینے کا انداز سو فیصد اس شخص سے مشابہ تھا جس پر دو ہفتے قبل اس نے بینک میں گولی چلائی تھی۔ یہ ویڈیو سات سال پہلے انا برگ کے فرسٹ فیڈرل بینک ٹرسٹ کمپنی میں ریکارڈ کی گئی تھی جو یہاں سے پچھتر میل کے فاصلے پر تھا۔ اسے یہ واقعہ اچھی طرح یاد تھا۔ کیشیئر کے دل میں گولی لگی اور وہ موقع پر ہی ہلاک ہو گیا جبکہ ڈاکو تیس ہزار ڈالر لوٹ کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اسے یاد آ گیا کہ اس وقت یہ ویڈیو نیٹ ورک ٹی وی نیوز پروگرام میں بار بار چلائی گئی تھی۔

وہ ڈاکو اور قاتل کبھی نہیں پکڑا گیا لیکن پولیس آلۂ قتل اور اس پلاسٹک کے تھیلے سے اس کی انگلیوں کے نشانات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی جس میں وہ رقم لے کر گیا تھا۔ اس نے جائے واردات سے نکلتے ہی ان دونوں چیزوں سے چھٹکارا حاصل کر لیا تھا۔ اس واقعے کے یاد آتے ہی اوبرن نے اس کے بارے میں دوسری ویب سائٹس سے مزید معلومات حاصل کرنا شروع کر دیں۔ یہ واقعہ جمعے کی سہ پہر رونما ہوا تھا جب کیشیئر والٹ میں رکھی ایک بڑی رقم کاؤنٹر پر رکھ کر اس کی گنتی کر رہا تھا جبکہ اوبرن کا واقعہ جمعے کی صبح گیارہ بج کر بیس منٹ پر ہوا تھا۔

بینک میں موجود وقوعہ کے گواہوں نے ڈاکو کے گن نکالنے تک اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔ کوئی بھی یہ نہ جان سکا کہ رقم لوٹنے کے بعد ڈاکو نے فرار ہونے سے پہلے کیشیئر پر گولی کیوں چلائی۔ شاید اسے یقین ہو گیا تھا کہ کیشیئر میکس پریویٹ الارم کا بٹن دبانے والا تھا لیکن ویڈیو یا برابر میں بیٹھے ہوئے کیشیئر کے مشاہدے میں ایسی کوئی بات نہیں آئی۔ اس نے ایک بار پھر اپنے ذہن میں دو ہفتے قبل پیش ہونے والے واقعے کو تازہ کرنے کی کوشش کی۔ ایوریٹ اسپرلنگ، لنڈسے ڈورلس کی کھڑکی کے پاس کھڑا ہوا تھا لیکن اوبرن کو یقین تھا کہ اس نے برابر میں بیٹھے ہوئے دوسرے کیشیئر گیری سیورن کو نشانہ بنانے کی کوشش کی جبکہ اسپرلنگ نے ڈورلس سے رقم دینے کا مطالبہ کیا تھا اور اس کی بات نہ ماننے کی صورت میں جسمانی طور پر نقصان پہنچانے کی دھمکی دی تھی لیکن ایسا لگتا ہے کہ گیری سیورن نے اس کی حرکت دیکھ کر اسے مشتعل کرنے کی کوشش کی اور اسپرلنگ نے اس پر ریوالور تان لیا۔

اس کے بعد گیری کو اپنی غلطی کا احساس ہوا ہوگا کیونکہ بینک میں کام کرنے والوں کو یہ ہدایات ہیں کہ وہ کسی بھی صورت میں ڈاکوؤں کو مشتعل کرنے کی کوشش نہ کریں جس کے نتیجے میں کسی انسانی جان کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو۔ چنانچہ گیری نے اپنا کیریئر بچانے کے لیے وہی کچھ کہہ دیا جو اسپرلنگ اور بینک میں موجود دیگر خواتین کہہ رہی تھیں، یعنی اسپرلنگ کے ہاتھ میں پستول نہیں بلکہ چین تھا۔ اس نے ڈورلس کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا کہ وہ بھی اپنے بیان میں یہی بات کہے۔

اس واقعے کو تین ہفتے گزر چکے تھے اور اخبارات میں اس کا ذکر تقریباً ختم ہو چکا تھا جبکہ اسپرلنگ بھی اسپتال سے ڈسچارج ہو کر گھر آ گیا تھا لیکن اوبرن کی مشکلات ختم نہیں ہوئی تھیں اور وہ ابھی تک معطل تھا اور اسے افسرانِ بالا کی طرف سے ایسا کوئی اشارہ نہیں ملا تھا کہ اس کے کیس کا فیصلہ جلد متوقع ہے۔ دن گزرنے کے ساتھ وہ اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ اسے اپنے آپ کو اس حال سے نکالنے کے لیے خود ہی کچھ کرنا ہوگا۔

اس نے ایک نئے عزم کے ساتھ جدوجہد کرنے کا فیصلہ کیا۔ دوسری صبح بیدار ہونے کے بعد اس نے غسل کیا اور ناشتا کر کے ڈاک خانے کی جانب چل دیا۔ اس نے ایک مہینے کے لیے پوسٹ بکس نمبر کرائے پر لیا اور واپسی میں فوٹو گرافی میں استعمال ہونے والے کاغذ کا ایک پیکٹ خرید کر گھر آ گیا۔ اس نے کسی اخبار میں ایوریٹ اسپرلنگ کا بیان پڑھا تھا کہ وہ ہمیشہ سے ہی ہوائی سفر کرنے سے ڈرتا ہے اور اسی وجہ سے اس کے گھومنے کا شوق بری طرح متاثر ہوا ہے۔ اوبرن نے پورے دن کی محنت کے بعد ایک ایسی ٹریول

ایجنسی کا خاکہ تیار کیا جس کا بظاہر کوئی وجود نہیں تھا لیکن وہ بزرگ شہریوں کے لیے ہوائی سفر کے بغیر سیاحتی دوروں کا اہتمام کرتی تھی۔ اس کمپنی کی پالیسی میں یہ بھی شامل تھا کہ جو لوگ باقاعدگی سے اس کا بلیٹن وصول کرتے رہیں گے، وہ ایک دس روزہ ٹرپ جیتنے کے حق دار ہوں گے اور امریکا کی اڑتالیس ریاستوں میں سے کسی بھی تین مقامات کی مفت سیر کر سکیں گے۔ اس نے ایک مضمون تیار کیا اور انٹرنیٹ سے چند تفریحی مقامات کی تصویریں ڈاؤن لوڈ کر کے فوٹو گرافک پیپر پر ان کا پرنٹ نکال لیا۔ البتہ اس نے یہ احتیاط ضرور رکھی کہ کاغذ کا پیکٹ کھولنے سے پہلے ہاتھوں پر دستانے چڑھا لیے پھر اس نے یہ سارا لٹریچر ایک لفافے میں بند کیا اور ٹکٹ لگے ہوئے واپسی لفافے کے ساتھ ایوریٹ اسپرلنگ کے پتے پر پوسٹ کر دیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ دس دن بعد پوسٹ بکس کھول کر ڈاک چیک کرے گا۔

اس دوران اوبرن نے کیس کے دوسرے پہلوؤں پر کام جاری رکھا۔ وہ جانتا تھا کہ جارج میک رائیڈز، بس چلانے کے علاوہ فرصت کے اوقات میں بریڈن کی واحد اشیا رہن رکھنے والی دکان پر بھی بیٹھتا ہے۔ اس دیہاتی علاقے میں ایسی دکان کی موجودگی تعجب خیز تھی لیکن شاید یہ شہر میں لوٹ مار کرنے والوں کے لیے ایک مثالی جگہ تھی۔ اوبرن نے کیلو آؤٹ لیٹ مال کے بھی کئی چکر لگائے اور اپنے سیل فون کے ذریعے دکانوں میں رکھی ہوئی ان اشیا کی بے شمار تصویریں بنا لیں جو بہ آسانی لے جائی جا سکتی تھیں۔ اپنے کمپیوٹر اسکرین پر ان تصویروں کا بغور جائزہ لینے کے بعد اس نے میک رائیڈز کی دکان کا بھی چکر لگایا اور وہاں کی بھی کئی تصویریں اتاریں۔

پہلی بار پوسٹ بکس کو کھولتے ہوئے اسے یوں لگا جیسے وہ کسی بم کو ناکارہ بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ ایوریٹ اسپرلنگ کا لفافہ ملتے ہی اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے اور وہ خوشی کے عالم میں ہاتھوں پر دستانے چڑھانا بھول گیا۔ فوراً ہی اسے غلطی کا احساس ہو گیا اور اس نے لفافہ ہاتھ میں پکڑنے سے پہلے ہاتھوں پر دستانے پہن لیے اور گھر کی طرف دوڑ پڑا۔ گو کہ انگلیوں کے نشانات تلاش کرنا اور انہیں ریکارڈ کرنا سرکاری طور پر تفتیشی ٹیکنیشنز کا کام ہے لیکن اوبرن نے بھی اس کی تربیت حاصل کر رکھی تھی اور اس کے پاس یہ عمل کرنے کے لیے ضروری ساز و سامان موجود تھا۔ صرف پندرہ منٹ بعد وہ اسپرلنگ کی تین انگلیوں کے نشانات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

قابلِ دید

ایک لڑکی نے اپنی سہیلی سے کہا۔ ”کل میں بس اسٹاپ پر کھڑی تھی کہ ایک خوبرو اجنبی نوجوان میرے پاس آیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھ سے اظہارِ محبت کرنے لگا۔“

”ہائے اللہ! تم نے اسے ڈانٹا نہیں، خاموش ہونے کے لیے نہیں کہا؟“ سہیلی نے حیران ہو کر پوچھا۔

”تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ امی نے مجھے اجنبی لڑکوں سے بات کرنے سے سختی سے منع کیا ہوا ہے۔“ لڑکی نے کہا۔

فی الحال یہ ثابت کرنا مشکل تھا کہ ایوریٹ اسپرلنگ ہی وہ شخص تھا جس نے سات سال پہلے ایک بینک لوٹا اور کیشیئر کو قتل کر کے فرار ہو گیا اور اب ایک ماہ قبل اس نے ایسی ہی کوشش دوبارہ کی تاہم اس سے اوبرن کے موقف کی معقولیت کا جواز بن رہا تھا کیونکہ انا برگ میں واقع بینک، فیڈرل ریزرو سسٹم کا ممبر تھا لہٰذا یہ کیس بھی ایف بی آئی کے دائرۂ اختیار میں آتا تھا اور ان کی فائلوں میں یہ معاملہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ یہ جان کر اوبرن نے اطمینان کا سانس لیا کہ اس مرتبہ اس کا واسطہ مقامی پبلک سیفٹی آفیسرز کے بجائے ایف بی آئی کے افسران سے پڑے گا۔ ایک معروف شخصیت کی بدولت وہ ایف بی آئی کے اعلیٰ افسر سے اگلے روز ملاقات کا وقت لینے میں کامیاب ہو گیا۔

جب ایف بی آئی کے تحقیقاتی افسر نے اوبرن کے لائے ہوئے فنگر پرنٹس کا موازنہ انا برگ کے بینک لوٹنے والے قاتل کی انگلیوں کے نشانات سے کیا تو شک کی کوئی گنجائش نہ رہی اور چوبیس گھنٹوں کے اندر ایوریٹ اسپرلنگ جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچ چکا تھا۔ عدالت نے اس کی ضمانت کی درخواست منظور نہیں کی۔ اس پر بینک ڈکیتی اور قتل جیسے سنگین الزامات تھے اور اب اسے اپنا مقدمہ شروع ہونے کا انتظار کرنا تھا۔

کورٹ ریکارڈ سے تصدیق ہو گئی کہ میریم لیک میڈ کا نام تبدیل کرنا قانونی تھا اور سیورل لیس وہیڈ کا نام اختیار کرنے کی مجاز ہے لیکن اوبرن کے اس نظریے کو ہیڈ کوارٹر میں سرد مہری سے سنا گیا کہ لیس وہیڈ اور میک رائیڈز نے ہی

جولائی نے اس جتھے کو کیلو مال پر حملے کی منصوبہ بندی کی تھی۔ ان کے خلاف کوئی سرکاری تحقیقات نہیں ہوئی۔ اسی طرح بریڈن سے تعلق رکھنے والے گواہوں کے بیانات کی صداقت کو بھی کسی نے چیلنج نہیں کیا اور نہ ہی ان میں سے کسی نے اپنا بیان تبدیل کیا۔

اوبرن کے مستقبل پر بدستور غیر یقینی کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ اس پر اب بھی جلد بازی سے کام لینے اور نامناسب تشدد کا شبہ ظاہر کیا جا رہا تھا۔ بالآخر لنڈسے ڈورنس نے اپنے ضمیر کی آواز پر عمل کرتے ہوئے زبان کھول دی۔ اس نے اپنے حلفیہ بیان میں انکشاف کیا کہ ایوریٹ اسپرلنگ اپنے ساتھیوں کے ساتھ بینک میں داخل ہوا اور اسے حکم دیا کہ وہ تمام کیش ایک تھیلے میں بھر کر اس کے حوالے کر دے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ مسلح ہے اور ضرورت پڑنے پر ہتھیار استعمال کر سکتا ہے کیونکہ وہ خود اونچا سنتا ہے اس لیے بہ آواز بلند بول رہا تھا۔ برابر میں بیٹھے ہوئے دوسرے کیشیئر گیری سیوبرن نے یہ دھمکی سن لی اور چیلنج کیا کہ وہ ہتھیار نکال کر دکھائے۔ اس کے بعد اس نے وہی کچھ بتایا جو اوبرن اپنے متعدد بیانات میں کہہ چکا تھا۔

اوبرن نے سیکسن پریوٹ کے قاتل کو انصاف کے کٹہرے میں لا کر جو کارنامہ انجام دیا تھا اسے عوام کی جانب سے خلاف توقع کم پذیرائی ملی۔ عام خیال یہ تھا کہ اس نے یہ سب صرف اپنے آپ کو بچانے کے لیے کیا تھا اور یہ اس کا کام نہیں تھا کہ وہ بے ایمان لوگوں کو پکڑے۔ کسی کو یہ خیال نہیں آیا کہ تحقیقات کے دوران وہ تمام اختیارات سے محروم ہو گیا تھا اور قانون نافذ کرنے والے ذرائع تک اس کی رسائی ممکن نہیں تھی۔ یہاں تک کہ معطل ہونے کے دو ہفتے بعد اس کی تنخواہ بھی روک لی گئی تھی اور اب اسے اس کی وصولی کے لیے محتسب سے رجوع کرنا تھا۔

ڈیوٹی پر واپس آنے کے پہلے روز ہی اسے سروس ریوالور واپس مل گیا۔ بیلاسٹک لیبارٹری والوں نے ریوالور میں موجود بقیہ پانچ گولیاں نکال کر انہیں پلاسٹک کی تھیلی میں رکھ کر ایک تار کے ذریعے ٹریگر سے باندھ دیا۔ ریوالور کی صفائی کرنے اور اس میں دوبارہ گولیاں بھرنے کے بعد اوبرن کو لگا کہ اس کا ڈراؤنا خواب ختم ہو گیا ہے۔ حقائق سامنے آ گئے اور ان کی تصدیق بھی ہو گئی۔ مجرم کیفر کردار کو پہنچ گیا اور ایک ذمے دار شہری اور سرکاری ملازم کے طور پر اوبرن کی حیثیت بحال ہو گئی۔

گو کہ اس کارنامے کے بعد اسے قصبے کا بہترین پولیس افسر تسلیم کر لیا گیا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اپنے آپ کو نفسیاتی طور پر کمزور سمجھنے لگا۔ اس کی روح پر جو زخم لگ گئے تھے انہیں بھرنے میں وقت لگ سکتا تھا۔ لوگوں کے طعنوں اور تنقید نے اسے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ اگر وہ جلد بازی سے گریز کرتے ہوئے اسپرلنگ پر گولی نہ چلاتا تو نہ وہ زخمی ہوتا اور نہ ہی اس کا ڈھیروں خون ضائع ہوتا۔

اخبارات نے ایوریٹ اسپرلنگ کو بے گناہ ثابت کرنے میں پورا زور لگا دیا تھا اور اب قصبے کے ہر فرد کو معلوم ہو گیا تھا کہ اسپتال والوں نے اس کی جان بچانے کے لیے پانچ بوتل خون چڑھایا تھا۔ ایک چھوٹے قصبے کے اسپتال کے لیے یہ ایک بڑا نقصان تھا کیونکہ قصبے میں خون کا عطیہ دینے والوں کی تعداد بہت کم تھی اور اسپتال میں خون کی کمی سے دوسرے مریضوں کے علاج میں مشکل پیش آ سکتی تھی۔

اوبرن خود کو اس نقصان کا ذمے دار سمجھتا تھا چنانچہ ایک روز کھانے کے وقفے کے دوران وہ اسپتال پہنچ گیا اور اس نے اسپرلنگ کے نام پر ایک بوتل خون کا عطیہ دے دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ایک اور بوتل عطیہ کرنے کے لیے چھ ہفتے بعد کا وقت لے لیا۔ اب اس کا ضمیر مطمئن تھا کہ اسپرلنگ کا خون بہا کر اس نے جو نقصان کیا تھا، اس کی تلافی ہو گئی تھی۔

اوبرن ان عورتوں کو بھی شریک جرم سمجھتا تھا جو اسپرلنگ کے ساتھ بینک میں داخل ہوئیں اور ان میں سے کسی ایک نے اس کا ریوالور اپنے شاپنگ بیگ میں چھپا لیا پھر سب نے اسپرلنگ کو بچانے کے لیے یہی بیان دیا کہ انہوں نے اس کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار نہیں دیکھا تھا۔ بظاہر یہی لگتا تھا کہ ایف بی آئی والے، اسپرلنگ کو سات سال پہلے ہونے والی بینک ڈکیتی اور قتل کا مجرم ہی سمجھ رہے تھے اور انہوں نے ان لوگوں کی حالیہ کوشش کو نظر انداز کر دیا تھا۔ شاید یہ واقعہ ان کے دائرۂ اختیار میں نہ آتا ہو اور ان کے خیال میں مقامی پولیس کو اس کیس کی تفتیش کرنی چاہیے تھی جبکہ مقامی پولیس کی نظر میں اصل مجرم ایوریٹ اسپرلنگ کی گرفتاری کے بعد یہ معاملہ ختم ہو گیا تھا اور وہ اپنے افسر کی بحالی پر مطمئن تھی۔

اسی طرح اوبرن کو بھی کیا ضرورت پڑی تھی کہ وہ ان بھول بھلیوں میں اپنا سر کھپاتا۔ اس کے لیے یہی بہت تھا کہ وہ اپنے موقف کی سچائی ثابت کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اس کی نظر میں قتل کے الزام میں اسپرلنگ کی گرفتاری ایک بونس کی حیثیت رکھتی تھی۔ البتہ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اگلے ایک سال تک نئی کار نہیں خریدے گا۔
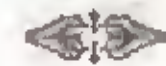
ذمّے دار

آصف ملک

غیر ذمّے دار رویے ہی مسائل کو جنم دیتے ہیں۔ اس گھر میں بھی ایک سے بڑھ کے ایک غیر ذمے دار موجود تھا... ماں... باپ... بہن اور بھائی... اور وہ خود... مگر وہ بھی کیا کرتا... جیسے ہی وہ کچھ اچھا کرنے کی کوشش کرتا... سب کچھ غلط ہو جاتا... مسائل میں گھرے ایک ایسے ہی خاندان کی سبق آموز کہانی... جب والدین اپنی ذمّے داریوں کو احسن طریقے سے انجام نہیں دے پاتے تو اس کا سارا بوجھ اولاد کے ناتواں کندھوں پر آجاتا ہے... جرم کی سنگینی... مزاح اور شگفتگی کا عنصر لیے ایک ذمّے دار تحریر...

پہلی سنجیدہ کوشش جو خاندان بھر کے لیے کامیابی کی کنجی ثابت ہوئی...

جیکی ویل کے لیے عمر کا سترھواں سال مشکلات لے کر آیا تھا۔ سولہ سال تک وہ بہت خوش، مطمئن اور مگن رہنے والا لڑکا تھا۔ مگر اس سال اسے لگا کہ بہت کچھ بدل گیا ہے۔ وہ بچہ نہیں رہا ہے۔ وہ جس گھر میں رہتا ہے اس میں بہت سارے مسئلے مسائل تھے اور وہ ان کا ایک حصہ تھا۔ ہائی اسکول کا آخری سال تھا اور اس کے بعد اسے اپنے کیریئر کا سوچنا تھا۔ جمی سے بڑے مارٹی کو تعلیم سے دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے بہ مشکل اسکول تک پڑھا اور آج کل وہ باڈی بلڈنگ

کے چکر میں رہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح اسے شو بزنس میں موقع مل جائے گا۔ اس سے چھوٹی نینسی دو سال پہلے ہائی اسکول پاس کر چکی تھی۔ اس نے بہت اچھے مارکس لیے تھے مگر یہ اسٹین فورڈ یونیورسٹی میں داخلے کے لیے ناکافی تھے۔ وہ تب سے ہر چھ مہینے بعد داخلے کا امتحان دے رہی تھی اور باقاعدگی سے ناکام ہو رہی تھی۔ مسلسل ناکامیوں سے دل برداشتہ ہو کر اس نے ایک بار میں ویٹریس کی جاب کر لی تھی۔

ان کی ماں لوسی کا مسئلہ حد سے زیادہ شراب نوشی تھا۔ وہ صبح سے پینا شروع کرتی اور عام طور سے سونے کے لیے بستر پر جانے تک پیتی رہتی تھی۔ شراب نوشی سے جو وقت بچتا تھا وہ سگریٹ نوشی کرتی اور اس سے بھی وقت بچ جاتا تو بچوں کو سناتی تھی کہ اپنے باپ کی طرح انہیں اپنی ماں کی بھی پروا نہیں تھی۔ ریمس ویل ایک کامیاب تاجر مگر ناکام شوہر اور اس سے بھی زیادہ ناکام باپ تھا۔ اسے اپنے بزنس سے ہٹ کر اگر کسی چیز سے دلچسپی تھی تو وہ لڑکیاں تھیں جو سو دو سو ڈالرز کے عوض بے حساب مل جاتی تھیں اور اس کام کے لیے اس کے پاس ڈالرز کی کوئی کمی نہیں تھی۔ ریمس امریکی کارخانوں میں بننے والی ذرا نقص والی الیکٹرانکس مصنوعات خرید کر یورپ سپلائی کرتا تھا جہاں ان کی بہت مانگ تھی۔ اس کام میں منافع اچھا تھا اور وہ خوب کما رہا تھا مگر اس نے اپنی اولاد سے کہہ دیا تھا کہ وہ صرف اسکول کی حد تک ان کی تعلیم کے اخراجات برداشت کرے گا اور اس کے بعد وہ اپنی تعلیم خود حاصل کریں۔

اس لیے نینسی اب بار میں کام کر کے اسٹین فورڈ میں داخلے کے لیے رقم جمع کر رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس جاب سے وہ ایک سال میں اتنا بچا لے گی کہ یونیورسٹی میں داخلہ لے سکے۔ جمی کو پسند نہیں تھا کہ وہ بار میں کام کرے۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ وہاں کام کرنے والی لڑکیوں کو شرابیوں کے ہاتھوں کن مشکلات سے گزرنا پڑتا تھا اور وہ انہیں کیا سمجھتے تھے؟ مگر وہ نینسی کو روک بھی نہیں سکتا تھا۔ اسے ماں پر غصہ آتا تھا کہ وہ بڑا تھا مگر گھر کے کسی مسئلے کو اپنا مسئلہ نہیں سمجھتا تھا۔ جمی کا ذاتی مسئلہ یہ تھا کہ وہ نینا کو پسند کرنے لگا تھا۔ نینا اس کے اسکول میں اور اس کی کلاس میں پڑھتی تھی۔ وہ جب اسے دیکھتا تو خیالوں میں کھو جاتا جہاں نینا پری اور شہزادی بن کر اسے لبھاتی تھی۔ مگر حقیقی دنیا میں وہ بگ گائے کی گرل فرینڈ تھی۔ بگ گائے کا اصل نام فریڈ تھا مگر اپنی لمبی چوڑی جسامت کی وجہ سے وہ بگ گائے کہلاتا تھا۔ نینا چھوٹے قد کی اور معصوم نقوش والی لڑکی تھی، اس کی سیاہ آنکھوں میں ایسی کشش تھی کہ جمی اس کی طرف دیکھنے سے گریز کرتا تھا۔ اسے خوف تھا کہ کہیں اس کے دلی جذبات نینا پر عیاں نہ ہو جائیں۔ مسئلہ نینا کا نہیں بلکہ بگ گائے کا تھا۔ غصے میں وہ بہت خطرناک ہو جاتا تھا اور ایسے میں اچھے خاصے پھنے خان قسم کے لڑکے بھی اس سے دور رہنا پسند کرتے تھے۔ جمی تو دبلا پتلا اور کمزور سا لڑکا تھا۔

جمی کا ایک اور مسئلہ سامنے والی مسز روب تھی۔ مسز روب خوب صورت اور طرحدار عورت تھی اور اسے لڑکوں سے خاص دلچسپی تھی۔ ان دنوں جمی اس کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ یہ مسئلہ بھی سترھویں سال میں شروع ہوا۔ جسامت سے قطع نظر اس کا چہرہ تو نوجوانوں والا ہو گیا تھا اور وہ ایک خاص قسم کی خوش روئی رکھتا تھا جو خواتین کو اچھی لگتی ہے۔ اس میں بیک وقت لڑکے اور بچے والی جھلک آتی ہے۔ مسز روب کی لوسی سے بہت اچھی دوستی تھی اور وہ اکثر ان کے گھر آتی تھی۔ وہ جب آتی تو جمی کی کوشش ہوتی کہ اس کا سامنا کرنے سے گریز کرے کیونکہ وہ اسے بہت والہانہ انداز میں دیکھتی تھی۔ جمی کا کوئی قصور نہیں تھا مگر اسے خوف آتا تھا کہ کہیں ماں مسز روب کی دلچسپی بھانپ نہ لے اور کہیں وہ اسے غلط نہ سمجھے۔ مسز روب کی بھرپور کوشش ہوتی کہ وہ کسی طرح اس کے گھر آئے اور جمی اس سے دامن بچاتا تھا۔

ایک مسئلہ اور بھی تھا۔ ٹیری جوزف اسکول کا سب سے ذہین لڑکا تھا۔ طویل قامت اور دبلی جسامت کے ساتھ آنکھوں پر دبیز شیشے کی عینک اس کی ذہانت کی دلیل تھی۔ مگر ٹیری نے اپنی ذہانت نہایت منفی انداز میں استعمال کی تھی۔ وہ کیمسٹری کا ماہر تھا اس نے اپنے گھر میں منشیات کی ایک چھوٹی سی فیکٹری لگائی ہوئی تھی۔ مختلف پودوں اور کیمیکلز سے وہ خود منشیات تیار کر کے فروخت کرتا تھا۔ خود اس کی شخصیت میں بدمعاشوں والی کوئی بات نہیں تھی، اس لیے اس نے دو عدد کرائے کے بدمعاش پال رکھے تھے جو اس کے ایک اشارے پر کسی کی بھی ہڈی پسلی برابر کرنے کے لیے بے تاب رہا کرتے تھے۔ ٹیری سے جمی کا دور کا واسطہ بھی نہیں تھا۔ مگر ہوا یوں کہ ایک دن ٹیری نے اسے لاکر کے پاس روک لیا اور اس سے پوچھا۔ ”تمہاری بہن وولف کے بار میں کام کرتی ہے؟“

”ہاں لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“ جمی نے بہادر بن کر کہا لیکن اندر سے ڈرا ہوا تھا۔ ٹیری سے سب ڈرتے تھے۔ وہ بھی جو اس کے گاہک تھے اور وہ بھی جو اس کے

گاہک نہیں تھے۔ جواب میں ٹیری نے ایک چھوٹا پلاسٹک شاپر اس کے ہاتھ میں دیا۔ اس میں تقریباً پچاس گرام سرخ سفوف تھا اور جمی جانتا تھا کہ یہ منشیات ہے۔ اس کی حالت خراب ہو گئی۔ ”یہ کیا کر رہے ہو؟“

”فکر مت کرو، یہ تمہارے لیے نہیں ہے۔ تم جا کر وولف کو دو گے اور اس سے ہزار ڈالرز لا کر مجھے دو گے۔“

”میں یہ کام نہیں کر سکتا۔“ اس نے انکار کیا۔

”جب تم مجھے ہزار ڈالرز لا کر دو گے تو میں سو ڈالرز تمہیں دوں گا۔“

اس پیشکش نے جمی کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنا انکار بدل دے۔ وہ اسی شام وولف کے بار پہنچا جہاں نینسی ویٹریس کا کام کر رہی تھی۔ اس نے جمی کو دیکھ کر برا سا منہ بنایا اور اسے آگاہ کیا۔ ”تم ابھی اٹھارہ کے نہیں ہوئے ہو۔“

وہاں موجود افراد میں سے نصف انڈر ایج تھے۔ جمی نے ان کی طرف اشارہ کیا۔ ”ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”یہ میرے بھائی نہیں ہیں اور اب تم یہاں سے دفع ہو جاؤ، اس سے پہلے کہ میں وولف کے آدمیوں کو اشارہ کروں۔“

”تمہیں اشارہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ جمی نے مسکرا کر کہا۔ ”میں وولف سے ملنے آیا ہوں۔“ اس نے شاپر دکھایا۔ ”بزنس ڈیل۔“

وولف ایک لڑکی کے ساتھ اپنے دفتر میں تھا اور جمی اندر آیا تو اس نے بیزاری سے اسے دیکھا مگر جب اس نے شاپر اس کے حوالے کیا تو اس کا موڈ بدل گیا۔ اس نے جمی کو پیشکش کی کہ اس کے پاس موجود لڑکی اسے بھی انٹرٹین کر سکتی ہے مگر جمی نے انکار کر دیا۔ ”شکریہ، مجھے ہزار ڈالرز دو تاکہ میں ٹیری تک پہنچا سکوں۔“

”ٹیری۔“ وولف نے گہری سانس لی اور اس کا موڈ بدل گیا۔ اس نے غرا کر کہا۔ ”اس خبیث سے کہنا کہ اس نے پچھلی بار جو چورا بھیجا تھا اسے استعمال کر کے میرے تین گاہک اسپتال پہنچ گئے اور مجھے ان کا منہ بند کرنے کے لیے فی کس ایک ہزار ڈالرز دینا پڑے تھے۔ اس لیے ہزار ڈالرز بھول جائے اور اگر مجھ سے بزنس جاری رکھنا چاہتا ہے تو مزید دو ہزار ڈالرز کا مال بھیج دے۔“

جب جمی نے یہ جواب ٹیری تک پہنچایا تو اس کی عینک کے پیچھے سے ابلی ہوئی آنکھیں مزید ابل گئیں اور اس نے غرا کر کہا۔ ”تم نے اس سے پہلے رقم کیوں نہیں لی؟“

”تم نے کب کہا تھا کہ رقم پہلے لینی ہے۔“

ٹیری نے اس کا گریبان پکڑ کر کھینچا۔ ”یہ بزنس کا اولین اصول ہے۔“

”میں نے پہلی بار ایسا کوئی کام کیا ہے اور اپنی رقم تم خود وصول کرو۔ میں نے غلطی کی تمہارا کام لے کر۔“

”ہزار ڈالرز اب تمہیں ادا کرنے ہوں گے۔“ ٹیری نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”میں تمہیں ایک مہینے کی مہلت دے رہا ہوں۔“

”میں..... مجھے کیوں؟“

”کیونکہ تم منافع میں حقدار ہوتے اس لیے اب نقصان میں بھی حصے دار ہو گے۔ تم نو سو ڈالرز مجھے دو گے اور سو ڈالرز تمہارے۔“

سونے پر سہاگا کہ ہسٹری کے ٹیچر مسٹر میک اون دوران کلاس انتقال کر گئے۔ بیماری کی وجہ سے وہ پہلے ہی اپنے شیڈول سے پیچھے تھے اور دوران لیکچر سکندر اعظم کی جواں مرگی پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ اچانک دھڑام سے نیچے گرے اور ساکت ہو گئے۔ جب طبی عملہ آیا تو اس نے انہیں مردہ پایا تھا۔ پرنسپل مسٹر ولیم نے اس سانحے پر چھٹی کا اعلان کیا تو تمام طلبہ خوشی سے چلاتے اور اچھلتے کودتے اسکول سے باہر نکلے تھے۔ نینا آگے تھی۔ دو دن پہلے نینا اور بگ گائے کا سرعام جھگڑا ہوا تھا اور اس کے بعد سے وہ دونوں الگ الگ نظر آ رہے تھے۔ جمی نینا کی طرف بڑھا۔

”ہائے..... میں۔“

”جمی ہو۔“ نینا بولی۔ ”ہم کلاس فیلو ہیں۔“

جمی کھسیا گیا اور ابھی سوچ رہا تھا کہ کیا بولے کہ اچانک بگ گائے اس کے اور نینا کے درمیان..... آ گیا۔ اس نے غرا کر کہا۔ ”تمہاری جرأت کیسے ہوئی میری گرل فرینڈ سے بات کرنے کی؟“

”میں تمہاری گرل فرینڈ کبھی نہیں رہی۔“ نینا بولی۔ ”ہم صرف دوست تھے اور اب وہ بھی نہیں ہیں۔ باقی رہی دے جمی نے مجھ سے ڈیٹ مانگی اور میں نے ہاں کہہ دیا ہے۔“

بگ گائے نے جمی کی طرف دیکھا جو مسکرا رہا تھا اور اس کے سینے پر انگلی رکھ کر بولا۔ ”میں تمہیں دیکھ لوں گا۔“

اس کے جانے کے بعد جمی نے ہچکچا کر پوچھا۔ ”وہ ڈیٹ والی بات ہے یا.....؟“

”ہے۔“ نینا بولی اور وہاں سے چلی گئی۔ جمی کے

پیچھے موجود اس کے واحد اور پکے دوست رون نے کہا۔
"بگ گائے خطرناک آدمی ہے، وہ تمہیں دھمکی دے کر گیا ہے۔ تمہیں ڈیٹ کے بجائے اس کی فکر کرنی چاہیے۔"
"میرا نہیں خیال کہ وہ عملی طور پر کچھ کرے گا۔"
مگر نینا کے ساتھ اس کی اولین ڈیٹ قبرستان میں ہوئی جہاں پورا اسکول مسٹر میک اون کی تدفین میں شرکت کے لیے آیا ہوا تھا۔ جمی لوسی کی کار لے آیا تھا۔ اس کے برابر میں نینا اور پیچھے رون موجود تھا۔ اسے شکوہ تھا کہ مسٹر میک اون کی تدفین اگر اتوار کے بجائے کسی اور دن رکھ لی جاتی تو انہیں ایک اضافی چھٹی مل جاتی۔ جمی نے اسے گھورا۔
"یہ آخری ٹرم ہے اور ابھی مسٹر میک اون کا مضمون آدھا بھی مکمل نہیں ہوا ہے۔ تمہیں چھٹی کے بجائے اس کی فکر کرنی چاہیے۔"
رون مسکرایا۔ "میں ہسٹری میں تیز ہوں اس لیے نو پرابلم۔"
یہاں بھی مسئلہ جمی کے لیے تھا، وہ ہسٹری میں کمزور تھا اور اب اضافی محنت کی ضرورت تھی۔ وہ گاڑی میں بیٹھے ہوئے جنازے کی آمد کا انتظار کر رہے تھے کہ اچانک کار بری طرح ہل کر رہ گئی اور عقب سے ایک دھماکے کی آواز آئی۔ وہ سنبھل کر نیچے اترے تو عقب میں سیاہ جنازہ گاڑی کھڑی تھی۔ اس کی فرنٹ جالی نے لوسی کی شاندار اور قیمتی گاڑی کا عقبی حصہ برباد کر دیا تھا۔ جمی نے نقصان کا جائزہ لیا اور کراہا۔ "اب میں مام کو کیا بتاؤں گا۔ وہ مجھے قتل کر دیں گی۔"
"میں پولیس کو کال کروں؟" رون نے پوچھا۔
مگر اسی لمحے ویگن سے فادر اسمتھ اور ان کے ساتھ کوئی نصف درجن نن اُتری تھیں۔ فادر اسمتھ نے حادثے کی طرف ذرا بھی توجہ دیے بغیر کہا۔ "اوہ جمی، تم کو دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے۔ ان سے ملو یہ مسٹر میک اون کے گروپ سے ہیں۔ وہ چرچ سے وابستہ تھے۔ یہ ان کی آخری رسومات میں خصوصی شرکت کے لیے آئی ہیں۔"
"کیا میں پولیس کو کال کروں؟" رون نے پھر پوچھا۔
"اوہ، اس کی ضرورت نہیں ہے۔" فادر اسمتھ نے ہاتھ ہلایا۔ "انشورنس یہ معاملہ دیکھ لے گی۔"
جمی کا بھی یہی خیال تھا کیونکہ اس کے پاس ڈرائیونگ لائسنس بھی نہیں تھا۔ تدفین کے بعد اس نے نینا کو اس کے گھر چھوڑا اور کار خاموشی سے اس ورکشاپ تک پہنچا دی جو حادثے کی صورت میں کار ٹھیک کرنے اور انشورنس سے اس کا بل وصول کرنے کا مجاز تھا۔ جمی کو امید تھی کہ مام ایک دو دن باہر جھانک کر پورچ میں نہیں دیکھیں گی۔ تب تک کار بن کر آ جائے گی۔ مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اگلی صبح وہ تیار ہو کر نیچے آیا تو اس نے لاؤنج میں صوفے پر لوسی کو بے حس و حرکت پڑے پایا۔ اسے شبہ ہوا کہ اس کا سانس رکا ہوا تھا۔ جمی نے فوری طور پر ایمرجنسی کو کال کی اور ایمبولینس کے ساتھ پولیس بھی آ گئی۔ پیرامیڈک نے فوراً لوسی کو اسٹریچر پر ڈالا اور اسپتال لے گئے۔ انہوں نے لوسی کو مخصوص پلاسٹک کفن میں نہیں لپیٹا تھا اس لیے جمی کو امید تھی کہ مام زندہ تھیں۔ البتہ پولیس والے وہیں رک گئے۔ بدقسمتی سے صوفے کے ساتھ میز پر لفافوں کا ایک بنڈل رکھا ہوا تھا۔ آفیسر گارنر نے پہلا لفافہ کھولا اور اس میں موجود کارڈ پڑھا۔
"میں اپنے شوہر سے بیزار ہوں جس کے سوائے میرے ہر عورت سے تعلقات ہیں۔"
"کیا یہ خودکشی کا نوٹس ہے؟" جمی نے پوچھا۔
آفیسر نے دوسرا کارڈ کھولا اور پڑھا۔ "میں اپنے بچوں سے بھی نالاں ہوں جنہیں اپنی ماں کی کوئی پروا نہیں ہے۔"
"میرا خیال ہے مام نے خودکشی کی کوشش کی ہے؟"
"یہ قتل کی کوشش بھی ہو سکتی ہے۔" آفیسر گارنر نے کہا۔ "مجھے کچھ معلومات درکار ہیں۔" اس نے باقی کارڈز رکھ لیے اور نوٹ بک نکالی۔ "خاتون کا نام؟"
"لوسی ویل۔"
"تاریخ پیدائش؟"
"یاد نہیں مگر مام تقریباً چالیس کی ہیں۔"
"تعلیم؟"
"خدا کے لیے، مام کی اس حالت کا تعلیم سے کیا تعلق ہے؟"
"اوکے۔" گارنر کا موڈ خراب ہو گیا اور اس نے نوٹ بک بند کر دی۔ "گھر کا سربراہ کون ہے؟"
"میرے ڈیڈی ریس ویل۔ وہ ان دنوں رومانیہ کے دورے پر گئے ہوئے ہیں۔"
گارنر نے ریس ویل کا کونٹیکٹ نمبر لیا اور رخصت ہو گیا۔ جمی اسپتال پہنچا تو مائرہ اور نینسی وہاں پہلے سے موجود تھے۔ ڈاکٹر ابھی لوسی کی حالت کے بارے میں بتانے کے لیے تیار نہیں تھے اور نہ ہی وہ یہ بتا رہے تھے کہ اس کی حالت کی وجہ کیا تھی۔ اس کے مختلف ٹیسٹ ہو رہے تھے اور اسے انتہائی نگہداشت کے شعبے میں رکھا ہوا تھا جہاں کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ مائرہ کا چہرہ اُترا ہوا تھا مگر نینسی خوش نظر آ رہی تھی۔ جمی نے پوچھا۔ "تم کس بات پر خوش ہو؟"
"مجھے معلوم ہے مام کی یہ حالت زیادہ پینے کی وجہ سے ہوئی ہے۔ وہ ٹھیک ہو جائیں گی مگر جب تک وہ اسپتال میں ہیں اور ڈیڈ رومانیہ میں تب تک میں گھر میں ایک پارٹی کر لوں گی۔"
"پارٹی مگر وہ کیوں؟"
"بے وقوف، میں اس سے کماؤں گی۔" نینسی بولی۔ "میں بار کی ساری لڑکیوں کو لے آؤں گی اور ان کے چکر میں آنے والے سارے لڑکے ہمارے گھر آئیں گے۔ میں ان سے ٹکٹ کی رقم بھی لوں گی اور پھر وہ جو شراب اور منشیات استعمال کریں گے اس کی رقم الگ لوں گی۔ مجھے یقین ہے ایک رات میں اتنی رقم ضرور ہو جائے گی کہ میں ایک سمسٹر کی فیس ادا کر سکوں۔"
جمی دنگ رہ گیا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کی بہن اتنی کاروباری ذہنیت رکھتی ہو گی، وہ اس قابل تھی کہ کسی اچھے بزنس اسکول میں اسکالرشپ حاصل کر لیتی۔ مائرہ فوراً اس کے ساتھ شامل ہو گیا کیونکہ اسے جم کی دو مہینے کی فیس دینی تھی۔ مجبوراً اسے بھی شامل ہونا پڑا۔ گھر آ کر اس نے ورکشاپ کال کی تو اس کے منیجر نے کال ریسیو کی۔ عقب میں بہت زیادہ شور تھا۔ جمی کو چلا کر بات کرنی پڑ رہی تھی۔ اس نے لوسی ویل کا حوالہ دیا۔ منیجر نے کہا۔ "کار ٹھیک ہو گئی ہے۔ انشورنس بھی ہو گئی ہے تم پتا بتاؤ وہاں پہنچ جائے گی۔"
جمی نے خوش ہو کر منیجر کو پتا بتایا۔ اس نے کہا کہ کار ایک گھنٹے بعد پہنچ جائے گی اور جب وہ دیکھے گا تو خوش ہو جائے گا کیونکہ اس میں کئی تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ جمی نے دوسری کال نینا کو کی اور اس سے پوچھا۔ "کیا تم لانگ ڈرائیو کے لیے تیار ہو؟"
"کیوں نہیں۔" وہ چہک کر بولی۔
ایک گھنٹے بعد ورکشاپ کا لڑکا کار لے کر آیا اور جمی سے سائن لے کر چلا گیا۔ مگر جب جمی نے کار دیکھی تو پریشان ہو گیا۔ یہ لوسی کی کار نہیں تھی بلکہ اس سے کہیں زیادہ اعلیٰ درجے کی کار تھی۔ اس برانڈ کی کاریں صرف بہت دولت مند افراد ہی افورڈ کر سکتے تھے۔ مگر پھر اس نے خود کو تسلی دی کہ غلطی اس کی نہیں تھی۔ منیجر نے اگر اسے کسی کی کار بھیج دی تھی تو اس میں اس کا کیا قصور۔ جب تک یہ غلطی درست نہیں ہو جاتی وہ اس شاندار کار کی ڈرائیو کے مزے لے سکتا تھا۔ اس نے رون کو کال کی تو وہ بھی تیار ہو گیا۔ جمی نے پہلے اسے لیا اور پھر نینا کو۔ پھر وہ ہائی وے پر نکل آئے۔ کار میں بہت اعلیٰ درجے کا میوزک سسٹم تھا، وہ اس سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ رون بیئر لایا تھا۔ وہ بیئر پیتے رہے۔ ان کا نشہ اس وقت ہرن ہوا جب عقب سے پولیس کار کی روشنیاں اور سائرن ایک لمحے کو آن ہوئے اور پھر میگا فون پر ان سے کار ایک طرف روکنے کو کہا گیا۔ رون نے گھبرا کر کہا۔
"لعنت ہو، یہ کہاں سے آ گئے۔"
جمی بھی پریشان تھا۔ وہ دیکھ نہیں سکا کہ رون نے جیب سے ایک دوا کی بوتل نکال کر دروازے کی جیکٹ میں ڈال دی۔ یہ دوا بیئر کے نشے کو وہسکی کے برابر کر دیتی تھی۔ ایک منٹ بعد وہ کار سے نیچے تھے اور پولیس والے ان سے سوالات کر رہے تھے۔ انہیں روکا اوور اسپیڈ کی وجہ سے گیا تھا مگر معاملہ کچھ اور نکل آیا۔ "یہ کار کس کی ہے؟"
"میری مام کی۔" جمی نے جواب دیا۔
پولیس والے نے جھک کر اس کی ناک سے ناک ملا کر کہا۔ "تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ کار لوسز ویل کی ہے۔"
"لوسز ویل؟"
"مشہورِ زمانہ رومانوی مافیا کا باس ہے۔ شکر کرو تم اس کے آدمیوں کے بجائے پولیس کے ہاتھ آ گئے۔" پولیس آفیسر نے کہتے ہوئے کار کی ڈکی کھولی تو اس میں ہاتھ پاؤں بندھا ایک آدمی زخمی حالت میں پڑا تھا۔ ایک گھنٹے بعد جمی پولیس اسٹیشن میں ایک پولیس آفیسر کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ نینا اور رون کو جانے کی اجازت مل گئی تھی۔ سفید بالوں اور جھری زدہ چہرے والے اس عمر رسیدہ آفیسر کو شاید اسی قسم کے کاموں کے لیے رکھا ہوا تھا۔ ورنہ پولیس فورس میں اس کی گنجائش نہیں تھی۔ اس نے جمی سے کہا۔
"بیٹے اصل کہانی اگل دو۔"
اس پر جمی نے اسے سب کچھ سچ سچ بتا دیا مگر اسے تسلی یقین نہیں آیا تھا۔ "تم جھوٹ بول رہے ہو۔"
"آفیسر، کیا میں مشکوک ہوں؟"
"نہیں لیکن اسی طرح جھوٹ بولتے رہے تو مشکوک ہو جاؤ گے۔"

اسی لمحے دروازہ کھلا اور ایک عورت نے اندر جھانکا۔ اس نے منی اسکرٹ کے ساتھ نہایت چست شرٹ اور اوپر کوٹ پہنا ہوا تھا۔ وہ وکیل تھی، اس نے آفیسر سے کہا۔ ”میں اپنے کلائنٹ سے اکیلے میں بات کرنا چاہتی ہوں۔“

”یہیں آجاؤ۔“ آفیسر نے کہا۔

”کسی ایسی جگہ جہاں کیمرے اور مائیک نہ ہوں۔“

کچھ دیر بعد جمی پولیس اسٹیشن کی لابی میں کورنیلا کے سامنے تھا۔ کورنیلا اونچے درجے کی وکیل تھی۔ مگر اسے کیسے پتا چلا کہ جمی کو کسی وکیل کی ضرورت ہے۔ جمی نے اس سے پہلا سوال یہی کیا تھا۔ کورنیلا تقریباً چالیس برس کی تھی مگر اس نے خود کو سنبھال کر رکھا تھا۔ منی اسکرٹ اور بہت گہرے وی شیپ گلے سے جھانکتا اس کا جسم گواہی دے رہا تھا۔ صرف آنکھوں کے نیچے ہلکی سی جھریاں اس کی عمر کی چغلی کھا رہی تھیں۔ وہ نہایت سنسنی خیز پوز میں جمی کے سامنے کھڑی تھی اور اسے تقریباً ان نظروں سے دیکھ رہی تھی جن نظروں سے مسز روب دیکھتی تھی۔ اس نے جمی کا سوال نظر انداز کر کے پوچھا۔ ”تم اس مصیبت سے نکلنا چاہتے ہو؟“

”کیوں نہیں۔“

”تب تم پولیس کو وہی بیان دو گے جو میں کہوں گی۔“

جمی اس وقت پولیس اسٹیشن سے نکلنے کے لیے خود کو شیطان تسلیم کرنے کو بھی تیار تھا مگر کورنیلا نے اسے نہایت آسان بیان رٹایا اور اس نے کچھ دیر بعد وہی عمر رسیدہ آفیسر کے سامنے بیان کر دیا۔ کورنیلا اس کے برابر میں بیٹھی ہوئی تھی۔ جمی نے کہا۔ ”اصل میں یہ کار میرے ڈیڈی کو مسٹر لوسزویل نے گفٹ کی ہے۔“

”لوسزویل کا تمہارے ڈیڈی سے کیا تعلق ہے؟“

”یہ تو وہی جان سکتے ہیں۔“ جمی نے اطمینان سے کہا۔ ”تم تصدیق کر سکتے ہو۔ مائلو ورکشاپ سے یہ کار ہمارے ہاں آج شام ہی پہنچائی گئی اور میں نے ان کو سائن بھی دیے تھے۔“

”ٹھیک ہے بیٹے۔“ عمر رسیدہ آفیسر نے اس بار بھی یقین نہ کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن ڈکی میں موجود زخمی آدمی۔۔۔؟“

”کیا تم اس پر چارج لگا رہے ہو۔“ کورنیلا بولی۔ ”اس صورت میں تم اسے اور کار کو پولیس اسٹیشن میں روک سکنے کے مجاز ہو۔“

عمر رسیدہ آفیسر جانتا تھا کہ ان پر پہلے ہی کاموں کا بہت زیادہ بوجھ تھا اور اس وقت وہ کوئی چارج لگائے گا تو اس بوجھ میں مزید اضافہ ہوگا اس لیے اس نے بادلِ نخواستہ جمی کو جانے کی اجازت دے دی۔ وہ باہر آئے تو کورنیلا نے کہا۔ ”کیا تم لفٹ دے سکتے ہو؟“

”کیوں نہیں، تم نے پولیس سے میری جان چھڑائی ہے۔“

”اوہ، یہ تو ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

وہ روانہ ہوئے۔ کورنیلا نے دروازے کی جیکٹ میں ہاتھ مارا اور گولیوں والی شیشی اس کے ہاتھ میں آگئی۔ اس نے جیسی آواز نکالی جمی کو یقین ہو گیا کہ وہ بھی ان گولیوں کی عادی تھی۔ اس نے اپنے پرس سے ایک چھوٹی بوتل نکالی اور چند گولیوں کے ساتھ اسے اپنے حلق میں انڈیل لیا۔ اس کا فوری اثر ہوا۔ اس کی آنکھوں میں نشہ آگیا اور اس نے جھومنا شروع کر دیا۔ پھر اس نے اپنے بال کھولے اور کوٹ اتار دیا۔ جمی کو خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں وہ اپنے باقی کپڑوں کے ساتھ بھی یہی سلوک نہ کرے۔ اگرچہ جمی کو اعتراض نہیں تھا مگر وہ سرِعام اپنا تماشا نہیں بنوانا چاہتا تھا اس لیے اس نے جلدی سے کہا۔ ”تمہارا اپتا کیا ہے؟“

کورنیلا نے جھومتے ہوئے پتا بتایا جو خوش قسمتی سے نزدیک کا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ حواس مکمل کھو دیتی، جمی نے کار اس کے گھر کے سامنے روک کر دروازہ کھولا۔ کورنیلا نے نیچے اتر کر نہایت دعوت انگیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”تم بھی آؤ نا، ایک کپ کافی کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”نہیں شکریہ، میں تھکا ہوا ہوں اور گھر جا کر آرام کروں گا۔“ جمی نے کہا اور کار آگے بڑھا دی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کورنیلا کا جھوٹ پولیس اسٹیشن میں تو چل گیا تھا مگر کیا لوسزویل اس بات کو تسلیم کرے گا اور اس کی کار کی ڈکی میں وہ زخمی شخص کون تھا؟ اسے خیال آیا کہ اس نے کار کے خانے تو دیکھے ہی نہیں ہیں۔ اس نے ڈیش بورڈ کی تلاشی لی تو اس میں کچھ نہیں تھا مگر اس کے ایک خفیہ خانے میں ایک سیل لفافہ موجود تھا۔ اس کا پتا بھی یوں چلا کہ جمی بورڈ کے متعلق بٹن چھیڑ رہا تھا تو ایک بٹن دبانے پر یہ خفیہ خانہ کھل گیا۔ لفافہ نکال کر اس نے اپنی جیکٹ میں رکھ لیا۔ وہ گھر پہنچا تو وہاں ورکشاپ والا لڑکا موجود تھا۔ اس نے خفگی سے کہا۔ ”تم نے جھوٹ بول کر کار منگوائی، باس مجھ پر خفا ہو رہا ہے۔“

”یہ تمہارے باس کا قصور ہے، میں نے لوسی ویلز کی کار کا پوچھا تھا اور اس نے لوسزویل کی کار بھیج دی۔ ویسے کار میں ایک بندھا ہوا زخمی شخص بھی تھا۔ پولیس عنقریب اس

بارے میں پوچھنے کے لیے تمہاری ورکشاپ کا چکر لگائے گی۔“

”یہ باس کا دردِ سر ہے۔“ لڑکا بیزاری سے بولا۔ ”چابی میرے حوالے کرو۔“

جمی نے چابی دی اور لڑکا کار لے کر رخصت ہو گیا۔ جمی کو ایک بار پھر خیال آیا کہ کورنیلا کو کس نے بھیجا تھا؟ اس نے نینا کو کال کی مگر وہ اس سے خفا تھی۔ ”مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم چوری کی کار میں مجھے ڈرائیو پر لے جاؤ گے اور وہ شخص کون تھا۔“

”کار چوری کی نہیں تھی۔“ جمی نے کہا اور اسے اصل صورتِ حال سے آگاہ کیا تو اس کا موڈ ٹھیک ہو گیا۔ موقع غنیمت جان کر جمی نے اسے گھر میں ہونے والی پارٹی میں شرکت کی دعوت دی۔ نینا مان گئی۔ اسی دوران میں نینسی بار سے واپس آگئی اور اس نے جمی سے کہا۔

”مجھے پارٹی کے لیے منشیات کی ضرورت ہوگی۔“

جمی نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میری پہلے ہی ایک ہزار ڈالرز کے لیے مجھے قتل کرنے کا سوچ رہا ہے۔“

”دیکھو یہ لازمی ہے ورنہ اس کے بغیر لڑکے کہاں آئیں گے۔“ نینسی نے اصرار کیا۔ ”تم میری سے بات کر کے دیکھو۔“

جمی نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے، میں کوشش کرتا ہوں لیکن وعدہ نہیں کر سکتا، ہو سکتا ہے وہ مان جائے یا وہ انکار کر دے۔ لیکن اگر اس نے پیشگی رقم مانگی تو۔۔۔“

”میں دے دوں گی۔“ نینسی خوش ہو کر بولی۔

میری کی آنکھیں اس کا مطالبہ سن کر ابل گئی تھیں۔ ”تمہارا مطلب ہے کہ میں تمہیں مزید مال دوں جبکہ تم نے اب تک میرے ہزار ڈالرز واپس نہیں کیے ہیں۔“

میری سے بحث کرنے کا فائدہ نہیں تھا اس لیے جمی نے نرمی سے کہا۔ ”وہ معاملہ الگ ہے۔ یہاں میری بہن اپنی پارٹی کے لیے لینا چاہتی ہے اور ادائیگی بھی وہی کرے گی۔“

”پہلے ہزار ڈالرز۔“ میری نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”پلیز۔“ جمی نے التجا کی۔ ”دیکھو نینسی جو کمائے گی اس میں میرا حصہ بھی ہوگا اور میں تمہیں ہزار ڈالرز دے سکوں گا۔ اگر تم نے مال نہیں دیا تو پارٹی کامیاب نہیں ہوگی اور مجھے کوئی حصہ نہیں ملے گا اور میں تمہاری رقم ادا نہیں کر سکوں گا۔ آسان سا فارمولا ہے۔“

بات میری کی سمجھ میں آئی مگر اس کی سوئی ہزار ڈالرز پر اٹکی ہوئی تھی اس لیے جمی نے پھر سمجھایا۔ ”دیکھو نقد لے کر تم مال دو گے اس سے مزید رقم آئے گی اور تب تمہارا قرض بھی اتر جائے گا۔ یہ بھی آسان سی بات ہے۔“

”اوکے لیکن پہلے رقم لاؤ گے تب مال ملے گا۔“

”وہ میری بہن لینے آئے گی۔“ جمی نے سکون کا سانس لیا۔ ایک مرحلہ طے ہو گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ معاملات نمٹ رہے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ کچھ عرصے بعد سب سیٹ ہو جائے۔ مگر اسے کیا ملے گا؟ اس نے نینسی کو میری کی رضامندی بتانے سے پہلے اس سے یہی سوال کیا۔

”بیس فیصد۔“ نینسی نے کہا۔

”اور باقی اسّی فیصد؟“

”اس میں سے بیس فیصد مائز کا ہوگا اور باقی ساٹھ فیصد میرا۔“

”کیا مطلب! تم اکیلی ساٹھ فیصد لو گی اور ہم دونوں کو چالیس فیصد ملے گا۔“

”کیونکہ ساری محنت میں کر رہی ہوں اور سارا خرچ بھی میں کروں گی اس لیے ساٹھ فیصد میرا ہوگا۔ ویسے تم فکر مت کرو، بیس فیصد بھی اچھا خاصا ہوگا۔“

جمی بادلِ نخواستہ راضی ہوا۔ وہ نینسی کو میری کے پاس لے گیا اور اس نے رقم لے کر اسے منشیات دی۔ میری کا دعویٰ تھا کہ اس کی بنائی ہوئی نشہ آور چیز آدمی کو سرور تو بہت دیتی تھی لیکن یہ نہ تو صحت کے لیے مضر تھی اور نہ ہی اپنا عادی بناتی تھی۔ جمی نے دیکھا تھا کہ لڑکے اور لڑکیاں اس چیز کے لیے اس کے آگے پیچھے پھرتے تھے اور اس کی خوشامد کرتے تھے۔ مگر میری کسی کو گھاس نہیں ڈالتا تھا۔ وہ صرف ان لوگوں کو منشیات سپلائی کرتا تھا جو اس کے اعتماد کے تھے اور اس کے اصل گاہک بارز اور نائٹ کلب تھے۔ اس نے منشیات بیچ کر اتنا کما لیا تھا کہ اس نے شہر کے باہر واقع ایک متروک ورکشاپ، اور اس کا شیڈ خرید لیا تھا اور وہاں وہ اپنی منشیات کی فیکٹری لے جا رہا تھا۔ وہاں اس نے گرین ہاؤس کی تیاری شروع کر دی تھی جہاں وہ بڑے پیمانے پر پودے لگاتا۔

☆☆☆

جمی بیئر کے کریٹ اور وہسکی کی بوتلیں لیے گھر میں داخل ہوا تو وہاں کا ماحول ہی بدلا ہوا تھا۔ لاؤنج خالی کر کے کناروں پر صوفے لگا دیے تھے جن پر نینسی کی بار گرلز براجمان تھیں۔ درمیان میں ڈسکو لائٹ بال لگی تھی اور بائی

فائی ڈیک پر موسیقی چنگھاڑ رہی تھی۔ گھر کے باہر خاصا میلہ لگا ہوا تھا اور لوگ آنا شروع ہو گئے تھے۔ جمی کریٹ رکھ رہا تھا کہ اچانک دروازہ کھلا اور مسز روب زرق برق اور نہایت چست لباس میں اندر آئی۔ ''ہائے۔'' اس نے ہاتھ ہلایا، جواب میں جینسی نے برا سا منہ بنایا مگر وہ اس کی طرف توجہ دیے بغیر جمی کی طرف بڑھ گئی۔ ''تمہارے ہاں پارٹی ہے اور تم نے مجھے بتایا نہیں...... ویسے لوسی کہاں ہے؟''

''مام۔'' جمی نے کہا۔ ''وہ تو اسپتال میں ہیں۔''

مسز روب کی آنکھیں کھل گئیں۔ ''تو یہ پارٹی اس خوشی میں دی جا رہی ہے۔ میں بھی مدعو ہوں نا؟''

''اوہ...... وہ بات یہ ہے کہ یہ پارٹی ادائیگی کی بنیاد پر......''

جمی کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے مسز روب نے اسے نوٹوں کا ایک رول پکڑا دیا اور اس کے کان میں گھس کر بولی۔ ''اب میں مدعو ہوں۔''

جمی گہری سانس لے کر رہ گیا۔ مائز ایک طرف بیٹھا ہوا تھا اور رقم جمع کر رہا تھا۔ وہ بہت خوش تھا اور جب جمی نے اسے نوٹوں کا رول دیا تو اس نے اسے گن کر اپنی ٹوپی میں موجود رقم میں شامل کیا اور مسرور لہجے میں بولا۔ ''یہ ہو گئے گیارہ سو پچاس ڈالرز اور ابھی پارٹی کا آغاز بھی نہیں ہوا ہے۔''

بار گرلز پارٹی کو گرمانے کے لیے لاؤنج کے وسط میں آ گئی تھیں۔ مگر لڑکے فی الحال ان کے بجائے ڈرنکس اور منشیات میں زیادہ دلچسپی لے رہے تھے۔ جمی مختلف کمروں میں جھانک رہا تھا، ہر جگہ لڑکے لڑکیاں بھرے ہوئے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کل تک مکان کا جو حشر ہوگا اس کا حساب کون دے گا؟ مگر پہلے گھنٹے میں جتنی رقم جمع ہو گئی، اسے امید تھی کہ پارٹی ختم ہوتے تک وہ کہیں زیادہ رقم جمع کر لیں گے اور اس کے بعد اسے کم سے کم ہزار ڈالرز ملیں گے جس سے وہ ٹیری کا منہ بند کر سکے گا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ مسز روب سے بچے کیونکہ وہ اسی کے چکر میں یہاں آئی تھی۔ اسے واحد جگہ کچن نظر آئی مگر بدقسمتی سے مسز روب وہیں اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے جمی کو کالر سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ ''ہینڈسم! کہاں چھپتے پھر رہے ہو۔ میں صرف تمہارے لیے یہاں آئی ہوں۔''

''مسز روب۔'' اس نے کسمسا کر کہا۔ ''یہ جگہ کسی قسم کی سرگرمی کے لیے موزوں نہیں ہے۔ میری مام اپنے کچن کا بہت خیال رکھتی ہیں۔''

''میرا خیال ہے یہاں کوئی نہیں آئے گا۔'' مسز روب نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''تو کیا خیال ہے؟''

جمی سوچ رہا تھا کہ اس مصیبت سے کیسے پیچھا چھڑائے کہ نینا وہاں نمودار ہوئی اور مسز روب کو اس کے اتنے نزدیک دیکھ کر ٹھٹکی تھی۔ جمی جلدی سے دور ہوا اور اس نے نینا کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے مسز روب میں مام کو بتا دوں گا کہ تم اس کا ڈونگا واپس کر گئی ہو۔'' اس سے پہلے کہ مسز روب اسے روکتی یا کچھ کہتی اس نے نینا کا بازو پکڑا اور اسے لے کر سیڑھیوں سے اوپر اپنے بیڈ روم میں آ گیا۔ اندر آتے ہی نینا نے پوچھا۔

''یہ کون ہے؟''

''مسز روب، ہماری پڑوسی اور مام کی دوست، ان کا ڈونگا واپس کرنے آئی تھی۔''

نینا مطمئن ہو گئی۔ ''نیچے بہت شور ہے۔''

''اسی لیے میں تمہیں یہاں لے آیا ہوں۔'' جمی نے کہا۔ ''یہاں ہم آرام سے بات کریں گے۔''

آج نینا خاص طور سے تیار ہو کر آئی تھی۔ اس نے سفید رنگ کے فراک کے ساتھ پمپ شوز پہنے ہوئے تھے اور ہلکا سا میک اپ بھی کیا تھا۔ جمی کچھ دیر کے لیے اسے دیکھتا رہ گیا تو اس کا چہرہ مزید سرخ ہو گیا۔ اس نے کہا۔ ''آج میں پہلی بار گھر والوں سے جھوٹ بول کر آئی ہوں کیونکہ میں ابھی سولہ سال کی ہوں اور مجھے اس قسم کی پارٹیوں میں شرکت کی اجازت نہیں ہے۔''

''اجازت تو مجھے بھی نہیں ہے لیکن پارٹی میرے اپنے گھر میں ہو رہی ہے۔''

جمی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ آگے کیا کہے تو اس نے اچانک ریک پر رکھا ہوا سیاہی مائل پتھر اٹھا کر نینا کو تھما دیا۔ وہ بولی۔ ''یہ کیا ہے؟''

''شہاب ثاقب کا ٹکڑا۔'' اس نے کہا۔ ''میں نے خود اسے ٹوٹ کر گرتے دیکھا تھا۔ جب میں نے اسے اٹھایا تو وہ انگارے کی طرح دہک رہا تھا۔ یہ تمہارے لیے میری طرف سے تحفہ ہے۔''

''شکریہ۔'' نینا نے اسے بیگ میں رکھ لیا۔

عین اسی وقت بپھرا ہوا بگ گائے مکان میں داخل ہوا اور اس نے آتے ہی ردن کا گریبان پکڑ کر پوچھا۔ ''نینا کہاں ہے؟''

''میں نہیں جانتا۔'' وہ گھبرا گیا۔ اس کے ساتھ ایک بار گرل رقص کر رہی تھی، اس نے نشیلے لہجے میں بگ گائے سے کہا۔

''تم نینا کے چکر میں کیوں ہو، یہاں لڑکیوں کی کمی ہے؟''

پہلی بار بگ گائے نے چاروں طرف دیکھا اور اس کے چہرے پر دلچسپی کے آثار نظر آئے۔ اس نے لڑکی سے کہا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہی ہو، میں کچھ دیر یہاں انجوائے کروں گا، مگر۔'' اس نے ردن کی طرف دیکھا۔ ''آج تمہارا دوست میرے ہاتھ سے بچے گا نہیں۔''

اوپر جمی بے خبر تھا کہ بگ گائے اس کی تلاش میں ہے۔ اسے اس وقت نینا کے سوا کوئی اور نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ دونوں بستر پر پاؤں لٹکائے ساتھ ساتھ بیٹھے تھے اور ان کے سروں کے درمیان فاصلہ غیر محسوس انداز میں ختم ہوتا جا رہا تھا۔ جب یہ فاصلہ تقریباً ختم ہونے والا تھا کہ اچانک دروازہ دھماکے سے کھلا اور مسز روب اندر آئی۔ اس نے انہیں دیکھا اور ہنسی۔ ''میں بالکل ٹھیک وقت پر آئی ہوں۔''

''مسز روب پلیز۔'' جمی نے اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا مگر وہ کنی کترا کر نینا تک چلی آئی اور اس کے پیچھے بیٹھ گئی۔ وہ نشے میں وحشت ہو رہی تھی۔ وہ گھر سے پی کر آئی تھی اور باقی کسر یہاں پوری کر لی تھی۔ نینا نروس ہو گئی، اس نے کہا۔

''میں چلتی ہوں۔''

''نہیں۔'' مسز روب نے کہا۔ ''تم ایک بہت پیاری سی لڑکی ہو۔''

''شکریہ۔'' نینا بولی۔ ''میری ماما بھی یہی کہتی ہیں، وہ تمہاری عمر کی ہیں۔''

مسز روب جو نینا کے گھنے بال ہاتھ میں لے کر ان سے کھیل رہی تھی، اس نے خفا ہو کر جھٹکا دیا۔ ''کیا مطلب؟''

نینا کراہی۔ ''چھوڑو مجھے۔''

''مسز روب پلیز۔'' جمی نے پھر کہا۔ وہ آگے بڑھا تھا کہ دروازہ ایک بار پھر دھماکے سے کھلا اور ایک اجنبی مرد اندر داخل ہوا۔ اس نے سب کا جائزہ لیا اور جمی کی طرف انگلی اٹھائی۔

''تم یقیناً لعنتی جمی ہو۔''

''میں جمی ہوں لیکن لعنتی بالکل نہیں ہوں۔'' اس نے تصحیح کی۔ ''بائی دی وے تم کون ہو؟''

''میں وہ ہوں جس نے تمہارے باپ کو قیمتی کار تحفے میں دی تھی۔'' اس نے جمی کی ناک سے ناک ملا کر کہا۔

''لوسز ویل۔'' جمی کا خون خشک ہو گیا۔ وہ اس سے اچھی طرح واقف تھا۔ باقی کسر پولیس والوں نے پوری کر دی تھی۔ صرف صورت دیکھنا باقی رہ گئی تھی تو وہ بھی دیکھ لی۔ نینا چونکی۔ ''مافیا مین...... تم لوگوں کا تعلق جرائم پیشہ مافیا سے ہے۔''

''لڑکی......!'' لوسز ویل غرایا مگر نینا اس کی بات سنے بغیر اٹھ کر کمرے سے نکل گئی۔ جمی اس کے پیچھے لپکا۔ اس دوران میں مکان بھر گیا تھا۔ باہر لان تک میں لڑکے لڑکیاں جمع تھے اور لگ رہا تھا کہ ان میں مزید اضافہ ہوگا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو جمی خوش ہوتا مگر اس وقت اسے نینا کا پیچھا کرنے میں دقت ہو رہی تھی اور اسے اس ہجوم پر غصہ آ رہا تھا۔ بہ مشکل وہ لان میں اسے روکنے میں کامیاب رہا تھا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ اس سے کچھ کہتا، کسی نے اس کا بازو پکڑا۔ یہ کورنیلا تھی۔ وہ مسکرائی۔

''ہائے ہینڈسم! تم اس دن کے بعد سے نظر ہی نہیں آئے۔''

نینا نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ سڑک پر پولیس کار کی روشنیاں چمکیں اور پولیس والے اتر کر اندر آئے۔ پیچھے مزید پولیس کار آ رہی تھیں۔ جمی، نینا کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ بالکل تیار نہیں تھی۔ اچانک اس نے اپنا بیگ گھمایا اور جمی بروقت جھکا مگر اس کے پیچھے آنے والا پولیس مین نہیں جھک سکا اور پرس اس کے سر پر لگا۔ شہاب ثاقب کا ٹکڑا یقیناً خاصا وزنی تھا اور پولیس مین چکرا کر نیچے گرا۔ اس کے بعد ایک ہنگامہ ہو گیا۔ وہاں موجود لڑکے لڑکیاں سمجھے کہ پولیس نے پارٹی پر چھاپا مارا ہے، وہ سب نکل بھاگنے میں لگ گئے۔ اوپر سے مسز روب بھی آ گئی تھی اور اس نے کورنیلا کو جمی کے ساتھ دیکھا تو اس سے لڑ پڑی۔ ذرا دیر میں وہاں فری اسٹائل ریسلنگ شروع ہو چکی تھی اور تماشائیوں میں پولیس والے بھی شامل تھے۔ جمی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟

پولیس کی مزید نفری آنے پر ہنگامہ ختم ہوا۔ لڑکے لڑکیوں سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا۔ اصل میں پولیس لوسز ویل کے پیچھے آئی تھی اور اس کے ساتھ جو گرفتار ہوئے ان میں مسز روب، کورنیلا اور نینا بھی شامل تھے۔ جمی بچ گیا تھا کیونکہ اس نے کچھ نہیں کیا تھا۔ اچانک ایک طرف سے بگ گائے نمودار ہوا اور جمی کی طرف لپکا۔ اس نے نزدیک آتے ہی اسے گھونسا مارنے کی کوشش کی اور جمی اس بار بھی بروقت جھکا تھا۔ اس پولیس مین کی کم بختی آئی جو آئس پیک سے اپنے مضروب سر کی سکائی کر رہا تھا۔ بگ گائے کا گھونسا

اسے لگا اور وہ ایک بار پھر گر گیا۔ اس بار ہتھکڑیاں بگ گائے کو لگیں جو جمی کو دھمکیاں دے رہا تھا۔ اسی اثنا میں میڈیا پہنچنا شروع ہو گیا۔ لوسز ویل کی گرفتاری معمولی بات نہیں تھی۔ مگر وہ اس کی چند تصویریں ہی لے سکے تھے کہ پولیس اسے لے گئی۔ پھر انہوں نے ویل فیملی کا رخ کیا اور جمی ان میں مقبول ہو گیا کیونکہ رپورٹرز زیادہ تر خواتین تھیں۔ جمی ان میں گھرا ہوا وضاحت کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہاں ہوا کیا تھا۔ مگر نینسی نے ان سب کو وہاں سے دفع ہو جانے کا حکم دیا اور زبردستی جمی اور مائز کو اندر لے آئی۔ گھر کا حشر ہو رہا تھا۔ جمی نے نینسی سے پوچھا۔ ”اب یہ کون صاف کرے گا۔“

”بھاڑ میں جائے یہ گھر اور تم۔“ نینسی نے جواب دیا۔ پارٹی خراب ہونے سے اس کا موڈ بھی خراب ہو رہا تھا۔ مائز رقم گن رہا تھا جو اتنی نہیں تھی کہ اس سے ہونے والا خرچ پورا ہو جاتا۔ نینسی نے رو دینے والے لہجے میں کہا۔ ”اب میں یونیورسٹی کیسے جاؤں گی؟“

”میرے جرم کی فیس۔“ مائز کراہا۔

جمی، نینا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس پر سنگین چارج لگ سکتا تھا۔ اس نے ایک پولیس والے کو زخمی کیا تھا۔ اگلی صبح سویرے پولیس نے اسے بیان کے لیے طلب کر لیا۔ وہ پولیس اسٹیشن پہنچا تو وہاں ایک لائن سے لاک اپ میں مسز روب، بگ گائے، نینا اور لوسز ویل بند تھے۔ کورنیلا چھوٹ کر جا چکی تھی۔ اس نے اپنی وکالت کا فائدہ اٹھایا اور اپنی ہی ضمانت پر رہا ہو گئی۔ بگ گائے نے اسے دیکھتے ہی شور مچایا اور دھمکیاں دیں۔ ”میں ایک بار چھوٹ جاؤں تو جلد یہاں واپس آؤں گا اور اس بار اس شخص کو قتل کرنے کے جرم میں آؤں گا۔“

جمی، مسز روب کے لاک اپ تک آیا تو اس نے بھی شرربار نظروں سے جمی کی طرف دیکھا اور غرا کر بولی۔ ”خبیث لڑکے، ایک بار میں یہاں سے نکل جاؤں تو تمہاری صورت بھی نہیں دیکھوں گی۔“

”میں شکر گزار ہوں گا۔“ جمی مسکرایا اور اگلے لاک اپ کی طرف بڑھا جہاں نینا پاؤں بستر کے اوپر سمیٹے اور گھٹنوں سے منہ لگائے بیٹھی تھی۔ جمی نے آہستہ سے کہا۔ ”نینا.....“

”چلے جاؤ یہاں سے، میں تمہاری صورت نہیں دیکھنا چاہتی۔“ وہ بولی، اس نے جمی کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ ”مجھے معلوم ہے یہ میری غلطی ہے لیکن تم غلط سمجھ رہی ہو۔“

”جمی میں بالکل ٹھیک سمجھ رہی ہوں۔“ وہ اٹھ کر سلاخوں کے پاس چلی آئی۔ ”مجھے تمہارے فیملی بیک گراؤنڈ سے دلچسپی نہیں ہے۔ ممکن ہے تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن جمی، تم غیر ذمے دار ہو۔ تمہارے اردگرد جو ہوتا رہے تم اس کی ذمے داری قبول نہیں کرتے ہو۔ ایسے شخص پر کس طرح بھروسا کیا جا سکتا ہے کہ وہ مستقبل کی کوئی ذمے داری پوری کرے گا یا نہیں۔“

جمی سر جھکائے کھڑا رہا پھر اس نے سرد آہ بھری۔ ”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ کیا میں تمہارے لیے کچھ کر سکتا ہوں؟“

”شکریہ۔“ نینا کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ”تم پہلے ہی میرے لیے بہت کچھ کر چکے ہو۔“

آخر میں جمی، لوسز ویل کے لاک اپ تک آیا۔ اس نے جمی کو دیکھا اور سلاخوں کے پاس آ کر دھیمے لہجے میں بولا۔ ”تم اٹھارہ سال کے ہو گئے ہو؟“

”نہیں۔“ جمی نے کہا۔ ”اگلے سال ہو جاؤں گا۔“

”تم کبھی اٹھارہ سال کے نہیں ہو سکو گے۔“ لوسز ویل نے پیشگوئی کی۔ ”اس سے پہلے دنیا سے رخصت ہو جاؤ گے۔“

جمی جانتا تھا وہ مافیا مین تھا اور اپنے الفاظ پر عمل کرنے کی قدرت رکھتا تھا۔ مگر فی الحال وہ لاک اپ میں تھا۔ پولیس نے اسے کار کی ڈکی سے ملنے والے زخمی شخص کین میڈ کے بیان پر گرفتار کیا تھا۔ کین کا کہنا تھا کہ وہ چھوٹے درجے کا منشیات فروش ہے اور اس پر لوسز ویل کا ادھار چڑھ گیا تھا۔ بعض وجوہات (جوا اور کال گرلز) کی بنا پر وہ قرض اتار نہیں سکا تھا اس لیے لوسز ویل نے اسے اٹھوالیا۔ تشدد کا نشانہ بنایا اور پھر اس کی لاش دریا میں پھینکنے کا حکم دیا مگر اس کے آدمی غلط فہمی میں اسے اس کار کی ڈکی میں ڈال گئے جو سروس کے لیے ورکشاپ جا رہی تھی۔ وہاں مزید غلط فہمی کے باعث یہ جمی کے پاس پہنچ گئی اور پولیس نے کار زخمی سمیت پکڑ لی۔ جمی کے پاس لوسز ویل کی دھمکی کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس لیے وہ خاموشی سے سر جھکا کر وہاں سے چلا آیا۔ وہ گھر پہنچا تو نینسی اور مائز نے حیرت انگیز طور پر سب صاف کر دیا تھا اور بالکل نہیں لگ رہا تھا کہ رات یہاں ایک ہنگامہ خیز پارٹی ہوئی تھی۔ مگر وہ دونوں صوفے پر بیٹھے تھے اور یک ٹک فون کے کورڈلیس کو گھور رہے تھے۔

”کیا ہو رہا ہے؟“ جمی نے پوچھا۔

”انتظار۔“ نینسی نے کہا۔

”کس کا؟“

اسی لمحے فون کی گھنٹی بجی اور نینسی کے ساتھ مائز بھی جھپٹا تھا مگر کورڈلیس نینسی کے ہاتھ میں آیا۔ مائز چلایا۔ ”کم آن نینسی میری باری ہے۔“

”اس کا انتظار کر رہے تھے۔“ نینسی نے کورڈلیس دکھایا اور کال ریسیو کی۔ ”ہیلو..... ہاں ہمارے ہاں ہوا تھا..... مکمل اسٹوری چاہتے ہو..... ٹھیک ہے پندرہ سو ڈالرز بھیج دو، اسٹوری مل جائے گی۔“

نینسی نے خوش خوش کورڈلیس واپس میز پر رکھا۔ جمی بولا۔ ”یہ کیا، تم اسٹوری پندرہ سو ڈالرز میں بیچ رہی ہو؟“

”نہیں ایک بار بارہ سو ڈالرز اور گیارہ سو ڈالرز میں بھی فروخت کر چکی ہوں۔“ نینسی نے مسرور لہجے میں کہا۔ ”امید ہے شام تک میں پارٹی کے مقابلے میں کہیں زیادہ کما چکی ہوں گی۔“

بیل پھر بجی اور تینوں جھپٹے لیکن کورڈلیس جمی کے ہاتھ میں آیا۔ مائز نے پاؤں پٹخے۔ ”میری باری ہے۔“

جمی نے اس پر توجہ دیے بغیر کال ریسیو کی تو ہیلو کے جواب میں دوسری طرف سے ریمس ویل کی غضب ناک آواز آئی۔ ”جمی..... یہ تم ہو؟“

”نہیں..... ہاں۔“ اس نے بوکھلا کر کہا۔

”تم نے مجھے مروا دیا ہے۔“ ریمس رونے والے انداز میں غرایا۔ ”یہاں رومانیہ کی پولیس نے مجھے گرفتار کر لیا ہے اور مجھ پر منشیات کی اسمگلنگ کا چارج لگا رہی ہے۔“

”ڈیڈ! کیا آپ سچ مچ منشیات اسمگل کرتے ہیں؟“

”ہرگز نہیں۔“

نینسی اور مائز خوش تھے کہ یہ بلا جمی کے سر پڑی تھی۔ جمی نے کہا۔ ”تب آپ چھوٹ جائیں گے فکر مت کریں۔“

ریمس پھٹ پڑا تھا۔ ”فکر نہ کروں۔ یہاں میرا بزنس تباہ ہو گیا ہے۔ منشیات کی تلاش میں پولیس نے صرف کارٹن نہیں الیکٹرانکس کو اندر سے بھی کھول کر دیکھا ہے۔ میرا ہزاروں ڈالرز کا نقصان ہوا ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ میں فکر نہ کروں۔ تم اپنی فکر کرو جب میں واپس آؤں گا۔ تم نے پولیس کو کیسے کہا کہ کار مجھے لوسز ویل نے تحفے میں دی ہے۔“

”مجھے کورنیلا نے کہا تھا۔“

”یہ کورنیلا کون ہے؟“

”ایک وکیل عورت۔“ جمی نے کہا اور اچانک بولا۔ ”ڈیڈی آپ کی آواز نہیں آ رہی۔ میرا خیال ہے لائن میں

دست بدست

ویت نام پر بھیجنے کے لیے فوجی بھرتی ہو رہی تھی۔ ایک نوجوان کا طبی معائنہ شروع ہوا تو اسے یقین تھا کہ وہ آنکھوں کے ٹیسٹ میں ناکام ہو جائے گا کیونکہ اس کی دور کی نظر بے حد کمزور تھی۔ جب ڈاکٹر نے اس سے کہا کہ چارٹ پڑھو تو اس نے بتایا کہ اسے چارٹ پر کچھ نظر ہی نہیں آ رہا ہے۔

ڈاکٹر نے اسے ایک قدم اور آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ وہ وہاں سے بھی نہ پڑھ سکا۔ ڈاکٹر اسے آگے بڑھاتا رہا، یہاں تک کہ چارٹ اور نوجوان کے درمیان صرف دو فٹ کا فاصلہ رہ گیا۔

”ٹھیک ہے۔“ ڈاکٹر نے اسے پاس کرتے ہوئے کہا۔ ”تم دست بدست لڑائی میں تو کام آ ہی جاؤ گے۔“

روبینہ حمید..... راول پنڈی

یزید اور بایزید

ایک دن مرزا غالب کے دسترخوان پر کھانا آیا تو برتن بہت تھے اور کھانا کم تھا۔ غالب نے کہا۔

برتنوں کی کثرت کے لحاظ سے تو میرا دسترخوان یزید کا دسترخوان معلوم ہوتا ہے اور کھانے کی مقدار کو دیکھتا ہوں تو بایزید کا دسترخوان ہے۔“

(بایزید ایک بہت بڑے ولی اور بزرگ کا نام ہے)

ناصر شیخ..... مانسہرہ

معصوم

ایک دس سالہ بچے نے اپنی والدہ سے پوچھا۔ ”ممی الیڈی ڈیانا کو کیسے معلوم ہوا کہ ان کے ہاں بچہ پیدا ہونے والا ہے۔“

ماں کے جواب دینے سے پہلے اس کی پانچ سالہ بہن بول اٹھی۔

”کیا وہ پڑھ نہیں سکتی تھی۔ یہ بات تو تمام اخباروں میں چھپی تھی۔“

امداد اللہ، سوکڑی کریم خان، بنوں

کوئی مسئلہ ہے۔'' اس نے کہتے ہوئے لائن کاٹ دی اور کورڈ لیس واپس میز پر رکھ دیا۔ اس نے نینسی اور مائز کی طرف دیکھا۔ ''تم دونوں نے مام کا معلوم کیا ہے؟''

''نہیں، ہم تو کل سے اب تک بہت مصروف رہے۔'' نینسی ندامت سے بولی۔ جمی نے انہیں گھور کر دیکھا اور گھر سے نکل گیا۔ وہ اسپتال پہنچا۔ اسے معلوم تھا کہ لوسی کہاں داخل تھی۔ یہ ایک سیمی پرائیویٹ روم تھا۔ اس میں پردوں کی مدد سے حصے بنائے گئے تھے۔ جمی اندر آیا تو ایک موٹی سی سیاہ فام نرس بستر کی چادر بدل رہی تھی اور بستر خالی تھا۔ اس نے گھبرا کر پوچھا۔

''یہاں جو خاتون تھی وہ کہاں گئی؟''

''اس کا انتقال ہو گیا۔'' نرس نے جواب دیا۔ اس نے اتاری ہوئی چادر باسکٹ میں ڈالی۔ جمی کو لگا اس کا سر گھوم گیا ہو، اس نے نرس کی بات دہرائی۔

''انتقال ہو گیا مگر کیسے؟''

''اس کا بچہ ضائع ہو گیا تھا اور وہ خود بھی نہیں بچ سکی۔''

اس بار جمی کا سر زیادہ گھوما تھا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کی مام اس عمر میں امید سے ہوگی۔ نرس نے اسے ہمدردی سے دیکھا۔ ''آئی ایم سوری سن، لیکن اس دنیا سے سب کو جانا ہے۔ اس کا وقت آ گیا تھا۔''

وہ چلی گئی اور جمی سر تھام کر بستر سے ٹک گیا۔ اس کے آنسو بہنے لگے تھے۔ اس نے خود سے کہا۔ ''مام مر گئیں۔''

''میں زندہ ہوں ایڈیٹ۔'' پردے کے دوسری طرف سے آواز آئی۔ ''تم غلط بیڈ پر چلے گئے ہو یہاں آؤ۔''

جمی کو ایک بار پھر اپنے حواس پر دھوکا ہوا اور وہ جھپٹ کر پردے کے دوسری طرف آیا جہاں لوسی بیڈ پر نیم دراز تھی اور بالکل ٹھیک نظر آ رہی تھی۔ ''مام آپ ٹھیک ہیں؟'' اس نے لوسی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کی آواز لرز رہی تھی اور آنکھوں میں آنسو بھی لرز رہے تھے۔

''ہاں میں ٹھیک ہوں۔''

''بالکل نہیں۔'' اندر آنے والی نرس نے کہا۔ ''تمہیں آرام کی اشد ضرورت ہے اور دوا کا وقت ہو گیا ہے۔'' اس نے کہتے ہوئے ڈرپ کی تھیلی میں انجکشن خالی کیا اور چند لمحے بعد لوسی کا سر تکیے پر ڈھلک گیا۔ نرس واپس گئی تو لوسی نے سر اٹھا کر دیکھا اور ٹیپ کے نیچے دبا کینولا نکال باہر کیا۔ اس کی سوئی پہلے ہی باہر تھی۔

''یہ ڈاکٹر احمق ہوتے ہیں۔ اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' اس نے اپنا پرس اٹھا کر اس میں سے لپ اسٹک نکال کر ہونٹوں پر لگائی۔ پھر بُندے نکال کر پہننے لگی۔ ''جمی تم اچھے نوجوان ہو مگر اپنے باپ کی طرح ذمے داری سے گھبراتے ہو۔ میرے تمام بچے اس معاملے میں باپ پر گئے ہیں۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں مام۔'' جمی نے اعتراف کیا۔ اسے نینا کی بات یاد آ گئی۔ ''ہم سب غیر ذمے دار ہیں لیکن میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اب ذمے دار بننے کی کوشش کروں گا۔''

''مجھے تم سے ہی کچھ امید ہے جمی۔'' لوسی نے پرس سے ایک مزا انترا سگریٹ نکال کر ہونٹوں سے لگایا اور سلگا کر ایک کش لیا۔ اس کے چند لمحے بعد وہ سو چکی تھی۔ جمی مسکرایا اس نے لوسی کے منہ سے سگریٹ نکال کر ڈسٹ بن میں ڈالا اور اس کے رخسار پر پیار کر کے کھڑا ہو گیا۔ اس نے دعویٰ تو کر دیا تھا کہ اب وہ ذمے دار بنے گا۔ مگر سامنے جو مسائل نظر آ رہے تھے ان سے نمٹنے کا کوئی طریقہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اول نینا اس سے خفا ہو گئی تھی اور وہ بہت سنجیدگی سے خفا تھی۔ دوسرے بگ گائے اس کے درپے تھا۔ لیکن سب سے بڑا خطرہ لوسز ویل تھا۔ اسے ان سب سے نمٹنا تھا لیکن سب سے پہلے اسے نینا کو پولیس اسٹیشن سے نکالنا تھا، اسے ایک ہی راستہ نظر آیا۔ وہ کچھ دیر بعد کورنیلا کے دفتر میں تھا۔ وہ یوں نک سک سے تیار تھی جیسے رات پولیس اسٹیشن میں گزارنے کے بجائے آرام سے اپنے گھر میں سوتی رہی ہو۔ جمی کو دیکھ کر وہ کھل اٹھی اور اس نے کہا۔

''میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔''

''میرا انتظار، کیوں؟''

''تم میرے مقروض ہو۔''

''وہ کیسے؟'' جمی نے اعتراض کیا۔

''میں نے تمہیں پولیس سے رہائی دلوائی تھی۔''

''ہاں لیکن اس کے لیے میں نے تم سے نہیں کہا تھا تم خود آئی تھیں۔''

''میں آئی تو کسی اور کام سے تھی لیکن تمہیں دیکھ کر مجھے ترس آ گیا اور میں نے تمہاری ضمانت کرائی۔''

''تب میں تمہارا مقروض نہیں ہوا۔'' جمی نے فاتحانہ انداز میں کہا تو کورنیلا کا منہ لٹک گیا تھا۔

''تب تم کیوں آئے ہو؟''

''میں تمہارا مقروض ہونے آیا ہوں۔'' اس بار جمی نے منہ لٹکا کر کہا۔ ''تمہیں نینا کو رہا کرانا ہے۔''

''میں کرا لوں گی۔'' وہ چہک کر بولی۔ ''اس کے بدلے صرف دو ہزار ڈالرز فیس لوں گی۔''

''میرے پاس ایک ہزار ڈالرز بھی نہیں ہیں۔''

''او کے تب تم آنے والے پانچ سال تک ہر ویک اینڈ میرے ساتھ گزارو گے۔ ویک اینڈ سے مراد ہے پورا ایک دن اور رات۔''

''مجھے منظور ہے۔''

''تب اس پر سائن کر دو۔'' کورنیلا نے ایک اسٹامپ پیپر نکال کر اس کے سامنے رکھا۔

''یہ کیا ہے؟''

''اس کے مطابق تم نے مجھ سے دو ہزار ڈالرز قرض لیے ہیں۔''

جمی نے کاغذ دیکھا اور اس پر سائن کر دیے۔ ''تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے؟''

''بالکل نہیں، اب چلیں۔''

ایک گھنٹے بعد نینا لاک اپ سے باہر تھی اور پولیس نے اس کی عمر کے پیش نظر اس پر سے چارج واپس لے لیا تھا مگر جمی جانتا تھا کہ یہ کورنیلا کی وجہ سے ہوا تھا۔ وہ نہایت قابل وکیل تھی اور جانتی تھی کہ پولیس سے کام نکلوانے کے لیے کون سی رگیں دبائی جا سکتی ہیں۔ جمی سامنے نہیں آیا تھا۔ وہ نینا کو شرمندہ کرنا نہیں چاہتا تھا اور ویسے بھی اس نے کہہ دیا تھا کہ وہ اس کے سامنے نہ آئے۔ نینا کے جانے کے بعد وہ کورنیلا کے پاس آیا تو اس نے اسے یاد دلایا۔ ''کل ویک اینڈ ہے اور تم یہاں آؤ گے۔'' اس نے جمی کو اپنا ایک کارڈ تھما دیا جس کی پشت پر ایک پتا لکھا ہوا تھا۔ جمی نے ٹھنڈی سانس لی۔

''میں آؤں گا۔''

اب کرنے کو کچھ نہیں تھا اور اسے گھر جانا تھا۔ مگر وہ گھر سے کچھ دور تھا کہ ایک سنسان گلی میں بگ گائے نے اسے گھیر لیا۔ جمی سر جھکائے خیالوں میں گم جا رہا تھا اور اس نے بگ گائے کو اس وقت دیکھا جب وہ بالکل سامنے آ چکا تھا۔ فرار کا راستہ بھی نہیں تھا۔ بگ گائے خوفناک انداز میں مسکرایا۔ ''ہیلو جمی۔''

''ہیلو۔'' اس نے مردہ لہجے میں جواب دیا۔

''ہمارا کچھ حساب ہے، کیا خیال ہے وہ بے باق نہ کر لیا جائے۔'' کہتے ہوئے بگ گائے نے اس کا گریبان پکڑ کر اپنی طرف کھینچا مگر جو مکا وہ جمی کے منہ پر رسید کرنا چاہتا تھا وہ جیسے کسی شکنجے میں آ گیا اور وہیں جام ہو گیا۔ اس کا ہاتھ پکڑنے والا روزی تھا۔ وہ جسامت میں بگ گائے سے بھی دگنا تھا اور مار پیٹ کے سلسلے میں اس سے کہیں زیادہ تجربہ بھی رکھتا تھا۔ اس کے ساتھ اسپانک تھا۔ وہ دونوں ٹیری کے گرگے تھے۔ روزی نے نرمی سے کہا۔ ''یہ باس کا شکار ہے۔''

بگ گائے فوراً اس سے دست بردار ہو گیا۔ اس نے چہک کر جمی سے کہا۔ ''سنا تم نے، تم ٹیری کا شکار ہو۔''

اس نے جمی کا گریبان چھوڑ دیا مگر روزی نے اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا بلکہ اسے مروڑا تو بگ گائے چلا اٹھا تھا۔ روزی نے بدستور نرم لہجے میں کہا۔ ''سر عام یوں باس کا نام لینا بالکل مناسب نہیں ہے، امید ہے تم سمجھ جاؤ گے۔'' اس نے کہتے ہوئے بگ گائے کا ہاتھ مزید مروڑا تو اس سے ٹہنی چٹخنے جیسی آواز آئی تھی۔ جب وہ وہاں سے روانہ ہوئے تو بگ گائے اپنا ہاتھ پکڑ کر رو رہا تھا۔ کم سے کم اس کی کلائی ضرور اتر گئی تھی۔ مگر جمی کو اس کے بجائے اپنی فکر تھی۔ ٹیری نے جس طرح اسے طلب کیا تھا، لگ رہا تھا کہ اس کی مہلت ختم ہو گئی تھی۔ اس کا اندازہ درست ثابت ہوا جب اس کا ہاتھ لیتھ مشین کے شکنجے میں جکڑ کر ٹیری نے بڑا والا ہتھوڑا اٹھایا۔ جمی کی حالت غیر ہو گئی تھی۔ اس نے چلا کر کہا۔

''ٹیری خدا کے لیے تم جانتے ہو، میں نے تم کو دھوکا نہیں دیا۔ میں وولف سے کیسے رقم نکلواتا۔''

''میں یہ سب نہیں جانتا۔'' ٹیری نے پیار سے اس کی انگلیاں سہلائیں۔ ''ان کو آخری بار سلامت دیکھ لو دوست، اس کے بعد یہ بیکار ہو جائیں گی اور ہو سکتا ہے ڈاکٹر کو انہیں کاٹنا پڑے۔''

ٹیری نے ہتھوڑا اٹھایا تو جمی رونے لگا تھا۔ ''او کے میں مانتا ہوں، یہ میری غلطی ہے۔ میں نے کام بھگتایا، مجھے وولف سے پہلے رقم لینی چاہیے تھی اور پھر اسے مال دیتا۔''

ٹیری مسکرایا۔ ''میں تم سے یہی تو سننا چاہ رہا تھا۔'' اس نے کہا اور ہتھوڑا گھما کر جمی کے ہاتھ پر مارا۔ کم سے کم جمی کو ایسا ہی لگا تھا۔ اس کے منہ سے ایک زوردار چیخ نکلی مگر جب کوئی درد نہیں ہوا تو اس نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ کی طرف دیکھا۔ وہ صحیح سلامت تھا۔ ٹیری نے ہتھوڑا میز پر مارا تھا۔ اس نے لٹو گھما کر جمی کا ہاتھ شکنجے سے آزاد کیا تو وہ بے ساختہ اس سے چمٹ گیا۔

''تھینک یو ٹیری۔''

ٹیری نے اس کا شانہ تھپکا۔ ''ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے۔ تم ہزار ڈالرز آرام سے دینا۔ بے شک قسطوں میں دینا اور ہاں بگ گائے کی فکر مت کرنا، اب وہ تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی

نہیں دیکھے گا۔ بے شک تم اس کے سامنے تینا کو کس کرو۔"

جمی کو لگا کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے کیونکہ میری اپنی رقم کے معاملے میں سود خور یہودیوں سے کم نہیں تھا۔ وہ معاف کرنے کا تو قائل ہی نہیں تھا اس لیے جمی کو اسے رقم دینی تھی۔ چار میں سے تین معاملات نمٹ گئے تھے۔ اب صرف لوسز ویل کا چکر رہ گیا تھا اور وہ سب سے خطرناک آدمی تھا۔ جمی کو اس لفافے کا خیال آیا جو اس نے لوسز ویل کی گاڑی کے خفیہ خانے سے نکالا تھا اور وہ اب تک اس کی جیکٹ میں پڑا تھا۔ اس نے ایک کیفے میں بیٹھ کر لفافہ کھولا تو اس میں سے ایک پرنٹ شدہ صفحہ نکلا۔ اس پر ترتیب سے کوئی ایک درجن نام، ان کے آگے یورو میں رقم، بینک اکاؤنٹ نمبرز اور فون نمبرز لکھے ہوئے تھے۔ جمی نے نمبروں پر غور کیا تو یہ مشرقی یورپ کے چار ملکوں کے ثابت ہوئے۔ ان میں ایک رومانیہ تھا۔ دوسرا بلغاریہ، تیسرا ہنگری اور چوتھا البانیہ۔ بینک اکاؤنٹس اور ان سے پہلے لکھی رقم قابل توجہ تھی۔ ان میں سے کوئی رقم بھی ایک لاکھ یورو سے کم نہیں تھی۔

جمی نے اپنی جیب ٹٹولی تو اس کے پاس کل سترہ ڈالرز اور پچاس سینٹ تھے۔ اس نے ایک اسٹور سے کالنگ کارڈ کا پوچھا جس کی مدد سے وہ مشرقی یورپ کم ریٹس میں کال کرسکتا تھا۔ اسٹور کیپر نے اسے ایک کارڈ دیا۔ جو دس ڈالرز کا تھا اور اس سے وہ مشرقی یورپ کے ممالک میں کل سو منٹ بات کرسکتا تھا۔ وہ ایک فون بوتھ تک آیا۔ اس نے کارڈ کی مدد سے پہلا نمبر ملایا اور دوسری طرف سے کسی نے رومانوی زبان میں بات کی۔ جمی نے انگریزی پر اصرار کیا تو کوئی انگریزی داں آگیا۔ اس سے چند منٹ کی گفتگو کے بعد جمی نے دوسرا، پھر ایک ایک کرکے سارے نمبر ملائے اور ان پر دستیاب ہونے والے افراد سے بات کی۔ چھ نمبروں پر انگریزی بولنے والے دستیاب ہوگئے تھے۔ ان سے بات کرکے ایک خیال جمی کے دماغ میں پرورش پانے لگا۔ مگر کچھ غور و خوض کے بعد اس نے یہ خیال مسترد کر دیا۔ اس کے بجائے اس نے ایک اور آئیڈیے پر غور کیا اور اسے موزوں پایا۔

☆☆☆

وولف کا غصے سے برا حال تھا کیونکہ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ اس کی تمام بارگرلز ایک ساتھ غائب ہوئی تھیں اور اسے یہ بھی معلوم ہوگیا تھا کہ وہ کہاں غائب ہوئی تھیں۔ اس نے نینسی کو فائر کر دیا تھا مگر وہ آئی ہی نہیں اور باقی لڑکیوں نے نہایت ڈھٹائی سے جھوٹ بولے۔ وہ کسی طرح ان کے جھوٹ نہیں پکڑ سکتا تھا اور نہ ہی سب کو فائر کرسکتا تھا اس لیے خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا تھا۔ اسے شبہ تھا کہ اس نے جمی کو ہزار ڈالرز نہیں دیے تھے تو اس کی بہن نے یوں اس سے انتقام لیا تھا۔ اس کا نقصان کہیں زیادہ تھا۔ وہ انتقام لینے کا سوچ رہا تھا۔ اس لیے جب اسے جمی کی آمد کی اطلاع ملی تو اس کی باچھیں کھل گئیں۔ بہن نہ سہی بھائی سہی۔ اس نے فوراً جمی کو اندر بلا لیا۔ جمی نے اس کی صورت دیکھی مگر خوفزدہ ہوئے بغیر بولا۔ "میں تم سے اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔"

جمی کے پیچھے وولف کا خطرناک صورت اور دیو قامت گرگا کھڑا ہوا تھا۔ وولف نے اسے دفع ہونے کا اشارہ کیا اور اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "تمہارے لیے میں کافی ہوں۔"

گرگے کے جاتے ہی جمی نے دونوں ہاتھ آگے کیے اور میز کے دوسری طرف آیا۔ "مسٹر وولف میری بات سن لو میں تمہارے فائدے کے لیے کچھ لایا ہوں۔"

"میں ضرور سنوں گا لیکن پہلے میں اپنے دل کی بھڑاس نکال لوں۔" وولف نے آستینیں اوپر کرتے ہوئے کہا۔ وہ جمی کے ساتھ ساتھ میز کے گرد گھوم رہا تھا۔

"اس صورت میں تم بہت بڑے فائدے سے محروم رہ جاؤ گے۔"

"کتنے بڑے فائدے سے؟"

"ممکنہ طور پر لاکھوں ڈالرز کے فائدے سے۔"

لاکھوں ڈالرز کی بات نے وولف کو رکنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔ "تم نشے میں تو نہیں ہو، لاکھوں ڈالرز کا مطلب سمجھتے ہو؟"

"ہاں میرے پاس ایک چیز ہے، میں اسے خود سے استعمال نہیں کرسکتا کیونکہ میں ایک عام کمزور سا لڑکا ہوں لیکن تمہارے جیسا مضبوط اور نڈر آدمی اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔"

"کیا چیز ہے؟"

"پہلے ڈیل ہوگی۔" جمی نے کہا۔ "اس کے بعد میں تمہیں دکھاؤں گا۔"

"کیسی ڈیل؟"

"مجھے اس کے بدلے بیس ہزار ڈالرز چاہئیں۔"

اب وولف بھی متجسس ہوگیا تھا۔ "ایسی کیا چیز ہے؟"

"اگر تم اس چیز کے بدلے بیس ہزار ڈالرز دینے کو تیار ہو تو میں بتا سکتا ہوں، چیز میرے پاس نہیں ہے وہ میں تمہیں رقم لے کر ہی دوں گا۔"

"کیا چیز ہے؟" وولف نے اس بار سر ہلایا۔

جمی اسے بتانے لگا کہ وہ کیا چیز ہے۔ اس نے کاغذ پر لکھا کوئی نام، نمبر اور بینک اکاؤنٹ نہیں بتایا تھا مگر جو بتایا تھا اسے سن کر وولف کی دلچسپی مزید بڑھ گئی۔ "تمہارا خیال ہے اس چیز کے بدلے لوسز ویل منہ مانگی رقم دے گا؟"

"بالکل ورنہ وہ ساری عمر کے لیے جیل جائے گا۔ یہ اس کے جرائم کا واضح ثبوت ہے۔"

وولف نے میز کی دراز کھولی اور اس سے ایک پستول نکال کر جمی کی طرف کر دیا اور سرد لہجے میں بولا۔ "میں رقم دوں گا لیکن اگر اس میں دھوکا ہوا تو تم یہ رقم استعمال کرنے کے لیے زندہ نہیں رہو گے۔"

"مجھے..... منظور ہے۔" جمی نے خشک لبوں پر زبان پھیر کر کہا۔

☆☆☆

جمی بڑا سا بیگ شانے سے لٹکائے اسپتال میں داخل ہوا تو اس نے غور نہیں کیا کہ ریسیپشن پر تینا بھی بیٹھی ہوئی تھی اور اس نے اسپتال کا مخصوص یونیفارم پہن رکھا تھا۔ وہ لوسی کے کمرے میں آیا تو وہاں نینسی اور مائر پہلے سے موجود تھے۔ ان کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ لوسی سے لیکچر سنتے رہے تھے۔ نینسی مایوس تھی کہ اس کی نوکری بھی گئی اور وہ اتنی رقم حاصل نہیں کرسکی جو یونیورسٹی میں داخلے کے لیے کافی ہوتی۔ لوسی نے اسے دیکھا اور طنزیہ انداز میں بولی۔ "آ گیا ایک اور عقل مند۔"

"ماما، میں عقل مند ہوں یا نہیں لیکن اب میں ذمے دار ضرور ہوگیا ہوں اور گھر کے مسائل کا حل نکالنے لگا ہوں۔"

"مثلاً؟" نینسی نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

جمی نے بیگ سے ایک بڑا سا لفافہ نکال کر اسے تھمایا۔ "مثلاً یہ..... اسٹین فورڈ یونیورسٹی میں تمہارا داخلہ ہوگیا ہے۔"

نینسی نے جلدی سے لفافہ کھول کر دیکھا اور چیخ ماری۔ "واؤ..... ! اب میں یونیورسٹی میں پڑھوں گی۔"

جمی نے بیگ سے دوسرا لفافہ نکالا جو کسی قدر چھوٹا تھا اور وہ اس نے مائر کی طرف بڑھایا۔ "یہ شارلی جم میں چھ مہینے کے کورس کا پیڈ بل ہے۔" مائر نے جھپٹنے کی کوشش کی مگر جمی نے ہاتھ پیچھے کر لیا۔ "شرط سن لو، اگر تم چھ مہینے میں اس قابل نہیں ہو سکے کہ کسی باڈی بلڈنگ مقابلے میں حصہ لے سکو تو تم اس چکر سے نکل جاؤ گے۔ منظور ہے؟"

مائر کچھ دیر اسے گھورتا رہا پھر بولا۔ "منظور ہے۔"

جمی نے اسے لفافہ دے دیا اور وہ بھی خوش نظر آنے لگا۔

لوسی اسے گھور رہی تھی۔ "میرے لیے اس پٹاری میں کیا ہے؟"

"ماما۔" جمی بولا۔ "میں ڈیڈی کو تبدیل نہیں کرسکتا۔ ہم سب بڑے ہوگئے ہیں اور ہماری اپنی مصروفیات ہیں۔ آنے والے دنوں میں ہم زیادہ مصروف ہوجائیں گے۔ نینسی یونیورسٹی چلی جائے گی۔ میں کسی کالج یا یونیورسٹی میں داخلہ لوں گا۔ مائر جم جائے گا اور آپ اکیلی ہوں گی اس لیے میں آپ کے لیے ایک مصروفیت لایا ہوں۔"

جمی نے بیگ کھولا اور اس میں سے ایک چھوٹا سا خوب صورت کتا نکال کر لوسی کی طرف بڑھایا تو اس نے اسے گود میں لے لیا۔ "بہت پیارا ہے، تھینک یو جمی۔"

"پینے پلانے سے جو وقت بچے آپ اس کی دیکھ بھال کیجیے گا۔"

لوسی کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ "شاید اب میں پینا چھوڑ دوں۔"

جمی کو بھی یہی امید تھی۔ اس نے لفافے سے نکلا اصل کاغذ لفافے سمیت وولف کو بیس ہزار ڈالرز کے عوض فروخت کر دیا تھا مگر اس نے اس کی ایک کاپی بنا کر ایف بی آئی والوں کو بھی بھیج دی تھی۔ اسے امید تھی کہ جلد یا بدیر پھندا نہ صرف لوسز ویل کے گرد کسے گا بلکہ وولف بھی اس کی لپیٹ میں آئے گا۔ یہاں آنے سے پہلے اس نے کورنیلا کو جب دو ہزار ڈالرز دیے اور اس سے اسٹامپ پیپر کا مطالبہ کیا تو اس کا چہرہ کچھ زیادہ ہی لٹک گیا تھا مگر اسے جمی کا مطالبہ پورا کرنا پڑا۔ کچھ دیر بعد وہ اسپتال سے نکلا اور سڑک پر آرہا تھا۔ حسب معمول اس کا دھیان کسی اور طرف تھا۔ اچانک اسے بچانے کے لیے ایک چھوٹا ٹرک تیزی سے مڑا اور اس پر لدے مرغیوں کے پنجرے کھل کر سڑک پر بکھر گئے۔ غصے سے بھرا ہوا ڈرائیور نیچے اترا۔ "احمق! تم آنکھیں بند کرکے سڑک عبور کر رہے تھے، ابھی مرتے۔"

"جمی..... !" عقب سے تینا کی آواز آئی۔ وہ اس کے پیچھے آئی تھی۔ "تم ٹھیک ہونا؟"

اس نے مڑ کر تینا کو دیکھا اور مسکرایا۔ "ہاں میں ٹھیک ہوں۔ میں ابھی تم سے بات کرتا ہوں، پہلے اس شریف آدمی کی مدد کر دوں جسے میری غلطی کا خمیازہ بھگتنا پڑ رہا ہے۔"

وہ بکھرے پنجروں کی طرف بڑھا۔ ڈرائیور انہیں اٹھا اٹھا کر ٹرک پر بار کر رہا تھا اور جمی اس کا ہاتھ بٹانے لگا۔ تینا اسے دیکھتے ہوئے زیر لب مسکرا رہی تھی۔
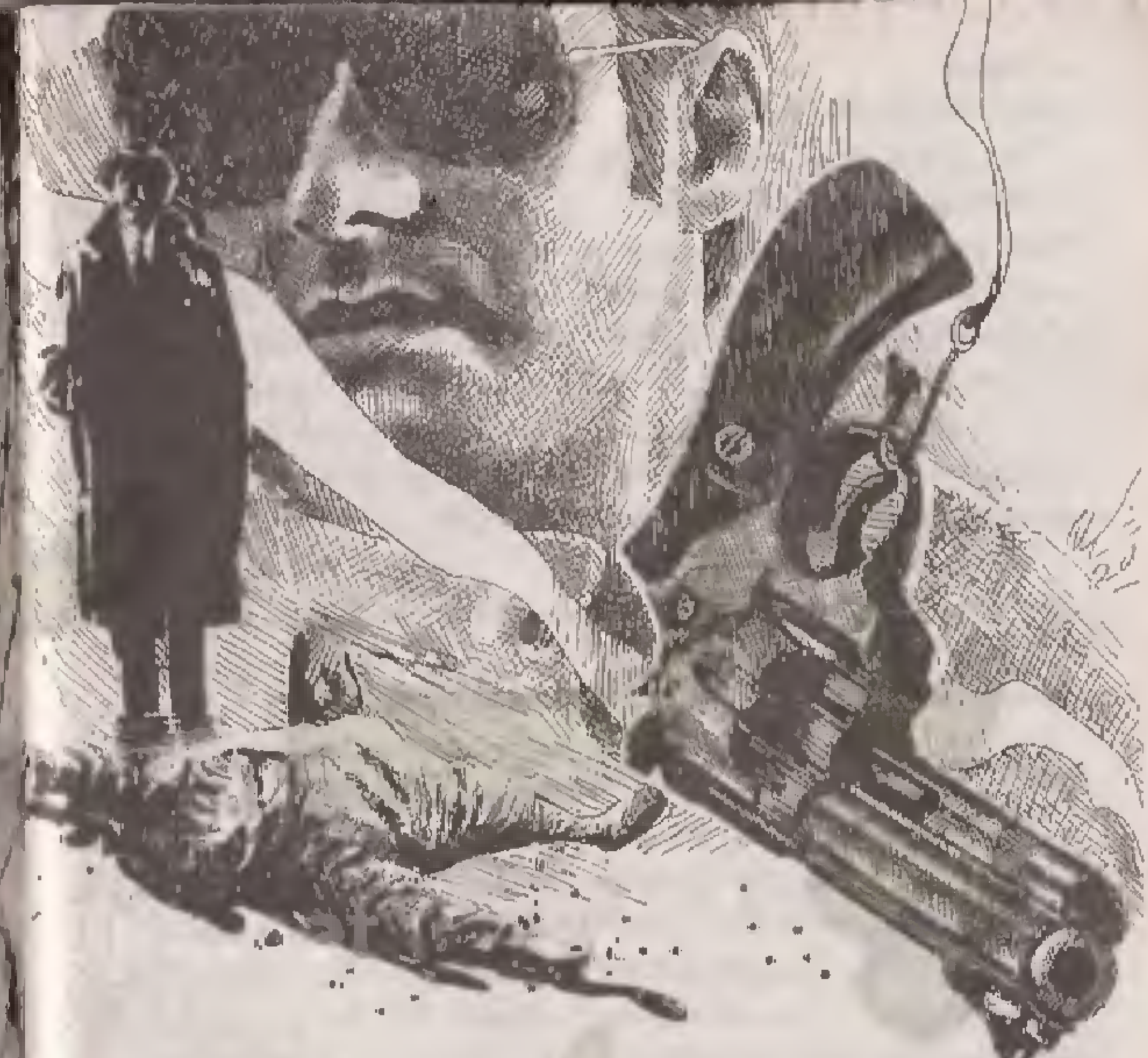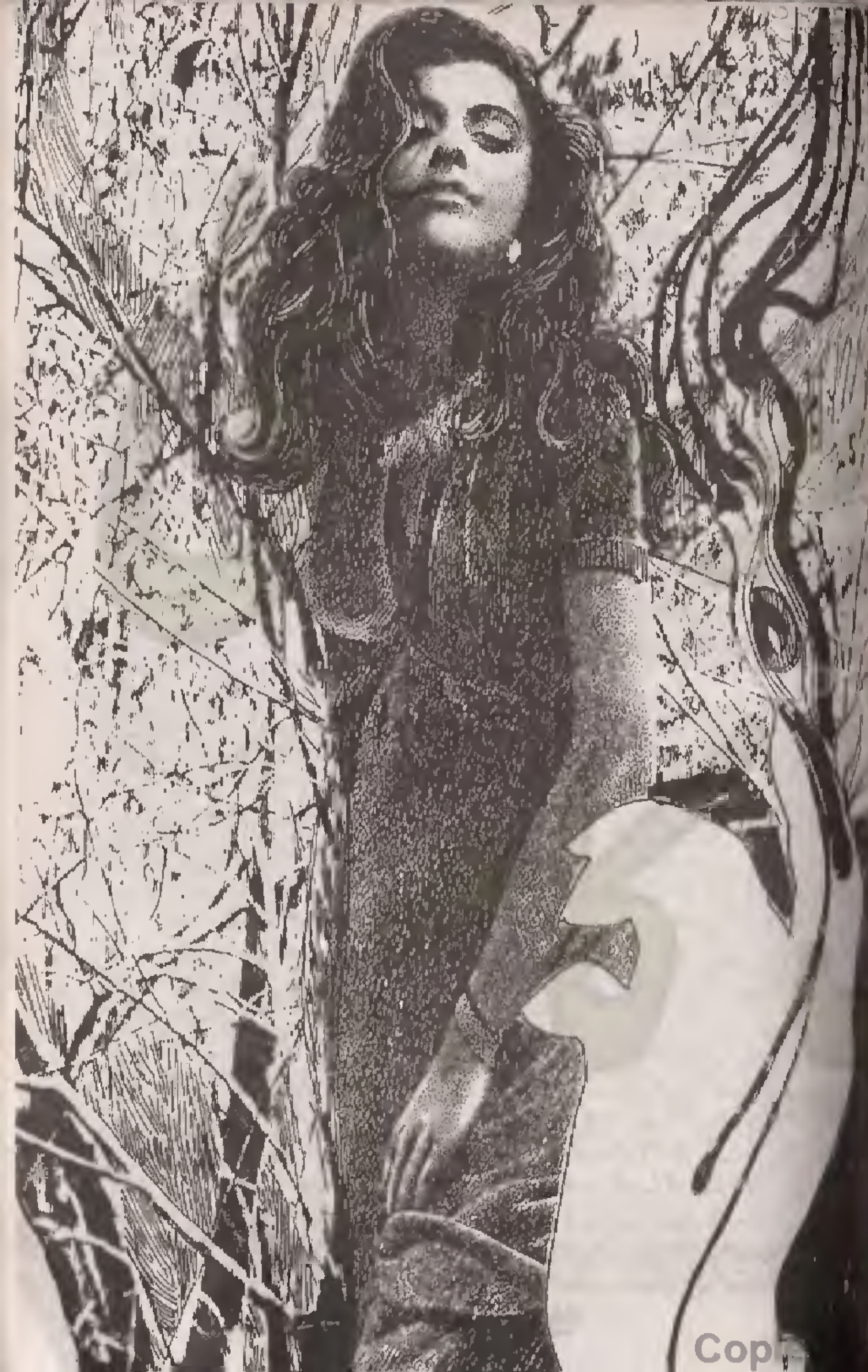
آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط : 9

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابلِ نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پُتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

میں بے ہوش نہیں ہوا تھا۔ میرے حواس مختل ہو گئے تھے۔ جس کا سبب میرے اعصاب کا یکلخت شل ہونا تھا۔ مجھ میں اپنے قدموں پر کھڑے رہنے کی طاقت نہ رہی تھی، دماغ ماؤف سا ہونے لگا تھا۔ یہاں تک کہ گرنے کا بھی مجھے احساس نہیں ہوا تھا۔ تاہم اس دوران میں، میں نے اپنے باپ کے یہ الفاظ سنے تھے۔

"ارے... ارے... اسے کیا ہو رہا ہے؟ یہ گر رہا ہے۔"

گویا بصری شہادت کے بعد سماعی تصدیق بھی ہو چکی تھی۔

میں فرش پر بچھے دبیز قالین پر اوندھے منہ پڑا لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ ابھی ہوش و خرد کو کچھ یارا تھا۔ اس طرح پڑا میں خود کو اپنے یکلخت شل پڑتے اعصاب کو، اپنے منتشر ہوتے دل و دماغ کو سکون پہنچانے کی، اپنے مختل پڑتے حواسوں پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا اور کافی حد تک کامیاب بھی ہو رہا تھا کہ اب میرے وجود کی طاقت بتدریج مجتمع ہو رہی تھی اور پھر حیرت انگیز طریقے سے میں رسن بستہ ہونے کے باوجود اپنی ٹانگیں اور گھٹنے سکیڑ کر ان کے سہارے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

اب میں وزیر جان کے سامنے تنا کھڑا تھا جبکہ اس کی ابھی الجھی ہوئی سی نظریں ہنوز میرے چہرے پہ جمی ہوئی تھیں، اس کے باقی ساتھی خاموش کھڑے تھے، ان کے بشروں پہ حیرت تھی۔ ہال کمرے کی دم بہ خود خاموشی میں وزیر جان کی کرخت اور چبھتی ہوئی آواز ابھری۔

"یہ کیا ڈراما تھا تمہارا؟"

میں آنکھیں پھاڑے اس شخص کو تکے جا رہا تھا جو میرا باپ تھا۔ میں اسے پہچان گیا تھا مگر وہ مجھے نہیں پہچان سکا تھا۔ وجہ معقول تھی، وہ اس وقت مکمل مرد تھا جب ایک سات، آٹھ سالہ بچے کو اطفال گھر کے منتظم کے حوالے کر گیا تھا۔ جوان ہونے تک اس آٹھ سالہ بچے کی شکل و صورت کافی حد تک تبدیل ہو جاتی ہے مگر ایک مکمل جوان مرد کے پختہ العمری تک پہنچنے پر شکل و صورت میں کچھ زیادہ فرق نہیں آتا، ماسوائے بالوں کی ہلکی سفیدی کے، اور پھر آواز تو بالکل بھی نہیں بدلتی، پھر بھلا اپنے باپ کی آواز اور شکل و صورت کو میں کس طرح بھلا سکتا تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس شخص کو، جو میرا باپ بھی تھا اور دشمن کے روپ میں میرے سامنے کھڑا تھا، کس طرح مخاطب ہوں؟ تب... اچانک میرے اندر کے جوار بھاٹے سے رقت کا ایک طوفان سا مچلا۔ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے عجیب اور ڈرامائی انداز میں کہا۔

"ابا! مجھے چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو؟ تم تو مجھے باہر گھمانے پھرانے کے لیے لائے تھے؟"

یہ آج سے پندرہ برس پہلے کا وہ معصومانہ جملہ تھا جو میں آج تک نہیں بھولا تھا اور یقیناً میرے باپ کو بھی اپنے لختِ جگر کی یہ معصومیت بھری آواز نہ بھولی ہوگی یا بھولی ہوگی تو بھی لاشعور سے اچانک ابھر کر یادداشت کے خانے میں سمائے گی ضرور... مگر نہیں، بھلا یہ بھی بھولنے والی بات کب تھی؟ ایک باپ جو اپنے لختِ جگر کو خود سے... اپنے ہاتھ کی شفقت بھری انگلی چھڑا کر کسی اور کے حوالے کرتا ہے... وہ یہ سب کیسے بھول سکتا ہے؟ یہی الفاظ تو درحقیقت ہم بچھڑے ہوئے باپ بیٹے کی دوری کے درمیان شناخت کی واحد ڈور تھی جبکہ وہ اس وقت خود بھی مجبور اور دکھی تھا۔

میں نے دوبارہ اپنی یادداشت کھنگال کر ایک جملہ اور دہرایا جو میرے باپ کا ادا کیا ہوا تھا، اسی کے لہجے میں ادا کرنے کی کوشش کی۔

"اب تم یہیں رہو گے... میں تم سے ملنے آتا رہوں گا۔"

ہم دونوں باپ، بیٹے کی نظریں ایک دوسرے کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

میں نے ماضی کے حوالے سے ایک اور جملہ داغا کہ اسے پوری طرح ہوش آ جائے۔

"ابا! مجھے یہاں سے لے جاؤ نا... اب میں شرارتیں نہیں کروں گا۔ نئی امی کو بھی تنگ نہیں کروں گا۔ اب میں شریف بچہ بن گیا ہوں۔"

"میرے بچے! تم گندے کب تھے؟ تم تو اچھے ہو مگر ابھی تم یہ سب نہیں سمجھو گے۔"

بولتے بولتے میری آواز بھرا گئی۔ رقت آمیز جذبات نے میرے پورے وجود کو مرتعش کر ڈالا تھا۔ اس دوران میں وزیر جان کے کسی کارندے کی "ٹھسکا" مار کے ہنسنے کی آواز ابھری تھی۔ کسی نے ہولے سے کہا بھی تھا۔

"پاگل ہو گیا ہے شاید۔"

کبیل دادا گم صم کھڑا تھا۔ میں نے وزیر جان کے چہرے کو پڑھنا شروع کیا۔ اس کی آنکھوں کی سختی اور چہرے کی کرختگی یک دم ہوا ہو گئی۔ آنکھوں میں پہلے الجھن تیر گئی پھر اس کی جگہ حیرت آمیز تاثرات نے لے لی۔ وہ بھویں اور آنکھیں سکیڑتا ہوا... چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر میری طرف بڑھنے لگا۔ باپ کو اس طرح اپنی جانب بڑھتے پا کر میرا دل... میرا خون جوش مارنے لگا کہ یہ شاید لہو کی کشش تھی، مجھے پورا یقین تھا کہ وہ اب کسی وقت بھی بے اختیار خود سے

لپٹا کر زار و زار رو پڑے گا اور میں بھی تو خود اس کے پُرشفیق سینے میں اپنا سر اور منہ رکھ کر آنسوؤں کے آبشار گرا دینا چاہتا تھا کہ آج میں اپنی شناخت پانے والا تھا۔

وہ میرے قریب آ گیا اور بہ غور میرا چہرہ تکتا رہا۔ اس کی تنگ پیشانی پر سلوٹیں نمودار تھیں۔ یہ مجھے کوئی جذباتی فلمی سچویشن محسوس ہو رہی تھی کہ جس میں دو بچھڑے ہوئے کسی پرانے یادگار گیت کے بول گا کر ایک دوسرے کی پہچان بن جاتے ہیں مگر میں شاید بھول گیا تھا کہ حقیقت اور فلم میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اسے تامل میں مبتلا دیکھ کر میں نے ہی بولنے کی ابتدا کی اور پھٹ پڑا۔

"مجھے پہچان کیوں نہیں لیتے ابا؟ تم ہی تو تھے جو مجھے آج سے پندرہ برس پہلے بے رحمی سے ایک ادارے میں چھوڑ کر چلے گئے تھے اور اس ادارے کا نام اطفال گھر تھا۔ ابا...! میں... مم... مجھے پہچانو... میں آپ کا بیٹا... شہزاد احمد ہوں۔" میرے یہ کہنے کی دیر تھی کہ پل کے پل جیسے ماحول کو سانپ نے ڈس لیا۔ کچھ متحیر سی آواز ابھری تھی۔ یقیناً کبیل دادا ہی نہیں... وزیر جان کے کارپرداز بھی چونکے بنا نہ رہ سکے ہوں گے۔

یہ کہنے کے بعد میں نے ایک بار پھر تڑپتی دھڑکتی نظروں سے باپ کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہاں شناسائی کے دیے پوری طرح سے روشن ضرور ہوئے تھے لیکن ان میں کسی قسم کی کوئی جذباتی وابستگی کی تڑپ مجھے کہیں نظر نہ آئی۔

وزیر جان واپس پلٹ گیا۔ اسے یوں بے حسی کے ساتھ پلٹتا دیکھ کر میرے پورے وجود میں جیسے چیختے ہوئے سناٹے اتر گئے۔ مجھے یوں لگا جیسے آج دوسری بار میرے باپ نے مجھے "دھتکار" دیا ہو۔ کہاں تو میں یہ توقع کیے بیٹھا تھا کہ وہ مجھے یعنی اپنے گبرو کڑیل جوان بیٹے کو پہچاننے کے بعد ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر بڑے فخر و انبساط سے اپنے سینے سے لگا لے گا۔

وہ واپس اپنی جگہ پر جا کے رکا اور دوسری طرف رخ کیے کھڑا ہو گیا۔

تب پھر اس اوپن ہال کمرے میں اس کی تحکمانہ آواز ابھری۔

"ان دونوں کو لے جاؤ اور گولی مار کے ختم کر ڈالو۔"

☆☆☆

مجھے اپنی سماعتوں پہ شبہ ہوا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے وزیر جان کے اس بے رحمانہ حکم سے پہلے ہی مجھے ان بے رحم لفظوں کی گولیوں سے چھلنی کر کے رکھ دیا گیا ہو۔ ایکا ایکی میری جلتی سلگتی آنکھوں میں سرخی اترنے لگی۔ مجھے اپنے قدموں تلے کمرے کے فرش پر ایک دراڑ سی ابھرتی نظر آئی جو پھیلتے پھیلتے وزیر جان تک چلی گئی۔ پھر اس دراڑ کا گویا جال سا ہر طرف پھیل گیا اور دیواروں تک جاتا محسوس ہوا جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔

میں اپنی لہو رنگ آنکھوں سے باپ کی شبیہ کو دیکھے جا رہا تھا۔ وہ باپ جس نے آج دوسری بار مجھے دھتکار دیا تھا۔ پہلے خود سے اور اب... دنیا سے دھتکار رہا تھا۔ کیا کوئی باپ اتنا بے حس، بے رحم اور سنگ دل بھی ہو سکتا ہے؟ ایک زبردست شاک تھا جس نے میرے دل و دماغ کو اس بری طرح سے جھنجوڑ.... ڈالا تھا کہ میرا تن بدن دہکتا ہوا آتش فشاں بن گیا۔ جو لاوا اگلنے کو بے چین اور پاگل ہو رہا ہو۔ میرے پورے وجود میں لرزا طاری ہو گیا تھا۔ میں بیک وقت دکھ اور غضب کی کیفیات سے دوچار تھا۔ اپنے باس کا حکم سنتے ہی اس کے مسلح کارپرداز فوراً حرکت میں آ گئے۔ کبیل دادا کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ میری نظریں دوسری طرف منہ کیے کھڑے وزیر جان پر جمی ہوئی تھیں۔ دو کارپردازوں نے مجھے دبوچا تو میں حلق کے بل چیخ کر بولا۔

"وزیر جان! گولی مارنے سے پہلے... خدا کے لیے مجھے یہ تو بتا دو کہ تم مجھے پہچان چکے ہو یا نہیں؟ لیکن... یہ بدنصیب بیٹا... تمہیں اپنے باپ کی حیثیت سے ضرور پہچان چکا ہے۔"

مجھے دبوچ کر لے جانے کی کوشش کرنے والے وہ دونوں کارپرداز یک دم اپنی جگہ ساکت ہو گئے۔ کیونکہ مجھ سمیت انہوں نے بھی وزیر جان کے سیدھے ہاتھ کو فضا میں بلند ہوتے دیکھ لیا تھا جو اس بات کا واضح اشارہ تھا کہ سردست پیش قدمی روک دی جائے... پھر وزیر جان بہت دھیرے دھیرے میری طرف اپنا رخ پھیرنے لگا۔ میری نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ پوری طرح ہماری طرف پلٹ کر کھڑا ہو گیا تو میں اس کے چہرے کو دیکھتے ہی بہت بری طرح ٹھٹکا تھا۔ وہاں مجھے بیک وقت پُرغیظ سرخی اور کرب کے تاثرات محسوس ہوئے، مجھے ایک زبردست دھچکا لگا۔ بلاشبہ یہ فیصلہ اس کے لیے... یعنی ایک باپ کے لیے بھی کڑا ثابت ہو رہا تھا کہ وہ اپنے ہی بیٹے کے لیے موت کا پروانہ جاری کر چکا تھا۔ آج سے پندرہ سولہ برس پہلے بھی اس کی آنکھوں اور چہرے سے ایسا ہی کرب جھلکتا ہوا مجھے نظر آیا تھا اور.... آج بھی یہی کچھ تھا۔

''یا خدا! یہ آخر کیا ماجرا ہے؟ کہیں میں پاگل ہی نہ ہو جاؤں۔'' میں بے قرار ہو کر چیخ اٹھا تھا۔

''ہاں... ہاں... میں تمہیں اچھی طرح پہچان چکا ہوں، شہزاد احمد... بہت اچھی طرح پہچان چکا ہوں۔ تمہیں بس...''

وفعتاً وزیر جان چلانے کے انداز میں بولا۔ اس کا لہجہ ہذیانی محسوس ہوتا تھا۔ انداز جھلایا ہوا تھا۔ زبان میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ ماحول ایک بار پھر دم بخود سا ہو گیا۔ میری یک ٹک اور خاموش سی نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ بھی میری طرف گھورنے کے انداز میں تکے جا رہا تھا۔ وہ آگے بولا۔

''مگر... تم اس وقت میرے بیٹے نہیں، میرے دشمن ہو... سمجھے تم؟'' اس کی بات سن کر مجھے ایک اور چرکا لگا۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے کوئی اندر سے میرا دل چھیل رہا ہو۔

''لے جاؤ... دونوں کو...'' اس نے پھر حکم صادر کیا۔

باپ بیٹے کا رشتہ کیا ہوتا ہے اور اس رشتے میں شکوک و شبہات کی دراڑ کہاں سے پڑنا شروع ہوتی ہے؟ اس کا ابھی شاید مجھے ادراک نہ تھا۔

اچانک عین اس وقت، جب مجھے اور کبیل دادا کو لے جایا جانے لگا تو اس دراز قامت کارپرداز نے مؤدبانہ انداز میں وزیر جان سے مخاطب ہو کر کہا۔

''باس! موت تو اب ان دونوں کا مقدر ہے ہی، تو کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ ان سے پوچھ گچھ کر لی جائے۔ آخر یہ ہیں کون؟ کس کے آدمی ہیں اور کس کے لیے کام کرتے ہیں۔ یہاں گھسنے کا آخر مقصد کیا تھا ان کا؟''

میرے مطابق اس کارپرداز نے اپنے باس سے بڑے پتے کی بات کہی تھی۔ اس بات سے قطع نظر کہ وزیر جان میرا باپ تھا اور مجھے ہی گولی مار دینے کا سفاک حکم دے چکا تھا۔ یہ بات دوسرے لحاظ سے باعثِ حیرت اور الجھن بھی تھی کہ وہ ہم سے کسی قسم کی پوچھ گچھ کیے بغیر ہی ہمارا صفایا کرنا چاہتا تھا؟ کیوں؟ مجھے وزیر جان کے جواب کا انتظار تھا۔ بالآخر وہ بولا۔

''میں جانتا ہوں... یہ دونوں کون ہیں اور کس کے آدمی ہو سکتے ہیں۔ ان کے یہاں اس طرح گھسنے کا مقصد بھی میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں زیادہ وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا، میرے لیے غیر اہم ہیں... فنش ناؤ۔''

وہ یہ کہہ کر دوسرے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

فیصلہ کن لمحات کی جاں گسل گھڑیاں موت بن کر میرے اعصاب پر ٹک... ٹک... ٹک کرنے لگیں۔ اپنے سنگ دل و بے حس باپ کا دوسری بار بھی یہ رویہ دیکھ کر میں یعنی بلکہ شہزاد احمد خان عرف شہزی... جذباتی کمزوری کی اس بھٹکتی رو سے نکل آیا جو انسان کے پیروں میں مجبوریوں کی بیڑیاں ڈال دیتی ہے۔ وہ شہزی... اب کسی کا بیٹا نہیں، صرف شہزی تھا۔ یاروں کا یار اور دشمنوں کا دشمن... جوش غیظ و غضب کی ایک لہر تھی جو سر... سے پاؤں تک میرے اندر سرایت کرتی چلی گئی۔ میرے دونوں ہاتھ رسن بستہ تھے۔ کبیل دادا میری جانب دیکھ رہا تھا۔ اس میدان کا وہ بھی نیا کھلاڑی نہیں تھا۔ مگر یہ سب کچھ اچانک اور بالکل غیر متوقع ہوا تھا کہ ہم یوں آسانی کے ساتھ اس چوہے دان میں پھنس گئے تھے، ہمیں بازوؤں سے دبوچ کر کسی طرف لے جایا جا رہا تھا۔

چار افراد نے ہم دونوں کو دبوچ رکھا تھا، دراز قامت ساتھی ان کی کمانڈ کر رہا تھا۔ مختلف راہداریوں سے ہمیں گزار کر وہ ایک ایسے کمرے میں لے آئے جس کے دروازے ائر ٹائٹ محسوس ہوتے تھے گویا یہ کمرا مکمل طور پر ساؤنڈ پروف محسوس ہوتا تھا۔ مجھے اور کبیل دادا کو دیوار سے لگا دیا گیا۔ ہماری پشت دیوار سے لگی ہوئی تھی اور وہ چاروں ہم سے کچھ قدموں کے فاصلے پر گنیں تانے کھڑے ہوئے تھے جبکہ ان کا دراز قامت ساتھی، ایک طرف کھڑا ہمیں سفاکانہ مسکراہٹ سے گھورے جا رہا تھا۔

ایسے سفاکانہ منظر میں اچھے اچھوں کا پتا پانی ہو جاتا ہے مگر میں اور کبیل دادا ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑے تھے۔ شاید کبیل دادا کو اپنی موت کا اندازہ ہو چکا تھا لیکن میرے اندر عجیب سی کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ یہ خوف کی کھلبلی نہیں تھی۔ میری چھٹی حس تھی جو مجھے چیخ چیخ کر کسی انہونی کے ہو جانے کی خبر دے رہی تھی کہ میں اپنے حوصلے پست نہ ہونے دوں کہ زندگی اور موت صرف اللہ کے اختیار میں ہے۔ اگر اس نے ہماری اس طرح موت لکھی تھی تو ہم خود چل کر اپنی موت کے روبرو پیش ہوئے تھے، وقتِ اجل کبھی نہیں ٹلتا، نہ ایک پل آگے... نہ پیچھے... مگر ہماری قضا ابھی لکھی ہی نہیں تھی۔

اچانک کمرے میں ایک تیز سیٹی کی آواز ابھری۔ ہم سب چونکے... یہ آواز کچھ خاص اطلاع کے موجب ہی تھی۔ یہی سبب تھا کہ ہم پر گنیں تانے کھڑے اور اپنے ساتھی کے اشارے کے منتظر وہ چاروں بیک وقت سر گھما کر

اپنے دراز قامت ساتھی کی طرف دیکھنے لگے۔ تیز سیٹی جیسی آواز پر اس کا چہرہ یک دم متغیر ہو گیا تھا۔ چونکے ہم بھی تھے۔ شاید یہ کوئی خطرے کا اشارہ تھا جو ممکن ہے چند مخصوص کمروں تک محدود تھا یا پھر پوری کوٹھی میں پھیلا ہوا تھا کیونکہ دراز قامت کارپرداز تیزی سے دروازے کی طرف لپکا تھا۔ میری اور کبیل دادا کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کے چاروں ساتھی بھی چونکے نظر آ رہے تھے۔

ایک موہوم سا خیال پہلے بھی میرے ذہن میں ابھرا تھا کہ باہر موجود ہمارے دو ساتھی، ہمارے لیے کیا کر سکتے تھے۔ وہ تو خود ہمارے منتظر تھے۔ انہیں بھلا کیا معلوم تھا کہ ہم اچانک کس مصیبت کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں اور پھر جب تک انہیں پتا چلتا ہم اس دنیا میں ہوتے بھی کہ نہیں پھر وہ دونوں ہماری رہائی کے سلسلے میں کر بھی کیا سکتے تھے۔ بے شک وہ دونوں بھی کبیل دادا اور ادل خیر کے زیر دست اور تربیت یافتہ تھے مگر کنال لاج میں تو کبیل دادا اور مجھ جیسے بھی چوہے دان میں آن پھنسے تھے کہ ہمیں سنبھلنے کا موقع بھی نہ مل سکا تھا۔

کمرے میں ابھرنے والی تیز سیٹی کی آواز پر خطرے کے کاشن کا گمان ہوتا... محض یہ میرے قیاسے کی بات نہیں تھی۔ دراز قامت کا چہرہ اس کی غمازی کرتا نظر آ رہا تھا۔ البذا پہلا خیال یہی میرے ذہن میں ابھرا تھا کہ کنال لاج کے باہر ایک تنگ تاریک گوشے میں گاڑی کے اندر موجود ہمارے دونوں ساتھی، ہمارے سلسلے میں خطرے کی بو سونگھ کر کنال لاج کی طرف جارحانہ پیش قدمی تو نہیں کر چکے تھے؟

کارپرداز نے جیسے ہی دروازہ کھولا۔ ''زٹ... زٹ'' کی دو بار آواز ابھری۔ وہ تیورا کر گرا اور بے حس و حرکت ہو گیا۔ میرے اور کبیل دادا کے تھکے ہوئے بشروں پر سناٹے اتر گئے۔ ادھر وہ چاروں گن بردار اپنے لیڈر کا یہ حشر دیکھ کر ہمیں فراموش کر کے تیزی سے حرکت میں آ گئے۔ مگر بے سود، دروازے کی آڑ سے دو سے زائد ہتھیار بدست افراد کی جھلک دکھائی دی اور ان کی مہیب نالوں نے اندر جھانکا۔ ان کا رخ ان چاروں گن بردار افراد کی طرف تھا۔ انہیں سنبھلنے یا جوابی فائر کا موقع بھی نہ ملا تھا کہ جھانکتی نالوں نے یک بیک ''زٹا زٹ'' کی پھنکار اگلی۔ چاروں برکارے زمین بوس ہوتے چلے گئے۔ مجھے کبیل دادا کے چہرے سے گھبراہٹ آمیز تشویش کی جھلک نمودار ہوتی محسوس ہوئی، شاید وہ یہی سمجھے ہوئے تھا کہ اب کسی وقت ہماری باری بھی آ سکتی تھی۔

وہ چار افراد تھے۔ ایک ساتھ کمرے میں داخل ہوئے تھے، ان کے جسموں پر مخصوص لباس دیکھ کر میں بری طرح ٹھٹکا تھا۔

''پاور۔''

دفعتاً ہی میرے ذہن رسا میں یہ لفظ گونجا تھا کیونکہ میں ان کے ایک ''کارندے'' کی جھلک پہلے بھی دیکھ چکا تھا اور کبیل دادا بھی... مگر کبیل دادا انہیں شاید ابھی پہچاننے سے قاصر تھا کہ یہ لوگ ''پاور'' کے خفیہ ایجنٹ تھے، تاہم پرانے واقعے کے حوالے سے وہ انہیں اب پہچاننے لگا تھا جب اس ''دیسی ننجا اسٹائل ٹولے'' نے ہمیں جنگلی خان اور اس کے برکاروں کے قبضے سے چھڑایا تھا۔ یہ سب رینجرز فورس کے سربراہ میجر ریاض باجوہ سے ایک ''خفیہ ڈیل'' کے تحت طے پایا تھا جس کی سن گن تک کبیل دادا کو نہ تھی۔

بہرحال، ہم دونوں بالکل غیر متوقع طور پر ایک یقینی موت کے منہ میں جانے سے بال بال بچے تھے۔ ''پاور'' والوں کی یہ سرعت کارروائی کا عمل بڑا فعال اور مربوط تھا۔ تاہم ابھی یہ میری سمجھ میں نہیں آ سکا تھا کہ یہ لوگ یہاں تک پہنچے کس طرح تھے اور وہ بھی عین وقت پر کہ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ ہم کنال لاج میں مقید ہیں۔ تب میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔ میجر ریاض باجوہ نے مجھے بتایا تھا کہ وہ بابن ڈکیت والے معاملے کے بعد سے وزیر جان کی ''ریکی'' کر رہے تھے اور کسی وقت بھی اس پر ہاتھ ڈالنے والے تھے، ممکن ہے یہ سب اسی اتفاق کا نتیجہ ہو۔

وہ چاروں بہ سرعت ہماری طرف بڑھے، ہمیشہ کی طرح ان کا انداز میکانکی اور وقتِ مقررہ میں کام یا مشن نمٹانے جیسا تھا۔ اسی سرعت کے ساتھ ان میں سے دو نے ہمارے دونوں ہاتھوں کے جکڑ بند کھولے۔ ابھی میں ان سے مخاطب ہوا چاہتا تھا کہ اچانک باہر راہداری میں دوڑتے قدموں کی آواز ابھری۔ پھر ایک دو فائر ہوئے۔ میں اور کبیل دادا کچھ گھبرائے اور چونکے ہوئے تھے مگر ان چاروں ''ننجا اسٹائل'' ٹولے کے افراد کی حرکات و سکنات سے کسی گھبراہٹ یا چونکنے پن کا شائبہ تک نہ تھا۔ ان کا انداز ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔ بالکل میکانیکی انداز... فیڈ کیا ہوا جیسے کوئی پروگرامنگ سافٹ ویئر... ان کے ہاتھوں میں اسٹیل کی عجیب ساخت پستول اور چھوٹی رائفلیں تھیں، وہی ڈارٹس داغنے والی جو بے ہوش یا اشتعال کر ڈالتی ہیں

''نمبر سکس اینڈ تھری... لیفٹس گو اینڈ اچیو دی

ٹارگٹ، لیا ہری۔" دفعتاً ان میں سے ایک نے مشینی سے انداز میں گھر گھراتے کہا۔ شاید یہی انہیں "لیڈ" کر رہا تھا۔ وہ دونوں مذکورہ "نمبرز" حرکت میں آ گئے۔ ان کے دو ساتھی بھی تھے، لیڈ کرنے والا مجھ سے مخاطب ہوا۔

"مسٹر شہزادا! اگر تمہارا یہاں کوئی اور ساتھی قید نہیں ہے تو تم دونوں فوراً یہاں سے جا سکتے ہو۔"

میں چونکا۔ وہ مجھے جانتا تھا۔ میرے نام سے واقف تھا۔ یقیناً یہ پاور کا وہی ٹولا ہوگا جنہوں نے جنگلی خان سے ہمیں آزادی دلائی تھی۔ اس کی بات پر کبیل دادا چھوٹتے ہی سر ہلا کے بولا۔ "نن... نہیں ہمارا کوئی ساتھی ادھر نہیں۔"

میں نے تحمل اور ہوش مندی کا مظاہرہ کیا اور لیڈ کرنے والے سے مخاطب ہو کر کہا۔ "ہمارا کوئی ساتھی تو یہاں نہیں ہے... مگر... وزیر جان ہمارے لیے اہم ہے... ہم اسے اپنے ساتھ لے جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔" میری بات پر اس نے بلا تصدیق و تامل نفی میں سر ہلا دیا۔ پھر مشینی سے لب و لہجے میں بولا۔

"وہ ہمارا ٹارگٹ ہے۔ اس کے لیے ہم نے آج پورے کنال لاج کو پچھلے کئی گھنٹوں سے "بگ" کر رکھا تھا۔ تم شاید نہیں جانتے کہ وزیر جان بہت عرصے بعد آج کنال لاج آیا تھا۔ وہ بھی ایک دن کے لیے۔"

"بگ" کے ذکر پر میں چونکا تھا۔ اطفال گھر میں اردو فلموں کے علاوہ ایڈونچرز اور جاسوسی انگریزی فلمیں بھی دکھائی جاتی تھیں۔ بالخصوص جیمز بونڈ کی فلمیں... ایسی ایک فلم میں، میں نے یہ "اسپائی" آلے کا ذکر سنا اور دیکھا تھا میں ٹھٹکا تھا، گویا انہوں نے میرے اور وزیر جان کے درمیان ہونے والی باپ بیٹے کے حوالے سے گفتگو بھی سنی ہوگی۔ تاہم میں نے کہا۔ "مگر میجر صاحب کے مطابق تم لوگ تو ابھی وزیر جان پر ایسا کوئی حملہ کرنے کے "آرڈرز" میں نہیں تھے، پھر یہ اچانک...؟"

"تمہاری وجہ سے۔" اس نے جیسے میری بات کاٹ کر کہا۔ "تمہارے سلسلے میں ہمیں پہلے سے ہی بریفنگ دے کر یہ ٹاسک دیا گیا ہے کہ ہر ایسے مشن آف ایکشن میں اپنے آدمیوں کا... بالخصوص تمہارا خیال کرنا ٹارگٹ اچیو کرنے سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔"

مجھے اس کی یہ بات عجیب لگی۔ جو ٹارگٹ سے زیادہ اپنے آدمیوں کی سلامتی کو ملحوظ رکھتے تھے یا پھر انہیں خود پر اتنا یقین کی حد تک بھروسا تھا کہ وہ جب چاہیں اپنا ٹارگٹ "نمبرز" کرنے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے۔ کبیل دادا آنکھیں پٹپٹانے لگا تھا اور تبھی اس "وسکی مارکا" نجیا ٹولے کو تکے جا رہا تھا۔ یقیناً کچھ باتیں ایسی تھیں جو میرے اور ان کے درمیان ہوئی تھیں وہ کبیل دادا کے لیے سوالیہ طلب تھیں۔ میرا ذہن وقت اور حالات کے مطابق بلکہ ہر طرح کی سچویشن میں تیزی سے کام کرتا تھا۔ میں نے اس کی ایک بات پکڑی اور بولا۔

"اگر یہ بات ہے تو پھر میں تم سے گزارش کروں گا کہ اپنا یہ ٹارگٹ میرے حوالے کر دو... میں اس سے کچھ پوچھنا بلکہ اگلوانا چاہتا ہوں۔"

"ہرگز نہیں۔" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "بے شک تمہاری شمولیت قابلِ قدر ہے۔ اور ہائر اتھارٹیز تک تمہاری سفارش پہنچ چکی ہے مگر ہماری ایک مخصوص اصطلاح میں تم ابھی ہماری خفیہ ایجنسی "پاور سروس" میں بلو پرنٹ کی حیثیت رکھتے ہو جس کی ابھی کوئی باقاعدہ اور باضابطہ شمولیت یا انٹری نہیں ہوئی ہے جو درخواست یا اپنی کوئی گزارشات پیش کرنے کا اہل نہیں ہوتا۔"

اس کی بات سن کر میں نے بے اختیار ایک ٹھنڈی سانس خارج کی۔

ٹھیک اسی وقت قدموں کی دھمک ابھری۔ پانچ چھ وسکی نجیا اندر داخل ہوئے، میں ٹھٹکا۔ انہوں نے وزیر جان کو دبوچ رکھا تھا۔ میں بری طرح الجھن آمیز پریشانی کا شکار ہو گیا کیونکہ یہ ہمارا شکار تھا جسے چھاپنے کے لیے میں اور کبیل دادا اپنی جانیں جوکھم میں ڈال کر یہاں آئے تھے مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ ہمیں عین موت کے منہ سے بچانے والے بھی یہی "پاور" والے تھے، اب اپنے شکار (وزیر جان) کے حصول کے لیے ان سے ٹکرانا ویسے بھی مناسب نہ تھا۔ ادھر وزیر جان کھا جانے والی نظروں سے ہماری طرف گھورے جا رہا تھا۔ یقیناً وہ پاور والوں کے ہاتھوں بری طرح پھنسا تھا جبکہ وہ ہمیں ان کا ساتھی سمجھ رہا تھا۔ اس کے فرشتوں کو بھی علم نہ تھا کہ وہ ایک انتہائی خفیہ اور حساس ادارے "پاور" والوں کے قبضے میں ہے جو وطنِ عزیز کو اس جیسی اور ممتاز خان جیسی کالی بھیڑوں کا صفایا کرنے کے لیے اور ایسے ابن الوقت سیاست دانوں کی ریکی اور ان پر نظر رکھنے کے لیے جو اپنے سیاسی مفادات پر وطنِ عزیز کی سلامتی کو بھی قربان کرنے سے نہیں چوکتے تھے، ان کی بیخ کنی کرنے کے لیے کچھ اسپیشل قسم کے "ماورائے قانون" اختیارات تفویض کروا کے وجود میں لائی گئی تھی۔ یہ بالکل

اسی طرح تھا جیسے کسی بیماری کے لیے کڑوی گولی نگلی جائے۔ بہ قول میجر باجوہ کہ... پاور والے ہر قسم کے سیاسی دباؤ سے آزاد رہتے تھے۔

کبیل دادا کو بھی ان کی حقیقت و اصلیت کا ابھی علم نہ تھا تاہم اسے اتنا اندازہ تو ضرور ہی ہوگا کہ ان کا تعلق رینجرز فورسز کے میجر باجوہ سے تھا جو درحقیقت انٹر سروسز میں بھی رہ چکے تھے۔

کسی مجرم کے سامنے ہمیں ایسی کوئی بات کرنے سے سختی کے ساتھ ممانعت تھی جو "پاور" والوں کی اصلیت کو ظاہر کرتی تھی، اس لیے میں نے کبیل دادا کو پہلے ہی سرگوشی میں سمجھا دیا تھا۔ خود پاور والے ایک دوسرے کو صرف نمبروں سے مخاطب کرتے تھے۔

"تم لوگ اس کوٹھی سے زندہ نہیں نکل سکتے۔" معاً وزیر جان کی غراہٹ سے مشابہ زہریلی آواز ابھری۔ وہ ہماری طرف پُرغیظ نظروں سے گھور رہا تھا۔ لیڈ کرنے والے نے اپنے ایک ساتھی کو مخصوص اشارہ کیا، اس نے کمال سرعت وزیر جان کی ہنسلی کی ہڈی کی طرف کی کوئی رگ حساس مسل ڈالی اور دوسرے ہی لمحے وزیر جان ان کے ہاتھوں میں لہرا گیا۔

"ہم شکار لے کر جا رہے ہیں۔ بہتر ہوگا تم بھی جلد سے جلد نکل جاؤ یہاں سے۔" لیڈ کرنے والے نے ہم سے کہا۔ "اور ہاں، میجر باجوہ صاحب بہت جلد تم سے رابطہ کرنے والے ہیں۔"

اس کے بعد سات، آٹھ افراد کا یہ ٹولا تیزی کے ساتھ باہر کو لپکا۔ جاتے جاتے اس نے ایک اور تنبیہ کی تھی کہ بے ہوش کرنے والی ڈاٹ کا اثر ایک سے دو گھنٹے رہتا ہے لہٰذا ان کے ہوش میں آنے سے پہلے ہمیں کنال لاج سے باہر ہونا چاہیے۔

"یہ لوگ تو ہمارے کاموں میں رخنہ ڈال رہے ہیں شہزی! تمہیں ان کے ساتھ راہ و رسم نہیں بڑھانے چاہیے تھے۔" ان کے جاتے ہی کبیل دادا نے مجھ سے تیز لہجے میں کہا جبکہ میں ہونٹ بھینچے کچھ سوچنے میں مستغرق تھا۔

"ان کا اپنا ایک طریقۂ کار ہوتا ہے... مت بھولو کہ ہم تھوڑی دیر پہلے یقینی موت کا شکار ہو گئے تھے اور انہی لوگوں نے ہمیں بروقت موت کے چنگل سے نجات دلائی۔"

"اونہہ، اس کا فائدہ کیا ہوا۔ شکار تو پھر بھی وہ لے اڑے ہمارا؟" کبیل دادا ہمیشہ کی طرح اپنی ہٹ دھرمی دکھانے لگا تو میں نے اس کی طرف تیز نظروں سے تکتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"کبیل دادا! تمہیں کبھی کبھی اس طرح بچگانہ قسم کی باتیں کرتے دیکھتا ہوں تو مجھے لگتا ہی نہیں ہے کہ بیگم صاحبہ کے گروہ میں تم بڑے استاد کہلاتے ہو۔ ابھی ہم نے وزیر جان پر ہاتھ ہی کب ڈالا تھا جو ہم اپنا حق جتاتے؟ الٹا ہم تو خود شکار ہو گئے تھے۔ وہ جن کا شکار تھا وہ ہم پر زندگی کا احسان کر کے اسے لے جا چکے ہیں۔"

مجھے میجر ریاض باجوہ کی بات یاد تھی کہ یہ لوگ وزیر جان کی بہت پہلے سے ریکی کر رہے تھے۔

"مگر اب کیا ہوگا؟ بیگم صاحبہ کا کس سے پتا چلائیں گے؟" وہ جھلا کر بولا۔ پھر اچانک جیسے اسے کچھ یاد آیا۔ "ایک بات تو بتاؤ... یہ تمہارا وزیر جان کے ساتھ کیا معاملہ نکل آیا؟ کیا یہ تمہارا واقعی باپ...؟"

"چھوڑو... اس موضوع کو۔" میں نے اس کی بات کاٹی۔ "بیگم صاحبہ کے بارے میں پتا چلانے کے لیے ہمارے پاس دوسرا راستہ بھی موجود ہے۔" کہتے ہوئے میں نے کمرے کے ایک کونے میں آڑے ترچھے بے ہوش پڑے، اس دراز قامت کار پرداز کو دیکھا جو ہمیں اپنے باس وزیر جان کے حکم کے مطابق اس کمرے میں موت سے ہمکنار کرنے آیا تھا اور اب وہ خود ہمارے رحم و کرم پر تھا۔ میں نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کبیل دادا سے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"مجھے یہ آدمی سردست وزیر جان کا بہترین نعم البدل لگتا ہے، وقت ضائع کیے بغیر ہمیں اسے اپنے ساتھ لے چلنا ہوگا۔" شکر یہ تھا کہ کبیل دادا کو میری بات سمجھ آ گئی تھی۔ اس نے دانت پیستے ہوئے اس کار پرداز کو جھپٹ کر اٹھا لیا۔

اچانک گولیوں کی تڑتڑاہٹ ابھری کہ ہم دونوں بُری طرح ٹھٹک گئے۔

☆☆☆

برسٹ کی آواز تھی۔ اس کے فوراً بعد تلے اوپر فائر ہوئے۔ کبیل دادا جو وزیر جان کے اس دراز قامت مقرب خاص کارندے کو اپنے کاندھے پر ڈالنے کے لیے پر تول رہا تھا، ارادہ بدل کر میری طرف دیکھ کر بولا۔ "یہ فائرنگ کیسی ہے؟" میں کیا جواب دیتا۔ مگر میرا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔

"فائرنگ کی آواز باہر سے آ رہی ہے، کہیں ایوب اور ماجا تو نہیں... ان لوگوں سے بھڑ گئے ہیں؟"

کبیل دادا نے فوراً خیال ظاہر کیا۔ جبکہ میں ابھی تک اچنبھے کا شکار تھا۔ کیونکہ وہ دونوں پاور کے سات آٹھ

ایجنٹوں سے نہیں بھڑ سکتے تھے، اس کا جواز میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ تاہم وقت اور حالات دگرگوں کی اس لپک جھپک میرے سوچنے کے عمل کو ہمیشہ کی طرح جلا بخشتی تھی۔ میں نے کسی جلد بازی کا مظاہرہ کیے بغیر سب سے پہلے وہاں بے ہوش پڑے کارندوں کے ہتھیار پر قبضہ جماتے کا کبیل دادا کو اشارہ کیا اور خاص کارندے کی جامہ تلاشی کے بعد اپنے سیل فون بھی تلاش لیے پھر کبیل دادا سے بولا۔

''آؤ... باہر کا جائزہ لیتے ہیں۔ اسے بھی لے چلو۔'' میرا اشارہ بے ہوش خاص کارندے کی طرف تھا۔

میں مرکزی دروازے کی طرف پہنچ کر ٹھٹک کر رکا۔ ادھر وہ موٹے تازے شکاری کتے اسی تعطیل حالت میں پڑے نظر آرہے تھے جبکہ تین مسلح گارڈز بھی اسی حالت میں تھے۔ یہ ''مناظر'' بیرونی گیٹ کے اندر کے تھے جبکہ یہاں سے مجھے سلائنڈنگ ہونے والے سیاہ رنگ کے دونوں گیٹ کھلے ہوئے نظر آرہے تھے۔ اور باہر کی نقل و حرکت خاصی سنسنی خیز حد تک مشکوک دکھائی دے رہی تھی کہ میرا دل یکلخت سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں پر دھڑکنے لگا۔ گیٹ سے باہر کا وہ منظر مقدور بھر سہی... لیکن جو نظر آرہا تھا وہ کوئی اور ہی کہانی کا منظر پیش کررہا تھا گویا مارا ماری اور چھینا جھپٹی کا سماں تھا۔ پاور کے تین ایجنٹ مجھے خون میں لت پت نظر آئے اور چند ایسے آدمیوں کی جھلک بھی دکھائی دی جن کے ہاتھوں میں جدید گنیں تھیں اور خاصے مستعد اور تربیت یافتہ نظر آرہے تھے۔ گیٹ کے ستونوں پر پوری طرح سے روشن... گلوب کی روشنی میں یہ خون ریز منظر واضح تھا۔ اس وقت میری تکتی ہوئی نظروں نے یہی منظر بدلتے دیکھا۔ گولیوں کی سمع خراش بوچھاڑ ابھری۔ ان میں سے دو حملہ آور چھلنی ہوکر گرے۔ یقیناً یہ کارروائی پاور کے ایجنٹوں کی تھی۔ گویا ڈاٹ پھینکنے کے علاوہ بھی ان کے پاس آتشیں ہتھیار تھے، میرے عقب میں کبیل دادا، وزیر جان کے کارندے کا بے سدھ وجود اٹھائے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔

''یہ کوئی اور ہی خطرناک معاملہ چل پڑا ہے شہزی! واپس پلٹو۔'' کہتے ہوئے وہ الٹے قدموں پلٹا۔ حملہ آوروں کی تعداد زیادہ معلوم ہوتی تھی اور وہ شاید پاور ایجنٹوں پر حاوی ہورہے تھے۔ یہ یقیناً وزیر جان کے آدمی ہوسکتے تھے۔ جو نجانے کہاں سے اچانک وہاں اپنے ''باس'' کی مدد کو ٹپک پڑے تھے۔ گویا یہ لوگ اندر کنال لاج کا رخ کرسکتے تھے اور نتیجتاً ایک بار پھر ہم دشمنوں کے نرغے میں ہوتے۔ میں نے سوچا۔ میرا ذہن تیزی سے کام کررہا تھا اور میں کبیل دادا کی طرح واپس کوٹھی کے اندر پلٹنے کے بجائے آگے بڑھا۔ گن میرے ہاتھ میں تھی۔ باہر معاملہ کچھ سرد پڑتا محسوس ہوا۔ میں نے کھلے گیٹ اور دیوار کی آڑ سے جھانکا۔ میرے نتھنوں سے بارود کی بو ٹکرائی۔ میں نے دیکھا۔ ایک سیاہ رنگ کی انٹرکولر میں چار پانچ حملہ آور سوار ہونے کی کوشش کررہے تھے اور وزیر جان کا بے ہوش وجود ان کے قبضے میں تھا جبکہ پاور کے چار ایجنٹوں کی خون میں لتھڑی لاشیں بے ترتیب بکھری نظر آئی تھیں۔ باقی نجانے کدھر تھے۔ گویا حملہ آوروں یا وزیر جان کے ساتھیوں کو پاور ایجنٹوں پر فتح حاصل ہوگئی تھی۔ مگر ایک بات پر مجھے تعجب ہوا کہ اگر یہ وزیر جان کے ساتھی تھے تو پھر اندر کوٹھی کا رخ کرنا چاہیے تھا، یہ اس کے بے سدھ وجود کو گاڑی میں ڈال کر کہاں لے جانے کا ارادہ کیے ہوئے تھے۔ دل میں آئی کہ ان سے دیوانہ وار بھڑ جاؤں... مگر اس میں رسک بہت تھا۔ وہ سب سیاہ نقاب چڑھائے ہوئے تھے چہروں پر۔ اچانک گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی... وہ لوگ فرار ہورہے تھے۔ ٹھیک اس وقت ایک خیال بجلی کی سی تیزی کے ساتھ میرے ذہن رسا میں دوڑتا چلا گیا۔ ادھر گاڑی حرکت میں آئی اور ادھر میں۔ مجھے ایک طرف پاور ایجنٹوں کی بند جیپ کھڑی نظر آگئی۔ یہ فور وہیل ڈرائیو تھی۔ میں تیزی سے لپک کر جیپ کی طرف بڑھا۔ بسرعت ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ اگنیشن سوئچ میں چابی لگی ہوئی تھی، وہ میں نے گھما دی۔ جیپ کا انجن غرا کر بیدار ہوگیا۔ میں نے ہیڈ لائٹس روشن کردیں اور ونڈ اسکرین کے پار تاریکی میں دیکھا۔ حملہ آوروں کی انٹرکولر کی بیک لائٹس مجھے تیزی سے دور ہوتی دکھائی دیں اور پھر دائیں جانب معدوم ہوگئیں۔ انٹرکولر نے موڑ کاٹا تھا۔ ادھر میں نے ان کے تعاقب میں جانے کے لیے جیپ ایک جھٹکے سے آگے بڑھائی ہی تھی کہ اچانک مجھے بریک لگانے پڑے۔ رات کے سناٹے میں ٹائر تھوڑے چرچرائے تھے کہ مجھے سامنے دو پاور ایجنٹ دکھائی دیے تھے۔ دونوں ہی زخمی نظر آئے تھے۔ ایک کے بازو سے خون بہہ رہا تھا، دوسرا قدرے لنگڑا رہا تھا۔ انہوں نے نہ صرف مجھے پہچان لیا تھا بلکہ مجھے جیپ میں سوار ہوتے بھی دیکھ لیا تھا اور ہاتھ کے اشارے سے جیپ روکنے پر مجبور کیا تھا۔ پھر وہ دونوں لپک کر جیپ میں سوار ہوگئے۔ ایک میرے برابر میں براجمان ہوگیا تھا دوسرا زخمی بازو والا عقبی سیٹ سنبھال چکا تھا۔

''تعاقب جاری رکھو۔'' میرے برابر براجمان

ہونے والے پاور ایجنٹ نے ہانپتی آواز میں کہا اور میں چونک پڑا۔ یہ ان کو لیڈ کرنے والا ساتھی تھا۔ کیونکہ میں اس کی آواز پہچان چکا تھا۔ بہرحال... میں نے جیپ ایک جھٹکے سے آگے بڑھادی اور انٹرکولر کے تعاقب میں لگ گیا۔

میں تیزی کے ساتھ مختلف موڑ کاٹتا ہوا جیپ کو ہائی وے پر لے آیا۔

''تمہارے آدمیوں کے انجام پر مجھے بے حد افسوس ہے۔'' میں نے تاسف کا اظہار کرنا ضروری سمجھا۔ ''کیا یہ وزیر جان کے ہی آدمی تھے؟'' میں نے آخر میں پوچھا۔

''انہی کے ساتھی سمجھو مگر یہ وزیر جان کے آدمیوں سے زیادہ خطرناک ہیں۔'' اس نے جواباً کہا۔

''ہاں، میں اس کا اندازہ تھوڑی دیر پہلے لگا چکا ہوں مگر... بات سمجھ نہیں آئی۔'' میں الجھن کا شکار تھا۔

وہ بولا۔ ''بڑے دھیان سے تعاقب جاری رکھو۔ انہیں اپنے تعاقب کا شبہ نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ... یہ ہمیں بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔'' اس کے لہجے میں نجانے ایسا کیا تھا کہ میں کانپ کر رہ گیا۔

میں اب محتاط روی کے ساتھ انٹرکولر کا تعاقب کررہا تھا اور میرے اندر بری طرح دھکڑ پکڑ مچی ہوئی تھی۔ مجھے یہ کوئی اور ہی پُراسرار معاملہ لگ رہا تھا۔ حملہ آوروں کا یہ گروپ مجھے کسی بھی طرح وزیر جان کے ساتھی ٹولے سے تعلق رکھتا محسوس نہیں ہورہا تھا۔ کیونکہ یہ لوگ مجھے وزیر جان کے کنال لاج میں موجود اس کے ساتھیوں سے زیادہ طاقت ور اور تربیت یافتہ نظر آئے تھے۔ جنہوں نے پاور کے انتہائی ٹرینڈ اہلکاروں کو شکست دے ڈالی اور ان کے منہ کا شکار چھین کر لے اڑے تھے۔

تعاقب جاری تھا۔ رات اپنے درمیانی پہر سے گزر رہی تھی، دور تک چمکتی ویران سڑک پر چند ایک گاڑیوں کی آمدورفت جاری تھی۔ انٹرکولر کی بیک لائٹس کو نظروں میں رکھے ہوئے میں ایک مناسب فاصلے سے اس کا تعاقب کررہا تھا۔ میرے حلق سے جانے کیوں ابھی تک یہ بات نہیں اتر رہی تھی کہ یہ حملہ آور وزیر جان کے ساتھی ہوسکتے تھے، پھر پاور ایجنٹ کے بقول... ''انہیں وزیر جان کا ساتھی ہی سمجھو'' مجھے یہ بات سمجھ نہیں آئی تھی۔

''یس سر! ممبر زیرو اسپیکنگ۔''

معاً مجھے لیڈ کرنے والے اس ایجنٹ کی آواز سنائی دی جو میرے برابر بیٹھا تھا، وہ ایک چھوٹے ٹرانسمیٹر نما آلے کو اپنے چہرے اور منہ کے قریب کیے شاید اپنے کسی افسر کو تازہ ترین رپورٹ سے آگاہ کررہا تھا جو میں بھی سننے میں محو ہوگیا۔ وہ نہایت مؤدبانہ انداز میں اپنے افسر کو اب تک کی ساری سچویشن کی رپورٹ دینے کے بعد آخر میں بتارہا تھا۔

''یس سر! پہلے ہمیں صرف شبہ تھا مگر اب یقین ہوچکا ہے، یہ لوگ ''اسپیکٹرم'' سے تعلق رکھتے ہیں۔ جی سر! ہم ابھی ان کے تعاقب میں ہیں مگر ابھی شکار ان سے واپس چھیننے کی پوزیشن میں نہیں ہیں، جی... جی... سر! ٹھکانے کا پتا چلنے کے بعد ان کو انفارم کیا جائے گا۔ اس کے بعد ہمیں ''ریڈ پرسن'' کی کمک درکار ہوگی، او کے سر! میں رابطے میں رہوں گا... اینڈ آل۔''

اس نے رابطہ منقطع کردیا۔ اس کی زبانی میں نے ان حملہ آوروں کے اس گروہ کا عجیب نام سنا تھا۔ یعنی ''اسپیکٹرم'' یقیناً عجیب اور غیر ملکی سا نام تھا۔ یہ کون تھے؟ ان کے مقاصد کیا تھے؟ میں نہیں جانتا تھا مگر... میں انہیں ٹھکانے تک پہنچنے سے پہلے ہی چھاپ لینا چاہتا تھا۔ مجھے ہر صورت میں اپنے باپ، یعنی وزیر جان کو ان کے قبضے سے چھڑانا تھا۔ لہٰذا میں نے زیرو نمبر ایجنٹ سے کہا۔

''مسٹر زیرو! میرا خیال ہے ہم ان کے ٹھکانے تک پہنچنے سے پہلے ہی اپنا شکار چھیننے کی کوشش کرسکتے ہیں۔''

وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ ''تم اس سلسلے میں ہمیں کسی قسم کا مشورہ نہیں دے سکتے، تمہاری حیثیت ابھی صرف انفارمیٹو یا میسنجر کی ہے۔ اسالٹ اینڈ ایکشن پوزیشن کے ایجنٹ بھی اس وقت چیف کے احکامات سے انحراف کرنے کی جرأت نہیں کرسکتے۔''

اس کی بات سن کر میں اپنے ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔ ظاہر ہے یہ اور حیثیت کے لوگ تھے اور ان سے بحث و مباحثہ فضول تھا۔ میں اس وقت کو کوس رہا تھا جب یہ دونوں اچانک تاریکی سے نمودار ہوکر میری جیپ کے سامنے آگئے تھے۔

''ارے... یہ گاڑی کدھر غائب ہوگئی؟'' معاً عقبی سیٹ پر بیٹھے ہوئے زیرو ایجنٹ کے ساتھی کی چونکتی ہوئی آواز ابھری۔ ہم دونوں ٹھٹکے۔ میری بھی نظریں بدستور سامنے جمی ہوئی تھیں، میں چونک پڑا۔ انٹرکولر کی بیک لائٹس واقعی غائب تھیں۔

''یقیناً آگے موڑ ہوگا۔ انہوں نے گاڑی موڑ لی ہوگی۔'' میرے برابر بیٹھے زیرو ایجنٹ نے خیال ظاہر کیا۔ میں کچھ الجھن کا شکار تھا۔ میری چھٹی حس پھڑک رہی تھی۔ میری گن پہلو کے پاس رکھی تھی۔ آگے واقعی موڑ تھا۔ مین ہائی وے ہونے کے باعث موڑ زیادہ تنگ نہیں تھا۔ نوّے

ڈگری کے اس موڑ کو اسی کی اسپیڈ سے بھی کاٹا جا سکتا تھا اور یہی میں چاہتا تھا کہ موڑ کاٹتے وقت گاڑی کی رفتار کم نہ کرنی پڑے اور میں نے ایسا ہی کیا۔ موڑ پر میں نے جیسے ہی تھوڑا اسٹیئرنگ کاٹا، اس دوران میں نے محتاط نظروں سے موڑ کے دائیں جانب بھی دیکھا تھا اور میرا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا تھا۔ ہمیں ٹریپ کیا گیا تھا، انٹرکولر سائڈ میں کھڑی تھی اور ہمیں سنبھلنے کا بھی موقع نہ ملا تھا کہ انٹرکولر کے قریب سے سمع خراش فائرنگ کے شعلے سے ہماری جانب لپکے۔ گاڑی موڑ کاٹ رہی تھی، میں غیر ارادی طور پر نیچے جھک گیا۔ مگر دونوں پاور ایجنٹوں کو یہ موقع نہ مل سکا۔ کئی گولیوں کی آتشیں بوچھاڑ جیپ کی باڈی اور کھڑکی پر پڑی۔ عقبی سیٹ پر بیٹھا پاور ایجنٹ کربناک چیخ مار کے ڈھیر ہو گیا۔ جبکہ میرے جھکنے سے میری طرف لپکنے والی گولیوں کے شعلے میرے برابر میں بیٹھے دوسرے پاور ایجنٹ کا بھیجا چاٹ گئے۔ شیشے ٹوٹنے کی سمع خراش آواز ابھری اور کئی کرچیاں میرے اوپر تیز برچھیوں کی طرح برسیں۔ دفعتاً ایک سماعت شکن دھماکا ہوا۔ جیپ ایک طرف سے بری طرح لہرائی، یقیناً کوئی گولی ٹائر کو برسٹ کرنے کا سبب بنی تھی۔ میں نے اس خطرناک صورتِ حال کو سنبھالنے کے لیے سیدھا ہو کے ڈولتی جیپ کی بدمستی پر قابو پانا چاہا مگر بے سود... وہ لڑھک گئی، مجھے پوری دنیا گھومتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ شکر تھا کہ سڑک کے دوسری جانب کچی ڈھلان پر کچھ جڑواں تنوں والے درخت تھے۔ جیپ فقط ایک ہی لڑھکنی کھا کے تنے کے ساتھ جا لگی۔ مجھے زوردار جھٹکا لگا۔ کاندھے اور بازو کی ہڈیاں مجھے چٹختی محسوس ہوئیں مگر یہ وقت انہیں سہلانے کا کہاں تھا۔ موت سر پر تھی، ''اسپیکٹرم'' نامی کسی تنظیم سے تعلق رکھنے والے موت کے ہرکارے پاور ایجنٹوں کی سوچ سے بھی زیادہ مستعد اور پاورفل ثابت ہو رہے تھے، مجھے ان سے مقابلے کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ میں تو آج تک عام نوعیت کی دیسی لڑائیاں ہی لڑتا آیا تھا۔ میں بھلا ان کے طریقہ کار اور اصولِ جنگ سے کہاں واقف تھا مگر جنگ اور دفاع کا انداز تو بقا کے لیے ایک ہی ہوتا ہے۔ میں نے ہمت مجتمع کی، خود کو سنبھالا اور گن اٹھائی۔

جیپ اس جڑواں تنے سے لگنے کے باعث ایک طرف کو جھکی ہوئی تھی اور سوئے اتفاق اس کا ایک دروازہ کھل چکا تھا۔ میں پھرتی کے ساتھ باہر تاریکی میں کودا... ابھی تھوڑا ہی دور تھا کہ مجھے اوپر سڑک کی سمت چار پانچ قدآور مسلح ہیولے نظر آگئے۔ ابھی میرے اور ان کے درمیان جیپ کا فاصلہ تھا۔ وہ شاید جیپ پر گولیوں سے ہلا بولنے کا ارادہ رکھتے تھے، میں ایک طرف دوسرے درخت کی اوٹ سے ان ہیولوں کو دیکھ رہا تھا۔ آسمان روشن اور صاف تھا۔ پورا چاند کہیں پرے جھکا ہوا تھا۔ مگر اس کی لامحدود ضیا پاشیاں کسی حد تک اس تاریک ویرانے کو منور کیے ہوئے تھیں۔

دفعتاً میں نے ان میں سے ایک کو کرکٹ کی باؤلنگ کے انداز میں اپنا ہاتھ لہراتے دیکھا۔ جب تک میں کچھ سمجھتا جیپ ایک سماعت شکن دھماکے سے آگ کے بھڑکتے گولے میں بدل گئی۔ انہوں نے دستی بم پھینکا تھا۔

میں بھربھری مٹی والی ڈھلان پر لیٹ گیا۔ ایسا میں نے اپنے بچاؤ کے لیے کیا تھا کہ کہیں بم کی طرح پھٹتی جیپ کے کسی جلتے سلگتے ٹکڑے کی زد میں نہ آ جاؤں، مگر جیپ پر بھڑکتی آگ کی روشنی میں مجھے بھی دیکھ لیا گیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے گولیوں کی بھیانک تڑاتڑ ابھری اور کئی گولیاں ''زٹ... زٹ... زٹ'' میرے قریب دائیں بائیں بھربھری مٹی والی ڈھلانی زمین میں پیوست ہونے لگیں۔ گولیوں کی ان آتشیں ''چھپک'' کو میں نے اپنے چہرے اور کنپٹیوں پر صاف محسوس کیا تھا، سفاک موت کو اپنے اتنے قریب دیکھ کر میں ایک لمحے کو دہل کر رہ گیا مگر پل کے پل سنبھالا لیتے ہی میں نے طوفان بلاخیز کے انداز ڈھلان پر دو تین لڑھکنیاں لگائیں اور پھر سیدھے ہو کے پوزیشن سنبھالتے ہی میں نے اوپر ڈھلان کے سرے پر ملک الموت بنے کھڑے ان ہیولوں پر اپنی گن سے ایک برسٹ داغ دیا۔ ٹھٹکے ہوئے سناٹے میں گولیوں کے آتشیں قہقہے ابھرے اور ایک سے زائد افراد کی کریہہ انگیز چیخوں نے میرے حوصلوں کے بادبان بلند کر دیے، باقی پیچھے پلٹ گئے۔

میں تیزی سے اوپر کی طرف رینگنے لگا۔ مجھے ہر حالت میں ان پر فتح پانا تھی، میرا باپ... وزیر جان ان کے قبضے میں تھا۔ ان کے کچھ آدمیوں کو واصل جہنم کر کے میری ہمت سوا ہوئی تھی۔ میں سڑک پر آیا تو انٹرکولر کے انجن کی غراہٹ ابھری۔

''فرار...'' میرے ٹھٹکے ہوئے ذہن میں ابھرا۔

گویا دشمن پسپا ہونے کے بعد فرار کی کوشش میں تھا۔

انٹرکولر نے جیسے ہی سڑک پر آنے کے لیے موڑ کاٹا، تو میرے ذہن میں ان کی پیش قدمی روکنے کا آسان حل یہی نظر آیا کہ میں ایک برسٹ مار کر ٹائر فلیٹ کر دوں مگر پھر ڈرائیونگ سیٹ

پر ایک دشمن کی شبیہ مجھے صاف دکھائی دی تو میں نے دوراندیشی سے کام لیتے ہوئے انٹرکولر کو ناکارہ کرنے کے بجائے ڈرائیور کا نشانہ لیا اور لبلبی دبا دی۔ رات کے دم بہ خود سناٹے میں میری گن نے آتشیں قہقہہ لگایا، اور میں نے ڈرائیور کے سر کو ڈھلکتے دیکھا، انٹرکولر ڈولنے لگی۔ ابھی اس کی رفتار بہت کم تھی، وہ رک گئی۔ یکلخت ہر طرف سناٹا جم سا گیا۔ کیونکہ میں ڈرائیور کو ہی ان کا آخری ساتھی سمجھا تھا اس لیے دھڑا دھڑ آگے بڑھا تھا۔ مگر یہ میری بدقسمتی تھی کہ میں عین آخری کامیابی کے لمحات میں اوورکانفیڈنس کا شکار ہو گیا تھا، یہ میرا کچاپن تھا شاید۔ اب بچنے کی امید نہ تھی، موت... یقینی موت کو اپنے سامنے بہت قریب دیکھ کر میں ایک لمحے کو سن ہو کے رہ گیا تھا۔ وہ چست سیاہ لباس اور اسی رنگ کے ماسک نما نقاب میں تھا اور بڑی تسلی کے ساتھ میرا نشانہ لے کر فائر کرنے کو تیار تھا کہ اچانک میں نے اسے چونکتے دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے بازی پلٹ گئی، کورٹ کی گیند گویا اچھل کر میرے پاس آ گئی، اس کی گن شعلے اگلنے سے قاصر رہی تھی، اور وہ بری طرح بوکھلا گیا تھا پھر میں نے ڈرامائی انداز میں اپنی گن سیدھی کر دی۔ اس کا نشانہ لے کے لبلبی دبائی، وہ اچھل کر انٹرکولر کے پچھلے حصے میں جا کودا مگر ادھر میری گن سے بھی محض کلک کی آواز ابھری۔ بازی ہم دونوں کے ہاتھ سے نکلتی چلی گئی۔ میری گن کا شکم آتش خالی تھا۔ میں گن پھینک کر طوفانی انداز میں انٹرکولر کی طرف دوڑا۔ میرے دشمن کو بھی پل کے پل احساس ہو گیا کہ میری حالت بھی اس سے مختلف نہیں تھی۔ وہ دست بست لڑائی پر اتر آیا۔ وہ بلا کا فائٹر ثابت ہوا۔ سب سے پہلے تو اس نے انٹرکولر کے عقبی دروازے کو لات مار کے توڑا اور اچھل کر باہر آن کودا۔ ٹھیک اسی وقت گاڑی کے کھلے دروازوں سے میں نے اپنے باپ کے بے سدھ وجود کو ایک سیٹ پر پڑے پایا۔ ادھر دشمن نے میرے اور اپنے درمیان کا مختصر فاصلہ دو ''فرشی'' قلابازی لگا کر طے کیا اور ایک لات میرے سینے پر رسید کر ڈالی۔ یہ سب کچھ پلک جھپکنے میں ہوا تھا کہ مجھے سنبھلنے کا موقع نہ مل سکا، میں لڑکھڑا کر گرا۔ مگر سنبھلنے میں بھی دیر نہیں لگائی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ میرا مقابلہ کسی عام آدمی سے نہیں بلکہ ایک تربیت یافتہ فائٹر سے تھا۔ اس کی قامت مجھ سے دبتی ہوئی تھی۔ جسم متناسب تھا مگر نہ جانے کیوں مجھے اس کی ''ٹکر'' میں مردانہ پن کہیں سے بھی جھلکتا محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے سر سے پاؤں تک چست سیاہ لباس پہن رکھا تھا۔ پیروں میں لانگ بوٹ تھے، اس نے جھک کر بڑی تیزی کے ساتھ اپنے لانگ بوٹ کی کسی خفیہ میان سے ایک قرولی ٹائپ کا عجیب دستے والا چاقو نکال لیا۔ جسے ہاتھ میں پکڑنے کا انداز بھی مہارت کی چغلی کھا رہا تھا۔ میں تھوڑا پریشان ہوا۔ وہ میری جانب لپکا، میں یہی سمجھا کہ وہ دست بہ دست مجھ سے بھڑ جائے گا مگر ایسا نہ ہوا۔ میرے صرف دو تین فٹ قریب آ کر اس نے نجانے کیسی مہارت اور بلا خیز پھرتی کے ساتھ چاقو میری طرف پھینکا تھا کہ میں اس کے حملے کا اندازہ ہی لگاتا رہ گیا اور چاقو سیدھا میرے پہلو میں پیوست ہو گیا۔ روح تک کو چیر دینے والی درد کی کربناک لہر نے میرے پورے وجود کو مارے اذیت کے تڑپا کر رکھ دیا تھا۔ بے اختیار میرے حلق سے ''اوغ'' کی کراہ آمیز آواز ابھری اور میں زخم پر ہاتھ رکھ کے جھکا تو اسی لمحے مجھے احساس ہوا کہ چاقو میرے پہلو میں پیوست نہیں ہوا تھا بلکہ چرکا لگاتا نکل گیا تھا۔ شاید دشمن سے کامیابی کے جوش میں اندازے کی عین آخری لمحات میں کوئی غلطی ہو گئی تھی۔ اس کا احساس اسے بھی ہوا تھا اور دوسرے ہی لمحے میں نے اسے گیند کی طرح اچھلتے اور خود پر پلٹتے دیکھا، میں جو پہلے ہی درد اور زخمی ہونے کے باعث تھوڑا جھکا ہوا تھا، حواسوں پر قابو پاتے ہوئے مزید نیچے کو جھک گیا۔ وہ میرے اوپر سے گزرا اور ''دھپ'' کی آواز سے گرا۔ میں درد کو پی کر طوفانی بگولے کی طرح جوشِ غیظ کے ساتھ پلٹا۔ عقب میں گرے دشمن کو سنبھلتے پا کر میں اس پر طوفان بلا خیز کی طرح ٹوٹ پڑا۔ میں اسے اپنے مضبوط آہنی بازوؤں کے شکنجے میں جکڑ کر بے بس کر دینا چاہتا تھا۔ میں ابھی اس پر زخمی شیر کی طرح جھپٹا ہی تھا کہ وہ تڑپا اور میرے شکنجے سے بچنے کی سعی چاہی مگر میں اسے دبوچ چکا تھا تب دوسرے ہی لمحے مجھے ایک عجیب احساس ہوا۔ مجھے وہ بدن کسی مرد کا محسوس نہیں ہوا تھا۔ تب میں نے ایک جھٹکے سے اس کا نقاب کھینچ لیا۔ لمبے گھنیرے لچھے دار بال میرے چہرے پر بکھر گئے، میں نے اس کا گلا دبوچ لیا اور جھٹکا دے کر اس کے بال چہرے سے دور کیے۔ اب ہم دونوں بہت قریب سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے، اور ایک دوسرے کو دیکھ کر ہم دونوں ہی اس بری طرح چونکے تھے کہ کئی ثانیے تک تو ایک دوسرے کو اس طرح دبوچے تکتے رہ گئے۔

☆☆☆

وقت رک گیا تھا، جیسے اسے موت آ گئی ہو۔ شناسائی کی جھلک ہم دونوں کی آنکھوں سے ہی نہیں چہروں سے بھی عیاں تھی۔ سب سے پہلے میرا سکتہ ٹوٹا اور بے اختیار منہ سے نکلا۔

''ثریا۔''

''شش... شہزی... تم۔'' اس کے ہونٹوں سے بھی تھراتی ہوئی آواز نکلی اور پھر ہم ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ ہم دونوں ہی ورطۂ حیرت میں مبتلا تھے۔ ہمیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

یہ وہی ثریا تھی، اطفال گھر کے زمانے کی ساتھی۔ عابدہ اور شکیلہ کی طرح میں نے اس کے ساتھ ہی اطفال گھر میں بچپن اور پھر لڑکپن بیتایا تھا۔ اوکاڑہ میں چنی بائی کے چنگل سے میں جن چار بدنصیب لڑکیوں کو چھڑا کر لایا تھا اور انہیں بعد میں دارالامان کے حوالے کیا تھا ان میں شکیلہ کے ہمراہ ثریا بھی تھی۔

''او... میرے خدا! یہ... یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں، مجھے یقین نہیں آ رہا۔'' وہ ہسٹریائی سے انداز میں بولی۔

میرے زخمی پہلو سے خون بھل بھل بہہ رہا تھا اور مجھ پر نقاہت سی طاری ہونے لگی تھی۔ میں اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا مگر زخم کھلا پڑا تھا۔ اس نے مجھے سنبھالا... سہارا دے کر مجھے گاڑی کی عقبی سمت لے آئی اور پھر اس کے پچھلے حصے میں سیٹ پر لٹا دیا۔ درمیانی سیٹ پر وزیر جان بے سدھ پڑا تھا، اور اسے ہوش آ رہا تھا۔ ثریا نے جلدی سے ڈیش بورڈ کے نچلے خانے سے ایک باکس نکالا، اور ایک سرنج بھر کے وزیر جان کی گردن میں لگا دی، لگ بھگ کوئی دن کی سی دوا انجیکٹ کر کے وہ میری طرف متوجہ ہوئی، اور میری قمیص اوپر کر کے زخم کا جائزہ لینے لگی۔

''اسے تم نے کون سا انجکشن لگایا؟'' میں نے پوچھا۔

''بے ہوشی کا، ورنہ یہ تمہارے میرے تعلق پر چونک پڑے گا۔ ہمارا بھانڈا پھوڑ دے گا۔'' وہ جواباً بولی۔

''کیا یہ بھی تمہارا ہی ساتھی ہے؟''

''ہاں۔''

وہ میرے زخم پر مرہم پٹی کرنے لگی۔ ''شکر ہے، آخری وقت میں میرا نشانہ جلد بازی میں چوک گیا، زخم زیادہ گہرا نہیں آیا ہے۔'' وہ بولی۔

''تم ان کے ساتھ کیسے شامل ہو گئی ہو؟ یہ لوگ مجھے کچھ اور ہی طرح کے لگتے ہیں۔ اسپیکٹرم...'' میں نے کہا۔

وہ چونکی۔ ''اوہ... تم اس تنظیم سے واقف ہو؟''

''صرف نام سے... اور وہ بھی چند گھنٹے پہلے۔'' میں نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ میری مرہم پٹی سے فارغ ہو گئی، مجھے درد میں افاقہ ہوا، ایک انجکشن بھی اس نے مجھے لگا دیا۔

''تم تو ان لوگوں کے ساتھ رہ کر بہت خطرناک فائٹر بن گئی ہو، حیرت ہے، تم ان کے ہتھے کیسے چڑھ گئیں؟'' میں نے ہلکی مسکراہٹ سے کہا۔ مگر وہ خاصی پریشان، گھبرائی ہوئی اور فکرمند نظر آ رہی تھی، اسی لہجے میں بولی۔

''شہزی! میں سب کچھ تفصیل سے بعد میں بتا دوں گی مگر پلیز، تم ان کے راستے سے ہٹ جاؤ، یہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔'' اس کے لہجے میں ازحد تشویش تھی، میں نے اسی طرح مسکرا کر کہا۔

''ان کی خطرناکی کا اندازہ مجھے تمہاری تربیت سے ہو چکا ہے۔ ویسے میری ان لوگوں سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ یہ لوگ میرا شکار چھین کر بھاگے تھے۔''

''شکار؟'' وہ الجھ گئی۔ میں نے درمیانی سیٹ پر بے ہوش پڑے وزیر جان کی طرف اشارہ کیا۔

''اوہ۔'' اس کے نرم ہونٹ دائرے کی شکل میں سکڑ گئے۔ میں اسے بہ غور دیکھ رہا تھا۔ ایک سیدھی سادی لڑکی آج مجھے کچھ اور ہی نظر آ رہی تھی، شاید کڑے وقتوں اور حالات کی مار نے اسے بھی میری طرح کیا سے کیا بنا ڈالا تھا۔

''میں اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ اشارہ وزیر جان کی طرف تھا۔ وہ مجھ سے مستفسر ہوئی۔

''تمہاری اس سے کیا دشمنی ہے؟'' اس کی بات سن کر میرے ہونٹوں پر بڑی تلخ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور میں بولا۔

''میری اس شخص سے بڑی عجیب طرح کی دشمنی ہے۔ تم اس بات کو چھوڑو، میں بہرحال اس کی جان کا دشمن نہیں ہوں لیکن میں نے اس سے کچھ اہم باتیں اگلوانی ہیں۔''

''ہم زیادہ دیر ادھر نہیں کھڑے رہ سکتے۔ خفیہ ایجنسی کے اہلکار سائے کی طرح ہمارے پیچھے ہیں۔'' وہ بولی۔ میں چونکا۔ سمجھ گیا کہ یہ پاور ایجنٹوں کی بات کر رہی تھی۔ میں بولا۔

''ٹھیک ہے تم چلی جاؤ، شکار میرے حوالے کر دو۔''

میری بات پر وہ الجھتی پھر بولی۔ ''اس طرح میں خود خطرے میں پڑ جاؤں گی۔ تنظیم کے لوگ یہ برداشت نہیں کریں گے۔ اسے وہ میری کوتاہی پر محمول کریں گے اور ایسے حالات میں جبکہ میں ان کی تنظیم میں عنقریب ایک اہم عہدے پر فائز ہونے والی ہوں کسی طرح بھی یہ میرے لیے بہتر اور مناسب نہ ہوگا۔''

"تم وزیر جان کی جان کی دشمن ہو؟" میں نے کسی خیال کے تحت دوبارہ ہچکچ اور تسلی چاہی۔

"یہ کب کہا میں نے؟" وہ بولی۔ "تمہیں شاید علم نہیں اس شخص کو تنظیم میں "اسٹیشن چیف" کا عہدہ ملنے والا ہے۔"

"اسٹیشن چیف؟" میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں، اسٹیشن چیف... تنظیم کی ماسٹر اتھارٹیز جس ملک میں اپنے پنجے گاڑتی ہیں، یہ ان لوگوں کا اصول ہے کہ اسی ملک کی کسی طاقت ور بااثر شخصیت کو وسیع تر تنظیمی مفادات کے لیے اس کا کنٹرول دے دیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کے زیادہ تر ایجنٹ بھی لوکل سطح کے ہوتے ہیں۔"

"کیا یہ کوئی بین الاقوامی دہشت گرد تنظیم ہے؟"

"یہ ان سے بھی بڑھ کر ہے۔"

"مگر تم ان کے ساتھ کیوں شامل ہو گئی ہو؟" میں نے ذرا سخت لہجے میں ثریا سے کہا۔ میری بات پر اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا پھر بولی۔

"یہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گی۔ ابھی ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔" اس نے کہا۔

اس کی بات ٹھیک تھی، وہ ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنے لگی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ درد کی ہلکی سے ٹیس میرے زخمی پہلو سے اٹھی اور پھر سرد پڑ گئی۔ مجھے حیرت انگیز طور پر افاقہ محسوس ہو رہا تھا۔ میں بھی اس کے برابر والی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔

سرِدست مجھے یہ سفر کسی انجان اور نامعلوم منزل کی طرف گامزن محسوس ہوا۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ظاہر ہے، وہاں تو نہیں جا رہے جدھر ہم پہلے وزیر جان کو پہنچانا چاہتے تھے۔ میں کسی اور جگہ کا قصد کیے ہوئے ہوں۔ اس میں اگرچہ خود مجھے بھی اپنے ہی لوگوں سے دشمنی مول لینے کا خطرہ ہے لیکن تمہاری خاطر مجھے یہ بھی قبول ہے۔ تم نے مجھے چنی بائی جیسی ظالم نائیکا اور اس کے خطرناک لوگوں سے جو بچایا تھا۔ میں تمہارا یہ احسان ساری زندگی نہیں بھول سکتی۔" اس کی بات پر میں نے ونڈ اسکرین کے پار ہیڈ لائٹس کی روشنی میں ویران سڑک پر نظریں ڈالتے ہوئے روکھے پھیکے لہجے میں کہا۔

"مگر تم نے میری یہ قربانی خاک میں ملا دی۔ نہ جانے اب تم کن خطرناک اور جرائم پیشہ لوگوں کی آلۂ کار بن گئی ہو۔ یہ مجھے بہر حال پسند نہیں۔" وہ کچھ نہیں بولی۔ شاید اسے افسوس ہوا تھا یا میری بات اچھی نہیں لگی تھی۔ میں نے یونہی اس کی طرف گردن موڑ کر دیکھا، وہ ونڈ اسکرین پر نگاہیں جمائے ہوئے ہولے سے بولی۔

"میں نے تمہاری قربانی ضائع نہیں جانے دی تھی مگر حالات اور بعض مجبوریوں کی بنا پر میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس راستے پر چل نکلی۔ میں اب پہلے والی ثریا نہیں رہی۔" مجھے اس کے آخری الفاظ میں رقت گھلی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ میں نے تلخی سے کہا۔

"حالات نے مجھے بھی مجبور اور بے بس کیا تھا مگر میں نے اس کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور کر رہا ہوں۔ مگر کبھی بھی غلط راستے کا انتخاب نہیں کیا۔ اس کے جواب میں اس نے روایتی جملہ بولا۔

"تم مرد ہو نا اور میں عورت۔"

"عابدہ کو بھول گئیں تم؟" میں نے تمثیلاً اس سے کہا۔ "وہ بھی ایک کمزور اور ناتواں عورت ہے مگر میری طرح اس نے کبھی بھی اپنے ضمیر کا سودا نہیں کیا اور عورت ہو کے مردانہ وار حالات کا مقابلہ کیا۔ تم کیا جانو وہ کن کن نازک لمحات اور کڑے حالات سے سرخرو ہو کے گزری ہے۔" عابدہ کے ذکر پر وہ چونکے بنا نہ رہ سکی تھی۔ ظاہر ہے اطفال گھر کی پرانی ساتھی ہونے کے ناتے اسے عابدہ نہیں بھولی تھی۔ اطفال گھر کے کچھ قریبی ساتھیوں کی طرح وہ میرے اور عابدہ کے درمیان پنپنے والے "تعلق خاطر" سے بھی بہ خوبی آگاہ تھی، میں نے دیکھا عابدہ کے ذکر پر اس کے ملیح چہرے پر یک دم گہری تشویش کی سلوٹیں سی پڑ گئیں۔ اس نے ونڈ اسکرین سے نگاہیں ہٹا کر ایک نظر میرے چہرے پر ڈالی پھر بولی۔

"عابدہ آج کل امریکا کے ایک اسپتال میں موجود ہے۔"

اس نے جیسے میری سماعتوں میں دھماکا کیا جس نے یکلخت ہی میرے وجود کی ساری حسیات بیدار کر دی تھیں اور میں بے چینی اور ایک نامعلوم سی تشویش آمیز فکر سے تڑپ کر بولا۔ "تت... تمہیں کیسے معلوم ہوا...؟ بولو؟" میری پھیلی ہوئی آنکھوں نے دیکھا۔ ثریا کے چہرے پر ہولناک سناٹے کسی آسیب کی طرح چپٹ گئے، وہ بولی۔

"شہزی! میں تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گی، یہ میرا وعدہ ہے۔"

"نہیں، مجھے ابھی بتاؤ، تم عابدہ کے بارے میں کیونکر واقف ہو۔ روکو گاڑی۔"

میں جیسے متوحش ہو گیا۔ مجھے ثریا ایک زہریلے دشمن کے روپ میں نظر آنے لگی۔ اس نے کہا۔

"شہزی! خدا کے لیے جوش میں مت آؤ، ورنہ سب کچھ بگڑ جائے گا۔ میں تم سے تعاون کی درخواست کرتی ہوں اور وعدہ کرتی ہوں۔ میں تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گی بلکہ... بلکہ میں تو خود تم سے مدد چاہتی تھی، مجھے سب معلوم ہے، تمہارے بارے میں، عابدہ کے بارے میں... اور چودھری ممتاز سے تمہاری دشمنی، اس کی سوتیلی بہن مختاری بیگم المعروف بیگم صاحبہ کے بارے میں بھی۔" مجھے اس کی بات پر حیرت کا شدید جھٹکا لگا، وہ آگے بولی۔ "شہزی! لگتا ہے تم بھی عجیب ہی قسمت لے کے پیدا ہوئے ہو۔ تقدیر تمہیں ہر وقت جیسے حالتِ جنگ میں رکھنا چاہتی ہے۔ اطفال گھر سے نکلے تو دوسرے دگرگوں حالات کا شکار ہو گئے اور اب ایک کے بعد دوسرے اور تیسرے نامساعد حالات کی طرف تمہیں دھکیلا جا رہا ہے اور تم اس سے ناواقف ہو۔"

میرا دماغ جیسے بھک سے اڑ گیا۔ مجھے تو بولنے تک کا ہی یارا نہیں رہا۔ اب وہی بولے جا رہی تھی اور ایک انکشاف کے بعد دوسرا انکشاف کیے جا رہی تھی۔ "شاید قدرت ہی دنیا میں کچھ ایسے لوگوں کا انتخاب کر چکی ہوتی ہے جن سے بنی نوعِ انسان کی بھلائی کے لیے کچھ کام کروانا چاہتی ہے جو تمہاری طرح ثابت قدم رہتے ہیں۔ وہ سرخرو ہوتے ہیں۔ شہزی! میری اس بات کا یقین کرو، جب سے مجھے تمہارے ان حالات کا پتا چلا ہے میں خود تم سے ملنے کے لیے بے چین ہو گئی تھی۔ میں اس وقت تمہاری ذہنی کیفیات سے واقف ہوں۔ مگر شاید یہ میری خوش قسمتی ہے یا پھر بدقسمتی کہ تم سے ملاقات تو ہوئی مگر بہت غلط وقت پر کہ میں اس وقت تمہارے ساتھ کوئی تفصیلی گفتگو کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔"

"تمہیں پریشانی کیا ہے اس وقت؟ اور اب تم میرے ساتھ کہاں جا رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے وزیر جان کو لے کر اپنے ہیڈ کوارٹر جانا ہے جو زیرو ہاؤس کہلاتا ہے۔ آگے بات لمبی ہے اسے چھوڑو مگر پہلے تمہیں وزیر جان سے جو پوچھنا اگلوانا ہے وہ کر کے مجھے فارغ کرو، اس کے لیے ابھی میں تمہیں ایک ویران عمارت میں لے جا رہی ہوں، وہ اسٹیشن نور کہلاتی ہے، جدھر ہمارے نئے اسٹیشن چیف وزیر جان کو رہنا ہوگا اور وہیں

سے اسے اوپر والوں کی طرف سے ہدایات ملیں گی۔ اگرچہ یہ سب کرتے ہوئے میں اپنے لیے ایک بہت بڑا رسک بھی لے رہی ہوں۔ ویسے تمہیں اس سے پوچھنا کیا ہے؟"

اچانک میرے ذہن میں روشنی کا جھماکا ہوا۔ وزیر جان سے سب سے پہلے تو میں یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ آخر میں اس کا لگتا کیا ہوں؟ اور وہ مجھے پندرہ سولہ سال سے اب تک کیوں متواتر دھتکار رہا ہے؟ اس کے بعد میں نے بیگم صاحبہ کے بارے میں اگلوانا تھا لیکن ثریا کو اتنے خطرات میں گھرے دیکھ کر اور وزیر جان یعنی اپنے باپ کی مستقبل میں حیثیت و مقام دیکھ کر میں نے اپنا ارادہ بدل لیا اور ذہن میں میرے روشنی کا جھماکا درحقیقت ایک فوری آنے والا خیال تھا کہ اگر ثریا میرے اور چودھری ممتاز خان سمیت بیگم صاحبہ کے بارے میں سب جانتی تھی تو پھر ممکن ہے اسے بیگم صاحبہ کے بارے میں یہ بھی معلوم ہوگا کہ اسے کہاں قید یا یرغمال بنا کے رکھا گیا ہے۔ کیونکہ میری معلومات کے مطابق بیگم صاحبہ کو چودھری ممتاز نے ہی اغوا کروایا تھا اور اس میں وزیر جان کی مدد شامل تھی جبکہ بابن ڈکیت نے ہی بیگم صاحبہ کو کسی خاص مقصد کے لیے اپنے کسی خفیہ یا نامعلوم اڈے میں مقید کر رکھا تھا جو چک نواں کے قریب کہیں واقع تھا۔ لہٰذا ثریا کے آخری سوال پر میں نے کہا۔

"میرا خیال ہے تم مجھے وہ سب بتا سکتی ہو جو میں وزیر جان کے منہ سے اگلوانا چاہتا ہوں۔"

"ہاں، بولو۔"

پھر میں نے اپنے اور وزیر جان کے باپ بیٹے والا تعلق اور رشتے کا ذکر کیے بغیر صرف بیگم صاحبہ کے بارے میں پوچھا تو وہ الجھ گئی۔ مگر پھر پُرامید ہو کے بولی۔ "اگرچہ ابھی مجھے یہ سب معلوم نہیں مگر اس کا پتا میں چلا لوں گی۔ یہ تم نے ٹھیک کہا۔ اس طرح تم نے مجھے ایک بڑے خطرے سے بچا لیا اور وقت بھی۔ تم فکر نہ کرو، میں تمہیں اسٹیشن نور پہنچاتی ہوں ادھر فون ہے۔ میں ہیڈ کوارٹر پہنچتے ہی یہ معلوم کر کے تمہیں اسٹیشن نور کی عمارت میں فون کر کے بتا دوں گی، رائٹ؟"

"تم اتنی جلدی ان ساری باتوں کا کیسے پتا چلا لو گی؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولی۔ "شاید تم بھول گئے، ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی میں نے تمہیں بتایا تھا کہ چودھری ممتاز کو وزیر جان کی فل سپورٹ حاصل ہے اور چودھری ممتاز خود بھی "اسپیکٹرم" کا کٹھ پتلی ایجنٹ جو تنظیم کے ہیں ٹاپ ایجنٹوں کو اپنی صوابدید پر

کنٹرول کرنے کا مجاز ہوتا ہے۔ اب تم خوب اندازہ کرلو کہ میرے لیے یہ کام کس قدر آسان ہوگا۔" وہ مسکرائی۔ میں نے قدرے طمانیت بھری سانس لی۔ ٹھیک اس وقت میں نے ثریا کو چونکتے دیکھا۔ بے اختیار میری نظریں ونڈ اسکرین کے پار پڑیں، شاید ثریا کو کچھ نظر آیا تھا مگر نہیں وہ بائیں ہاتھ سے اسٹیئرنگ کو پکڑے سیدھا ہاتھ کان پر رکھ کر دھیمے لہجے میں کسی سے بات کرنے لگی۔

"یس مسٹر آرک! مشن کامیاب رہا۔ باور ایجنٹوں کا خاتمہ کر کے ان کے قبضے سے وزیر جان کو چھڑا کر ہیڈ کوارٹر لایا جارہا ہے۔ مگر بدقسمتی سے ہمارے سارے ساتھی اس مشن کی تکمیل میں کام آچکے ہیں... اوور..."

میں ٹھٹکا۔ وہ شاید اپنے کان میں لگے آویزے کی طرح جھولتے کسی خفیہ بٹن نما ٹرانسمیٹر کے ذریعے مخاطب تھی۔ پھر دوسری طرف سے کچھ سننے کے بعد بولی۔ "او کے مسٹر آرک! آپ بے فکر رہیں، میں بہت جلد ہیڈ کوارٹر پہنچ رہی ہوں... اوور اینڈ آل۔"

یہ ساری گفتگو انگریزی میں ہوئی تھی، میں ایک بار پھر ثریا اور وزیر جان کی طرف سے الجھن کا شکار ہوگیا۔ وزیر جان کو میں کسی بھی صورت میں ان کے حوالے کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا، مگر یہ تسلی ہونے کے بعد کہ وزیر جان کی ان کی نظروں میں کیا حیثیت تھی، مجھے کچھ تسلی ہوگئی تھی اور پھر ثریا نے مجھے یہ اطمینان بھی دلایا تھا کہ میں جو کچھ وزیر جان کے منہ سے اگلوانا چاہتا تھا اس سلسلے میں بغیر کسی رکاوٹ اور مشکل کے وہ میرا مسئلہ حل کرسکتی تھی۔ ورنہ وزیر جان کب اتنی آسانی سے اپنا منہ کھولتا اور منہ کھلوانے کے لیے میرا ضمیر یہ گوارا نہیں کرتا کہ اپنے ہی باپ پر تشدد کرتا، پھر ایسے میں ثریا کی زندگی کو بھی اپنے لوگوں سے خطرہ لاحق ہونے کا اندیشہ تھا جبکہ وہ مجھ سے ہر طرح کا تعاون کرنے کو بھی تیار تھی اور بہت سی ایسی باتیں مدد کے حوالے سے بھی مجھ سے شیئر کرنے کا ارادہ رکھتی تھی تو مجھے لمبے چوڑے کھڑاگ میں پڑنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس پر مستزاد وقت میرے پاس بھی کم تھا۔

ہائی وے پر سفر بہ مشکل بیس، پچیس منٹ میں طے ہوا تھا کہ ثریا نے دائیں جانب موڑ کاٹا۔ گاڑی ایک متوسط علاقے میں داخل ہوگئی۔ یہ خاصا گنجان آباد علاقہ نظر آتا تھا اور اس وقت سنسان اور تاریک پڑا تھا۔ کہیں کہیں کسی گھر کے صحن سے ہلکی پیلی روشنی پھوٹتی نظر آتی تھی۔ ایک دو گلی نما راستے طے کرنے کے بعد گاڑی ایک خاصے کشادہ بنگلے نما گھر

کے سامنے رک گئی۔ ہم دونوں نیچے اترے۔ دروازے پر تالا نہیں تھا۔ انٹرلاک تھا۔ ثریا نے چابی نکال کر گھمائی، دروازہ اندر کی طرف دھکیلا اور ہم دونوں اندر داخل ہو گئے۔ صحن میں ہلکے پاور کا بلب روشن تھا۔ ایک طرف باغیچہ تھا۔ ہم اندر آگئے۔ یہ بنگلا نما عمارت ایک منزلہ تھی، اس وقت بنگلا ویران پڑا تھا۔

ثریا مجھے ایک آرام دہ کمرے میں لے آئی، اس کے انداز و اطوار سے اب عجلت ظاہر ہونے لگی تھی۔ شاید اسے اپنے ہیڈ کوارٹر پہنچنے کی جلدی تھی۔

"میں اب چلوں گی۔" بالآخر وہ بولی۔ "تم فکر مت کرنا تمہارا کام ہوجائے گا۔"

"مگر میں تم سے رابطے میں کیسے رہوں گا؟" میں نے سوال کیا۔ جواباً اس نے اپنے چست لباس کی شرٹ کے اندر ہاتھ ڈال کے ایک بٹن نما شے میری جانب بڑھا دی۔ اسکن کلر کا یہ بٹن کسی موٹے جیسٹر یا کوٹ کا ہی لگتا تھا۔

"لو رکھو اسے... سنبھال کر۔"

"کیا ہے یہ؟" میں بٹن نما شے اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے بولا۔

"یہ ٹرانسمیٹر ہے۔" وہ مسکرا کر بولی۔ "اسے خفیہ رکھنے کے لیے کان کے پیچھے لگاتے ہیں بادی النظر میں یہ کم ہی کسی کو دکھائی دیتا ہے۔ غور سے دیکھنے پر کوئی یہی سمجھتا ہے کہ یہ آلۂ سماعت ہے۔"

"مگر اس کا اسپیکر، مائیک، آن اینڈ آف کا سسٹم کہاں ہے؟" میں نے الجھن آمیز حیرت سے کہا۔

"اسے فریکوئنسی پر سیٹ کیا گیا ہے جو میں تمہیں بتا دیتی ہوں۔ جب تمہیں مجھ سے بات کرنا ہوگی تو اپنے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی بٹن پر رکھو گے تو پھر تمہاری یہ انگلی اسپیکر اور مائیک دونوں کا کام کرے گی، فریکوئنسی بھی تم اسی طرح بٹن پر انگلی رکھ کر ملاؤ گے۔" یہ کہہ کر اس نے مجھے نہ صرف اس کا میکنزم سمجھا دیا بلکہ طریقۂ کار بھی۔ مجھے اپنے وجود میں عجیب سے سنسنی کا احساس ہونے لگا۔ اس نے مجھے یہ آلہ کان سے چپکانے اور اتارنے کا طریقہ بھی بتا دیا۔ اب وہ میرے کان میں چھپاں تھا۔ آزمائشی طور پر دوسرے کمرے میں جاکر میں نے دو تین بار ثریا سے اس ٹرانسمیٹر سے رابطہ بھی کیا۔

"اب چلو... اور مجھے چک نواں کے کسی قریبی جگہ پر اتار دینا۔ اب میں یہاں بیٹھ کر کیا کروں گا۔"

وہ بولی۔ "یہ کام گاڑی میں بھی کرسکتی تھی میں، لیکن

تمہیں اسٹیشن نور نامی یہ عمارت دکھانے کا میرا ایک مقصد تھا۔ کیونکہ اب وزیر جان یعنی ہمارے نئے "اسٹیشن چیف" کو ادھر سے ہی تنظیم کی ماسٹر اتھارٹیز سے خاص ہدایات ملتی رہیں گی۔ دو تین روز میں یہ عمارت پوری طرح فعال کر دی جائے گی۔ تمہارا زخم ٹھیک ہے اب؟" اس نے آخر میں پوچھا۔

"بہت بہتر ہے، تمہاری لگائی ہوئی دوا نے جادو کا کام کیا ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

میں اب پوری طرح مطمئن ہوگیا تھا۔ گویا مجھے وزیر جان کے دونوں ٹھکانوں کا علم ہو چکا تھا، میرا ارادہ بیگم صاحبہ والا معاملہ نمٹانے کے بعد وزیر جان سے اس سوال کا جواب حاصل کرنے کا تھا۔ میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ آخر وہ کیوں مجھے مسلسل دھتکار رہا تھا؟ اس کے دل میں میری ذرا بھی پدرانہ محبت نہ تھی حتیٰ کہ وہ اپنے مفادات کی خاطر میری جان لینے پر بھی تیار تھا، کیوں؟ حقیقت یہ تھی کہ اپنے باپ کے اس سنگدلانہ، بے رحمانہ سلوک کے بعد میرے اندر کا وہ ازلی دکھ جو باپ کی بے حسی کے باعث ایک بیٹے کی دوری کا تھا وہ اب ویسا شدید نہ رہا تھا۔ تاہم سوالیہ نشان ضرور ایک آنکڑے کی طرح میرے حلق میں ابھی تک اٹکا ہوا تھا۔ اور مجھے یہ باور کرا رہا تھا کہ کیا واقعی وزیر جان میرا باپ ہی تھا؟ نہیں تو پھر کون تھا میرا باپ؟

دل تو چاہتا تھا کہ ابھی وزیر جان کو گاڑی سے گھسیٹ کر یہاں لاؤں اور جس طرح اس نے میرے ساتھ بے حسیانہ سلوک کیا تھا میں بھی اس کے ساتھ ویسا ہی کروں اور اس سے پوچھوں کہ اگر میں اس کا بیٹا نہیں تو پھر میں کس کا بیٹا ہوں؟ لیکن ثریا کی غیر متوقع مداخلت اور اس کی جان کے خطرے کے پیش نظر میں ابھی اس کی بات ماننے پر مجبور تھا۔ پھر ثریا نے بھرپور تعاون کا بھی مجھ سے وعدہ کیا تھا یہاں تک کہ مجھے وزیر جان کی حیثیت اور اس کے ٹھکانے کے بارے میں بھی آگاہ کیا تھا اور خود سے مستقل رابطے کے لیے اس نے ایک خفیہ ٹرانسمیٹر بھی دیا تھا۔

ہم دونوں باہر گاڑی میں آکر سوار ہوئے اور روانہ ہو گئے۔

پو پھٹے مجھے کھلاں والی کے قریب چک نواں اتار کے ثریا آگے روانہ ہوگئی۔

میں ایک چائے خانے میں جاکر بیٹھ گیا۔ نیند اور تھکن سے برا حال ہو رہا تھا۔ یہاں مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ میں اول خیر سے کہاں رابطہ کروں؟ بیگم ولا میں اس

نے مجھے فقط اتنا ہی بتایا تھا کہ وہ کھلاں والی کے قریب کسی چھوٹے دیہات چک نواں میں کہیں چھپا بیٹھا ہے اور بیگم صاحبہ کی بازیابی کے لیے کوشاں ہے، جبکہ اس نے کبیل دادا کو بھی بتایا تھا کہ اس نے بابن ڈکیت کا ٹھکانا تلاش کرلیا ہے، مگر ابھی اس سے بھڑنے سے کترا رہا تھا جب تک کبیل دادا اپنے چند آدمیوں کے ساتھ وہاں نہیں پہنچ جاتا، نیز میں اول خیر سے ٹیلی فونک رابطہ کرنے کی پوزیشن میں بھی نہ تھا۔ کیونکہ اس نے کہا تھا وہ خود مجھ سے رابطہ کرے گا اور جس نمبر سے اس نے بیگم ولا میں ہم سے رابطہ کیا تھا وہ اس کا نمبر نہیں تھا اور نہ ہی وہ دوبارہ اس نمبر پر مل سکتا تھا۔ مجھے خود اس کے فون کا انتظار تھا۔ مگر ابھی تک اس نے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔

بہرحال مجھے اب ثریا سے ہی امید تھی کہ وہ اپنے تنظیم کے ہیڈ کوارٹر پہنچ کر ان باتوں کا پتا چلانے کی کوشش کرے گی اور مجھے دیے ہوئے ٹرانسمیٹر پر رابطہ کرے گی مگر پھر بھی چک نواں پہنچنے کے بعد میرا دل اول خیر سے ملنے کے لیے بے چین تھا۔ نہ جانے اب وہ کہاں اور کس حال میں تھا۔ دفعتاً ایک خیال میرے ذہن میں "کلک" ہوا۔ کیوں نہ اول خیر کے اس نمبر پر رابطہ کیا جائے، جس پر کل اس نے ہم سے بیگم ولا میں رابطہ کیا تھا۔ اگرچہ اس نے کہا تھا کہ وہ دوبارہ اس نمبر پر نہیں ملے گا مگر ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید اس نمبر پر اس کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہوسکیں۔

ابھی میں پرانے نمبر پر اول خیر سے رابطہ کرنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ میرے سیل پر اس کی کال آگئی۔ نمبر یہ بھی اجنبی تھا مگر دوسری جانب سے اول خیر کی آواز سنتے ہی میرے وجود میں مسرت اور جوش کی لہریں دوڑ گئیں۔

"او خیر... کاکا... کدھر ہے تو؟ بھلا چنگا تو ہے نا؟"

اس کی مخصوص یار باش آواز ابھری تو مارے بے قراری کے الٹا میں نے اس پر سوالوں کی بوچھاڑ کر ڈالی۔

"تو... تو کیسا ہے... میرے یار؟ کہاں ہے؟ کس حال میں ہے؟ ٹھیک تو ہے؟" میں جذباتی سا ہونے لگا۔ میرا اور اول خیر کا رشتہ ہی ایسا تھا بلکہ عجیب تھا۔ یہ مجھے بھائیوں سے بڑھ کر یاروں کا یار... لگتا تھا، ایسا بے لوث رشتہ جس میں کوئی دنیاوی غرض و غایت نہ تھی، یہ صرف محبت تھی، خلوص تھا اور ایک دوسرے پر فدا ہونے کا جاں نثار رشتہ تھا۔

"او... خیر... خیر کاکے... ذرا ہولا ہو، تیرا یار بالکل ٹھیک ہے، تو اپنی سنا۔ باقی ساتھی تو ادھر پہنچ گئے، بڑا استاد بھی پہنچنے والا ہے، تو کدھر رہ گیا ہے۔ لگتا ہے پھر کسی

لیے مسئلے میں پڑ گیا ہے تو۔"

میں اس کی بات پر چونکا۔ باقی ساتھیوں سے اس کی مراد ہمارے ہی ساتھی تھے جو میرے اور کبیل دادا کے ساتھ بیگم ولا سے روانہ ہوئے تھے۔ پھر کبیل دادا ہی کی ہدایت کے مطابق وہ قادر پور کی طرف سے دو جیپوں میں الگ الگ دو مختلف راستوں پر آگے چک نواں کی طرف روانہ ہو گئے تھے، اس کا مطلب تھا وہ اول خیر کے پاس پہنچ چکے تھے۔

میں نے اول خیر سے کہا۔ "ساری تفصیل ملنے کے بعد ہو گی۔ میں خود اس وقت چک نواں کے ایک چائے خانے میں بیٹھا ہوں۔"

"کک... کیا؟ تو ادھر ہی ہے میرے یار؟" اسے یقین نہیں آیا۔

"ہاں۔"

"گلبہار چائے خانہ؟"

"آں... ں پتا نہیں۔" میں نے سوچتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا۔ چائے خانے کی ایک اندرونی دیوار پر ڈیزائننگ کے انداز میں گلبہار چائے خانہ نام پڑھ کر فوراً آگے کہا۔ "ہاں، ہاں اسی چائے خانے میں ہوں۔"

"وہیں پر کیل ہو جانا، میں پہنچ رہا ہوں۔" اس نے چھوٹتے ہی کہا اور فون بند کر دیا۔

گلبہار چائے خانہ شاید اس چھوٹے سے قصبے میں ایک ہی تھا، کچی دیواریں تھیں، رنگ و روغن اترا ہوا تھا۔ پو پھٹنے کا وقت تھا۔ کچھ لوگ جو چوبی بنچوں پر بیٹھے پیالیاں پکڑے گرما گرم چائے پی رہے تھے۔

میرے ہاتھ میں بھی چائے کی دھواں اڑاتی پیالی تھی اور میں اس کی ہلکی ہلکی چسکیاں لیتے ہوئے ثریا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کی کئی باتوں نے مجھے اندر سے بری طرح تشویش آمیز الجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔ بالخصوص عابدہ سے متعلق اور پھر "اسپیکٹرم" نامی اس بین الاقوامی تنظیم کے بارے میں اور وہاں وہ (ثریا) کیا کر رہی تھی، ان کے عزائم کیا تھے اور خود ثریا کو مجھ سے کس قسم کی مدد چاہیے تھی۔ پھر ثریا کا میرے بارے میں سب کچھ جان لینا... یہ سب مخمصے میں ڈالنے والی باتیں تھیں۔ اس نے وعدہ تو کیا تھا کہ وہ بہت جلد مجھ سے رابطہ کر کے سب کچھ تفصیل کے ساتھ بتانا چاہتی تھی کب؟ یہ مجھے معلوم نہ تھا اور شاید اسے بھی۔ تاہم مجھے اندازہ ہوتا تھا کہ ثریا کسی معمولی تنظیم کی آلۂ کار نہ تھی جس انداز کی وہ فائٹنگ کر رہی تھی، اور اس نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ بہت جلد اسپیکٹرم... میں ایک اہم عہدے پر فائز ہونے والی تھی، تیز چودھری ممتاز کا بھی اسی تنظیم سے تعلق تھا۔

میں نے ابھی چائے ختم کی ہی تھی کہ ایک ویسپا موٹر سائیکل میرے قریب آن رکی۔ میں چائے خانے کے باہر وسیع احاطے پر بچھی ایک کھڑی چارپائی پر بیٹھا تھا۔ بائیک رکتے دیکھ کر میں اس طرف متوجہ ہوا۔ وہ اول خیر تھا۔ اسے دیکھ کر میں فوراً چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بھی بائیک سے اترا اور ہم دونوں پورے جوش کے ساتھ ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ وہ خاصی عجلت میں تھا۔ ہم پھر وہاں رکے نہیں، بائیک پر سوار ہوئے اور اس نے ویسپا واپس موڑ لی۔

کملاں والی کے اس دور دراز قصبے کی دھول اڑاتی کچی پگڈنڈی نما راستے پر وہ ویسپا دوڑائے جا رہا تھا۔ راستے میں اس نے مجھے ایک اطلاع دی تھی کہ کبیل دادا سے اس نے رابطہ کیا تھا اور وہ بھی وہاں ٹھکانے پر پہنچ چکا تھا۔ تاہم اول خیر میری وہاں آمد پر خوش نہ تھا۔

گارے مٹی کی اوپلے تھپی کچی دیواروں والے ایک گھر کے سامنے بائیک رکی۔ ہم نیچے اترے۔ دروازے پر پرانی بوری کا ٹاٹ جھول رہا تھا۔ اول خیر نے دستک دی۔ دوسری دستک پر ایک شخص نے محتاط انداز میں دروازہ کھولا۔ ہم دونوں اندر داخل ہو گئے۔

صحن ناپختہ اور قدرے کشادہ تھا۔ وہاں دو تین آدمی گنیں لیے ایک چارپائی پر بیٹھے تھے، ہمیں دیکھ کر یک دم اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ ہمارے ہی آدمی تھے۔ اندر بڑا کمرا تھا۔ ہم دونوں وہاں آ گئے۔ دائیں جانب گودڑی بچھی چارپائی، اس کے سامنے نیم دائرے کی صورت میں کرسیاں اور لکڑی کی پیڑھیں دھری تھیں اور یہاں بھی ہمارے مسلح ساتھی موجود تھے۔ چارپائی پر کبیل دادا بڑے غصے کے ساتھ بیٹھا تھا اور چہرے سے خاصا برہم نظر آ رہا تھا۔ مجھ پر اور اول خیر پر تو وہ ویسے ہی ادھار کھائے رہتا تھا لہٰذا مجھے دیکھتے ہی وہ خراش لہجے میں بولا۔

"تم مجھے کنال لاج چھوڑ کر کہاں دفع ہو گئے تھے؟"

مجھے اس کا یہ حاکمانہ لہجہ انتہائی ناگوار گزرا اور میں جواباً اس سے زیادہ سخت اور تلخ لہجے میں بولا۔ "کبیل دادا! لہجہ سنبھال کر بات کیا کرو مجھ سے، میں تم لوگوں کا کارندہ یا آلۂ کار نہیں ہوں۔ رہی بات میری تو تم اندھے تو نہیں تھے، دیکھ ہی رہے تھے کہ ہم پر وزیر جان کے ساتھی ٹوٹ پڑے تھے اور وزیر جان کو خفیہ ایجنسی کے اہلکاروں سے چھڑا کر

لے جانے میں کامیاب ہو گئے تھے، میں ان کے تعاقب میں گیا تھا۔"

کبیل دادا کے ساتھ اس ترکی بہ ترکی لہجے میں جوابی کارروائی پر پہلے اس کے ساتھی مجھ پر مشتعل ہو جاتے تھے، مگر اب بیگم صاحبہ کا میرے ساتھ "سلوک" دیکھنے کے بعد وہ خاموش رہتے تھے۔ کبیل دادا بھی حد سے آگے بڑھنے کی جرأت نہ کرتا تھا جبکہ میرے اور کبیل دادا کے بیچ ہونے والی نوک جھونک اور تلخ کلامی پر اول خیر بھی ایک حد تک "مجبوراً" خاموش رہتا تھا۔

"تو تم نے کون سا تیر مار لیا ان کا تعاقب کر کے؟ میں تو تمہیں خالی ہاتھ دیکھ رہا ہوں۔ ہمارا شکار وزیر جان کہاں ہے؟" وہ تیز نظروں سے میری طرف گھور کے بولا۔ جواباً میں نے استہزائیہ لہجے میں اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ایک شکار تو میں نے تمہارے حوالے بھی کیا تھا، اس کا کیا کیا تم نے؟"

"وہاں پولیس آ گئی تھی، مجھے، ماجے اور ایوب کے ساتھ وہاں سے نکل بھاگنا پڑا... ویسے بھی کارندہ بے ہوش تھا، ہمارے کسی کام کا نہیں تھا۔ مجبوراً ہم نے چک نواں کا رخ کیا تو راستے میں اول خیر کی... کال آ گئی۔" کبیل دادا نے جواب دیا تو اول خیر نے اس خدشے کے پیش نظر کہ میرے اس کے درمیان تلخ بحث طوالت یا بدمزگی کا شکار نہ ہو جائے، فوراً مداخلت کرتے ہوئے بولا۔

"اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں نے اتنا تو پتا چلا ہی لیا ہے کہ بیگم صاحبہ کو بابن ڈکیت نے یرغمال بنا رکھا ہے۔ اب ہمیں اس کے ٹھکانے کا پتا چلانا ہے۔"

"تو تم تین دنوں سے یہاں چک نواں میں جھک مار رہے ہو؟" کبیل دادا کی توپ کا رخ اس کی طرف ہو گیا۔ (شاید اول خیر چاہتا بھی یہی تھا، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ کبیل دادا کی کرخت کلامی کو وہی برداشت کر سکتا تھا، میں نہیں)

"میں نے جھک ماری، بڑے استاد۔" اول خیر نے گمبھیر سنجیدگی سے کہا۔ اس کے لہجے میں بہرحال "بڑے استاد" کا مؤدبانہ پن تھا۔ "یہ بھی میں نے ہی پتا چلایا تھا کہ بیگم صاحبہ بابن ڈکیت کے قبضے میں ہے... ورنہ ہم تو بیگم صاحبہ کی تلاش میں کبھی نیو ملتان کے گرائیں نگر میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے تھے تو کبھی چودھری ممتاز کی آبائی جاگیر سنے پنڈ کی خاک چھاننے میں وقت کا زیاں کر رہے تھے۔"

"یہ بکواس اب رہنے دو، یہ بتاؤ تم نے بابن ڈکیت کے ٹھکانے کا پتا چلایا؟" کبیل دادا جھلا کے بولا۔

اچانک مجھے اپنے کان کی لو میں چبھن کا احساس ہوا، میں چونکا۔ ثریا نے بتایا تھا کہ کال آنے کی صورت میں میرے کان میں چھپا بٹن نما ٹرانسمیٹر گرمائش سی پیدا کرے گا۔ میں نے واش روم جانے کا بہانہ کیا اور اول خیر کے اشارے پر کمرے سے نکل آیا۔ واش روم کیا تھا کچی دیوار کی آڑ کے عقب میں گندا سا غسل خانہ ہی تھا جو بیک وقت رفع حاجت کے طور پر بھی مستعمل ہوتا تھا، بہرحال... مقصد چھپ کے گفتگو کرنا تھی۔ کال یقیناً ثریا ہی کی تھی۔ میں نے نلکا چلا دیا۔ شور میں میری ہلکی آواز بھی دب گئی۔

"یس، شہزی ہیئر، اوور۔" میں نے دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت کان کی طرف لے جاتے ہوئے ہولے سے کہا۔ دوسری طرف سے ثریا کی آواز ابھری۔

"شہزی! بیگم صاحبہ اس وقت چک نواں کے جنوب مشرق میں ہائی وے کی دوسری جانب کچے کے علاقے میں کوئی چالیس کلومیٹر دور چک جھمرہ کے لوٹی شاہ قبرستان کے پچھواڑے... جدھر ایک پرانی باؤلی ہے، وہاں مختصر سے ایک ڈیرے میں بنے ایک کشادہ مکان میں قید ہے۔ بابن ڈکیت بھی وہیں موجود ہے مگر تمہیں جلدی پہنچنا ہو گا۔ اطلاع ہے کہ چودھری ممتاز اس پر تشدد کر کے کسی اسٹامپ پیپر پر دستخط کروانا چاہتا ہے اس کے بعد اسے ہلاک کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، وقت کم ہے، فوراً پہنچو ورنہ چودھری کے تم سے پہلے پہنچ جانے پر صورتِ حال سے نمٹنا اتنا آسان نہ ہو گا... اوور..."

اس کی بات سن کر میرا رواں رواں تھرا اٹھا۔ میں نے کہا۔ "ہم روانہ ہونے کے لیے بالکل تیار ہیں۔ کیا تم بتا سکتی ہو کہ وہاں دشمنوں کی نفری کتنی ہو گی، اوور؟"

"سوری، اس کا مجھے کوئی اندازہ نہیں۔ میں پھر بات کروں گی اوور اینڈ آل۔" اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔ میں فوراً حرکت میں آ گیا۔ کمرے میں پہنچا مگر ابھی مصلحتاً ایسی کوئی بات نہ چھیڑی۔ میں پہلے یہ دیکھنا چاہ رہا تھا کہ کبیل دادا کیا منصوبہ بنائے ہوئے تھا۔ اندر پہنچا تو چونکے بنا نہ رہ سکا۔ کبیل دادا سر پکڑے بیٹھا تھا جبکہ اول خیر بھی متفکر نظر آ رہا تھا۔ تب میں نے گمبھیر آواز میں انکشاف کیا گویا بالفاظ دیگر دھماکا کیا۔

"تیاری پکڑو دوستو! ہمیں اسی وقت چک جھمرہ روانہ ہونا ہے۔ وہاں لوٹی شاہ نامی قبرستان کے پچھواڑے ایک پرانی باؤلی کے قریب کچے میں بنے ایک کشادہ مکان میں بابن ڈکیت نے بیگم صاحبہ کو یرغمال بنا رکھا ہے اور ممتاز

خان وہاں پہنچنے والا ہے۔ وہ ایک اسٹامپ پیپر پر زبردستی بیگم صاحبہ کے دستخط اور انگوٹھا لگوانے کے بعد انہیں قتل کرنے کا ناپاک ارادہ کیے ہوئے ہے۔''

اس اطلاع نے جیسے سب کو تھرا کر رکھ دیا۔ کبیل دادا یوں چارپائی سے اچھل کر کھڑا ہوا تھا جیسے اسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ وہ تحیر آمیز نظروں سے مجھے تکتے ہوئے غیظ آلود جوش سے بولا۔ ''تت... تمہیں یہ کیسے پتا چلا؟''

''وقت ضائع مت کرو دادا! میرے اپنے بھی کچھ ذاتی ذرائع ہیں، نکلو یہاں سے۔''

میں نے کہا اور پلٹا۔ اول خیر کی آنکھیں بھی حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں۔ انہیں اتنا تو اندازہ ہو گیا تھا کہ میں وہاں سے کیوں کھسک گیا تھا، موبائل کے سبب... میرے کان سے چسپاں خفیہ بٹن نما ٹرانسمیٹر کے بارے میں بھلا انہیں کیا معلوم تھا۔

باہر ہماری تین گاڑیاں موجود تھیں۔ ہم سب اس میں سوار ہو گئے۔ ڈرائیونگ سیٹ میں نے سنبھالی تھی۔ میرے برابر میں کبیل دادا اور عقبی نشست پر اول خیر اور تین مسلح ساتھی سوار تھے۔ ہماری گاڑی آگے تھی، میں نے گاڑی اسٹارٹ کر کے ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔

وہ سب... چودھری ممتاز سمیت بابن ڈکیت کا خون چوسنے کے لیے بے چین ہو رہے تھے۔

تینوں گاڑیاں آندھی طوفان کی طرح آگے پیچھے دوڑتی ہوئی، بائی وے پر آگئیں اور چک جھمرہ کی طرف روانہ ہو گئیں۔

میں کسی بھی صورت میں کبیل دادا کو ثریا کے متعلق کچھ بتانے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ البتہ اول خیر کی تو بات اور تھی، وہ تو میرا غم خوار اور ہم رکاب و ہم راز تھا، سو موقع ملنے پر میں اسے سب کچھ بتانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

سفر وہ گرتی خاموشی کے ساتھ جاری تھا مگر اس خاموشی میں آنے والے ایک خوفناک جنگجو طوفان کی دھمک بھی محسوس ہوتی تھی۔ لگتا کچھ ایسا ہی تھا کہ یہ ایک فیصلہ کن معرکہ تھا چودھری ممتاز کے خلاف... کیونکہ اس نے بیگم صاحبہ کو اغوا اور بعد میں یرغمال پھر قتل کرنے کا ناپاک ارادہ کر رکھا تھا جبکہ بیگم صاحبہ کے کارکنوں کے لیے چودھری ممتاز کا یہ جرم ہی ناقابل معافی تھا کہ اس نے ان کی لیڈر کو اغوا کیا تھا۔

چک جھمرہ کا طے شدہ فاصلہ پاٹنے کے بعد میں نے گاڑی دائیں جانب کچے میں اتار لی۔

دور مشرق کی سمت صبحِ صادق کی سپیدی نمودار ہو چکی تھی اور کسی بھی دم سورج طلوع ہونے والا تھا۔ کچے دھول اڑاتے پگڈنڈی نما راستے پر ہماری گاڑی ہچکولے کھا رہی تھی۔

جلد ہی میری عقابی نظروں نے لوئی شاہ قبرستان کا چوبی پھاٹک دیکھ لیا۔ اب یہاں سے یہ پگڈنڈی نما کچا راستہ دو حصوں میں منقسم ہو رہا تھا۔ ایک پھاٹک کی طرف جاتا تھا دوسرا قبرستان کی کچی باؤنڈری وال سے گھوم رہا تھا۔

قبرستان کا رقبہ خاصا وسیع نظر آتا تھا۔ میں نے اسٹیئرنگ گھما لیا اور قبرستان کے کھلے پھاٹک سے اندر داخل ہو گیا۔

اب ہم قبرستان کے بیچ سے گزر رہے تھے۔ کبیل دادا، اول خیر سمیت ہماری نظریں گرد و پیش کا جائزہ لینے میں بھی محو تھیں، باقی دو گاڑیاں جن میں ہمارے مسلح ساتھی سوار تھے، ہمارے پیچھے دوڑی چلی آ رہی تھیں۔ ہم قبرستان کے دوسرے پھاٹک سے باہر آئے تو میں نے جیپ روک دی۔ باقی دو گاڑیاں بھی رک گئیں، میں نے کبیل دادا سے کہا۔

''اپنے آدمیوں کو کہو کہ وہ دائیں جانب سے پرانی باؤلی کو کراس کرتے ہوئے آگے چلتے جائیں اور جہاں وہ عمارت دیکھیں، فاصلہ دے کر رک جائیں۔''

کبیل دادا نے اپنے سیل فون پر پچھلی گاڑی میں موجود ایک ساتھی سے رابطہ کر کے یہ ہدایات دیں۔ پھر میں نے گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھا لی۔ باقی دونوں گاڑیاں دائیں طرف گھوم گئیں جبکہ میں نے اپنی جیپ بائیں جانب موڑ لی، منزل قریب ہونے کے باعث میں نے رفتار نسبتاً کم رکھی تھی۔ پرانی باؤلی سے آگے کیکر اور سرس کے درختوں کا سلسلہ تھا۔ وہاں میں نے جیپ روک دی اور اول خیر کو اپنے ساتھ آنے کا کہا، پھر نیچے اتر کر کبیل دادا سے کہا۔

''ہم پیدل آگے چلتے ہیں۔ تم ٹھیک پندرہ منٹ بعد جیپ اس راستے سے آگے بڑھا لینا جس پر ہم جا رہے ہیں۔'' یہ کہہ کر میں آگے بڑھ گیا۔ گن میرے ہاتھ میں تھی۔ اول خیر بھی پوری طرح مسلح تھا۔ وہ میرے ساتھ چلتے ہوئے بولا۔

''او خیر... کاکا! تو نے تو اپنے بڑے استاد کو بھی اپنے حکم کا غلام بنا لیا۔''

''میں جانتا ہوں، کبیل دادا کبھی بھی میری بات نہیں مانتا ہے مگر یہ معاملہ اور ہے۔ اس سے کبیل دادا کی بیگم صاحبہ سے وفاداری اور نیک نیتی ظاہر ہوتی ہے، وہ جانتا

ہے اس وقت بیگم صاحبہ کی زندگی داؤ پر لگی ہوئی ہے۔ وہ اپنی ذاتی مخاصمت اور انا پرستی کو بالائے طاق رکھے ہوئے ہے۔''

''یہ بات تو ہے کاکا۔'' اول خیر کے لہجے میں اعتراف تھا۔

''بیگم صاحبہ کا اپنے قریبی ساتھیوں کے سلسلے میں انتخاب کبھی غلط نہیں ہوتا، یہ بھی حقیقت ہے کہ بیگم صاحبہ مجھ سے زیادہ بڑے استاد (کبیل دادا) پر بھروسا کرتی ہے۔''

کیکر اور سرس کا یہ ٹنڈ منڈ سا جنگل بہت مختصر ثابت ہوا تھا۔ اس کے سرے پر پہنچ کر ہم رک گئے۔ سامنے مجھے ڈیرے کی عمارت نظر آ گئی اور میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔ ڈیرے کا احاطہ اس قدر وسیع و عریض تھا کہ اس پر فٹ بال کھیلنے کے میدان کا گمان ہوتا تھا۔ وہاں دو لمبی جیپیں، ایک کار اور تین بغیر ہڈ والی جیپیں کھڑی دکھائی دے رہی تھیں۔ ایک خستہ حال بس بھی کھڑی نظر آئی جس کی کھڑکیاں اور شیشے ٹوٹے ہوئے تھے اور سیٹیں غائب تھیں۔

آٹھ دس مسلح افراد دکھائی دے رہے تھے اور ان میں کچھ دو چارپائیوں پر بیٹھے تھے اور باقی احاطے کے پھاٹک پر باہر کھڑے ادھر ادھر چوکسی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

''پہرا کڑا ہے کاکا۔'' معاً اول خیر کی سرگوشی ابھری۔ میں نے فوراً سیل پر کبیل دادا سے رابطہ کر کے ہدایت جاری کیں اور موجودہ صورتِ حال گوش گزار کر دی جس کے مطابق وہ سب سے پہلے اپنے ساتھیوں کو سیل فون سائلنٹ کر کے وائبریشن پر رکھنے کی تاکید کرے دوم، کبیل دادا اور دیگر ساتھیوں کو گاڑیاں وہیں چھوڑ کر عمارت کے سامنے کے رخ پر تین اطراف سے گھیرتے ہوئے پیش قدمی کرنے کا کہا اور آخر میں، میں نے کبیل دادا سے کہا کہ وہ گاڑی سے اتر کر ماجے اور ایوب کے ساتھ ہم سے آن ملے۔ تھوڑی دیر بعد میری منصوبہ بندی کے مطابق سارا کام ریڈی ہو چکا تھا اور اب صرف حملہ کرنے کی دیر تھی۔

کبیل دادا نے کہا۔ ''پہلے دائیں جانب کے ساتھیوں کو فائر کھولنے کا اشارہ دینا ہوگا۔ وہ سب اس طرف متوجہ ہو جائیں گے۔''

''یہی کرنا ہے ہم نے۔'' میں نے کہا۔ ''مگر ابھی نہیں، پہلے اصل شکار پہنچنے دو۔'' وہ میری بات کا مطلب سمجھ کر چپ ہو رہا۔ اول خیر میری کارروائی سے مطمئن اور خاموش تھا۔

ثریا کی رپورٹ کے مطابق چودھری ممتاز خان بھی یہاں کسی وقت پہنچنے والا تھا۔ میرا ارادہ اس سے دو دو ہاتھ کرنے کا تھا۔ مگر اس سے بڑھ کر میرا ایک اور مقصد بھی تھا۔ وہ یہ کہ اس طرح کے حملے میں بیگم صاحبہ رسک پر ہوتیں تو چودھری ممتاز بھی حالتِ جنگ میں ہوتا، اس طرح فریقین کے درمیان ایک توازن رہتا۔ تاہم پلڑا پھر بھی دشمنوں کا ہی بھاری تھا کہ ہمارا ایک ساتھی (بیگم صاحبہ) ان کے قبضے میں تھا۔ وقت گزرتا رہا، دشمن بے خبر تھا کہ موت ایک لشکر کی صورت میں ان سے چند قدموں کے فاصلے پر گھات لگائے بیٹھی تھی۔ ٹھیک اس وقت میرے ذہنِ رسا میں ایک خیال بجلی کی سی سرعت کے ساتھ کوندا اور میں نے کبیل دادا سے کہا۔

''دادا! تم ادھر ہی رکو... میں اور اول خیر یہاں پلٹ رہے ہیں۔''

''تم دونوں کدھر جانے کا ارادہ رکھتے ہو؟'' اس نے فوراً پوچھا۔ میں نے کہا۔

''ہم چودھری ممتاز پر راستے میں ہی ہاتھ ڈالنے کی کوشش کریں گے، اسے یرغمال بنا کے بھی ہم اپنا مقصد بہ آسانی حاصل کر سکتے ہیں۔''

اس بات پر کبیل دادا کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرا گئی۔ اسے میری بات سے پورا اتفاق تھا۔ تاہم بولا۔ ''مگر یہ خطرناک کام صرف تم دونوں نہیں کر سکتے۔ کچھ ساتھی اپنے ساتھ لے جانے ہوں گے۔'' میں نے اختلاف کرنا چاہا مگر اول خیر نے کبیل دادا کی بات پر صاد کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔

''بڑا استاد ٹھیک کہہ رہا ہے شہزی کاکے۔ ہمارے ساتھ اس وقت پندرہ ساتھی ہیں۔ ان میں سے آٹھ ہم اپنے ساتھ لے چلتے ہیں۔''

میں نے کچھ سوچ کر اثبات میں اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے، مگر آٹھ ساتھی زیادہ ہیں چار کافی ہوں گے، یہاں دادا کے ساتھ زیادہ سے زیادہ ساتھی موجود ہونا ضروری ہیں کیونکہ جب ہم ممتاز خان کا راستہ کھوٹا کرنے کی کوشش کریں گے تو یقیناً وہ موبائل فون پر یہاں ڈیرے پر موجود اپنے ساتھیوں سے ضرور رابطہ کرے گا اور پھر یہ ان کی مدد کو روانہ ہوں گے تو دادا اپنے ساتھیوں کے ساتھ ان سے بھڑ کر ان کا راستہ روکنے کی کوشش کرے گا۔''

اس پر اتفاق ہونے کے بعد میں اور اول خیر چار مسلح ساتھیوں کے ساتھ جیپ میں سوار ہوئے اور واپس پلٹے۔

لوئی شاہ کے قبرستان سے ہم ایک بار پھر گزرنے لگے۔ اب کی بار یہ واپسی کا سفر تھا۔ ابھی ہماری جیپ نکاسی کے پھاٹک سے چند گز ہی دور تھی کہ میں ٹھٹکا۔ سامنے دھول اڑاتے کچے راستے پر مجھے گرد و غبار کے بگولے رقص کرتے دکھائی دیے۔ میں نے فوراً بریک پر پاؤں رکھ دیا۔ کچی زمین پر جیپ کے ٹائر تھوڑا چرچرائے اور ایک جھٹکے سے رک گئی۔ اول خیر میرے برابر والی سیٹ پر براجمان تھا۔ اس نے بھی جیپ کی ونڈ اسکرین کے پار یہ منظر دیکھ لیا تھا۔

''شاید ہمارا شکار آ رہا ہے، اول خیر۔'' میں نے ونڈ اسکرین کے پار آنکھیں سکیڑ کر دیکھتے ہوئے سرسراتے لہجے میں کہا۔

''او خیر، لگتا تو یہی ہے کاکے۔''

میرا دل سینے میں تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ چودھری ممتاز کس راستے کا انتخاب کرتا ہے۔ اغلب امکان یہی تھا کہ وہ ڈیرے تک پہنچنے کے لیے ادھر کا راستہ نہیں اختیار کرے گا، جدھر ہم موجود تھے۔ میرا خیال درست ثابت ہوا، وہ قبرستان کی بیرونی دیوار کے پار ایک دوسرے راستے پر تھا۔ نئے ماڈل کی پجارو جیپ تھی وہ اور اس کے عقب میں بغیر ہڈ والی جیپ جس میں چار پانچ مسلح افراد سوار تھے۔

''اول خیر ہوشیار... ان کا راستہ کاٹنا ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''او خیر۔'' اس نے ہولے سے جوش سے مرتعش لہجے میں کہا۔ میں نے ایک جھٹکے سے جیپ آگے بڑھا دی۔ اول خیر لپک کر گن سنبھالے عقبی حصے میں ماجا اور ایوب کے ساتھ جا ملا۔ تینوں حملہ کرنے کے لیے تیار تھے۔ پھاٹک پار کرتے ہی میں نے پجارو اور جیپ کا تعاقب شروع کر دیا اور ایک ناہموار کچے راستے سے شارٹ کٹ کر کے پجارو کے عقب میں جانے والی جیپ کے تھوڑا قریب پہنچ گیا۔ دشمنوں کو خطرے کی بھنک ہوئی اور جب تک وہ سنبھلتے اول خیر اور اس کے دونوں ساتھیوں نے جیپ پر تابڑ توڑ گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ ٹائر کو بھی نشانہ بنایا گیا۔ جیپ میں موجود مسلح دشمنوں کو میں نے گولیاں کھا کر لڑھکتے دیکھا اور پھر جیپ کو بھی۔ میں نے رفتار بڑھا دی۔ پجارو میں ممتاز خان کے ساتھ بیٹھے مسلح محافظوں کی تعداد شاید زیادہ نہ تھی۔ تین ہی افراد نظر آئے۔ انہوں نے خطرہ دیکھتے ہی اندر ہی سے فائرنگ شروع کر دی۔ میں نے یک دم اسٹیئرنگ کاٹا۔ اول خیر اور دونوں ساتھیوں نے ان پر گولیاں برسا دیں۔ دشمنوں کے مقابلے میں ہمیں کمک مل چکی تھی اور اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم چشم زدن میں پجارو کے قریب جا پہنچے۔ دونوں گاڑیاں ایک ''اینگل'' کی صورت میں آگے بڑھ رہی تھیں۔ لمحہ بہ لمحہ فاصلہ قریب ہوتا جا رہا تھا۔ دفعتاً سماعت شکن دھماکا ہوا، میری جیپ کا اگلا حصہ آگے سے گزرتی پجارو کے پچھلے حصے سے ٹکرایا۔ ممتاز خان کی بھاری بھرکم جیپ کی طاقت منقسم ہو گئی۔ نتیجتاً ٹکر لگتے ہی وہ بری طرح ڈول گئی۔ ہماری جیپ کو بھی طوفانی جھٹکا لگا تھا۔ مگر میں نے اسٹیئرنگ پر اپنے دونوں ہاتھوں کی گرفت مضبوطی سے جمائے رکھی تھی۔ ادھر پجارو کا ڈرائیور بھی ماہر ثابت ہوا تھا۔ اگرچہ پجارو کو ٹکر لگنے سے وہ سائڈ کے دو پہیوں پر آ کر الٹتے الٹتے بچی تھی۔ مگر ڈرائیور نے بڑی مہارت سے اس سمت اسٹیئرنگ کاٹا ہوگا جدھر سے پجارو سائڈ کے دو پہیوں پر آ کر الٹتے الٹتے بچی تھی۔ اس لیے وہ دوبارہ جھٹکے سے چاروں وہیل پر آ گئی۔ اس طرح ایک فائدہ ہمیں ہوا تھا کہ پجارو کے عقبی حصے میں سوار دشمن بھی یقیناً اپنا توازن برقرار نہیں رکھ پائے ہوں گے۔ یہی سبب تھا کہ ان کی طرف سے سردست جوابی فائرنگ کا سلسلہ موقوف ہو گیا تھا اور اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اول خیر نے پجارو کے عقبی دروازے کی بیک اسکرین پر گولیاں برسا دیں جبکہ ماجے اور ایوب نے پجارو کے پچھلے ٹائروں کو نشانہ بنانے کی کوشش چاہی تھی جس کا نتیجہ کامیاب ثابت نہ ہوا۔ وجہ بڑی ٹھوس تھی، عقب سے ٹائروں کا نشانہ بنانا ناممکن حد تک مشکل تھا ایسے میں جبکہ دونوں گاڑیاں بھی خاصی تیز رفتاری سے دوڑ رہی ہوں۔ پجارو کی بیک اسکرین فائرنگ کے باعث چھناکے سے ٹوٹی تو مجھے اگلی نشستوں پر ڈرائیور دکھائی دیا۔ ممکن تھا ممتاز خان بروقت نیچے جھک کر سیٹ میں دبک گیا ہو۔ میں نے جیپ کے اسٹیئرنگ پر ایک ہاتھ جمایا اور دوسرے ہاتھ میں اپنی گن اٹھالی۔ میں پجارو کے ڈرائیور کے نظر آنے والے سر کو نشانہ بنانے کی کوشش کرنا چاہ رہا تھا کہ اچانک میں نے سامنے دوڑتی پجارو کے عقبی حصے سے ایک اور سر ابھرتے دیکھا پھر دفعتاً ہی پجارو کا پچھلا دروازہ کھلا اور مجھے دو خون میں لت پت لاشوں کی جھلک نظر آئی۔ تیسرا زخمی حالت میں تھا مگر اس نے مجھے موقع دیے بغیر ہی برسٹ فائر کر دیا۔ میں نے اسٹیئرنگ گھما دیا اور ساتھ ہی اپنا سر بھی جھکایا۔ جیپ کی ونڈ اسکرین دھماکے سے ٹوٹی اور مجھے ایوب اور ماجے کی کربناک چیخیں سنائی دیں۔ میرا دل دکھ سے بھر گیا۔ ہماری فتح شکست میں بدلنے لگی۔ اسٹیئرنگ

کاٹنے سے جیپ پھر کچے اور ناہموار راستے پر آ کے بُری طرح ہچکولے کھانے لگی۔ میں نے فوراً بریک لگا دیے۔ وہ ایک جھٹکے سے رک گئی۔ گرد و غبار کے بگولے نے ہمیں آن لیا۔

''گئے کاکا! ہمارے دونوں یار۔'' مجھے اول خیر کی کرب سے آمیز آواز سنائی دی۔

میں نے مڑ کر دیکھا، ماجا اور ایوب خون میں لت پت بے سدھ، جیپ کے فرش پر لڑھکے ہوئے تھے۔

کیکر اور سرس کا ایک مختصر سا جنگل میری نظروں کے سامنے تھا۔ جدھر ہمارے ساتھی گھیرا ڈالے ہوئے گھات لگائے بیٹھے تھے اور پجارو اس جنگل میں دوڑتی ہماری نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔

اول خیر نے فوراً سیل پر کبیل دادا سے رابطہ کر کے بتایا کہ چودھری ممتاز کی جیپ جنگل کی کسی سمت سے ڈیرے کی طرف بڑھ رہی ہے کہ اسے فائرنگ کی آواز سنائی دی اور کبیل دادا نے فوراً رابطہ منقطع کر دیا۔ اول خیر نے جوش سے کہا۔ ''کاکے! جیپ آگے بڑھا۔ لگتا ہے وڈا ٹاکرا شروع ہو گیا ہے۔''

میں نے فوراً جیپ کا گیئر بدلا، وہ زور سے غرائی اور وحشی گینڈے کی طرح ایک بار پھر دوڑنے لگی۔

''ادھر سے کاکا۔'' اول خیر ایک جمپ مار کے میرے برابر والی سیٹ پر آ کے بولا۔ جس طرف اس نے اشارہ کیا تھا، میں نے اسی سمت جیپ کا رخ موڑ دیا۔ یہ وہی سمت تھی جدھر پجارو غائب ہوئی تھی۔ ہمیں فائرنگ کی آوازیں صاف... سنائی دے رہی تھیں۔ ممکن تھا کہ وہاں پہلے سے موجود ہمارے ساتھیوں نے پجارو کو جا لیا ہو لیکن وہاں پہنچے تو ہمیں جنگ کا میدان سا سلگتا ہوا نظر آیا۔ یقیناً پجارو میں موجود ڈرائیور یا ممتاز خان نے ڈیرے والی عمارت میں موجود بابن ڈکیت اور اس کے ساتھیوں کو موجودہ مخدوش صورتِ حال کے بارے میں آگاہ کر دیا ہو۔

جنگ کا میدان گرم تھا۔ میں نے جیپ روک دی اور اول خیر سمیت کد کڑا مار کے جیپ سے اتر آیا۔

ڈیرے والی عمارت سے دشمنوں نے پوزیشن سنبھالی ہوئی تھی اور جنگل کی طرف بے تحاشا فائرنگ کر رہے تھے۔ ان کی جانب سے ایک دو راکٹ بھی فائر ہوئے تھے۔ جن کے دھماکوں سے پورا جنگل لرزتا محسوس ہوا تھا۔

مجھے یہ دوسری جنگ بھی مات ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ نجانے کبیل دادا کدھر تھا۔ اول خیر اور میں گن سنبھالے آگے بڑھے اور موٹے موٹے درختوں کی آڑ لیتے ہوئے سرے پر پہنچے تو کبیل دادا اپنے تین ساتھیوں کے ہمراہ ہم سے آن ٹکرایا۔

''تم دونوں کی غلط منصوبہ بندی کے باعث ہم جیتی جنگ ہارنے والے ہیں۔'' وہ مارے طیش کے غرایا۔ یہ وقت بحث کا نہیں تھا۔ میں نے گن سنبھالی اور اس سمت کا رخ کیا جدھر کچھ دیر پہلے ہمارے ساتھیوں کا مسلح ٹولا گھات لگائے بیٹھا تھا مگر اب وہاں جلی ہوئی دھواں اگلتی لاشوں کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ شاید دشمنوں کی طرف سے فائر کیا ہوا پہلا راکٹ ادھر ہی گرا تھا۔

میں نے ایک درخت کی آڑ سے جوابی فائرنگ کرتے ہوئے دشمنوں کی تعداد کا اندازہ لگایا جو مجھے دس بارہ سے زیادہ محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اس اثنا میں کبیل دادا اور اول خیر میرے قریب آ گئے۔ ''ہمارے تین چار بچے.... ساتھی ہم سے آن ملے تھے۔'' میں نے کہا۔

''تم لوگ دو کی ٹولیوں میں بٹ جاؤ اور دشمن کو مصروف رکھو۔'' یہ کہتے ہوئے میں پیچھے پلٹا۔ یہاں ہماری ایک بغیر ہڈ والی جیپ کھڑی تھی، میں اس میں سوار ہو گیا اور اسے اسٹارٹ کیا۔ اول خیر ہک دک چہرے اور پھیلی ہوئی آنکھوں سے میری جانب دیکھتا رہ گیا جبکہ میں جیپ کی رفتار بتدریج بڑھاتا چلا گیا اور زن سے ان کے قریب سے گزرا۔

جیپ طوفانی رفتار سے دوڑنے لگی اور اس کا رخ ڈیرے والی عمارت کے بڑے سے چوبی پھاٹک کی طرف تھا۔ آخری رفتار پر چھوڑ کے میں نے بہ سرعت اسٹیئرنگ کو ''راڈ لاک'' لگا دیا۔ اب جیپ کہیں نہیں مڑ سکتی تھی۔ اس کے بعد میں نے ایکسیلریٹر پر ایک بھاری ٹول رکھ دیا اور اچھل کر جیپ کے عقبی حصے میں دو سیٹوں کے درمیان فرش پر لیٹ گیا۔ اب ایک کے بجائے دو گنیں الگ الگ میرے ہاتھوں میں تھیں۔ دشمن پہلے کئی سیکنڈوں تک تو میری اس دراندازی آتشِ نمرود میں کود پڑنے والی جانبازانہ حرکت کو سمجھ ہی نہ پایا تھا کہ یہ میرا کیسا پاگل پن تھا مگر پھر ان کی گولیوں کا رخ میری جیپ کی طرف ہو گیا۔

''زٹ... زٹ... زٹ۔'' کی سنسناتی ہوئی آوازوں سے گولیوں کی طوفانی بارش جیپ کی باڈی میں پیوست ہونے لگی اور ساتھ ہی ایک سماعت شکن دھماکا بھی سنائی دیا۔ جیپ ڈولنے لگی، رفتار میں بھی فرق آیا مگر رکی نہیں تھی۔ اگلے دونوں ٹائر برسٹ ہو گئے تھے۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا تھا کہ دونوں اگلے ٹائر بیک وقت ہی برسٹ ہوئے تھے،

ورنہ جیپ کے ڈس بیلنس ہو کر الٹنے کا خطرہ ہوتا۔

ایک طے شدہ مقررہ انداز ے کے مطابق میں نے اگلی دو سیٹوں کی آڑ لے کر سر ابھارا اور ساتھ ہی گنوں کا رخ بھی سامنے کر دیا اور جو دکھائی دیا اس طرف کر کے ٹریگر دبا دیا۔ دشمن آخری وقت تک میری اس درانہ وار چال نہ سمجھ پایا تھا۔ وہ گولیوں سے چھلنی ہو کے گرنے لگے یہاں تک کہ جیپ عمارت کا پھاٹک توڑتی ہوئی اندر جا گھسی۔ اس کی رفتار خاصی حد تک کم ہو چکی تھی۔ وہ کسی دیوار سے ٹکرائی اور تب تک میں سنبھل کے جیپ سے چھلانگ مار کر فرش پر لڑھکتا چلا گیا اور فرش سے چیتے کی طرح ٹھونک کر یک دم کھڑا ہو گیا۔ کمرے میں کوئی نہ تھا۔ ایک دروازہ مجھے دائیں جانب دکھائی دیا۔ باہر فائرنگ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ شاید اول خیر وغیرہ کو بھی پیش قدمی کا موقع مل گیا تھا یا پھر وہ دشمنوں کو اپنی جانب مصروف رکھے ہوئے تھے۔ میری اس کوشش کے باعث یقینی طور پر دشمن کی قوت بٹ چکی تھی۔ کھلے ٹوٹے دروازے کے باہر میں نے چند دوڑتے قدموں کی آوازوں کے ساتھ بیک وقت مذکورہ بند دروازے سے پیچھے کسی کے زور زور سے باتیں کرنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ میں نے ایک برسٹ کھلے دروازے پر داغ دیا۔ جدھر مجھے دو تین مسلح دشمنوں کی جھلک دکھائی دی تھی۔ بعد میں ان کی لرزہ خیز چیخیں بھی سنائی دیں۔ میں پھرتی کے ساتھ مذکورہ بند دروازے کی جانب بڑھا تو اس وقت دھڑ سے دروازہ کھل گیا۔ سامنے مجھے دو مسلح افراد دکھائی دیے۔ ان کے ہاتھوں میں پستول تھے۔ میری ایک گن خالی ہو چکی تھی، جو میں پھینک چکا تھا، دوسری گن سے میں نے ان پر برسٹ فائر کر دیا۔ ایک آواز نکالے بغیر ڈھیر ہو گیا جبکہ دوسرا زخمی ہو کے گرا مگر اس نے دلیری اور پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھ پر اپنے پستول سے گولی چلا دی تھی جو میری گن پر لگی، شکر تھا میرا ہاتھ زخمی نہ ہوا... مگر گن میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔ ٹھیک اس وقت مجھے عقب سے گولیوں کے گرجنے کی آواز سنائی دی۔ گن اٹھانے کا موقع نہ تھا۔ میں ایک جست بھر کے مذکورہ دروازے سے اندر کود پڑا۔ زخمی دشمن فرش پر لیٹا آخری سانسوں پر تھا، میں نے اس کا پستول اٹھالیا۔ مگر دوسرے ہی لمحے ایک گھونسا میری ٹھوڑی پر پڑا۔ یہ حملہ غیر متوقع نہیں تو اچانک ضرور تھا۔ ایک لمحے کو میرا دماغ جھنجنا سا گیا۔ ضرب طاقتور تھی، لگتا تھا جیسے ہتھوڑا چہرے پر پڑا ہو۔ سنبھلنے میں مجھے چند ہی پل لگے تھے اور اس دوران میں ایک لات میرے پستول والے ہاتھ پر لگی۔ وہ میرے ہاتھ سے بھرا مار کر اڑتے پرندے کی طرح نکل گیا.... تب میں نے ایک دشمن کو دیکھا وہ تھا تو قد و قامت میں مجھ سے بونا ہوا مگر اس پر گینڈے کا سا گمان ہوتا تھا۔ رنگت انتہائی سیاہ تھی۔ سر گنجا تھا، چہرہ گول اور مکروہ... آنکھیں بھی چھوٹی اور گول گول تھیں، بائیں کان میں سونے کا بالا لٹکا ہوا تھا۔ اس نے کھلے گھیر والی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ گردن پر چربی چڑھی ہوئی تھی، وہ بڑی خونخوار نظروں سے میری جانب گھور رہا تھا۔ اس کے دائیں بغلی ہولسٹر میں پستول موجود تھا، جسے اس نے نکالنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔ مجھے اس پر سو فیصد بدر اقبال عرف بابن ڈکیت کا گمان ہوا، اس نے خونخوار غراہٹ کے ساتھ مجھ پر جھپٹا مارا، اس کے ڈیل ڈول کو دیکھتے ہوئے مجھے اس قدر پھرتی کی توقع نہ تھی۔ تاہم اس نے ایک ہاتھ سے میری گردن دبوچ لی اور سرعت سے اپنی دائیں ٹانگ کا وار میری ناف پر کیا۔ میں دہری تکلیف کی شدت سے بری طرح کراہ کے رہ گیا۔ گردن میری ابھی تک اس نے ایک ہاتھ سے دبوچ رکھی تھی جس پر مجھے آہنی شکنجے کا گمان ہو رہا تھا۔ بلاشبہ اس کے موٹے تازے گینڈے وجود میں کسی خونخوار درندے جیسی ہی طاقت تھی، وہ رکا نہیں اور اپنا گھٹنا میرے دونوں جانگھ کے درمیان میں رسید کرنے کی کوشش چاہی تھی کہ میں نے بھی اپنی ایک ٹانگ سکیڑ کر اس کا یہ چال نما وار روکا اور اس کی ناک پر گھونسا جڑ دیا۔ وہ بیل جیسے انداز میں ڈکرایا۔ گردن پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑتے محسوس کرتے ہی میں نے اس کی کلائی پکڑ کر موڑ ڈالی اور ایک دم اپنے ایک پاؤں کی ایڑی پر گھوم گیا۔ ادھر اس کی گرفت سے میری گردن پھسل کر نکلی ادھر میرے دوسرے بازو کی کہنی اس کے پیٹ اور سینے کے درمیان نازک جگہ پر لگی، وہ کئی قدم پیچھے کو لڑکھڑا گیا۔ وہ شاید مجھ سے دوبدو لڑنا چاہتا تھا اور نہ جانے اپنے کس پُرغرور جذبے کی تسکین کرنا چاہتا تھا مگر میرے دو تین جوابی وار کھا کر اسے یقین ہو گیا تھا کہ جو شخص اس طرح درانہ وار یہاں گھسا چلا آیا تھا وہ دوبدو لڑائی کی ابجد سے تو کم از کم واقف ہو گا ہی۔ لہٰذا میری اس جوابی ہاتھا پائی سے اسے فوراً ادراک ہو گیا کہ وہ مجھ پر محض اپنے زورِ بازو سے قابو نہیں پا سکتا، وہ اپنے ہولسٹر سے پستول نکالنے لگا تو میں نے اس پر چیتے جیسی جست بھری اور زبردست ٹھوکر رسید کر دی۔ وہ گینڈے جیسی مضبوط جسامت ہونے کے باوجود فرش سے تقریباً دو تین انچ اچھل کر دیوار سے جا ٹکرایا۔ میرا قد چھ فٹ ایک انچ تھا اس کے مطابق میرا ڈیل ڈول خاصا کسرتی

تھا۔ یہ میں ہی تھا جو اس گینڈے جیسی گٹھی ہوئی جسامت کے بابن ڈکیت کو زمین سے چند انچ اوپر اچھال کے پیچھے دھکیلنے اور دیوار سے ٹکرانے پر مجبور کر ڈالا تھا۔ اس نے اپنے ہولسٹر میں ہاتھ ڈال دیا تھا۔ یہی سبب تھا کہ جھٹکا لگنے کے باعث پستول ہولسٹر سے نکل کر فرش پر آن گرا تھا۔ جسے وہ سنبھل کے فرش سے اچکنا چاہتا تھا کہ میں نے اس کے جھکے ہوئے چہرے پر گھٹنا رسید کر دیا اور پستول کو لات سے دور کہیں سرکا دیا۔ ابھی تک اس کا کوئی ساتھی اندر نظر نہیں آیا تھا نہ ہی باہر سے کسی نے اندر داخل ہونے کی کوشش کی تھی۔ شاید وہ سب باہر... اول خیر اور کمیل دادا وغیرہ کے ساتھ جنگ میں الجھے ہوئے تھے مگر ایک چکردار آہنی زینہ اوپر جاتا تھا۔ دوسرے دروازے کے باہر راہداری تھی، باہر دھواں دھار فائرنگ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے بابن کے چہرے سے محسوس کیا کہ اسے شاید نکلنے کی عجلت ہو رہی تھی۔ معاً مجھے اپنے عقب میں دوسرے والے دروازے پر کھٹر بڑ سنائی دی۔ میں تیزی سے پلٹا، ایک خون میں لت پت آدمی لڑھکتا ہوا اندر آیا۔ یہ بابن ڈکیت کا کوئی ساتھی تھا جو بری طرح زخمی تھا، وہ فرش پر گرتے گرتے بابن سے بولا۔

’’بب... بب بدرو استاد! شش... شکار... لے کر... بب... باہر... پچھواڑے... پپ... پہنچو... گگ... گاڑی موجود ہے۔‘‘

یہ کہہ کر وہ بے سدھ ہو گیا۔ شاید مر گیا تھا۔ شاید دشمن کو شکست ہو رہی تھی مگر چودھری ممتاز جانے کدھر تھا، میں نے دیکھا بابن ڈکیت بے چین درندے کی طرح تڑپتا نظر آیا اور دوسرے ہی لمحے پہلے والے دروازے کی طرف دوڑا اور باہر راہداری میں نکل گیا۔ میں بھی اپنی جھونک میں اس کے تعاقب میں لپکا اور جیسے ہی دروازے سے باہر قدم نکالا... دھوکا کھا گیا۔ لامحالہ... بابن ڈکیت کو اندازہ تھا کہ میں بھی اس کے تعاقب میں لپکوں گا۔ وہ باہر نکلتے ہی رک گیا تھا اور جیسے ہی میں نے باہر قدم نکالے اس نے اڑنگا لگا دیا۔ میں لڑکھڑا کر منہ کے بل گرا۔ خود سے جھٹکاتے کہ یہ اس کی لنگڑی لولی کوشش تھی۔ میں نے گرتے سنبھلنے کی کوشش کے دوران بابن کو عمارت کے اندرونی حصے کی طرف دوڑتے ہوئے پایا۔ میں نے بھی اٹھ کر اس کے تعاقب میں دوڑنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ وہ ایک طرف مڑا، میں بھی سرپٹ دوڑتا رہا۔ وہ ایک کمرے میں گھسا اور دروازہ بند کر دیا۔ ٹھیک اس وقت میں بابن کے کسی ساتھی کی نظر میں آ گیا جو باہر برآمدے کی دیوار کی آڑ سے سامنے احاطے کی سمت فائرنگ کرنے میں مصروف تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس نے اپنی گن کا رخ میری جانب کر دیا۔ میں نہتا تھا اور اس کے نشانے پر۔ مگر اسے مجھ پر گولی چلانے کی حسرت ہی رہ گئی، میرے کسی ساتھی کی گولی اس کے دماغ میں گھس گئی اور وہ تیورا کر گرا۔ میں نے جان بچ جانے پر خدا کا شکر ادا کیا اور جھکے جھکے آگے بڑھا اور جس دروازے سے بابن ڈکیت اندر داخل ہوا تھا، اسے دو تین زوردار ٹھوکریں مار کے توڑ ڈالا۔ اندر کا منظر واضح تھا۔ بابن کو پوری امید تھی کہ اس کے لیے ملک الموت بنا میں اس کا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔ اس لیے اس نے پہلے ہی بیگم صاحبہ کو دبوچ رکھا تھا۔ ایک تیز پھل والا چاقو اس کے دائیں ہاتھ میں تھا جس کی تیز دھار اس نے بیگم صاحبہ کی نرم و نازک گردن کے ساتھ لگا رکھی تھی اور بائیں ہاتھ کے شکنجے سے اس نے بیگم صاحبہ کو بیدردی سے دبوچ رکھا تھا۔ مجھے دیکھ کر بیگم صاحبہ کی آنکھوں میں خوف کے بعد حیرت اور مسرت کی چمک ابھری تھی۔

’’خبردار! ادھر ہی تنے کھڑے رہو۔ ایک قدم بھی مت بڑھانا آگے... ورنہ۔‘‘ بابن ڈکیت نے خوفناک غراہٹ کے ساتھ مجھے گھورتے ہوئے دھمکی دی۔

’’تم بچ کر کہیں نہیں جا سکتے رذیل انسان، میں قبر تک تمہارا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔‘‘ میں نے خون رنگ لہجے میں اس سے کہا۔ ’’بیگم صاحبہ کو چھوڑ دو کتے، ورنہ تیرا برا حشر کروں گا میں۔‘‘

’’میں جانتا ہوں تم کتنے خطرناک اور دلیر آدمی ہو، جو اس طرح آگ اور شعلوں کے درمیان اپنی جان کی پروا کیے بغیر بابن ڈکیت جیسے شیر کی کچھار میں گھستا چلا آیا ہے وہ معمولی آدمی نہیں ہو سکتا۔ بہادر دشمنوں کی قدر کرتا ہوں، مگر...‘‘

’’بکواس بند کر دو اپنی۔‘‘ میں دہاڑا۔ ’’تم خود کو شیر کہتے ہو اور ایک کمزور عورت کو ڈھال بنا رکھا ہے۔‘‘

’’میں حکم کا غلام ہوں... مجھے جانے دو۔‘‘

’’غلام نہیں، زرخرید کتا کہو، چودھری ممتاز خان کا کتا... خود کو شیر کہنا تمہیں زیب نہیں دے رہا۔‘‘ میں نے خوفناک غراہٹ سے کہا۔ بیگم صاحبہ یک ٹک پھیلی پھیلی آنکھوں سے مجھے تکے جا رہی تھیں، اب ان کی کشادہ قدرتی کاجل لیے ہوئی آنکھوں میں خوف کا شائبہ تک نہ تھا مگر خوف کی جو ہلکی جھلک ان کی آنکھوں سے مترشح محسوس ہوتی تھی اس کی نوعیت مجھے اور ہی محسوس ہوتی تھی، وہ شاید میری

وجہ سے خوف کا شکار تھیں کہ میں ان کی خاطر اپنی جان خطرے میں ڈال چکا تھا۔ بابن ڈکیت نے بیگم صاحبہ کو دبوچے ہوئے پیچھے سرکنا شروع کر دیا۔ اس طرف ایک سنگل پٹ کا دروازہ تھا جو تھوڑا تھوڑا کھلا ہوا تھا۔ دفعتاً بیگم صاحبہ نے چیخ ماری۔ میں ٹھٹکا۔ ان کی کشادہ اور پھیلی آنکھوں میں خوف کی چمک واضح ہو گئی۔ میرے عقب میں انہوں نے شاید کسی کو دیکھا تھا۔ میں تیزی سے عقب میں گھوما اور غیر ارادی طور پر میرے دونوں ہاتھ بچاؤ کے لیے اٹھے تھے کیونکہ ایک دشمن رائفل کو نال سے پکڑے ہوئے میرے سر پر وار کرنا چاہ رہا تھا۔ میں نے رائفل اپنے دونوں ہاتھوں سے دبوچ لی اور نال پر گرفت جماتے ہی حملہ آور کے پیٹ پر لات رسید کر دی۔ رائفل چھوڑ کر اس نے اپنا پیٹ پکڑ لیا۔ میں نے رائفل اس پر سیدھی کر کے ٹریگر دبایا مگر وہ خالی تھی۔ وہ سنبھل کر پھر مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ اس بار میں نے اپنے سر کی زوردار ٹکر اس کی ناک پر رسید کر دی۔ ٹکر زوردار تھی، اس کی ناک کا بانسہ تک پچک گیا وہ ڈھیتا چلا گیا۔ ٹھیک اسی وقت میں نے تین گن بردار آدمیوں کو ٹوٹے دروازے سے اندر کودتے دیکھا۔ وہ کبیل داوا اور اول خیر تھے، تیسرا بھی ہمارا ہی ساتھی تھا۔ شاید انہوں نے باہر کا میدان مار لیا تھا۔ میں تیزی سے پلٹا اور پھر جیسے میرے اوسان خطا ہو گئے۔ رذیل بابن ڈکیت بیگم صاحبہ سمیت غائب ہو چکا تھا۔

میں گولی کی طرح سنگل پٹ والے دروازے کی طرف لپکا، عقب میں مجھے اول خیر کے پکارنے کی آواز سنائی دی تھی مگر مذکورہ دروازے سے باہر نکل چکا تھا، سامنے بنجر علاقہ تھا اور میری تلاش کرتی ہوئی نظروں نے بابن ڈکیت کو تاڑ لیا، وہ ایک بند جیپ میں بیگم صاحبہ کو سوار کرانے کی کوشش کر رہا تھا، میں نے اس طرف دوڑ لگا دی، جب تک میں قریب پہنچا، وہ جیپ میں سوار ہو چکا تھا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے جیپ اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ تب تک میں پھرتی سے جیپ کے عقبی بند دروازے پر نصب فاضل ٹائر کے ساتھ اچھل کر چپک گیا تھا۔ شاید بابن کو ابھی اس بات کا علم نہیں ہو سکا تھا۔ جیپ میں مجھے ایک ڈرائیور کی جھلک بھی نظر آئی تھی، جیپ طوفانی رفتار سے دوڑنے لگی، میں اس کی چھت پر آ گیا۔ شکر تھا کہ چھت سپاٹ نہیں تھی، ورنہ ہچکولے کھاتی جیپ کی چھت سے میں پھسل کر گر سکتا تھا۔ سامان رکھنے والے آہنی جنگلے کے ساتھ میں چپک گیا تھا اور آگے سرکنے لگا۔ روف ونڈو سے میں نے نیچے کا جائزہ لیا۔ گھنی مونچھوں والا ایک آدمی اس جیپ کا اسٹیئرنگ سنبھالے بیٹھا تھا جبکہ بابن ڈکیت اس کے عقب والی سیٹ پر بیگم صاحبہ کو دبوچے بیٹھا تھا۔ وہ ڈرائیور سے پوچھ رہا تھا۔

”چودھری صاحب کدھر نکل گئے؟“

”دشمن ان کے پیچھے تھے، وہ بھی بڑی مشکلوں سے نکلے ہیں۔ آپ ان سے رابطہ کر لیں۔“ ڈرائیور نے کہا۔ بابن کو میں نے اپنی قمیص کی سائڈ پاکٹ کھنگالتے دیکھا۔ شاید وہ سیل فون نکالنا چاہتا تھا کہ اچانک اس کی نظر روف ونڈو پر پڑی۔ ایک لمحے کو غیر یقینی انداز میں اس کی آنکھیں پھیلیں۔ روف ونڈو پر آہنی جنگلا فٹ تھا۔ میں نے اس کی چلاتی ہوئی آواز سنی، وہ ڈرائیور سے مخاطب تھا۔

”جوجی...وہ چھت پر موجود ہے، جیپ کو لہراؤ۔“

جوجی نامی ڈرائیور کو یقیناً حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔ وہ پہلے تو تھوڑا اگڑبڑا سا گیا۔ پھر اس نے نہ صرف جیپ کی رفتار بڑھا دی بلکہ اسے زگ زیگ انداز میں لہرانے بھی لگا۔ میرا توازن بگڑنا شروع ہوا مگر میں نے روف پر لگے آہنی جنگلے کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔

”یہ لو بابن استاد! چھت پر فائر کرو۔“ معاً میں نے جوجی ڈرائیور کی آواز سنی اور ذرا آگے سرک کر نیچے جھانکا، وہ ڈیش بورڈ کے خانے سے ایک سیاہ پستول نکال کر بابن ڈکیت کو تھما رہا تھا۔ بیگم صاحبہ کو اس نے ایک ہاتھ سے دبوچ رکھا تھا۔ انہیں بظاہر اب جیپ کی چھت پر میری موجودگی کا علم ہو چکا تھا انہوں نے اپنی مزاحمت تیز کر دی تاکہ بابن ڈکیت مجھ پر فائر نہ کر سکے، یہ خطرناک صورت حال تھی، جیپ ناہموار کچے راستے پر دوڑ رہی تھی۔ ایسے میں جیپ کے اندر سے داغی جانے والی اندھی گولیوں سے خود کو بچانا ناممکن حد تک مشکل عمل ہوتا۔ اس پر مستزاد میرے دائیں پہلو کا چرکا نما خوابیدہ زخم بھی جاگ سکتا تھا مگر شکر تھا خدا کا کہ ابھی تک وہ بالکل ٹھیک تھا، ثریا نے بڑی مہارت سے مرہم پٹی کی تھی اور اس کے بعد نہ جانے کون سا انجکشن لگایا تھا کہ درد تو کجا زخم کا احساس بھی نہ ہوتا تھا۔

دفعتاً فائر ہوا۔ گولی جیپ کی چھت میں سوراخ کرتی ہوئی، میرے چہرے کے اس قدر قریب سے نکل گئی کہ مجھے اس کی ”جھپک“ بالکل اپنے چہرے کے قریب محسوس ہوئی تھی، میں ایک دم پیچھے کو ہٹتا چلا گیا۔ وہ ایک کے بعد ایک فائر کرتا رہا۔ اور گولیاں چھت میں سوراخ کرتی میرے چہرے کے بالکل سامنے آر پار ہونے لگیں۔ ادھر جیپ بھی لہرا رہی تھی، اس کے باعث میرا ایک ہاتھ لوہے کے جنگلے کی

ایک سلاخ پر گرفت نہ جما سکا اور میں دائیں جانب کو پھسل کر جیپ کی چھت سے نیچے گرنے لگا تو ایک ہاتھ نے گرفت مضبوط کر لی۔ اب میرا وجود جیپ کے دائیں جانب کھڑکی کے قریب جھولنے لگا۔ یہ اس سمت کی کھڑکی تھی جدھر بابن ڈکیت، بیگم صاحبہ کو دبوچے بیٹھا چھت پر اپنے پستول سے فائر کر رہا تھا۔ مجھے کھڑکی کی سمت جھولتے دیکھ کر اس نے پستول کا رخ میری جانب کر دیا۔ میں اس کے نشانے پر تھا۔ بیگم صاحبہ کے حلق سے تیز چیخ خارج ہوئی، جس وقت بابن ڈکیت مجھ پر فائر کرنے کی کوشش میں تھا کہ اچانک بیگم صاحبہ نے ہمت سے کام لے کر اس کے پستول والے ہاتھ پر اپنے ایک ہاتھ سے جھپٹا مارا۔ عین فائر کرنے سے پہلے بابن کے ہاتھ سے پستول چھوٹ کر گرا اور سیٹ کے نیچے کہیں لڑھک گیا۔ اس کے حلق سے طیش ناک غراہٹ ابھری اور اس نے بیگم صاحبہ کے چہرے پر تھپڑ رسید کر دیا۔ ادھر میں نے موقع غنیمت جان کر اپنے دونوں ہاتھوں کی گرفت جنگلے کے سرے پر مضبوطی سے جمائی اور اپنا... ہوا میں جھولتا وجود سکیڑ کر اوپر اٹھایا اور دونوں ٹانگیں کھڑکی کے اندر گزار کر بابن ڈکیت کی بیل جیسی گردن پر ”لیگ لاک“ لگا دیا۔ اب میرا آدھا دھڑ باہر تھا اور نصف اندر... میری اور بابن ڈکیت کے درمیان زور آزمائی جاری تھی کہ اچانک ڈرائیور کی ہولناک کارروائی میری نظروں میں آ گئی۔ وہ جیپ کو سامنے تیزی سے قریب آتے ہوئے ایک موٹے تنے والے درخت کے بتدریج قریب کرنے لگا۔ مقصد جیپ کو اس کی سائڈ سے ٹکراتے گزارنا تھا۔ جس کے باعث میرا باہر کو جھولتا ہوا اوپری وجود درخت کی خوفناک رگڑ سے بری طرح مجروح ہو جاتا۔ وقت کم تھا، درخت لمحہ بہ لمحہ اور نہایت تیزی کے ساتھ قریب آ رہا تھا۔ ادھر بابن ڈکیت کی گردن سے میری زور آزمائی جاری تھی۔ جیپ اور درخت کے درمیان فاصلہ تیزی سے گھٹتا جا رہا تھا اور میرے پاس محض چند سیکنڈ تھے کہ یا تو میں بابن کی گردن چھوڑ کر دوبارہ چھت کی طرف جانے کی کوشش کرتا یا کھڑکی ہی کے راستے میں اندر داخل ہوتا جو سر دست مشکل ہی نظر آ رہا تھا، ٹھیک اس وقت جب میں بابن کی گردن اپنی ٹانگوں سے آزاد کرنا چاہتا تھا اس بدبخت کو بھی عین وقت پر احساس ہو گیا کہ اس کا ساتھی ڈرائیور جوجی میرے خلاف کس قدر ہولناک داؤ کھیل چکا ہے۔ تب بابن نے فوراً اپنی گردن میری ٹانگوں سے چھڑانے کے بجائے اپنے دونوں ہاتھوں سے مضبوطی کے ساتھ میری دونوں ٹانگوں کو گرفت

میں لے لیا۔ گویا وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کی گردن میں ڈالنے والی میری ٹانگوں کی کوشش خود میرے گلے کا پھندا بن گئی تھی، اب میں اوپر کی جانب حرکت کرنے سے معذور تھا۔ یوں بھی اتنا وقت ہی نہیں بچا تھا میرے پاس کہ میں خود کو تیزی سے قریب آنے والے درخت کی ہولناک رگڑ نما ٹکر سے بچا پاتا۔ مجھے اپنی کرب ناک موت محض چند انچ کے فاصلے پر نظر آ رہی تھی اور میں بے بسی سے اسے اپنے قریب آتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

عین آخری لمحات میں بیگم صاحبہ کو بھی اس خوفناک صورتِ حال کا احساس ہوا اور پھر انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ایک دم اپنی جگہ سے اچھل کر ڈرائیور جوجی کے ہاتھوں میں اسٹیئرنگ کو بائیں جانب موڑ دیا۔ جیپ کا رخ بدلا اور موٹے درخت کا مہیب تنا میرے بالکل قریب سے گزرتا چلا گیا مگر ایک اور مصیبت گلے آن پڑی۔ اچانک اسٹیئرنگ کاٹنے کے باعث جیپ کا توازن بگڑا۔ پہلے وہ دائیں جانب لہرائی پھر شاید ڈرائیور جوجی نے اسے سنبھالنے کی کوشش چاہی تھی اور پھر وہ بائیں جانب لہرائی، پھر ایک کچے ٹیلے پر چڑھ گئی اور الٹ گئی، شکر تھا کہ دوسری جانب سے الٹی تھی ورنہ میں پس جاتا، جیپ تھوڑی دور تک گھسٹتی رہی پھر رک گئی، گرد و غبار کا طوفان سا اٹھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں مٹی سے اٹ گیا ہوں، میں نے خود کو فوراً سنبھالا اور جیپ کا دروازہ کھولا جو اب اوپر کی جانب کھل رہا تھا۔ میں نے اندر جھانکا۔ ڈرائیور جوجی اگلی نشست میں پھنسا ہوا تھا اور بابن ڈکیت کا بھی یہی حال تھا۔ وہ درمیانی سیٹوں میں اٹکا ہوا تھا اور بیگم صاحبہ اس کے اوپر تھیں، میں نے بیگم صاحبہ کا ہاتھ تھام لیا اور انہیں سہارا دے کر باہر نکال لیا۔ وہ ہوش میں تھیں مگر تھوڑا کراہ رہی تھیں۔ میں انہیں سنبھال کر ٹیلے سے نیچے لے آیا اور پوچھا۔

”بیگم صاحبہ! آپ ٹھیک تو ہیں نا؟“

”ہاں، میں.... میں ٹھیک .... آہ....“ وہ بولتے بولتے کراہ گئیں۔ تب میں نے محسوس کیا ان کے ایک پاؤں کے گھٹنے میں چوٹ لگی تھی اور ٹخنے کی ہڈی کا بھی یہی حال تھا۔ میں نے ان کا نرم و نازک ہاتھ تھام لیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے بیگم صاحبہ کو چھوا تھا، اور اس چھونے میں مجھے عجیب طرح کی لطافت کا احساس ہوا تھا، میں نے اس پر زیادہ توجہ نہ دی۔ میں انہیں سہارا دیتا ہوا ٹیلے سے اترا۔ ایسے میں ان کا بھرا بھرا اور گداز سا وجود مجھ سے مس ہو رہا...

میں انہیں لے کر ایک نسبتاً چھوٹے ٹیلے کی آڑ میں لے آیا اور آرام سے سہارا دے کر بٹھا دیا اور گرد و پیش پر ایک سرسری نگاہ ڈالی۔

دور و نزدیک ٹیلوں ٹبوں کا سلسلہ پھیلا نظر آتا تھا، کہیں کہیں خودرو جھاڑیاں بھی نظر آتی تھیں۔ کچھ ٹنڈ منڈ سے درخت بھی دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے بیگم صاحبہ سے کہا۔

”بیگم صاحبہ! آپ ادھر رکیں، میں ابھی آتا ہوں۔“

”کک.... کدھر جا رہے ہو تم.... شہزی؟“ ان کے لبوں سے جیسے بے اختیار نکلا۔

”جیپ میں ابھی ہمارا ایک خطرناک دشمن موجود ہے۔ وہ کوئی بھی گل کھلا سکتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”اسے زندہ نہ چھوڑنا.... شہزی۔“ بیگم صاحبہ کی آواز میں اچانک ہی ناگن جیسی منتقمانہ پھنکار عود کر آئی۔

”مگر اپنا خیال رکھنا۔“ میں انہیں تسلی دے کر پلٹا ہی تھا کہ اچانک میں نے کسی کو خوفناک انداز میں غراتے ہوئے خود پر ٹوٹ پڑتے دیکھا۔ میں نے بچنے کی کوشش چاہی تھی مگر بے سود.... حملہ آور مجھے رگیدتا رہ گیا۔ بھربھری مٹی کی گھٹن آمیز گند میرے سینے میں بھرتی محسوس ہوئی۔ پھر دوسرے ہی لمحے میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ تڑپا اور خود پر سوار ہونے کی کوشش کرنے والے کو دونوں بازوؤں سے دبوچ کر گھما کر خود سے دور لڑھکا دیا۔ وہ بدر اقبال عرف بابن ڈکیت تھا۔ میں نے پھرتی سے اٹھ کھڑے ہونے میں ذرا دیر نہیں لگائی تھی، کھڑا تو وہ بھی فوراً ہو گیا تھا مگر اس نے دوبارہ مجھ پر پل پڑنے کی کوشش نہ کی اور غرا کر تہدیدی انداز میں بولا۔

”تم بچ کر نہیں جا سکتے.... شہزاد خان! مجھے تمہاری اصلیت کا علم ہو چکا ہے۔ چودھری صاحب اپنے آدمیوں کے ساتھ یہاں کسی بھی وقت پہنچنے والے ہیں۔“

میں اس کی بات پر ٹھٹکا اور اندر سے فکر آمیز تشویش کا شکار ہو گیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اس خبیث نے موقع ملتے ہی ممتاز خان کو نہ صرف موجودہ حالات بلکہ ویران اور بنجر مقام کے بارے میں بھی اچھی طرح آگاہ کر دیا ہوگا جدھر اس وقت ہم موجود تھے۔ سیل فون اس کے پاس تھا اور میں تھوڑی دیر پہلے ہی جیپ کے اندر اسے ممتاز خان سے سیل فون پر باتیں کرتے دیکھ اور سن چکا تھا۔ ممکن تھا ممتاز خان میرے پہلے والے حملے سے بچ کر جیپ اپنے ڈیرے کا رخ کرنے کے بجائے جان بچانے کے لیے کسی اور سمت اپنی

گاڑی میں فرار ہوا تھا کہ وہ زیادہ دور نہیں گیا ہوگا اور آس پاس کہیں موجود تھا۔ گویا اب میرا اور بیگم صاحبہ کا یہاں رکنا خطرے سے خالی نہ تھا اور بابن ڈکیت ہر قیمت پر ہمارا راستہ روکے رکھنا چاہتا تھا۔ لہٰذا اس سے فیصلہ کن جنگ کرنا اور جلد اس کا قضیہ نمٹانا میرے لیے ازبس ضروری ہو گیا تھا۔ یہ تہیہ کر کے میں اس پر پل پڑا۔

اس نزاکت کو وہ بھی بھانپ چکا تھا لہٰذا پوری طرح میرے مقابل آن کھڑا ہوا تھا۔ ہم دونوں بری طرح گتھم گتھا ہو گئے، بیگم صاحبہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ رہی تھیں۔ ایک موقع ایسا آیا کہ بابن ڈکیت نے اپنے دائیں بازو کے گھیرے میں میری گردن لینے کی کوشش چاہی تھی کہ مجھے اپنے بائیں بازو کی کہنی کا وار اس کے پیٹ پر کرنے کا موقع مل گیا۔ ضرب زوردار تھی جس نے اسے بلبلا کر رکھ دیا۔ میں نے پلٹ کر ایک زوردار گھونسا اس کی ناک پر رسید کر دیا۔ وہ تکلیف سے دہرا ہو گیا۔ میں اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ میں نے پھرتی سے اڑنگا لگا کر گینڈے جیسی جسامت والے بابن کو نیچے گرا دیا۔ خون اس کی ناک سے بھل بھل بہتا جا رہا تھا جس کے باعث اس کا چہرہ مزید مکروہ نظر آنے لگا۔ میں نے اس کی گردن دبوچ لی۔ وہ مرغ بسمل کی طرح تڑپنے لگا مگر میں نے اس وقت تک اس کی گردن نہ چھوڑی تھی جب تک اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز نہ کر گئی۔ میں اٹھ کر پلٹا تو سناٹے میں آ گیا۔ بیگم صاحبہ اپنی جگہ سے غائب تھیں۔

ابھی میں اسی کیفیت میں تھا کہ معاً مجھے قریب سے ایک چیخ سنائی دی۔ میں ٹھٹکا۔ آواز کی سمت کا اندازہ لگایا تو وہ اس ٹبے کے عقب سے آتی محسوس ہوئی، پھر جیسے میرے بدن میں بجلی دوڑ گئی، میں دوڑتا ہوا ٹبے کے اوپر پہنچا تو مجھے گرتی پڑتی بیگم صاحبہ دکھائی دے گئیں۔ بابن ڈکیت کا ساتھی جوجی انہیں بیدردی سے کھینچے لیے جا رہا تھا۔ میں نے ایک زوردار للکار سے مشابہ چیخ ماری تو وہ ٹھٹک کر رکا اور مڑ کر پیچھے میری طرف دیکھنے لگا۔ مجھے بابن کے ساتھ گتھم گتھا ہوتا دیکھ کر یقیناً اس نے موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی اور بیگم صاحبہ کو کسی طرح بے بس کر کے خاموشی سے اپنے ساتھ لے اڑا تھا مگر موقع ملتے ہی بیگم صاحبہ کی چیخ سے میں اس طرف متوجہ ہوا۔ میں نے اس طرف دوڑ لگا دی اور ٹبے کی بھربھری مٹی والی ڈھلان سے دوڑتا پھسلتا ہوا چشم زدن میں اس کے سر پر جا پہنچا۔ وہ شاید جان چکا تھا کہ میں اس کے گرو گھنٹال بابن ڈکیت کو ”پچھاڑ“ آیا تھا۔ اس لیے

اس پر میری دہشت سوار ہو گئی، وہ بیگم صاحبہ کا ہاتھ چھوڑ کر سرپٹ ایک جانب دوڑ پڑا۔ میں نے اس کے تعاقب میں جانے کی سعی چاہی تھی مگر بیگم صاحبہ نے مجھے روک دیا اور وہ خود بے دم ہو کے گر پڑیں۔

دن پوری طرح نکل چکا تھا۔ سورج گویا سوا نیزے پر آ کے آگ برسا رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر بیگم صاحبہ کو سنبھالا.... مگر وہ بے ہوش ہو چکی تھیں۔ میرا اب یہاں موجود رہنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ نہ جانے کون سا علاقہ تھا، کس کی جاگیر تھی؟ تاہم اتنا مجھے پتا تھا کہ بھگوڑا ممتاز خان کسی وقت بھی یہاں آ سکتا تھا۔ مجھے اور تو کچھ نہ سوجھا۔ بیگم صاحبہ کے نرم و نازک وجود کو اٹھا کر میں نے اپنے کاندھے پر لادا اور ایک طرف کو چل پڑا۔

مجھے دور و نزدیک کہیں بھی آبادی کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ مگر میں اس نیم صحرائی علاقے سے دور نکل جانا چاہتا تھا۔ دھوپ کی شدت کے باعث گرمی بڑھتی جا رہی تھی۔ میں پسینے میں شرابور ہو چکا تھا۔ پیاس کی شدت سے حلق میں بھی کانٹے چبھ رہے تھے۔ اس پر مستزاد میں پچھلے کئی گھنٹوں سے مسلسل حالتِ جنگ میں تھا اور مجھے ذرا بھی آرام کرنے کا موقع نہ ملا تھا۔

ذہن اور جسم پر اب تھکن کے آثار غلبہ پانا شروع ہو گئے تھے مگر ایک لمحے کے لیے میں یہاں رکنا نہیں چاہتا تھا۔ لہٰذا بیگم صاحبہ کے بے سدھ وجود کو اٹھائے چلتا رہا۔ تھوڑی دور گیا تھا کہ مجھے بیگم صاحبہ کے وجود میں حرکت سی محسوس ہوئی۔ پھر وہ کراہنے لگیں.... میں رک گیا اور انہیں خود پر سے نیچے اتار کر بہ غور جائزہ لیا۔ وہ ہوش میں آ چکی تھیں۔ شاید انہیں میری تکلیف کا احساس اور اندازہ تھا، بولیں۔ ”میں پیدل چل سکتی ہوں۔“

”شکر ہے بیگم صاحبہ! آپ کو ہوش آ گیا۔ آپ ٹھیک تو ہیں نا؟“ میں نے پوچھا۔ وہ بہ غور مگر عجیب سی نگاہوں کے ساتھ میری طرف تکتی رہیں پھر بولیں۔

”میں ٹھیک ہوں مگر ہم ہیں کہاں؟ اور وہ بابن ڈکیت؟“

میں نے بیگم صاحبہ کو بتا دیا کہ میں اسے ختم کر چکا ہوں جبکہ اس کا دوسرا ساتھی جوجی فرار ہو چکا ہے۔

”بیگم صاحبہ! ہمارا اس علاقے سے جتنی جلدی ہو سکے دور نکل جانا بہتر ہوگا۔“ انہیں بھی اس خدشے کا پوری طرح علم تھا لہٰذا بولیں۔

”چلو.... میں چل سکتی ہوں۔“ کہہ کر انہوں نے

آگے قدم بڑھایا ہی تھا کہ بے اختیار ان کے منہ سے ایک تکلیف دہ کراہ خارج ہوئی۔ وہ گرنے لگیں تو میں نے ان کو تھام لیا اور بولا۔

”بیگم صاحبہ! ہمیں یہاں سے جلد از جلد نکلنا ہوگا ورنہ اس بار خطرے میں گھر گئے تو نکلنا مشکل ہو جائے گا۔“

”تم سہارا دو مجھے... میں چلنے کی کوشش کرتی ہوں۔“ وہ ہولے سے بولیں۔ میں نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”بیگم صاحبہ! اس طرح دیر ہو جائے گی ہمیں نکلنے میں... میرا مطلب تھا اگر آپ برا نہ منائیں تو... میں آپ کو اٹھا لوں؟ اس طرح فاصلہ جلدی طے ہو جائے گا۔ ابھی آپ بے ہوش تھیں تو میں آپ کو اسی طرح ہی اٹھا کر لایا تھا۔“

بیگم صاحبہ نے ایک عجیب سی نگاہ میرے چہرے پر ڈالی اور اپنے سر کو جنبش دی۔ میں نے دھیرے سے تھاما اور پھر کاندھے پر ڈال لیا۔

شدید گرمی اور دھوپ میں جلتے نیم صحرائی علاقے میں بیگم صاحبہ کو اٹھائے میں تیز تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔ ساتھ ہی میں اپنے گرد و پیش پر بھی نظریں دوڑاتا جاتا، میں پیدل کافی فاصلہ طے کر چکا تو مجھے سامنے ذرا دور کھیتوں کا سلسلہ نظر آیا۔ اس سے پرے گارے مٹی کی کچی دیواروں والے بے ترتیب گھروں کی قطاریں بھی دکھائی دیں۔ ایک چھتنار سے درخت تلے میں سستانے کو ذرا رکا اور نہایت آہستگی سے بیگم صاحبہ کو اپنے کاندھوں سے نیچے اتار کر درخت تلے بٹھا دیا اور خود لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ میرا پورا جسم پسینے سے تربتر تھا۔ چند ثانیے بیگم صاحبہ مجھے دیکھتی رہیں پھر ہولے سے بولیں۔

”شہزی! تم نے میری جان بچانے کی خاطر اپنی زندگی کی بھی پروا نہ کی اور خطروں سے کھیلتے رہے؟ کیوں؟“ بیگم صاحبہ کا سوال مجھے کچھ عجیب سا لگا۔ میں ان کے قریب ہی درخت کے تنے سے پشت ٹکا کر بیٹھ گیا۔ پھر مسکرا کر جواباً کہا۔

”بیگم صاحبہ! ہر ایک انسان دوسرے انسان کی خاطر کچھ نہ کچھ کرتا ضرور ہے اور پھر آپ کا تو مجھ پر احسان بھی ہے کہ...“

”میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا ہے اب تک۔“ وہ فوراً میری بات کاٹ کر بولیں اور اپنے میلے چیکٹ دوپٹے سے چہرہ صاف کیا۔

”اول خیر کی صورت میں آپ کا مجھ پر کوئی معمولی احسان نہیں ہے بیگم صاحبہ۔“ میں نے کہا۔

”اوہ...“ ہولے سے ان کے دلنشیں لبوں سے نکلا۔ ”اول خیر سے تمہاری گاڑھی چھننے لگی ہے۔“ وہ معنی خیز انداز میں مسکرائیں۔

”جی ہاں بیگم صاحبہ! اول خیر میرے لیے بھائیوں سے بڑھ کر ہے۔ وہ میرا سچا جاں نثار دوست ہے۔ جسے اچھا اور سچا دوست میسر آجائے، دنیا میں پھر اس سے بڑھ کر خوش نصیب کوئی نہیں۔“

”ہم...“ بیگم صاحبہ نے ہولے سے ہنکاری بھری پھر بولیں۔ ”عابدہ کو بھی تم بہت پسند کرتے ہو اگر کبھی کوئی ایسا موقع آجائے کہ تمہیں اپنے دوست اول خیر اور عابدہ میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑ جائے تو تم دونوں میں سے کس کا انتخاب کرو گے؟“

میں بیگم صاحبہ کے اس عجیب و غریب سوال پر چونکا تھا۔ کیونکہ اس وقت ہم دونوں جن حالات سے دوچار تھے، وہ کم از کم اس طرح کے عجیب و غریب اور گمبھیر سوالات کرنے کے نہ تھے۔ بہرحال میں نے بے تاثر مسکراہٹ سے کہا۔ ”عابدہ اور اول خیر کا میرے دل میں الگ الگ مقام ہے بیگم صاحبہ اور دونوں ہی مقام میرے لیے اہمیت کے حامل ہیں۔“ کہتے ہوئے میں نے یونہی گرد و پیش پھر نظر ڈالی اور پر کھڑے ہو کر اپنی پیشانی پر ہاتھ کا چھجا بنا کر دور نظر آتے کھیتوں کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

”آگے آبادی ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں وہاں پہنچنا چاہیے... آپ تیار ہیں بیگم صاحبہ؟“

”ہاں چلو۔“ وہ بولیں پھر خود ہی اٹھ کر کھڑے ہونے کی کوشش چاہی۔ میں نے انہیں سہارا دیا۔ وہ ہلکے سے لنگ کے ساتھ آگے بڑھیں اور کراہ کر رہ گئیں۔ میں نے انہیں دوبارہ اٹھا لیا اور آگے بڑھنا شروع کر دیا۔

کھیتوں کے قریب پہنچ کر میں رک گیا۔ مجھے کچھ لوگ کھیتوں میں کام کرتے نظر آئے تھے۔ بیگم صاحبہ کو نیچے اتار کر میں ان کی جانب ابھی بڑھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اچانک مجھے کھیتوں کے درمیان میں ذرا دور گرد و غبار کے مرغولے اٹھتے دکھائی دیے۔ متوقع خدشے کے پیش نظر میرا دل زور سے دھڑکا۔ پیش قدمی کا ارادہ بدل کر بہ غور مذکورہ سمت دیکھنے لگا۔ کھیتوں کے درمیان بل کھاتے کچے راستے پر مجھے دو تین گاڑیاں دوڑتی دکھائی دیں۔ ان کا رخ آبادی کی طرف تھا۔ پھر اچانک اگلی دو گاڑیاں آبادی کی طرف

گھوم گئیں جبکہ ایک کا رخ کھیتوں کی طرف ہو گیا۔ مجھے تشویش نے آن لیا۔ میں فوراً پلٹا اور اس بیشتار درخت تلے آ گیا جدھر بیگم صاحبہ موجود تھیں۔ میرے چہرے سے مترشح فکر کو بھانپتے ہوئے بولیں۔

"خیریت ہے؟"

"جلدی آئیں میرے ساتھ۔" میں نے سہارا دے کر انہیں کھڑا کرتے ہوئے کہا۔ مجھے قریب ایک کھوہ سی دکھائی دی تھی۔ یہ ایک گڑھا سا تھا جو تازہ کھودا گیا تھا۔ شاید یہاں ٹیوب ویل یا واٹر کورس کا کام ہونے والا تھا۔ میں بیگم صاحبہ کو لے کر اس مختصر سے گڑھے نما کھوہ میں اتر گیا اور انہیں خطرے سے آگاہ کر دیا۔ اچانک مجھے اپنے دائیں کان کی لو میں گرمی کا احساس ہوا۔ میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ میرے کان میں نصب خفیہ ٹرانسمیٹر میں کال آ رہی تھی جو ثریا کے سوا کسی کی نہیں ہو سکتی تھی۔ میں کھوہ سے باہر بھی نہیں نکل سکتا تھا۔ مجبوراً مجھے بیگم صاحبہ کے سامنے کال ریسیو کرنا پڑی۔ اپنے دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت کان میں نصب ٹرانسمیٹر بٹن پر رکھ لی اور بولا۔ "یس شہزاد اسپیکنگ... اوور۔"

دوسری جانب سے ثریا کی آواز ابھری۔ "شہزی! تم کہاں ہو؟ خیریت سے تو ہونا؟ اوور؟"

میں نے اسے اب تک کی مختصراً صورت حال سے آگاہ کیا تو اس نے مجھے بتایا... ممتاز خان نے ہیڈ کوارٹر کال کر کے اسپیکٹرم کے دس ایجنٹوں کو مدد کے لیے بلایا ہے۔

"شہزی! ممتاز خان نے بہت خطرناک اور تربیت یافتہ کارندوں سے مدد لی ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ میں بھی تمہاری کوئی مدد کرنے سے قاصر ہوں۔ بس! اطلاع ہی دے سکتی ہوں اوور..."

بیگم صاحبہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے مجھے اس طرح کان پر ہاتھ رکھ کر باتیں کرتے ہوئے خاموشی سے تکے جا رہی تھیں۔

میں نے ثریا سے کہا۔ "تمہارا شکریہ... ثریا! تم میرے لیے جتنا کر سکیں وہ کم نہیں۔ بس خیریت کی دعا کرو، اوور..."

"شہزی! میں تمہیں ایک مقام کا پتا بتاتی ہوں۔ اگر تم کسی طرح وہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاؤ تو میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں۔ تم نے اس وقت اپنی موجودگی کی جو لوکیشن بتائی ہے... وہاں سے..."

اچانک مجھے کسی گاڑی کے غراتے ہوئے انجن کی آواز سنائی دی۔ میں بری طرح ٹھٹکا اور فوراً باتوں کا سلسلہ موقوف کر کے پلٹا۔ بیگم صاحبہ کو ساتھ گھسیٹ کر ایک دم کھوہ کی دیوار کے ساتھ چپک کے دبک گیا۔ مجھے اپنے سر پر مٹی کے ذرے گرتے محسوس ہوئے اور پھر جیسے منڈیر کے بالکل قریب ہی کوئی گاڑی رکی تھی۔ اس کے بعد دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں ابھریں۔ یکلخت میرا دل گویا سائیں... سائیں کرتی کنپٹیوں پر دھڑکنے لگا۔ خطرہ... محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً ہمارے سروں پر منڈلا رہا تھا۔ بیگم صاحبہ سمیت کھوہ کی دیوار سے چپکا ہوا اس سمت سرکنے لگا جدھر سیمنٹ کا تھڑا سا بنا ہوا تھا اور یہاں موٹر فٹ کرنے کے لیے تقریباً سات فٹ لمبا اور پانچ فٹ چوڑا چبوترا بنایا ہوا تھا۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے جاں گسل لمحات درکار تھے۔ دیکھ لیے جانے کا خدشہ تھا۔ مگر اس سے زیادہ خطرہ یہاں محبوس پڑے رہنے پر تھا۔ دشمن سر پر تھے۔ اگرچہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ یہ دشمن ہی ہوں۔ مگر حالاتِ دوراں کے پیشِ نظر اور "کا نوائے" سے ایک گاڑی کا اس جانب مڑنا... اس امکان کا پتا دیتا تھا کہ یہ حرکت پذیری... ہماری تلاش ہی کا شاخسانہ لگتی تھی۔

بہت دھیرے سے محتاط روی کے ساتھ میں اوپر کھوہ کی منڈیر پر نظر ڈالتا ہوا بالآخر سیمنٹ کے مذکورہ رخنے کے پاس پہنچ ہی گیا۔ پہلے میں نے بیگم صاحبہ کو اندر داخل کیا اور پھر جیسے ہی میں اندر کی جانب دیکھنے کے لیے لپکا... دفعتاً مجھے اوپر منڈیر پر تین چار مسلح افراد کے سر طلوع ہوتے دکھائی دیے۔ میں فوراً نیچے بیٹھ گیا۔ خیریت رہی کہ ان میں سے کسی کی نظر مجھ پر نہ پڑ سکی۔ اب میں ان لوگوں کو دیکھنے سے تو قاصر تھا مگر ان کی آپس میں ہونے والی باتوں کی آوازیں مجھ تک صاف پہنچ رہی تھیں، جس سے یقین کی حد تک اس شبے کی بھی بالآخر تصدیق ہو گئی کہ یہ ہمارے دشمن اور چودھری ممتاز خان کے ساتھی تھے۔

"میرا خیال ہے... ہمیں واپس لوٹ جانا چاہیے۔ وہ دونوں آبادی میں ہی کہیں کسی گھر میں چھپے بیٹھے ہوں گے۔" دوسرے کی آواز ابھری۔ "ہم نے یہاں کھیتوں میں کام کرنے والے مقامی لوگوں سے بھی پوچھ لیا مگر انہوں نے کسی اجنبی یا نو وارد افراد کے بارے میں لاعلمی کا ہی اظہار کیا۔"

ان کے لہجے مقامی تھے۔ تاہم اندازہ نہیں تھا کہ یہ ممتاز خان کے دیسی ساختہ کارندوں کا گروپ تھا یا اسپیکٹرم کے ایجنٹ تھے۔ کیونکہ بقول ثریا کے... اسپیکٹرم میں غیر ملکیوں کے علاوہ مقامی لوگ بھی آلۂ کار تھے جبکہ میری عقل سلیم کے مطابق اسپیکٹرم جیسی بین الاقوامی نوعیت کی حامل تنظیم صرف مخصوص عہدوں کے لیے مقامی اور بااثر شخصیات کا ہی .... انتخاب کرتی تھی۔ ان میں ... ممتاز خان اور ثریا اہم مثالیں تھیں۔

معاً ایک تیسری آواز ابھری۔ "واپس لوٹنے سے پہلے اس کھالا نما جگہ میں اتر کر تسلی کر لینی چاہیے ہمیں۔"

میرا دل یک بارگی زور سے دھڑکا۔ بیگم صاحبہ یہ سب باتیں سن رہی تھیں۔ ان کا چہرہ بھی متوحش سا نظر آنے لگا۔ میں نے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ اسلحہ نام کی کوئی شے اس وقت میرے پاس نہ تھی، میں نہتا تھا۔ میں تھوڑا... اوپر ہو کے ان کی پوزیشن کا اندازہ کرنے لگا۔ اور تب میں نے دو آدمیوں کو کھالے نما کھوہ میں اترتے دیکھا۔ ممکن تھا کہ وہ وہیں کھڑے کھڑے چاروں طرف نظر ڈالنے کے بعد لوٹ جاتے مگر ایسا نہ ہوا۔ دونوں کو میں نے اس سمت بڑھتے دیکھا جدھر میں اور بیگم صاحبہ چھپے بیٹھے تھے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں جدید ساختہ کے پستول نظر آ رہے تھے جبکہ اوپر موجود ان کے دو ساتھی بھی مسلح تھے گویا ہم بری طرح پھنسے تھے۔ مجھے آگے بڑھتے ہوئے ان دونوں پستول بدست کارندوں کے قدموں کی آواز لحظہ بہ لحظہ قریب آتی محسوس ہو رہی تھی۔ اب بس... جھانکنے کی دیر تھی ان کے اور ہمارے دیکھ لیے جانے کی۔ خطرہ لٹکتی تلوار کی طرح سر پر جھولنے لگا تھا۔ میں محتاط ہو گیا۔ میرے ڈھیلے پڑے اعصاب یک دم تن گئے، دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ جوشِ لہو کی گردش رگوں میں لاوا سا اچھالنے لگی کہ بس کوئی دم کو لاوا اُبل پڑنے کو تیار تھا اور پھر... وہی ہوا۔

میں نے ایک سر کو اوپر سے ابھرتے اور پھر نیچے جھکتے دیکھا۔ اس نے سیمنٹ کی منڈیر کا سہارا لیا ہوا تھا اور پستول اس کے دائیں ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ ہم دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں پھر جیسے میرے تنے ہوئے وجود میں ایکا ایکی بجلی دوڑ گئی۔ میں نے ایک زوردار گھونسا اس کی ناک پر جڑ دیا اور بہ سرعت دوسرے ہاتھ سے اس کا پستول جھپٹ لیا۔ پھر تلے اوپر دو فائر کر ڈالے۔ ایک گولی میرے قریب لہراتے اور اپنی زخمی ناک سہلاتے کارندے کو چاٹ گئی۔ دوسری گولی نے ذرا فاصلے پر کھڑے دوسرے کارندے کے سینے کو نشانہ بنایا۔ اوپر منڈیر پر موجود مسلح کارندوں کے ہاتھوں میں ایس جی ایم رائفلیں تھیں، وہ ایک دم مجھ پر سیدھی کر کے انہوں نے بیک وقت دو برسٹ فائر کر دیے مگر متوقع خطرے کو بھانپ کر میں پہلے ہی پھرتی کے ساتھ نیچے کو جھک گیا۔ گولیوں کی بوچھاڑ سیمنٹ کے کونوں کناروں پر پڑی اور کئی سنگ ریزے بکھرے۔ میں نے پھرتی سے اپنی جگہ بدلی اور مشرقی کونے کی آڑ سے اوپر سامنے منڈیر پر کھڑے دونوں کارندوں پر تلے اوپر دو تین فائر کر ڈالے۔ ایک کریہہ انگیز چیخ مار کے نیچے کھالے میں آن گرا جبکہ دوسرا پیچھے کو ہٹ گیا۔ میں وہیں دبکا عقابی نظروں سے اوپر دیکھتا رہا کہ شاید کہیں سے اچانک ابھر کر مجھ پر فائر کرنے کی کوشش کرے گا۔ مگر کئی پل بیت گئے تو ایک خیال سے میرا ماتھا ٹھنکا کہ کہیں وہ فون وغیرہ پر ممتاز خان سے رابطہ کر کے یہاں ہونے والی خوں ریز کارگزاری کے بارے میں نہ بتا رہا ہو۔ اگر ایسا تھا تو یقیناً یہ میرے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ لہٰذا میں دردانہ وار ہمت اور پیش قدمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سیمنٹ کے اس قبر نما کھالے سے نکلا اور جھکا جھکا محتاط روی سے چلتا ہوا کھوہ کی دیوار کے نزدیک آ گیا۔ پھر اوپر کی جانب رینگنے لگا۔ پستول میں نے منہ میں دبایا اور دونوں ہاتھوں کی مدد سے نچلا دھڑ اوپر گھسیٹا اور سر ابھار کر دیکھا تو میرا خدشہ درست ثابت ہوا۔ وہ کار کے قریب پوزیشن سنبھالے فون پر باتوں میں مشغول تھا اور میرا سر ابھرتا اس نے بھی دیکھ لیا۔ میں ابھی اس پر گولی چلانے کی پوزیشن میں نہ تھا مگر اس نے دوسرے ہاتھ میں دبی ہوئی گن سے جس کا رخ کھوہ کی طرف ہی تھا برسٹ داغ دیا۔ میں خطرہ بھانپ کر پہلے ہی نیچے کو دبک گیا، کھوہ کی منڈیر کے پاس زمین پر گولیوں کی آتشیں بوچھاڑ پڑی اور مٹی کے ذروں کی بارش میرے چہرے سے ٹکرائی۔ میں نے آنکھیں موند لی تھیں پھر فوراً دوسری جانب سرک کر میں ابھرا اور اس دوران میں نے پستول بھی منہ سے نکال کر اپنے داہنے ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔ اس بار ابھرتے ہی میں نے اسے فائر کرنے کا موقع دیے بغیر اپنے پستول سے تلے اوپر دو تین فائر کر ڈالے۔ ایک گولی اس کی ٹانگ پر لگی جبکہ دو گولیاں کار کی باڈی میں کہیں پیوست ہو گئیں۔ اس نے سنبھل کر مجھ پر ایک اور برسٹ داغ دیا۔ میں نے ایک بار پھر کھوہ کی منڈیر والے مورچے میں سر دبا دیا۔ اس بار گولیوں کی بوچھاڑ زمین پر پڑنے کے بجائے میرے سر کے اوپر سے گزری۔ میں صحرائی چھپکلی کی طرح ایک بار پھر کھوہ کی ڈھلوانی دیوار پر تیزی سے ہاتھوں پیروں کی مدد

سے رینگتا ہوا دوسری سمت پر آیا اور سر ابھارنے سے پہلے اپنے پستول کا جائزہ لیا۔ اس کے کلپ میں فقط ایک گولی رہ گئی تھی۔ موجود دشمن کے آخری کارندے نے یقیناً اب تک فون پر ”شکار“ (یعنی میرے اور بیگم صاحبہ) کے بارے میں بتا دیا تھا۔ لہٰذا اب اس کو جلد سے جلد پچھاڑ کر ہمیں یہاں سے بھی نکل جانے کی ضرورت تھی، مگر مسئلہ یہ تھا کہ میرے پستول میں صرف ایک ہی گولی بچی تھی، جبکہ میرے دشمن کے پاس رائفل..... میرے پاس اتنا وقت بھی نہ تھا کہ میں دوبارہ پیچھے رینگ کر دوسرے کارندے کی لاش سے پستول حاصل کرنے کی سعی کرتا۔

میں نے سر ابھار کر دیکھا اور دوسرے ہی لمحے میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ رقصاں ہوگئی۔ کار کے نیچے مجھے پیٹرول پھیلا ہوا دکھائی دیا۔ شاید میری فائر کی ہوئی کسی گولی نے فیول ٹینک میں سوراخ کر دیا تھا اور پیٹرول سوئی دھار کی صورت میں زمین پر بہہ رہا تھا جبکہ میرا آخری دشمن شاید اس بات سے بے خبر دوسری جانب کار کے بونٹ کو مورچا بنائے کھوہ کی سمت دیکھنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ میں نے بڑے آرام سے کار کے نیچے جمع شدہ ”آبِ استادہ“ کی صورت بنے تالاب پر گولی چلا دی۔ میرے دشمن کے فرشتوں کو بھی میری اس چال کا علم نہ ہو سکا۔ سب سے پہلے کار کے نیچے آگ کا جہنم سا دہکتا ہوا نمودار ہوا پھر سماعت شکن دھماکے سے کار کی ٹنکی پھٹی۔ گاڑھے کثیف دھوئیں کی آتشیں چھتری فضا میں بلند ہوئی اور کار دھڑا دھڑ جلنے لگی۔

میں خالی پستول پھینک کر تیزی سے واپس پلٹا اور بیگم صاحبہ کی طرف آیا۔ وہ بے چاری خاصی گھبرائی ہوئی اور متوحش سی نظر آرہی تھیں حالانکہ وہ خود ایک بڑے گروہ کی سربراہ تھیں مگر اس بار شاید وہ خود براہِ راست ایسے مخدوش حالات سے دوچار تھیں کہ ان کی اپنی جان پر بنی ہوئی تھی۔ بیگم ولا کے آرام دہ اور پُرسکون ماحول میں پُرتعیش زندگی گزارنے والی بیگم صاحبہ کو نامساعد اور حالات دگرگوں نے میرے ساتھ دوبدو ہونے پر مجبور کر ڈالا تھا۔ بہرحال..... میں نے بیگم صاحبہ کو سنبھالا..... اور کھوہ سے باہر نکل آیا۔ انہوں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے کار کو دھڑا دھڑ جلتے دیکھا، وہ اب چل سکتی تھیں۔ میں نے ان کا ہاتھ پکڑا اور ایک بار پھر کھیتوں کی طرف رخ کیا۔ بیگم صاحبہ کو میں نے بتا دیا تھا کہ دشمن یہاں ہماری تلاش میں پہنچ چکا تھا۔ وہ پریشان ہوگئیں۔ ایک جگہ مڑ کر بولیں۔

”پھر ہمیں دوسری سمت جانا ہوگا۔ آبادی کا رخ کرنا ہمارے لیے خطرے سے خالی نہ ہوگا۔“

میں نے کہا۔ ”پہلے میرے ذہن میں بھی یہی بات تھی مگر پھر یہ سوچ کر میں نے اپنا ارادہ بدل ڈالا کہ اس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا، دشمن کسی وقت بھی ہماری تلاش میں پہنچ سکتا ہے۔ وہ اب ادھر کھوہ کا ہی رخ کرنے والا ہے۔ آپ فکر نہ کریں بیگم صاحبہ! اب دشمن سے بھاگنا بے وقوفی ہو گی۔ اسے جل دے کر گھات لگانا زیادہ مناسب ہوگا۔ آیئے۔“ وہ کچھ نہ بولیں۔ ہم دونوں آگے بڑھنے لگے۔

اس بار میرا رخ کھیتوں میں کام کرنے والے لوگوں کی طرف نہ تھا۔ جو اب ایک جگہ جمع ہو کے کھوہ والی سمت میں موجود جلتی ہوئی کار کو دیکھنے میں محو تھے۔ ایک لمبا چکر کاٹ کر ہم جیسے ہی کھیتوں میں داخل ہوئے اچانک میرے قدم رک گئے۔ آبادی کی طرف سے مجھے دو گاڑیاں دوڑتی ہوئی نظر آگئیں۔ ان کا رخ کھوہ والی سمت کی جانب تھا جدھر کار سے شعلے اٹھ رہے تھے۔ گویا آخری کارندے نے مرتے مرتے بھی ہمیں مصیبت میں مبتلا کر دیا تھا۔ میں اور بیگم صاحبہ یک دم نیچے بیٹھ گئے۔ فصلیں جوان تھیں اور ان کی پیٹر اس سے ہمیں قیامت جیسی گرمی کا احساس ہو رہا تھا۔ میں تھوڑا سر ابھار کے مذکورہ سمت جھانکنے لگا اور چونکے بنا نہ رہ سکا۔ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے دوڑتی ہوئی کھوہ کی سمت بڑھی چلی جا رہی تھیں۔ سب سے آگے والی گاڑی چودھری ممتاز کی وہی پجارو تھی جس پر وہ اپنے ڈیرے آیا تھا مگر راستے میں ہی ہم نے اس کا راستہ کھوٹا کرنے کی کوشش چاہی تھی تو یہ بغیر رکے دم دبا کے بھاگ نکلا تھا۔ اس طرح بعد میں ہمارا ابن ڈکیت اور اس کے ساتھیوں سے ٹکراؤ آسان ہوگیا تھا۔

بہرحال دونوں گاڑیاں کھیتوں کے سلسلے پار کر کے آگے بڑھ گئیں تو میں نے بیگم صاحبہ کا ہاتھ پکڑا اور آگے بڑھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ یہ کون سے علاقہ تھا؟ یہ بھی نہیں کہ چودھری ممتاز خان کے یہاں کتنے ہاتھ لمبے تھے؟ یا پھر وہ یونہی ہماری تلاش میں یہاں تک آیا تھا اور یہ علاقہ اس کے لیے بھی اجنبی ہو۔ بہرطور..... ابھی تو ہماری اپنی بقا کا مسئلہ تھا۔

میں اور بیگم صاحبہ آگے بڑھتے رہے۔ بیگم صاحبہ کے پاؤں کی چوٹ یا ذکت پچھ کم ہوگئی تھی اس لیے اب وہ بغیر سہارے کے چل رہی تھیں مگر انہوں نے میرے ہاتھ سے اپنا ہاتھ ابھی تک چھڑانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

ایک بڑے گروہ کی سربراہ..... یوں بے یار و مددگار

میرے ہمراہ تھی، یہ دل کی بات تھی کہ مجھے خود بڑا عجیب لگ رہا تھا۔ بیگم صاحبہ اپنے گروہ کی ایک ایسی دبنگ لیڈر تھیں کہ کوئی ادنیٰ کارندہ کیا..... ان کے قریبی ساتھی بھی بیگم صاحبہ کے سامنے آنکھ اٹھا کر بات کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ کبیل دادا اور اول خیر کی مثالیں میری آنکھوں کے سامنے تھیں۔ کبیل دادا تو پھر بھی گروہ میں ”بڑا استاد“ کہلاتا تھا، وہ تک نظریں اٹھا کر بیگم صاحبہ سے بات کرنے کی جرأت نہ کرتا تھا۔ کہاں تو بیگم صاحبہ کے ایک اشارے پر من و سلویٰ پیش کر دیے جاتے ہوں گے اور کہاں اب وہ پانی کے ایک قطرے کو ترسی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ ان کے ہونٹوں پر پیاس سے پپڑیاں جم گئی تھیں۔ بھوک اور تھکن نے انہیں نڈھال کر رکھا تھا مگر انہوں نے خود کو سنبھالے رکھنے کی کوشش کی تھی اور میرا ساتھ دے رہی تھیں۔

”کہیں سے فون کا بندوبست ہو جائے تو ہم اپنے ساتھیوں کو مدد کے لیے بلا سکتے ہیں۔“ بیگم صاحبہ نے میرے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ پھر بولیں۔ ”شہزی! تمہارے کان میں کیا کوئی خفیہ ٹرانسمیٹر لگا ہوا ہے؟“

میں ان کے سوال پر تھوڑا ہچکچاہٹ آمیز انداز میں مسکرایا۔

وہ اس بات کو بھولی نہیں تھیں، ابھی تھوڑی دیر پہلے کھوہ میں ثریا نے مجھ سے جس خفیہ ٹرانسمیٹر پر بات کی تھی بیگم صاحبہ کے علم میں آچکی تھی۔ لہٰذا میں نے کہا۔ ”جی ہاں، بیگم صاحبہ! وہ ایک خفیہ ٹرانسمیٹر ہے جو کان میں نصب ہوتا ہے۔“

”کیا تم کسی جرائم پیشہ تنظیم کے آلۂ کار بن چکے ہو؟“ ان کے لہجے میں تشکیک تھی اور شکوے کی چبھن۔ میں نے ہلکی مسکراہٹ سے جواب دیا۔ ”نہیں بیگم صاحبہ! میری الطرت میں جرم کے جراثیم سرے سے موجود ہی نہیں ہیں۔“

”تو پھر..... یہ سب کیا ہے؟ تم کس سے باتیں کر رہے تھے، اس خفیہ ٹرانسمیٹر پر؟“

بیگم صاحبہ لائقِ اعتبار تھیں۔ یوں بھی انہیں حقیقتِ حال بتانا ضروری تھا۔ میں نے انہیں ثریا کے متعلق بتا دیا اور اس بین الاقوامی جرائم پیشہ تنظیم ”اسپیکٹرم“ کے بارے میں بھی بتا دیا۔

یہ سن کر بیگم صاحبہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ پھر قدرے آمیز تشویش سے بولیں۔

”اوہ..... اس کا مطلب ہے یہ مردود ممتاز خان اپنے ہاتھ پاؤں اس قدر پھیلا چکا ہے ہوں.....“ کہتے ہوئے انہوں نے معنی خیز انداز میں ایک پُرسوچ ہنکاری خارج کی، پھر مزید سنجیدہ لہجے میں بولیں۔

”سب جانتی ہوں میں اچھی طرح..... وہ اپنے ہاتھ کیوں مضبوط کرنا چاہ رہا ہے۔ وہ دوسروں کو اپنا زرخرید کتا تو بناتا ہی تھا، میرے انتقام میں وہ اس قدر اندھا ہو گیا ہے کہ اپنے گلے میں بھی کسی کی غلامی کا پٹا ڈال لیا ہے۔“

ہم چلتے چلتے ایک جگہ رک گئے۔ مجھے ابھی تک بیگم صاحبہ سے تفصیلی گفتگو کا موقع ہی نہ ملا تھا۔ میں نے پوچھا۔

”بیگم صاحبہ! اس بار ممتاز خان نے آپ پر بہت کاری وار کرنے کی مذموم کوشش کی تھی۔ کبیل دادا اور اول خیر سمیت ہم سب کا یہی خیال تھا کہ چودھری ممتاز اپنے جواں سال بیٹے فرخ کا قاتل آپ کو سمجھنے لگا ہے، خدانخواستہ، آپ کو یرغمال بنانے کا مقصد اس کا یہی تھا کہ وہ آپ کی زندگی کی کہانی کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینے کا ارادہ رکھے ہوئے ہے۔ اس بات کی ہم سب کو گہری تشویش تھی۔“

”ہاں! یہ بات درست ہے۔“ بیگم صاحبہ نے کہا۔ ”وہ واقعی میرا کانٹا صاف کرنے کا پختہ ارادہ کر چکا ہے۔ وہ میرے خون کا اس قدر پیاسا ہو رہا ہے کہ اس کا بس نہیں چل رہا کہ مجھے دیکھتے ہی گولیوں سے بھون ڈالے۔“

”ایسی باتیں تو نہ کریں بیگم صاحبہ۔“ بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ ”اللہ آپ کو لمبی عمر دے۔ آپ نے میری عابدہ کے سلسلے میں بہت مدد کی ہے۔ چودھری ممتاز خان ہمارے ہوتے ہوئے آپ کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا مگر ایک بات آپ کی سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ بے بس کیوں ہے؟“ میری بات پر بیگم صاحبہ نے بڑے غور سے میرے چہرے کو دیکھا تھا۔ اس دوران ان کا چہرہ کئی رنگوں کے اتار چڑھاؤ کا پیش خیمہ بنا رہا پھر ایک گہری سانس خارج کی۔

”وہ مجھ سے ایک اسٹیمپ پیپر پر میرے دستخط اور انگوٹھوں کے نشان لینا چاہتا ہے۔“

”کیسا اسٹیمپ پیپر؟“ میں نے الجھی ہوئی سوالیہ نظروں سے بیگم صاحبہ کی طرف دیکھا۔

”جائداد کا..... نئے پنڈ کی جائداد اور ملتان کے نواح میں پھیلی ہوئی ان گنت فیکٹریوں اور فلور ملز کی حصے داری سے دستبرداری، اس کے بعد وہ مجھے جان سے مارنے کا تہیہ کیے ہوئے تھا۔ اسٹیمپ پیپر پر میرے دستخط کروانے کے لیے بھی اس نے بڑا گھناؤنا طریقہ اپنانے کا فیصلہ کر رکھا تھا جس کے لیے اس بے غیرت نے مجھے بدر اقبال جیسے تھرڈ کلاس آدمی کے حوالے کر دیا۔ مقصد مجھے ذہنی اذیت پہنچانا

تھا۔ آئندہ بھی اس کے بڑے گھناؤنے منصوبے تھے کہ تم نے بروقت اپنی جان خطرے میں ڈال کر نہ صرف میری عزت و جان بچائی بلکہ بدر اقبال (بابن ڈکیت) جیسے خطرناک آدمی کو جہنم واصل بھی کردیا۔“

میں نے کہا۔ ”بیگم صاحبہ! اس کارِ خیر میں، میں اکیلا نہیں تھا۔ آپ کے دونوں قریبی ساتھی، کبیل داد اور اول خیر بھی میرے ساتھ تھے۔“

”کسرِ نفسی چھوڑو شہزی۔۔۔ جو حقیقت ہے وہی رہے گی۔ میری آنکھوں نے صرف تمہیں خاک و خون میں میرے دشمنوں کے ساتھ دلیرانہ وار نبرد آزما ہوتے اور موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر لڑتے دیکھا ہے، اس وقت بھی تم ہی میرے ساتھ ہو۔“

میں کیا جواب دیتا۔ یونہی گرد و پیش پر نظریں دوڑانے لگا۔ جی میں آئی کہ بیگم صاحبہ کو ان کے ماضی کے حوالے سے بھی کریدوں نیز لئیق شاہ نامی اس شخص کے بارے میں استفسار کروں، جس کا ایک دو بار عجیب انداز میں وہ میرے سامنے ذکر بھی کر چکی تھیں مگر یہ موقع ان سے باتوں کا نہ تھا۔ ہم نے آگے بڑھنا شروع کردیا۔

ہم آبادی کا رخ کرنے کے بجائے اس کے قریب سے گزرنے لگے۔ یہ کوئی چھوٹا سا بستی نما گاؤں محسوس ہوتا تھا جو محض چند ہزار نفوس پر مشتمل ہوگا۔ یقیناً ہمارا یہاں دیکھ لیا جانا سو فیصد یقینی تھا۔ میں عقب میں مڑ کر کھوہ والی سمت نظریں ڈال لیتا کہ دشمن کہیں ہمارے قدموں کے نشانات پہچان کر تعاقب میں تو نہیں آرہے، انہیں بھٹکانے کے لیے ضروری تھا کہ ہم آبادی کے قریب سے گزر کر دوسری طرف کی راہ لیں۔

دن اب ڈھلنے لگا تھا۔ دھوپ کی شدت کم ہونے لگی تھی مگر حبس بڑھنے لگا تھا۔ سرِدست ہمیں کوئی منزل دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ کبیل داد اور اول خیر ہماری تلاش میں کہاں تک ٹوئیاں مار رہے تھے۔ تاہم میری کوشش یہی تھی کہ کسی طرح بیگم صاحبہ کو لے کر جلد سے جلد ملتان ”بیگم ولا“ پہنچ جاؤں۔ مگر یہاں تو صورتِ حال ہی کچھ ایسی تھی کہ ایک کے بعد ایک دشمن گلے پڑ رہا تھا اور ابھی تک ہم ممتاز خان سے پوری طرح پیچھا نہیں چھڑا پارہے تھے۔ ثریا سے اچانک ڈرامائی بلکہ حادثاتی ٹکراؤ آمیز ملاقات نے کچھ نئے سنسنی خیز انکشافات کو جنم دیا تھا ”اسپیکٹرم“ کی بین الاقوامی تنظیم کا انکشاف معمولی بات نہ تھی جبکہ ثریا کے مطابق وہ خود بھی اس کی آلۂ کار تھی، مگر اس کی تنظیم میں شمولیت کوئی اور ہی معنی رکھے ہوئے تھی جبکہ چودھری ممتاز اسپیکٹرم میں کیشا ایجنٹ کی حیثیت رکھتا تھا، وہ کب اور کیسے اسپیکٹرم میں شامل ہوا تھا یہ اور ان سے متعلق بہت سی باتیں مجھے ثریا پوری تفصیل کے ساتھ بتانے کا وعدہ کر چکی تھی۔ یہی نہیں میرا باپ وزیر جان جو اب بھی اولاد اور پدرانہ شفقت کے سلسلے میں اپنی سابقہ بے حس روش پر قائم تھا، وہ اسپیکٹرم میں ایک بڑے عہدے کا حامل بن چکا تھا۔ جسے تنظیم میں اسٹیشن چیف کہا جاتا تھا۔ کوئی ”ماسٹر اتھارٹی“ اسپیکٹرم کا نظم و نسق چلا رہی تھی، ان کا یہاں کیا مشن تھا؟ یہ میں نہیں جانتا تھا مگر ثریا سے یہ ساری معلومات مل سکتی تھیں لیکن سرِدست موجودہ صورتِ حال کی کشاکشی سے چھٹکارا پانا ضروری تھا۔ آگے ایک اونچے مقام پر چند لوگ ادھر ادھر سے لکڑیوں کو جمع کر کے گٹھیاں بنانے میں مصروف تھے، ایک کنواں بنا ہوا تھا، وہاں سے آگے چھوٹی سی نہر بہہ رہی تھی۔ ہم نہر کے مختصر کراڑے میں آکر بیٹھ گئے۔ یہاں پانی کی وجہ سے کچھ ٹھنڈک اور سکون کا احساس ہوتا تھا۔ دائیں بائیں بہر کے موٹے پتوں والے پودوں کے جھنڈ بکھرے ہوئے تھے۔ یہ نسبتاً الگ تھلگ جگہ تھی اور کافی حد تک محفوظ بھی۔ ہم نے منہ ہاتھ دھویا تو کچھ تازگی کا احساس ہوا۔ قریب ایک چھوٹا سا کھالا بھی تھا، وہاں سے ہاتھوں کی اوک بنا کر پانی پیا۔ بھوک محسوس ہو رہی تھی، میں بہر کے پتوں کی طرف دیکھنے لگا۔ ان میں ڈوڈیاں سی نکلی ہوئی تھیں۔ بیگم صاحبہ میری نظروں کا مطلب بھانپ کر مسکرا کر بولیں۔

”یہ بہر ہے، ان کے پتوں کو مسلنے سے جو سفید گاڑھا دودھ جیسا مواد نکلتا ہے وہ پینے میں زہر سے بھی زیادہ کڑوا ہے مگر زخموں کے لیے انتہائی مفید ہوتا ہے۔ البتہ ان کی ڈوڈیاں میٹھی ہوتی ہیں۔ مگر ان کو بھی ایک طریقے سے توڑ کر کھانا پڑتا ہے، ورنہ سارا منہ کڑوا ہو جاتا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ آگے بڑھیں۔

بیگم صاحبہ نے بہر کے پودوں سے کچھ ڈوڈیاں توڑ کر اپنی قمیص کے دامن میں بھر لیں۔ ایک دو ڈوڈیاں میں نے توڑ کر بے اختیار منہ میں ڈال لیں اور چبائیں تو فوراً تھو۔۔۔ تھو۔۔۔ کرنے لگا۔ میرا حلق کڑوا زہر ہو گیا اور فوراً کراڑے سے ذرا نیچے جا کر ہاتھوں کی ”اوک“ بنا کر پانی کی کلیاں کر ڈالیں۔ ایسے میں مجھے بیگم صاحبہ کی کھنکتی ہنسی کی آواز سنائی دی۔ وہ دیتیلے کراڑے پہ دامن پھیلائے بیٹھی تھیں، بولیں۔

”میں نے کہا تھا نا ان ڈوڈیوں کو کھانے کا ایک طریقہ ہے۔ آؤ۔۔۔ میں تمہیں چھیل کر دیتی ہوں۔“

میں ان کے قریب ہو کر بیٹھ گیا۔ ”لو دیکھو، اس طرح کھاتے ہیں۔“ انہوں نے میری طرف مسکرا کر دیکھا اور ایک ڈوڈی اپنے گلابی لبوں میں دبا کر دانت کی مدد سے اس کا چھلکا چھیلا پھر ایک طرف تھوک دیا۔ پھر چھلی ہوئی ڈوڈی کو اپنی اجلی قمیص سے صاف کر کے میری طرف بڑھا دی۔ میں نے وہ لے کر منہ میں ڈال کر چبائی۔ بہت لذیذ اور نمکین نمکین سی تھی۔ اس طرح بیگم صاحبہ نے مجھے مزید دو تین ڈوڈیاں دانت سے چھیل کر اور اپنی قمیص سے پونچھ کر دیں۔ پھر میں طریقے کے مطابق اپنے دانت سے چھیل کر ڈوڈیاں کھانے لگا۔

ہم نے خوب سیر ہو کے وہ ڈوڈیاں کھائیں۔۔۔ شام اترنے لگی تھی۔ بیگم صاحبہ نے مجھ سے کہا۔

”تم ثریا سے ٹرانسمیٹر پر رابطہ کر کے مدد کیوں نہیں مانگ لیتے؟“ میں نے جواب دیا۔

”یہ کام اگر ہوتا تو میں بہت پہلے ہی کر چکا ہوتا بیگم صاحبہ! ثریا نے جب مجھ سے رابطہ کیا تھا تو اس نے صرف میری خیریت دریافت کرنا چاہی تھی اور کچھ معلومات دی تھیں کہ چودھری ممتاز نے میرے اور آپ کی تلاش کے سلسلے میں اسپیکٹرم کے دس تربیت یافتہ ایجنٹوں سے مدد لی ہے۔ خود بھی ان کے ہمراہ ہے۔“

”حیرت ہے، کچھ عجیب سی ہی بات لگتی ہے، کیا چودھری ممتاز کے اپنے سارے آدمی مر چکے ہیں جو وہ اس کام کے لیے اسپیکٹرم کو استعمال کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔“ بیگم صاحبہ نے استہزائیہ آمیز حیرت سے کہا۔

”بیگم صاحبہ! آپ نے گیدڑ کی وہ مثل نہیں سنی کہ۔۔۔ گیدڑ کی کم بختی آئے تو گاؤں کو بھاگا جائے۔۔۔ وہ اپنے سارے کارپردازوں کو آزما چکا ہے۔ اب وہ ولایتی مہرے میدان میں ہمارے خلاف اتارنا چاہتا ہے۔“

”اور اس کے سارے خطرناک کارپرداز صرف تمہارے ہاتھوں جہنم واصل ہوئے ہیں۔“ بیگم صاحبہ نے مسکرا کر گرہ لگائی۔ میں نے انہیں جنگی خان کے بارے میں بتایا جسے ہم نے بیگم ولا کے تہ خانے میں قید کر رکھا تھا۔

اچانک مجھے اپنے دائیں کان کی لو میں حرارت محسوس ہوئی، میں چونکا۔ پھر فوراً میرا سیدھا ہاتھ حرکت میں آیا۔ کان پر انگلی رکھ کر میں نے ثریا کی کال وصول کی۔ وہ ملتجیانہ۔۔۔ انداز میں بولی۔

”شہزی! تم ٹھیک ہو؟ اب کدھر ہو؟ اوور۔“

”میں ادھر ہی ہوں، جہاں پہلے تھا۔ البتہ لگتا ہے ممتاز خان اپنے گرگوں کے ساتھ میری تلاش میں یہاں بھی آن پہنچا ہے۔۔۔ اوور۔“

”تم جس علاقے میں ہو۔۔۔ وہ چک لواں کے قریب ہی کا علاقہ ہے، موضع سدراں کہلاتا ہے۔ شکر ہے کہ تم ابھی تک ممتاز خان کے ہتھے نہیں چڑھے۔ اب میں شاید تمہاری مدد کرنے کی پوزیشن میں ہوں۔ تم ایک کام کرو۔ تم اس وقت جس جگہ پر چھپے بیٹھے ہو کچھ گھنٹے مزید وہیں رکو۔۔۔ تو میں خود تمہاری مدد کو وہاں آن پہنچوں گی۔ جلدی جواب دو مجھے۔۔۔ اوور۔“

ثریا کی اس بات پر میرا دل امید کے دیے کی طرح ٹمٹمایا۔ ”میں اور بیگم صاحبہ اس جگہ نسبتاً محفوظ مقام پر موجود تو ہیں مگر یقین سے اس بارے میں نہیں کہہ سکتا کہ یہاں ہم کتنی دیر تک محفوظ رہ سکتے ہیں۔ اگر بات محض ایک دو گھنٹے کی ہو تو ٹھیک ہے لیکن ثریا میں تمہیں بھی مشورہ دوں گا کہ تم خود کو اتنے بڑے رسک میں مت ڈالو، اس طرح تمہاری اپنی جان کو بھی خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے ممتاز خان تمہیں بھی پہچانتا ہو۔۔۔ اوور۔“ میں نے اپنی سابقہ مبہم کے حوالے سے کہا تو وہ پورے مستحکم لہجے میں بولی۔

”اس کی تم فکر نہ کرو شہزی، میں پوری طرح سے محتاط ہوں۔ یوں بھی مجھے تم سے ایک تفصیلی ملاقات تو کرنا ہے۔ رہی بات ممتاز خان کے مجھے پہچان لینے کی تو یہ ناممکن ہے۔ اطفال گھر میں گگل خان اور اس کے چند ایک کارندوں کے سوا مجھے کوئی نہیں پہچانتا تھا۔ البتہ عابدہ، شکیلہ، زیبا اور نازو وغیرہ کو ممتاز جانتا ہوگا۔ مگر یوں بھی جب سے میں ”اسپیکٹرم“ کی آلۂ کار رہی ہوں، میں نے اپنا رنگ ڈھنگ کافی حد تک بدل لیا ہے۔ اب کام کی بات سنو، تم اس وقت جہاں ہو، وہیں رہو، اور مجھے اس جگہ کی تفصیل بتادو۔ میں ایک دو گھنٹے کے اندر اندر پہنچ جاؤں گی۔۔۔ اوور۔“

میں نے اسے مختصراً موجودہ مقام کی صراحت بتادی۔ بیگم صاحبہ کا پژمردہ چہرہ یہ سن کر یک دم کھل اٹھا تھا کہ ثریا ہماری مدد کو پہنچنے والی تھی۔

میرے محتاط اندازے کے مطابق چودھری ممتاز ہنوز آبادی اور موضع سدراں میں کہیں منڈلا رہا تھا۔ اگرچہ اس بات کا بھی پورا احتمال تھا کہ وہ یہاں بھی آسکتا تھا لیکن میں نے یہاں نہر کے کنارے اور تقدرے آس پاس کچھ گاڑیوں کے ٹائروں کے تازہ نشانات دیکھے تھے جس کا

مطلب تھا کہ وہ یہاں سے ہو کر جا چکے تھے، گویا ان کے دوبارہ یہاں آنے کا امکان کم ہی تھا۔

''کیا سوچنے لگے؟''

مجھے سوچ میں مستغرق پا کر بیگم صاحبہ نے پوچھا۔ مجھے ان کی آواز میں غیر معمولی ملائمت اور عجیب سی نرماہٹ کا احساس ہوا تھا۔ میں نے یونہی نظر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ مجھے ان کے خوب صورت چہرے پر کچھ ایسے آثار محسوس ہوئے جو کچھ گہرائی لیے ہوئے تھے، ان کی بڑی بڑی کشادہ سیاہ آنکھوں میں ہلکورے لیتی رمزیہ کشش میں جو گیرائی اتری ہوئی تھی، اس کا مفہوم مجھے کچھ ''پرانے حوالوں'' سے سمجھ میں آتا تھا۔ تاہم پھر فوراً میں نے یونہی اپنا سر جھٹک کر ان سے کہا۔

''کچھ خاص نہیں بیگم صاحبہ! ہاں، ایک خدشہ ذہن میں آرہا ہے کہ کھوہ والی جگہ پر اپنے کارندوں کی جلتی ہوئی کار دیکھ کر ممتاز خان کو ہماری اسی علاقے میں موجودگی کی تسلی ہو جائے گی۔ پھر وہ ہمیں تلاش کیے بغیر یہاں سے ٹلے گا نہیں اور یہ بھی ممکن ہے شاید ہمارے پیروں کے نشانات یہاں تک ان خبیثوں کی رہنمائی بھی کر ڈالیں۔'' کہتے ہوئے میرے چہرے پر تشویش کی لہر سی پھیل گئی جسے بھانپ کر بیگم صاحبہ نے بہت دھیرے سے اور بڑی نرماہٹ سے اپنا مرمریں نازک ہاتھ میرے بالوں بھرے کھردرے ہاتھ پر رکھ دیا اور بولیں۔

''شہزی! اللہ نے اب تک ہماری مدد کی ہے اور نہ جانے کتنے خطرات سے ہمیں اس پاک ذات نے بچایا ہے، وہ آگے بھی ہماری دست گیری فرمائے گا۔ پھر مجھے تو تم پر.... تمہاری عقل و فہم اور تمہاری جواںمردی پر بھی پورا بھروسا ہے، ہم اس خطرے سے بھی بہ حفاظت نکل جائیں گے۔''

''انشاء اللہ۔'' میں نے ہولے سے کہا۔

''شہزی۔''

''جی بیگم صاحبہ؟''

''تمہارے ذہن میں کبھی میرے بارے میں کوئی سوال نہیں ابھرتا.... کہ میں کون ہوں.... کیا ہوں اور میرا ماضی کیا ہے اور.... اور.... یہ.... کہ.... میں ایک بڑے گروہ کی سربراہ ہونے کے باوجود میں تمہارا.... اس قدر احترام کیوں کرتی ہوں؟ اور.... اور.... تمہیں پسند بھی کرتی ہوں.... کیوں؟''

بیگم صاحبہ کی بات سن کر میں جیسے یک دم سناٹے میں آگیا۔ مجھے اپنے دل کی دھڑکنیں بے ربط سی محسوس ہونے لگیں۔ بیگم صاحبہ نے جس طرف میری توجہ دلائی تھی... بھی میرے لیے ایک کھوج کا درجہ رکھتی تھی۔ یہ تجسس تو میں بھی اپنے اندر رکھتا تھا کہ بیگم صاحبہ کی اصل حقیقت سے کسی روز پردہ کراؤں، کچھ باتیں وقت کے ساتھ بیگم صاحبہ کی پہلو دار... اور پراسرار شخصیت کے حوالے سے ظہور پذیر ہوتی رہی تھیں۔ لیکن اب بھی کئی ایسی باتیں اہم اور مخفی تھیں جنہیں بے نقاب کرنے کا میرے اندر ایک فطری تجسس مجھے بے چین کیے رہتا تھا۔ کئی بار اول خیر سے بھی جاننا چاہا تھا مگر پہلو تہی کر گیا، پھر کچھ حالات بھی ایسے رہے کہ اسے بھی موقع نہ مل سکا کچھ صراحت سے بتانے... اگرچہ موقع محل تو یہ بھی نہ بنتا مگر نہ جانے کس جذبے نے بیگم صاحبہ کو اپنی حقیقت آج اور اس نازک لمحے میں ''بہ قلم خود'' بتانے پر مجبور کر دیا تھا۔ لہٰذا میں نے بھی ایک گہری ہنکاری خارج کر کے کہا۔

''جی بیگم صاحبہ! یہ حقیقت ہی ہے جو میں بھی اب آپ سے چھپانا نہیں چاہتا کہ.... آپ کو جاننے کی.... خواہش میرے دل میں بھی کروٹیں لیتی رہی ہے بالخصوص لئیق شاہ کے حوالے سے۔''

لئیق شاہ کے ذکر پر بے اختیار بیگم صاحبہ کے حلق سے ایک دریدہ سی آہ خارج ہوگئی، پھر اپنی داستان غم سنانے کو ان کے لب وا ہوئے ہی تھے کہ اچانک اوپر کراڑے کے سرے کے پاس.... بالکل قریب بلند گاڑیوں کے انجنوں کی غراہٹیں ابھریں۔ پھر دروازے کھلنے کی دھمک کے ساتھ ہی مجھے ایک پرغیظ جوشیلی اور غصیلی آواز سنائی دی۔

''وہ دونوں ادھر ہی کہیں موجود ہیں۔ قدموں کے نشان کراڑے سے نیچے نہر کی طرف جا رہے ہیں۔ آگے بڑھو.... جلدی۔''

میں بری طرح ٹھٹک گیا۔ خطرے کو یوں اچانک سر پر منڈلاتا محسوس کر کے مجھے اپنی سانسیں تک رکتی محسوس ہونے لگی تھیں۔ پورے وجود میں جیسے چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ بیگم صاحبہ کا چہرہ بھی ڈھلے ہوئے لٹھے کی طرح سفید پڑ چکا تھا اور وہ حسرت و یاس کے ساتھ مجھے تکے جا رہی تھیں۔

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرضی محبت میں پروان پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

گول مال

مختار آزاد

زمین واقعی گول ہے... شمال کی سمت ملنے والا شخص کبھی کبھی مغرب کے کسی بھی کنارے پر ٹکرا جاتا ہے... ناقابلِ گرفت مجرموں کا عجیب و غریب ٹولا... جو بڑی صفائی سے اپنی کارکردگی اور مہارت کا ثبوت دے رہا تھا... قدیم تہذیبی نوادرات کے شوقین افراد کے لیے ایک یادگار مرقع تحریر... صورتِ حال کا حیرت انگیز بیان جسے پڑھنے کا تجربہ بھی انوکھا لگے گا...

منفرد کرداروں اور سراغ رسی کے متوالوں کے لیے ایک دلچسپ تحفہ...

پولیس افسر کائٹ کا موڈ خوشگوار ہونا چاہیے تھا۔ وہ ایک خوبصورت صبح تھی۔ آسمان بادلوں سے صاف اور موسم بھی نہایت دلکش تھا، خاص طور پر اس لیے بھی کہ اس روز سنیچر تھا اور ڈیوٹی سے اس کی چھٹی تھی۔

ویسے تو پولیس والوں کو بھی ہفتے میں دو چھٹیاں ملتی ہیں لیکن کائٹ جیسے پولیس افسروں کو ایسا ہفتہ کبھی کبھار ہی ملتا ہے کہ وہ سنیچر اور اتوار، لگاتار دو ہفتہ وار چھٹیاں کر سکیں۔ اسے اکثر سنیچر کو اپنے ان ساتھیوں کی جگہ ڈیوٹی دینا پڑتی تھی

جنہیں اچانک ویک اینڈ پر ہی ایسے ضروری کام یاد آ جاتے جس کے لیے گھر پر ہونا لازمی ہوتا ہے۔ کانٹ ساتھیوں کے کام آنے والے لوگوں میں سے تھا۔ یہی وجہ ہے وہ تو آرام سے ویک اینڈ مناتے لیکن بے چارہ کانٹ، ویک اینڈ اس کے لیے تو جیسے بنا ہی نہیں۔ بروِن کاؤنٹی پولیس ڈپارٹمنٹ میں سب ہی اچھی طرح جانتے تھے کہ ویک اینڈ پر ڈیوٹی لگنے تو ملبے کی بلا کس بندر کے سر باندھی جا سکتی ہے۔

بہرحال، کئی مہینوں بعد کانٹ ویک اینڈ منانے جا رہا تھا۔ موسم بھی جیسے اس کی خوشی پر خوش تھا۔ دن کا آغاز اچھے انداز سے ہونے جا رہا تھا۔ کھلی فضا میں موسم بہار کی تازہ ہوا سے اس کے مزاج پر بھی اچھا اثر پڑ رہا تھا۔ اس وقت وہ اپنی گرل فرینڈ نوئیل کے ساتھ تھا۔

نوئیل، ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ اسے تین چیزیں بہت پسند تھیں۔ کانٹ کا ساتھ، بے فکری سے گھومنا پھرنا اور جگہ جگہ رک کر ایسی چیزوں کی خریداری کے لیے دکان دار سے بھاؤ تاؤ کرنا جس کی اسے قطعی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔

نوئیل بہت خوبصورت تھی لیکن اس کی یہ عادت کانٹ کو سخت ناپسند تھی لیکن اس بات کا اظہار کبھی کیا نہیں تھا۔ کیونکہ وہ اس کی کسی بات سے انکار کرنے کی ہمت ہی نہیں رکھتا تھا۔ اسے خریداری کا جنون تھا لیکن بھاؤ تاؤ اتنا کرتی تھی کہ یا تو دکان دار زچ ہو کر اسے چیز بیچ دیتا تھا یا کبھی کبھار کانٹ اس کا ہاتھ کھینچ کر دکان سے دور لے جاتا۔ اکثر نوئیل کی اس بات سے وہ جھلا جاتا تھا لیکن اس سے پہلے کہ نوئیل اس بات کو محسوس کرے، سامنے کوئی اور دکان آ جاتی اور پھر کسی نئے دکان دار سے ازسرِ نو بحث کا مرحلہ شروع ہو جاتا۔

نوئیل کو خریداری اور کانٹ کو نوئیل پسند تھی۔ وہ اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ وہ دونوں گزشتہ شام سے ایک ساتھ تھے۔ کانٹ کی مصروف زندگی کے سبب ان کی زندگی میں ایسے لمحات کم ہی آتے تھے اسی لیے دونوں کی خواہش تھی کہ خوب گھوم پھر کر مزے کریں۔

بروِن کاؤنٹی، کیلی فورنیا کی ایک خوبصورت وادی کا چھوٹا سا شہر تھا۔ یہاں آنے والوں کی زیادہ تر تعداد مختلف دوسرے علاقوں کے سیاحوں پر مشتمل ہوتی تھی۔ کاؤنٹی کے مرکز میں تفریحی مراکز اور... بڑے شاپنگ اسٹورز کے ساتھ ساتھ چھوٹی چھوٹی دکانیں بھی تھیں لیکن ہفتہ اور اتوار کی تعطیلات کے باعث بند رہتے البتہ ویک اینڈ پر بروِن کاؤنٹی کے تجارتی حصے میں چھوٹے چھوٹے کیبن فروشوں اور اسٹالز کے سبب میلے کا سماں ہو جاتا تھا۔

بروِن کاؤنٹی میں سیاحوں کی آمد کے پیشِ نظر تحائف اور نوادرات کی کئی دکانیں تھیں مگر سنیچر اور اتوار کو وہ بھی بند رہتی تھیں۔ البتہ ویک اینڈ پر آنے والوں کے لیے کئی ایسے نیلام گھر ضرور موجود تھے جو صرف ہفتے کے انہی دو دنوں کھلے رہتے۔ یہ صرف نام کے نیلام گھر تھے، وہاں فروخت ہونے والی اشیا نیلام عام کے بجائے عموماً بھاؤ تاؤ سے ہی بکتی تھیں۔

اگر آپ کے پاس ایسا کچھ ہو جس میں کسی کو دلچسپی ہو سکتی ہے اور پھر آپ اسے بیچنا بھی چاہتے ہو تو ان نیلام گھروں میں سے کسی ایک کے کرتا دھرتا سے بات کرو، چیز کی قیمت لگاؤ، اُن سے فروخت کا کمیشن طے کرو اور شام کو حساب کرلو۔

صبح کے دس بج کر دس منٹ ہو رہے تھے۔ گھومتے گھماتے وہ دونوں بھی ایک نیلام گھر کے سامنے پہنچ گئے۔ بس! پھر کیا تھا، نوئیل کا دل مچل گیا اور کانٹ کی مجال تھی کہ جو انکار کر سکے۔ اب دونوں بولی دہندگان کے چھوٹے سے ہجوم میں کھڑے تھے۔ وہ تقریباً تیس لوگ تھے جو اس چھوٹے سے بنگلے کے سامنے کھڑے دروازہ کھلنے کا انتظار کر رہے تھے، جہاں پر لگے بینر کے مطابق کچھ 'خاص نوادرات' کی فروخت شروع ہونے والی تھی۔

سب ہی لوگ سکون سے اپنی اپنی جگہ کھڑے تھے ماسوائے کانٹ کے جو گہری گہری سانسیں لے کر اپنے اندر کی بے چینی چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے پیچھے کھڑا شخص اُس سے بھی زیادہ بے چین دکھائی دے رہا تھا۔ جس طرح وہ تیز تیز اور اونچی آواز میں بول رہا تھا، اس سے کانٹ کو خاصی تکلیف ہو رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا... جیسے اس کے الفاظ تیر کی طرح اس کے کانوں میں گھس رہے ہوں۔ شکایتی لب و لہجے والا ادھیڑ عمر شخص اونچی آواز میں نیلام گھر کی برائیاں جس انداز میں اپنی بیوی کو گنوا رہا تھا، وہ وہی کچھ تھا جو کانٹ سوچ رہا تھا:

''ہم تو خوامخواہ ہی یہاں کھڑے ہو کر اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں، جانتی ہو کیوں؟'' اس نے اپنی بیوی سے سوال کیا اور جواب کا انتظار کیے بنا خود ہی شروع ہو گیا۔ ''آج کل انٹرنیٹ کی آکشن ویب سائٹ پر سب کچھ پہلے سے ہی نیلام ہو چکا ہوتا ہے، یہ تو بس دکھاوا ہے۔ تم سمجھتی ہی نہیں کہ یہ سب ایجنٹوں کا کیا دھرا ہوتا ہے۔ انہیں پتا ہے کہ ویب سائٹ پر بولی لگ چکی۔ اب اگر یہاں کوئی بکرا پھنس گیا تو ٹھیک ورنہ ویب سائٹ پر لگی بولی تو ہے ہی۔ ہم تو

یہاں صرف بے وقوف بن کر تماشا بنے جا رہے ہیں اور تم سمجھ رہی ہو کہ ہم تماشا دیکھنے والے ہیں لیکن بات اس کے اُلٹ ہے۔'' بے تکان بولنے سے اس کی سانس پھولنے لگی تھی لیکن اس کی بیوی پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔

وہ اکھڑی سانسیں درست کرنے کو لمحہ بھر کے لیے چُپ ہوا تو کانٹ نے بھی سکون کی سانس لی۔ وہ اس کی بات سے سو فیصد متفق تھا لیکن نوئیل کا کیا کرتا۔ اس شخص کی بیوی کی طرح، اُسے بھی کوئی طاقت یہاں کھڑے ہونے سے روک نہیں سکتی تھی۔ یہاں آنے والے زیادہ تر نوادرات جمع کرنے کے شوقین یا سیاح لگ رہے تھے مگر نوئیل ان سے مختلف تھی۔ اسے بھاؤ تاؤ کا چسکا ہی یہاں روکے کھڑا تھا۔

کانٹ نے ایک نظر پیچھے کھڑے جوڑے پر ڈالی اور پھر نوئیل کو متوجہ کرنے کے لیے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ نوئیل نے مسکرا کے اسے دیکھا۔ اس دلکش مسکراہٹ کے بعد کانٹ میں اتنی ہمت ہی کہاں رہی کہ اپنی بات کہتا۔ اس نے گہری سانس لی اور اضطرابی کیفیت میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

''میں تو سمجھ ہی نہیں سکا کہ آخر تمہیں اس نیلام گھر میں ایسی کیا خاص بات نظر آ رہی ہے جو اس ہجوم میں آ کر کھڑی ہو گئی ہو۔'' کچھ دیر کے توقف کے بعد وہ شخص ایک بار پھر شروع ہو چکا تھا۔ کانٹ نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی بیوی سنی ان سنی کیے کھڑی تھی۔ ''دیکھ نہیں رہی ہو یہاں کتنے سارے لوگ کھڑے ہیں۔ اتنے ہجوم میں رہنے سے تو انسان کا دم گھٹنے لگتا ہے، سارا سکون غارت ہو سکتا ہے۔ جب اتنے سارے لوگ اطراف میں ہوں تو خدانخواستہ کوئی بھگدڑ بھی مچ سکتی ہے، جس کے دوران کسی دوسرے کا پاؤں تمہارا پاؤں کچل سکتا ہے۔'' جب نیلام گھر کی برائیاں اپنا کام نہ دکھا سکیں تو اس نے پینترا بدلا لیکن اس عورت کے چہرے پر چھائے اطمینان کو دیکھ کر یہ نہیں لگتا تھا کہ وہ اپنے شوہر کی ان باتوں پر ذرّہ برابر بھی دھیان دے رہی ہوگی مگر اس کے باوجود وہ شخص ہار ماننے پر تیار نہ تھا۔ مستقل مزاجی سے اپنی ہی کہے جا رہا تھا۔

کانٹ نے گہری سانس لی اور نوئیل کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کی لہردار سنہری زلفیں ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے لہرا رہی تھیں، جنہیں دیکھ کر کانٹ کے پیار کا سمندر فرطِ محبت سے موجیں مارنے لگا۔

دوسری طرف، اس کے پیچھے کھڑا شخص خاموش تھا اور شاید یہ سوچ رہا ہوگا کہ اب کیا طریقہ اختیار کرے۔ اسی دوران اس نے بیوی کو متوجہ کرنے کی خاطر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''میرے خیال میں تمہیں میری بات دھیان سے سننی چاہیے۔ یہ مالی معاملہ ہے اور یہاں پیسا خرچ کرنا سراسر گھاٹے کا سودا۔ ہم اتنے مال دار نہیں کہ خوامخواہ محنت کی کمائی یوں لٹاتے پھریں۔''

یہ سن کر کانٹ مسکرایا اور ایک بار پھر گردن گھما کر ان کی طرف دیکھا۔ اب اسے اتفاق کہیں کہ اسی لمحے اچانک صورتِ حال بدل گئی۔ وہ شخص مزید کچھ کہنے والا تھا کہ اسے نہ جانے کیا ہوا، وہ مڑا اور اس کے ساتھ ہی معاملے نے باتوں کے بجائے لات گھونسے کی شکل اختیار کر لی۔ اس کے پیچھے کھڑا شخص یا تو اس کی بک بک سنتے سنتے تنگ آ گیا تھا یا پھر وہ نیلام گھر والوں کا آدمی تھا جو گاہکوں کو خراب کرنے پر بھڑک گیا تھا۔ اس نے ایک زوردار گھونسا اس کی پیٹھ میں مارا۔ ادھیڑ عمر شخص نے زوردار چیخ ماری اور دُہرا ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ کانٹ کچھ سمجھ پاتا، اس شخص نے پیچھے سے ایک لات اس کی کمر میں رسید کی اور پھر اگلے ہی لمحے دوڑ لگا دی...... چند سیکنڈ میں یہ سارا واقعہ رونما ہو چکا تھا۔ بوڑھے کی چیخ سے ذرا دیر کے لیے وہاں موجود لوگوں میں کھلبلی مچ گئی لیکن اس سے پہلے کہ معاملہ ہاتھ سے نکلتا، وہ عورت شوہر کو گھسیٹتے ہوئے اس جگہ سے دور لے گئی۔ کانٹ ہنس پڑا۔ سوچ رہا تھا کہ شاید وہ خود بھی یہی چاہتا ہوگا۔ جو بات اس کی بیوی کے دماغ پر اثر نہ کر سکی، شاید وہ دوسرے کے کانوں پر ضرور اپنا اثر ثبت کر گئی۔

اگرچہ کانٹ اس ادھیڑ عمر مرد کی باتوں سے سو فیصد متفق تھا لیکن سچ یہ ہے کہ وہ چاہنے کے باوجود نوئیل کو اُس کی طرح کی باتیں کر کے نیلامی میں حصہ لینے سے بدظن نہیں کر سکتا تھا۔ ''صرف ایک لات، ایک گھونسا اور کئی سو ڈالر کی بچت... واہ واہ کیا عمدہ ترکیب ہے۔'' کانٹ نے خود کلامی کی۔ وہ دل ہی دل میں اُس مرد کو داد دیے جا رہا تھا۔ وہ خود بھی یہی سمجھتا تھا کہ مرد کی محنت کی کمائی کو پانی کی طرح بہانے کی ذمے دار یہی عورتیں ہیں۔ اکثر نوئیل کی فضول خرچی دیکھ کر وہ یہی کچھ سوچتا تھا مگر اُس کے منہ پر یہ سب کچھ کہنے کی ہمت اس میں نہ تھی۔ وہ واقعی سچے دل سے نوئیل کا پجاری تھا۔

کانٹ قانون پسند شہری اور ذمے دار پولیس افسر تھا۔ اگر چاہتا تو ڈیوٹی پر نہ ہونے کے باوجود لات اور گھونسا مارنے والے کو دوڑ کر گرفتار کر سکتا تھا لیکن اس وقت اسے قانون اور فرض سے زیادہ نوئیل کا ساتھ پسند تھا۔

دو چار منٹ تک لوگ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کھسر پھسر

کرتے رہے مگر رفتہ رفتہ سب پہلے جیسا ہوگیا۔ اسی دوران میں آگے کھڑا شخص کھسک کر ایک طرف ہوا تو اس نے قدم آگے بڑھایا اور لوئیل کے برابر جا کر کھڑا ہوگیا۔ اس کا بازو اس کی گردن کے گرد حمائل تھا۔ اس نے بھی اپنا سر کائٹ کے شانے سے ٹکا دیا۔ وہ ان خوشگوار لمحات کا بھرپور لطف اٹھانے کے موڈ میں تھا۔

نیلام گھر کھلنے کے منتظر لوگوں میں دو بہنیں، نینا اور مونا بھی شامل تھیں۔ یہاں موجود لوگوں کی اکثریت ادھیڑ عمر جوڑوں پر مشتمل تھی لیکن اُن کے مقابلے میں وہ دونوں خاصی کم عمر اور حسین تھیں۔ وہ صبح ساڑھے نو بجے سے یہاں کھڑی تھیں۔

کائٹ نے ایک نظر ان دونوں پر ڈالی۔ وہ خاصی کم عمر اور خوبصورت تھیں اور یہاں موجود بوڑھی عورتوں کے درمیان ان دونوں پر صرف اندھے مرد کی نظر ہی نہیں پڑ سکتی تھی۔ دونوں ہجوم میں نمایاں تھیں اور شاید اپنے حُسن کے راز سے اچھی طرح واقف بھی تھیں۔ انہیں یقین تھا کہ دروازہ کھلنے کے بعد وہ شاید سب سے پہلے تو نہیں لیکن پھر بھی اپنی باری سے پہلے ہی اندر داخل ہو سکیں گی۔ ان کے چہرے پر اعتماد اور بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے حُسن کے جلوے عام کرنے کے اعلان کو کائٹ نے بھی بھانپ لیا تھا۔ آخر کو وہ پولیس والے کے ساتھ ساتھ ایک مرد بھی تھا۔

ساڑھے گیارہ بجے دروازہ کھلا۔ کائٹ کی توقع کے عین مطابق اور نیلام گھر پر لگے بینر پر لکھے اعلان کے برعکس، قطار کے بجائے وہاں کھڑے لوگ ایک دوسرے کو ہلکا سا دھکیلتے ہوئے، آگے پیچھے اندر داخل ہوگئے۔ گھر خاصا بڑا تھا لیکن نیلامی کی اشیا جس کمرے میں رکھی تھیں وہ اتنا بڑا نہ تھا کہ جہاں تیس چالیس لوگوں کی ایک ساتھ موجودگی کے باوجود ہجوم کا احساس باقی نہ رہے۔

وہ دونوں بہنیں سب سے پہلے اندر داخل ہوئی تھیں۔ لوئیل اور کائٹ کو کوئی خاص جلدی نہیں تھی۔ ویسے بھی وہ تو تفریح کے لیے نکلے تھے۔ خریداری کے لیے بھاؤ تاؤ لوئیل کے لیے بھی ضرورت سے زیادہ ایک شوق تھا۔ اس لیے دوسروں کی نسبت انہیں وقت گزرنے کی کوئی خاص فکر نہ تھی۔

نینا اور مونا نیلامی کے لیے بچی چیزوں کو اچھی طرح دیکھنے کے بعد کمرے کے وسط میں رکھی ڈائننگ ٹیبل کے بالکل قریب کھڑی تھیں۔ ان میں سے ایک کا ہاتھ اس پر ٹکا ہوا تھا۔ ڈائننگ ٹیبل کا ڈیزائن بھی وکٹورین طرز کا تھا مگر وہ قابلِ فروخت نہ تھی۔ اسی پر نیلامی کے لیے پیش کیے جانے والا چاندی کا کٹلری اور کینڈل سیٹ بھی رکھا تھا۔ وہ دونوں وکٹورین عہد کے لگ رہے تھے۔ دونوں لڑکیاں نظریں گھما گھما کر ایک ایک چیز کا گہری نگاہوں سے جائزہ لے رہی تھیں۔ اس وقت ہال میں زیادہ تر لوگ کتابوں، جیولری اور اسی طرح کی دیگر چیزوں کو دیکھنے میں محو تھے۔

کائٹ نے ایک چکر ہال کا لگایا اور پلٹ کر دروازے کے قریب آکر کھڑا ہوگیا۔ اسے نوادرات میں نہیں بلکہ صرف لوئیل میں دلچسپی تھی جو جیولری والے کارنر کی طرف تھی۔ وہ اطراف پر طائرانہ نظریں دوڑاتے ہوئے ٹائم پاس کرنے میں مگن تھا۔ اسی دوران میں اس کی نظر ان دونوں خوبرو لڑکیوں پر پڑی۔ نہ جانے کیوں کائٹ کو ان میں دلچسپی محسوس ہونے لگی۔ اس وقت مونا ڈائننگ ٹیبل کے قریب کھڑی تھی جب کہ اس کے برابر کھڑی نینا بے اعتنائی سے بالوں میں برش کرتے ہوئے ادھر اُدھر اچٹتی نظریں ڈال رہی تھی۔ اس وقت ڈائننگ ٹیبل پر رکھے ان نوادرات میں بظاہر کسی کی کوئی خاص دلچسپی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ شاید اس کی وجہ وہ چٹ ہو، جس پر لکھا تھا: قیمت نو سو پچاس ڈالر۔ نینا کے بائیں شانے سے بنا زپ کا بڑا سا بیگ لٹک رہا تھا جو اس کی بہن کے داہنے شانے سے ٹکرا رہا تھا۔ انہیں مناسب موقع محل کا انتظار تھا لیکن یہ بات وہاں موجود کسی شخص کے علم میں نہ تھی۔ نیلام گھر کے سیلز مین بھی اسی طرف تھے، جہاں ممکنہ خریداروں رش تھا۔

مونا پُرسکون کھڑی تھی۔ اس کا ہاتھ غیر محسوس انداز میں آگے بڑھتا ہوا سامان کے قریب پہنچ چکا تھا۔ وہ واردات کے لیے تیار تھی۔ بس اسے سگنل کا انتظار تھا۔

''کائٹ...'' اس دوران لوئیل نے آہستہ سے اسے پکار کر ہاتھ کے اشارے سے قریب بلایا۔ وہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھا۔

میدان صاف تھا۔ ''ہاں، تیار ہو جاؤ۔'' نینا نے آہستہ سے کہا۔

یہ سنتے ہی مونا مستعد ہوگئی۔

اگلے ہی لمحے مونا نے سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔ سگنل ملتے ہی اُس نے غیر محسوس انداز میں بہن کے بیگ کو جھٹکا دیا۔ وہ ذرا سا پھسلا لیکن اس کے مڑے بازو کی کہنی تک پہنچ کر رک گیا۔ دوسرے ہی لمحے مونا نے نہایت تیزی سے میز پر رکھا چاندی کا کینڈل اور کٹلری سیٹ اٹھا کر اس کے بیگ میں ڈال دیا۔ سب کچھ نہایت تیزی سے ہوا تھا۔ کوئی بھی دیکھ نہ سکا مگر واردات ہو چکی تھی۔ تین چار سیکنڈ میں ہاتھ کی صفائی دکھائی جا چکی تھی۔

اس کے فوراً بعد نینا نے بہن کا بازو پکڑا اور اونچی آواز میں یہ کہتے ہوئے مڑی۔ ''یہاں کچھ خاص نہیں، چلو کسی اور نیلامی میں چلتے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ پُراعتماد قدموں سے آگے بڑھتے ہوئے، لوگوں کے درمیان سے نکل کر دروازے کی طرف بڑھنے لگیں۔ اس دوران میں کائٹ ایک بار پھر واپس دروازے کے پاس آکر کھڑا ہو چکا تھا۔ وہ اس کے قریب پہنچیں تو کائٹ نے مسکراتے ہوئے ان حسیناؤں کے لیے دروازہ کھولا۔

نیلام گھر میں کھڑا رالف نہایت اچھے موڈ میں تھا۔ اس نے اصلی پرل کا نہایت خوبصورت اور قدیم شاہی طرز پر بنا نیکلس خریدا تھا۔ وہ واقعی بیش قیمت نوادرات میں شامل کیے جانے کے لائق تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس کے اصل مالک کو ضرور یہ ورثے میں ملا ہوگا۔ یہ اس بات کا بھی ثبوت تھا کہ اس کا مالک کوئی مرد ہی ہوگا اور وہ بھی بدذوق تبھی اتنا عمدہ نیکلس نیلام گھر میں پہنچا ورنہ کوئی عورت اسے خود سے جدا کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

کاؤنٹر پر پہنچ کر رالف نے بٹوا نکالا، جس میں پچاس پچاس ڈالر کے کڑکتے نوٹ رکھے تھے۔ اس نے دو سو ڈالر نکال کر کیش کلرک کو تھمائے، رسید لی اور بٹوا جیب میں رکھتے ہوئے باہر نکل گیا۔ وہ سڑک کے اُس زیریں حصے کی طرف بڑھ رہا تھا، جہاں اس کی کار کھڑی تھی۔ یہاں آنے والے رش سے بچنے کے لیے اکثر گاڑی کچھ فاصلے پر، سڑک کے کھلے حصے کی طرف کھڑی کر دیتے تھے۔

''ارے نہیں، پریشان مت ہو، وہ پہلے ہی کمرا سربہ مہر کر چکے تھے، انہیں کچھ نہیں پتا چلے گا۔'' رالف پارکنگ کے قریب پہنچا تو اس کے کانوں سے مردانہ آواز ٹکرائی۔ وہاں قریب میں کوئی نہ تھا۔ اس نے تجسس سے اِردگرد دیکھا۔ آواز سامنے کھڑی نیلے رنگ کی برانڈ نیو کار سے آئی تھی۔ اس نے غور سے دیکھا۔ کار کے شیشے اترے ہوئے تھے اور اندر دو افراد آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

''لیکن مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' یہ آواز زنانہ تھی۔

یہ سن کر آگے بڑھتے رالف کے قدم جہاں تھے، وہیں رک گئے۔ اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔ وہ انہیں دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ان کی عمریں بیس سے پچیس سال کے درمیان لگ رہی تھیں۔ چہرے مہرے سے وہ دونوں ایشیائی لگ رہے تھے، غالباً

جاپانی یا پھر چینی۔ مرد ڈرائیونگ سیٹ پر تھا جبکہ عورت پچھلی نشست پر بیٹھی تھی۔

رالف کی کار ان سے آگے کھڑی تھی۔ اس نے دو چار قدم اٹھائے تو ان کے قریب پہنچ گیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا نوجوان اسٹیئرنگ پر ایک نقشہ پھیلائے بیٹھا تھا۔ ڈیش بورڈ پر اس کا ڈرائیونگ لائسنس، سگریٹ کی ڈبیا اور لائٹر رکھے تھے۔ اس نے پچھلی نشست پر نظر ڈالی۔ وہاں 'جاپانی ہنڈی کرافٹس' نامی کتاب کی کئی جلدیں رکھی تھیں۔ اس کے ساتھ ایک نہایت خوبصورت چھوٹا سا سنگی مجسمہ بھی تھا۔ اسے نوادرات سے دلچسپی تھی اور جہازی سائز کی کتاب کے سرورق پر بڑے بڑے حروف میں لکھے عنوان نے اس کی پوری توجہ اپنی طرف مبذول کرا لی تھی۔

''ہیلو...'' کار کے قریب پہنچ کر اس نے پچھلی سیٹ پر نظر ڈالی۔ اس وقت نوجوان عورت مجسمہ ہاتھ میں لیے اسے دیکھنے میں مصروف تھی۔ ''کتنے کی ہے یہ کتاب...'' یہ کہتے ہوئے وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے نوجوان کی طرف بڑھا۔ ڈیش بورڈ پر بھی اس کتاب کی ایک جلد رکھی تھی۔

''پانچ ڈالر...'' نوجوان نے رکھائی سے جواب دیا۔

''بہت عمدہ کتاب ہے۔'' پچھلی نشست سے آواز آئی تو رالف نے مڑ کر دیکھا۔ اس کا خیال درست نکلا۔ وہ بیضوی آنکھوں والی پتلی دبلی ایشیائی لڑکی تھی، جاپانی یا شاید چینی۔ ''یہ کتاب پہلی بار انیسویں صدی میں شائع ہوئی تھی — بڑی نایاب کتاب ہے۔ بس ہمیں بھی اتفاق سے اس کی کچھ جلدیں ملی ہیں۔'' اس عورت نے غیر ملکی لہجے میں انگریزی بولتے ہوئے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

''واقعی...'' یہ بات سنتے ہی اس کی آنکھوں میں چمک اتر آئی۔ ''میں ایک نظر اسے دیکھ سکتا ہوں۔'' رالف نے ڈرائیونگ سیٹ کی طرف منہ کرکے، کتاب کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے دوستانہ لہجے میں کہا۔

یہ سن کر نوجوان نے اسے گھورا۔

''چاہو تو میں اسے خرید بھی سکتا ہوں۔''

''نادر کتاب ہے۔''

''وہ تو لگتا ہے، فروخت پر مالک نے تمہیں کتنے کمیشن کی پیشکش کی ہوگی؟'' رالف نے بنا سوچے سمجھے سوال کر دیا۔

''خریدنا ہے تو پھر دکھا سکتا ہوں۔''

رالف نے اثبات میں سر ہلایا۔

نوجوان نے ڈیش بورڈ کی طرف ہاتھ بڑھایا اور کتاب اٹھا کر اس کی طرف اچھالی۔ لمحہ بھر کے لیے اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے کتاب پکڑلی۔

"ایک بات ہے..." رالف نے کتاب کے اوراق پر نظر ڈالی۔

"وہ کیا..." نوجوان نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"لمبا ہاتھ مار کر نکلے ہو۔"

"کیا بک رہے ہو۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ہاتھ بڑھا کر کتاب اس کے ہاتھوں سے جھپٹی اور اگنیشن میں چابی گھمائی۔ اس سے پہلے کہ وہ کار اسٹارٹ کرکے آگے بڑھتا، رالف نے دروازے کے ہینڈل کو تھام لیا۔ "بھاگنے کی کوشش فضول ہے۔ میں سب کچھ بالکل ٹھیک ٹھیک سمجھ چکا ہوں۔" اس کے لبوں پر خباثت بھری مسکراہٹ طاری تھی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا..." نوجوان نے حیرانی سے کہا۔

"تم غیر ملکی ہو اور جس کرائے کے گھر میں رہتے ہو، اس کے سربہ مہر کمرے میں رکھے نوادرات کو تم نے چرایا ہے۔"

"وہ کیا بکواس ہے۔"

"میں ڈیش بورڈ پر تمہارا ڈرائیونگ لائسنس اور اس پر لکھے نمبر کو دیکھ چکا ہوں۔ اب شہر سے تمہارا فرار ممکن نہیں۔"

"کیا..." یہ کہتے ہوئے اس نے گردن گھمائی اور جھپٹ کر لائسنس شرٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ وہ چہرے سے خوف زدہ نظر آرہا تھا۔ لڑکی بھی پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"اب کوئی فائدہ نہیں، تمہاری کار کا نمبر میں دیکھ چکا ہوں اور میری یادداشت بہت اچھی ہے۔" وہ بدستور مسکرا رہا تھا۔

"میں نہیں جانتا تم کیا فضول بکواس کررہے ہو۔" نوجوان غرایا۔ "میری کار سے دور ہٹو ورنہ..." اس کا لہجہ دھمکی آمیز تھا۔ ایکسیلریٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھا تو وہ غرایا۔

رالف نے سنی ان سنی کردی۔

"دور ہٹو یہاں سے، دفع ہوجاؤ۔" پچھلی نشست پر بیٹھی لڑکی بھی چلائی۔

"بکواس تم دونوں کررہے ہو، میں تمہیں پہچان چکا ہوں مسٹر۔" اس بار رالف کا لہجہ بھی دھمکی آمیز تھا۔

"اوکے..." یکدم نوجوان کا لہجہ نرم پڑگیا۔ "تم چاہتے کیا ہو..."

"یہ ہوئی نا بات..." رالف نے جواب دیا۔

"بکواس بند کرو، صاف صاف یہ بتاؤ تم چاہتے کیا ہو۔" اس بار لڑکی نے متوحش آواز میں پوچھا۔

"کچھ خاص نہیں اور کچھ زیادہ بھی نہیں۔" رالف کا انداز عادی مجرموں جیسا تھا۔

"اگر ہم تمہیں بیس ڈالر پیش کریں تو جو کچھ تم دیکھ یا جان چکے ہو، کیا اسے فراموش کردو گے۔" نوجوان کا لہجہ سوالیہ تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ اچانک پڑنے والی اس افتاد سے نمٹنے کے لیے سودے بازی پر اتر آیا تھا۔

"اب بات بن رہی ہے..." رالف کا لہجہ بھی نرم پڑ گیا۔ "تمہاری کار کی پچھلی نشست پر جو سامان رکھا ہے، ان کا شمار نوادرات میں ہوتا ہے اور میں پہلی ہی نظر میں بھانپ چکا تھا کہ اس کی قیمت کافی ہے..."

"تم چاہتے کیا ہو؟"

"مسٹر پال تم نے بیس ڈالر کی بات کی ویسے پچیس سو ڈالر کے بارے میں کیا خیال ہے۔" رالف کے لبوں پر مکارانہ مسکراہٹ طاری تھی۔

"اُف..." نوجوان نے ہنکارا بھر کر کہا۔ "ہمارے پاس اس وقت وہ ڈھائی سو ڈالر ہیں اگر اچھا گاہک مل گیا تو پھر تمہاری بات پر سوچ سکتا ہوں۔"

"جو کچھ تم پار کرچکے، میرا مطالبہ اس کی قیمت کا نصف ہے یعنی..." یہ کہہ کر رالف مسکرایا۔ "ففٹی ففٹی۔"

"مگر میں بتاچکا ہوں کہ ہمارے پاس تمہیں دینے کے لیے اس وقت پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔" نوجوان کے لہجے سے بے بسی ظاہر ہورہی تھی۔

"یہ تو بہت بری بات ہوئی۔" رالف نے منہ بنا کر کہا۔ اس کا دماغ تیزی سے چل رہا تھا۔ وہ اس وقت پکے ٹھگوں کی طرح سوچ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اسے یہ نوادرات مل جائیں تو چاندی ہوسکتی ہے۔ اسے امید تھی کہ انہیں بیچ کر اتنی رقم ضرور ملے گی کہ وہ کئی ہفتوں تک بلاناغہ نیلام گھر میں نوادرات کی نیلامی میں جاسکے گا اور ساتھ ساتھ اپنا کام بھی آسانی سے کرتا رہے گا۔ ویسے بھی وہ نوادرات کا شوقین نہیں بلکہ یہ سلسلہ تو اس کی روزی روٹی کا تھا۔ اچانک

اس کے دل میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا۔ "اس مسئلے کا ایک حل ہے میرے پاس، دونوں کا کام بن جائے گا۔"

"وہ کیا..." نوجوان نے جلدی سے پوچھا۔

"تمہارے پاس موجود ان کتابوں اور نوادراتی مجسموں کی قیمت پانچ ہزار ڈالر کے قریب ہوگی۔" رالف نے شہادت کی انگلی سے کنپٹی دباتے ہوئے کاروباری لب و لہجے میں کہا۔ "اگر ایسا ہے تو تمہارے بنے پچیس سو ڈالر میرا حصہ نکال کر۔"

"شاید..." نوجوان نے آہستگی سے کہا۔

"تو پھر ٹھیک ہے، میں انہیں تم سے خرید لیتا ہوں۔"

"کیا..." یہ سن کر نوجوان خاصا خوش دکھائی دے رہا تھا۔ "بہت خوب، تو نکالو پچیس سو ڈالر۔"

"اوکے..." یہ کہہ رالف نے بٹوا نکالا اور پچاس، پچاس ڈالر پر مشتمل چھوٹی سی گڈی نکال کر نوٹ گننے لگا۔ "اوہ..." اس نے نوٹ گننے کے بعد نوجوان کی طرف دیکھا۔ اس کا لہجہ افسردہ تھا۔

"اب کیا ہوا۔" اس نے پریشانی کے عالم میں پوچھا۔

"افسوس... میرے پاس صرف ساڑھے پانچ سو ڈالر ہیں۔ پچاس میں رکھتا ہوں اپنی فوری ضروریات کے لیے اور باقی بچے پانچ سو..."

"لیکن یہ تو بہت کم ہیں۔" نوجوان کے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔

"کیا کروں..." رالف نے بے نیازی سے جواب دیا۔ "اب میرے پاس تو اتنی ہی رقم ہے، لینا ہے تو لو ورنہ اپنا راستہ ناپو۔"

"کیا بکواس ہے..." نوجوان غصے سے چلایا۔

"زیادہ مت چلاؤ..." یہ سن کر رالف نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ "جانے سے پہلے یہ ضرور سوچ لینا کہ میں تمہارا ڈرائیونگ لائسنس اور کار، دونوں کا نمبر دیکھ چکا ہوں اور میری یادداشت بہت اچھی ہے مسٹر چور..."

"تم چاہتے کیا ہو؟" نوجوان نے بے بسی سے اسے دیکھا۔

"تمہارے پاس جو یہ سامان ہے، اسے خریدنا یا پھر میرے پچیس سو ڈالر..."

"پورے پیسے دو یا پھر دفع ہوجاؤ..." نوجوان چلایا۔

مسکرائیے

جج: "تم شہر کے بیچوں بیچ اتنی تیز رفتاری سے کار کیوں چلا رہے تھے؟"

ملزم: "جناب میری کار کے بریک نہیں اور میں چاہتا تھا کہ کوئی حادثہ ہونے سے پہلے پہلے گھر پہنچ جاؤں۔"

☆☆☆

"میرے دادا کان سے پیانو بجاتے ہیں۔"

"یہ تو کچھ بھی نہیں، میرے نانا داڑھی سے وائلن بجا لیتے ہیں۔"

☆☆☆

"کیا تمہاری گھڑی ٹائم بتاتی ہے؟"

"نہیں جناب [illegible]"

☆☆☆

"میرے پاس تین [illegible] ایک [illegible] لیے، دوسری [illegible] کے لیے اور تیسری ان دونوں کو [illegible] کرنے کے لیے۔"

☆☆☆

"جب کسی کھلاڑی کی نظر کمزور ہوجائے تو وہ کیا کرتا ہے؟"

"اسے امپائر بنا دیا جاتا ہے۔"

☆☆☆

"اگر شیکسپیئر آج زندہ ہوتا تو غیر معمولی اہمیت کا شخص ہوتا؟"

"ہاں، اس وقت اس کی عمر کم از کم چار سو برس ہوتی۔"

افتخار حسین اعوان مظفر آباد، آزاد کشمیر

"بہت خوب، چلا جاتا ہوں مگر یاد رکھنا..." بات ادھوری چھوڑ کر رالف نے خباثت بھری نگاہوں سے اسے گھورا۔ "میں یہاں سے گھر نہیں بلکہ سیدھا پولیس اسٹیشن جاؤں گا۔ یہ امریکا ہے مجرم کا بھاگ جانا یہاں اب اتنا آسان نہیں۔"

"تم مجھے دھمکیاں دے رہے ہو؟"

"بالکل نہیں..." رالف نے جلدی سے کہا۔ "میں تو گاہک بھی ہوں اور رقم میں حصے دار بھی، بس اسی لیے سمجھا دیا

تھا۔"

"حصے دار ہو تو پوری رقم نکالو ورنہ چلتے بنو۔"

"میں تیار تھا پر اب ذرا مجبوری ہے..." یہ کہہ کر رالف نے نوٹ ہوا میں لہرائے۔ "میرے پاس تو صرف یہی پانچ سو ڈالر ہیں۔"

"کیا مصیبت ہے یہ منحوس..." پچھلی نشست پر بیٹھی لڑکی بڑبڑائی اور اپنے ساتھی کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ مڑا تو اس نے ایک مجسمہ اور کتاب اس کی طرف بڑھائی۔ "یہ اسے دے دو اور کہو ہمارا پیچھا چھوڑ دے۔" رالف یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ لڑکی نے اس کی طرف دیکھا۔ "میں نہیں چاہتی کہ کوئی ہماری کار کے نیچے کچل کر مارا جائے۔"

بظاہر یہ بات اس لڑکی نے اپنے ساتھی سے کہی تھی لیکن اس کا اصل مخاطب کون تھا، یہ رالف سمجھ چکا تھا۔ یہ سن کر اس کے بھی کان کھڑے ہوگئے۔ اس نے بھی عافیت اسی میں سمجھی کہ بھاگتے چور کی لنگوٹی پکڑ لے۔ سو اس نے ایسا ہی کیا لیکن جیسے ہی اس نے کتاب اور مجسمہ پکڑا نوجوان نے ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھ سے نوٹ اچک لیے۔ اس سے پہلے کہ رالف کچھ سمجھتا کار ایک زناٹے سے آگے بڑھی اور دیکھتے ہی دیکھتے نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔

"کچھ چور تھے، ورنہ میں کہاں اس کا لائسنس نمبر دیکھ سکا تھا۔ کچھ نہ ہوتے تو... ایک ٹھگنے پر تہ لٹتے یہ لٹیرے۔" اس کے ہاتھوں میں مجسمہ اور کتاب تھی۔ اسے یقین تھا کہ یہ بھی چار پانچ سو ڈالر سے تو کم پر نہیں بکے گی۔ پرنٹ لائن پر لکھی تاریخ کے مطابق، انیسویں صدی میں شائع شدہ کتاب اتنی سستی تو نہیں ہوسکتی تھی۔ یہ سوچ کر وہ ایک بار پھر خباثت بھرے انداز میں مسکرایا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ یہ کتاب کا نقلی ایڈیشن ہے جو ہوبہو اصل کی حالت پر چھاپا گیا تھا۔ وہ کتاب کا جائزہ لینے لگا اور پھر اس کے ہوش اڑ گئے۔ پس ورق پر نہایت باریک حروف میں لکھا تھا: "یہ اصل کتاب کی ہوبہو نقل ہے، جسے پرانے طریقوں کے مطابق چھاپا گیا۔" اس نے گھبرا کر مجسمہ دیکھا۔ اس کے نیچے باریک حروف میں کندہ تھا: "ڈین چنگ، چائنا ٹاؤن، یو ایس اے۔"

"اوہ میرے خدا، میں لٹ گیا۔" یہ کہہ کر اس نے ڈرائیونگ سیٹ کی پشت سے سر ٹکا لیا۔ "میرے پانچ سو ڈالر..." اب اسے اپنی رقم کا غم کھائے جا رہا تھا۔ اچانک اسے ایک خیال سوجھا۔ اس نے کار اسٹارٹ کی اور اس جوڑے کی تلاش میں لگ گیا۔ اسے رقم واپس ملنے کا یقین تو نہ تھا لیکن پھر بھی موہوم امید کے سہارے وہ انہیں تلاش کرنا چاہتا تھا کہ شاید... لٹی رقم مل ہی جائے۔ اس نے سوچ لیا کہ اگر وہ جوڑا نہ ملا تو پھر پولیس کا سہارا لینے کے سوا کوئی چارہ نہ رہے گا۔

☆☆☆
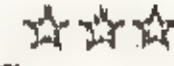
دوسری طرف کائنات بدستور نیلام گھر کے اندر موجود تھا۔ لوسیل بدستور چیزوں کو دیکھنے میں مصروف تھی لیکن کائنات کی توجہ کسی اور طرف ہوچکی تھی۔ وہ کاؤنٹر کے قریب کھڑا اس ادھیڑ عمر مرد کی باتیں سن رہا تھا جو نیلامی سے پہلے گھونسا اور لات کھا چکا تھا۔ اس کے ساتھ ہی سرخ لانگ اسکرٹ میں اس کی بیوی بھی تھی۔ کائنات کو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ اپنی بکواس سے واضح کیا کرنا چاہتا تھا۔ اس وقت وہ بیوی کی پسند کے مطابق خریدی گئی اشیا کی قیمت چکانے کے لیے کاؤنٹر پر کھڑا تھا، جہاں بیٹھا بوڑھا کیش کاؤنٹر کلرک بھی اس کی بک بک سے زچ نظر آرہا تھا۔

اسی دوران لوسیل بھی وہاں پہنچ گئی۔ "ہے... کیا چل رہا ہے؟" اس نے کائنات کی طرف دیکھا اور پھر فوراً اس ادھیڑ عمر مرد سے محو گفتگو ہوگئی۔ "چیزیں بڑی مہنگی ہیں یہاں پر..."

"یہی تو میں مرینا کو سمجھا رہا تھا یہاں آنے سے پہلے۔" وہ بھی اس سے بھڑ گیا اور پھر گاڑی چل پڑی۔

لوسیل کو اس کی بک بک میں نہ جانے کیا دلچسپی تھی کہ وہ بھی بات سے بات نکال کر اسے اور بکواس کرنے کی شہ دیے جا رہی تھی۔ کائنات نے آج اپنا موڈ خوشگوار رکھنے کا تہیہ کیا ہوا تھا اسی لیے مداخلت کیے بنا، چپ چاپ کھڑا سب کچھ دیکھے جا رہا تھا۔

"کیا خیال ہے..." آخر اس سے رہا نہ گیا۔ کائنات نے ان دونوں کی گفتگو ختم کرنے کے لیے لوسیل کو مخاطب کیا۔

"چلتے ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

اس دوران کیش کلرک نے موقع غنیمت سمجھا اور اسے متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ "پلیز... یہ لیں بل... ففٹی ڈالر۔"

"اوکے..." یہ کہتے ہوئے ادھیڑ عمر لڑاکو مرد نے پتلون کی پچھلی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا۔ وہ جلدی جلدی ایک کے بعد دوسری جیب ٹٹولتا رہا اور پھر زور سے چیخا۔ "میرا بٹوا... میں لٹ گیا، کسی نے میرا پاکٹ مار لیا۔" یہ کہتے ہوئے وہ وحشت ناک نگاہوں سے چاروں طرف دیکھے جا رہا تھا۔ اس وقت کاؤنٹر کے اطراف پانچ چھ لوگ موجود تھے۔ اس کی چنگھاڑتی چیخ سن کر بھی اسی طرف متوجہ تھے۔

"یہاں کوئی پاکٹ مار ہے، اس نے میرا پاکٹ مارا ہے۔ اب یہاں سے کوئی باہر نہیں جاسکتا۔" زور زور سے چلاتے ہوئے اس نے بوڑھے کیش کلرک کی طرف دیکھا۔ "پولیس کو فون کرو..." یہ کہہ کر وہ لوگوں کی طرف پلٹا، یہاں سے کوئی باہر نہیں جائے گا۔ سب کی تلاشی لینا ہوگی۔" وہ خاصا بدحواس ہوچکا تھا۔

کمرے میں طرح طرح کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ صورت حال کی نزاکت دیکھتے ہوئے اس نے مداخلت کا فیصلہ کیا۔ "ایک منٹ..." کائنات نے اس کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے رعب دار لہجے میں کہا۔ "سب خاموش ہوجائیں۔"

"تم کون ہو مسٹر..." اس نے کائنات کو گھورا۔

"تم پولیس بلوانا چاہ رہے ہو نا۔"

"ہاں..."

"میں پولیس افسر ہوں۔"

"لیکن..." اس نے کائنات کے حلیے کا بغور جائزہ لیتے ہوئے سوالیہ لہجے میں کہا۔

"چھٹی پر ہوں اسی لیے یونیفارم میں نہیں۔" یہ کہتے ہوئے کائنات نے بٹوے سے اپنا پولیس شناختی کارڈ نکال کر اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔

"اوہ..." کارڈ دیکھتے ہی اس کی آواز خاصی نیچی ہوگئی۔ کمرے میں بھی مکمل خاموشی تھی۔ وہاں موجود سارے لوگوں کی نگاہیں ان دونوں پر تھیں۔

"ان سب لوگوں کی تلاشی لو، ان میں سے کسی نے میرا بٹوا مارا ہے۔" لمحہ بھر پرسکون نظر آنے کے بعد ایک بار پھر اسے اپنے لٹنے کا دکھ یاد آگیا تھا۔

"میرے خیال میں تم ٹھیک نہیں سوچ رہے۔" کائنات نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ یہ سن کر وہاں کھڑے کئی لوگوں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

صورت حال کو غیر موافق دیکھ کر وہ گڑبڑا گیا۔ "یہاں میری رقم لٹ گئی اور تم ہو کہ..." اس کا لہجہ شکایتی تھا۔

"یاد کرو، تقریباً گھنٹا بھر پہلے جب باہر کھڑے تھے تب تمہارے پیچھے کھڑے شخص نے تمہیں گھونسا دے مارا تھا جس کی وجہ سے تم کمر کے بل دہرے ہوگئے تھے۔"

یہ سنتے ہی وہ لمحہ بھر کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ "تمہارا مطلب ہے کہ..." اس نے کہنا شروع کیا لیکن بات ادھوری چھوڑ کر کائنات کو گھورا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

یہ سن کر وہ پھر بدک گیا۔ "تو یہاں کھڑے کھڑے میرا منہ کیوں تک رہے ہو، جاؤ... جا کر اسے پکڑو۔" وہ بے تابی سے بولا۔

یہ سن کر کائنات نے دل ہی دل میں خود کو کوسا کہ اس نے پرائے پھڈے میں اپنی ٹانگ کیوں اڑائی۔ اس واقعے کو گزرے ایک گھنٹے سے زیادہ وقت ہوچکا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ اب وہ نہ جانے کہاں پہنچ چکا ہوگا۔ میں اپنی چھٹی غارت کرکے اسے کہاں کہاں ڈھونڈتا پھروں گا۔ اگرچہ کائنات کو اپنی یادداشت پر ہمیشہ ناز رہا لیکن پھر بھی وہ اس کی صرف ایک جھلک دیکھ سکا تھا۔ اس نے گھونسا مارنے والے کو اس نظر سے تو دیکھا نہ تھا کہ اس کا چہرہ بھی ذہن نشین رہتا۔

"اب چپ کیوں ہو، بولتے کیوں نہیں، یہاں میرا پرس..."

"جانتا ہوں مگر..."

"مگر کیا؟" اس نے بے تابی سے پوچھا۔

"اس طرح جا کر اتنے سارے لوگوں میں اسے ڈھونڈنا آسان نہیں، بہتر یہ ہے کہ ہم مل کر پہلے اس کا حلیہ اور تمام تر تفصیلی جزئیات سمیت سمجھ لیں، پھر تلاش کرتے ہیں۔" کائنات نے بات بنا کر جان چھڑانے کی کوشش کی۔

وہ دونوں کاؤنٹر کے قریب کھڑے ہوکر جیب کترے کا حلیہ طے کرنے لگے۔ وہ باتونی بہت کنفیوز بھی تھا۔ کافی دیر کی مغز ماری کے بعد آخر کائنات نے ایک کاغذ پر اس ممکنہ جیب کترے کے حلیے کا لفظی خاکہ تیار کرلیا۔ "اور کچھ یاد آرہا ہے۔" اس نے کاغذ کو ایک بار بغور پڑھنے کے بعد سوال کیا۔

"کچھ خاص نہیں..."

"تو پھر ٹھیک ہے، یہ لو..." یہ کہتے ہوئے کاغذ اس کی طرف بڑھایا۔ "اب نائن ون ون ملا کر پولیس کے پاس رپورٹ درج کرادو۔"

"لیکن تم تو خود..." یہ سن کر وہ منمنایا۔

"پولیس والا ہوں مگر آج چھٹی پر ہوں۔ یہ کام تمہیں خود کرنا پڑے گا۔"

"اوکے..." یہ کہہ کر وہ اپنا موبائل فون نکالنے لگا۔

اس دوران نوئیل چیزوں کو دیکھنے میں ایک بار پھر مصروف ہو چکی تھی لیکن اس بار وہ بالکل ٹھیک وقت پر شوودار ہوئی، کم از کم کائٹ کا تو یہی خیال تھا۔ ”کیا ہو رہا ہے۔“ اس نے رسماً پوچھا۔

کائٹ مسکرا دیا۔ ”میرا کام ختم، اب چلتے ہیں۔“

”چلو...“ نوئیل نے جواب دیا۔ خلاف توقع اس نے کچھ بھی نہیں خریدا تھا۔

”جو حکم میڈم کا...“ کائٹ نے زیر لب مسکراتے ہوئے، محبت بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ خوش تھا کہ کم از کم اس دکان میں تو نوئیل کے باعث لٹنے سے وہ محفوظ رہا۔

☆☆☆

”اب میں اپنے پیارے انکل کے لیے اس سے زیادہ کچھ اور کیا کرسکتی تھی۔“ برٹنی کورلے نے مگ میں کافی انڈیلتے ہوئے کہا۔ اس وقت شام ڈھل چکی تھی۔

جانسن نیلام گھر کا سیل ڈائریکٹر مارٹن پیٹر ڈائننگ ٹیبل پر رکھے حساب کتاب کے کاغذات اور نوٹوں کی گڈیوں کو غور سے تک رہا تھا۔ برٹنی کی بات سن کر اس نے نظریں اٹھائیں اور بنا کچھ کہے کافی کا مگ تھام لیا۔ وہ گنجے سر، چوڑی پیشانی اور لمبی ناک والا دبلا پتلا شخص تھا۔ چہرے مہرے سے ہی اس کے اندر چھپی عیاری واضح تھی۔

”شکریہ...“ اس نے کافی کا پہلا گھونٹ بھر کر تعریفی لہجے میں کہا۔ ”بہت عمدہ کافی ہے۔ واقعی مجھے اس کی طلب بھی ہو رہی تھی۔“

”واقعی...“ برٹنی کا لہجہ رسمی تھا۔ ”ویسے میں انکل کے سامان کے بارے میں کہہ رہی تھی...“

”ارے... تم اس کی بالکل بھی فکر نہ کرو۔ جیسا میں نے پیش گوئی کی ہے، ویسا ہی ہوگا اور سب اچھا رہے گا۔“ مارٹن کا لہجہ ہمت بندھانے جیسا تھا۔ ”سب حفاظت سے ہے۔ ویسے وہاں ارد گرد بہت سارے چور آتے جاتے ہیں مگر تمہیں فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ اس سے زیادہ برے ثابت نہیں ہوسکتے، جتنا میں نے سوچ رکھا ہے۔“

”اب سب پر تو بھروسا نہیں کیا جاسکتا۔“

”تم نے ٹھیک کہا مگر مجھ پر اعتبار کر کے تمہیں مایوسی نہیں ہوگی۔“

برٹنی ہلکے سے مسکرا دی۔

”تمہاری ہر شے محفوظ ہاتھوں میں ہے سامان بھی اور ان کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم بھی۔“ مارٹن نے ایک ہاتھ نوٹوں کی گڈی پر رکھتے ہوئے کہا۔

برٹنی نے کافی کا ایک اور گھونٹ بھر کر مارٹن کی طرف دیکھا۔ ”میرا خیال ہے کہ تمہارے نیلام گھر کا عملہ بھی ایمان دار ہوگا۔“

”یہ بات اپنی جگہ سو فیصد درست ہے۔“ یہ سنتے ہی مارٹن نے فوراً جواب دیا۔ ”لیکن آج ایک چھوٹا سا ناخوشگوار واقعہ ہوگیا۔“

”وہ کیا...“ برٹنی نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

”اس بڈھے کا قصہ تو میں تمہیں سنا ہی چکا ہوں...“ مارٹن نے کہنا شروع کیا۔ برٹنی نے سر ہلا کر تائید کی۔ ”بس ایک بدقسمتی ہوئی، میں کبھی نہیں چاہتا کہ میرے نیلام گھر کی وجہ سے کبھی معاملہ پولیس تک پہنچے لیکن...“

”پولیس...“ برٹنی کے چہرے پر حیرت تھی۔ ”یہ تو تم نے نہیں بتایا تھا۔“

”جس وقت اس احمق بڈھے نے اپنی جیب کٹنے کا ہنگامہ مچایا، تب ایک پولیس افسر بھی وہاں موجود تھا۔ ورنہ تو مجھے یقین تھا کہ فروخت بنا کسی تعطل کے شام تک چلتی رہتی اور خوب آمدنی ہو جاتی۔“ یہ وضاحت کرتے ہوئے اس کے لہجے سے افسوس کا اظہار ہو رہا تھا۔

”لیکن پولیس والا وہاں کیوں آیا تھا؟“ وہ پریشان نظر آ رہی تھی۔

”وہ اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ خریداری کے لیے آیا تھا کہ اسی دوران میں وہ ہنگامہ پیش آگیا۔“ مارٹن نے تفصیل بیان کی۔

یہ سن کر برٹنی نے اثبات میں سر ہلایا اور گہری سکون بھری سانس لی۔

”خیر... میری رائے درست ثابت ہوئی۔“ مارٹن نے بات کا رخ پلٹنے کی کوشش کی۔ ”مجھے تو پکا یقین تھا کہ ایک بار ان آئٹمز کو نیلام گھر میں رکھا، تو بس لوگ ٹوٹ پڑیں گے اور تقریباً ایسا ہی ہوا ہے۔“

”مجھے تمہاری خدمات پر خوش ہونا چاہیے۔“ برٹنی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے تعریفی لہجے میں کہا۔

یہ سن کر مارٹن کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ سمجھ گیا کہ جس لمحے کا انتظار تھا، وہ آگیا۔ ”اچھی بات یہ بھی تھی کہ میں نے ساتھ مل کر سامان چھانٹ لیا تھا۔“ یہ کہہ کر وہ رکا اور کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ ”میرے خیال میں یہ بتانے کا مناسب وقت ہے کہ تمہارے انکل ٹام کے نوادرات کی

فروخت سے حاصل ہونے والی آدھی رقم پر میرا حق بنتا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس کی حریصانہ آنکھوں میں چمک اتر آئی۔ وہ برٹنی کو غور سے دیکھتے ہوئے ردعمل کا منتظر تھا۔

”لیکن...“ برٹنی نے سر اوپر اٹھایا۔ مارٹن کی بات سن کر اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ ”یہ تو ہمارے درمیان پہلے ہی طے ہو چکا تھا کہ جو آمدنی ہوگی، اس میں سے پندرہ فیصد تمہارا ہوگا مگر اب یہ کیا تم نیا مطالبہ کر بیٹھے۔“

”بالکل ٹھیک کہا تم یہ کہہ سکتی ہو، مجھے اس سے کوئی انکار نہیں مگر...“

”مگر کیا...“ برٹنی نے قطع کلامی کی۔

”اس وقت میں یہ سمجھا تھا کہ تمہارے انکل ٹام اس دنیا میں نہیں رہے ہوں گے تبھی تم ان کا سامان فروخت کر رہی ہو لیکن جب میں نے تھوڑی بہت ریسرچ کی تو پتا چلا...“

”کیا پتا چلا...“ برٹنی نے چڑچڑے انداز میں اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے پوچھ لیا۔

”یہی کہ وہ مرے نہیں بلکہ ٹیکس فراڈ اور دیگر دو نمبری دھندوں کے سبب پکڑے جانے کے ڈر سے برازیل میں پڑے ہوئے ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے چند لمحے توقف کیا۔

یہ سن کر برٹنی کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

”یہی وہ مرحلہ تھا جب میں سمجھا کہ انکل ٹام نے اپنی پیاری بھتیجی کو دنیا بھر سے جمع کردہ نادر و نایاب اشیا فروخت کرنے کی اجازت کیوں کر دی ہوگی۔“ یہ کہہ کر اس نے برٹنی کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”اب وہ خود تو یہ کام کم از کم یہاں آکر کر نہیں سکتے تھے لہٰذا میرا کمیشن بھی پندرہ سے پچاس فیصد ہوگیا۔ ویسے بھی دو نمبر کام ہے دو نمبری انکل کے دو نمبری کام کا معاوضہ تو بڑھنا ہی تھا۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک بار پھر توقف کیا۔

برٹنی نے گہری سانس لی۔ وہ بھانپ گئی تھی کہ مارٹن درست اندازہ لگا چکا ہے کہ وہ انکل کی اجازت کے بنا یہ سب کچھ کر رہی ہے لیکن کھل کر کہنے کے بجائے وہ اشارے کنائے میں اب اپنا حصہ مانگ رہا ہے۔

”مردہ انسان کا ترکہ اور روپوش فراڈی کے سامان کو بیچنے میں بہت فرق ہے۔ باریک بینی سے جائزہ لو تو میں قانون کی گرفت میں بھی آسکتا ہوں۔“

یہ سن کر برٹنی کچھ دیر سوچتی رہی۔ ”مگر... یہ تو بہت بڑی زیادتی ہے، ایک بات طے ہو چکی تو مطلب...“ اس نے رک کر مارٹن کو گھورا۔ ”زبان بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔“

لطیفہ

ایک دفعہ مُلّا نصیر الدین بازار سے جا رہے تھے کہ پیچھے سے کسی نے انہیں زور سے تھپڑ مارا۔ مُلّا نصیر صاحب نے غصے سے پیچھے دیکھا، وہ شخص گھبرا کر بولا۔ ”معاف کرنا میں سمجھا، میرا دوست ہے۔“

مُلّا صاحب نے کہا۔ ”نہیں، چلو عدالت چلتے ہیں۔“

جج صاحب کے سامنے اپنا مدعا پیش کیا۔

جج نے اس شخص کا خوف دیکھ کر کہا: ”کیوں جناب! تم تھپڑ کی قیمت دو گے یا مُلّا صاحب آپ کو بھی تھپڑ لگائیں؟“

اس شخص نے کہا۔ ”جناب! میں تھپڑ کی قیمت دوں گا لیکن ابھی میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ میری بیوی کے پاس کچھ زیور ہیں، وہ میں لے کے آتا ہوں۔“

جج نے کہا: ”ٹھیک ہے، جلدی آؤ۔“

مُلّا صاحب انتظار کرتے کرتے تھک گئے لیکن وہ شخص نہیں آیا تو مُلّا نصیر الدین اٹھے اور ایک زوردار تھپڑ جج کو مارا اور کہا۔ ”اگر وہ زیور لائے تو تم لے لینا۔“

کلر شاخ کوئٹہ تاج محمد سے محمد ہارون بلوچ

”تمہاری بات اپنی جگہ بالکل ٹھیک ہے لیکن ایک انکشاف بھی سن لو۔“ مارٹن نے عیارانہ لہجے میں کہا۔

”اب کیا ہوا...؟“ برٹنی چونکی۔

”میرے پاس تمہارے انکل کا فون نمبر بھی ہے۔ چاہو تو اس سلسلے میں ان سے بات کر لو، ان دنوں وہ ریو میں رہ رہے ہیں۔“

یہ سن کر برٹنی واقعی لمحہ بھر کو سخت پریشان ہوگئی۔ جلدی سے بولی۔ ”میرے خیال میں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے، ہم یہ آپس میں بیٹھ کر خود بھی طے کرسکتے ہیں، یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔“

”پھر بھی...“ مارٹن نے گہری سانس لے کر کہنا شروع کیا۔ اس کا لہجہ سنجیدہ تھا۔ ”بات کرنے میں کیا حرج ہے، پوچھ لو۔ ممکن ہے کہ وہ پچاس فیصد کمیشن دینے پر... خوش نہ ہوں۔ کیا ہوا جو وہ امریکا سے باہر ہیں، یقیناً ان کے دو چار دوست تو یہاں ہوں گے، ان میں سے کسی ایک پر تو ان کا اعتماد ہوگا۔ وہ ان کے ذریعے کسی اور نیلام گھر کی خدمات بھی حاصل کرسکتے ہیں۔ بات کرنے میں کیا حرج ہے؟“

"میں نے کہہ دیا نا کہ اس کی تفتیش کوئی ضرورت نہیں۔"

برنٹی نے سخت لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "جو کہا، وہ ٹھیک ہے۔ تمہارے پچاس فیصد پر سوچا جا سکتا ہے۔" اس کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ وہ مارٹن کا مطالبہ ماننے پر تیار ہے۔

"بہت خوب..." مارٹن نے کافی کا گھونٹ بھرا۔ اس کی آنکھوں میں چمک اتر آئی۔ "میں تو پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ تم خاصی سمجھدار ہو۔" اس نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ اب اسے پندرہ سے بڑھ کر پچاس فیصد کمیشن ملنے کا سو فیصد یقین ہو چکا تھا۔ اس پر وہ دل ہی دل میں خوب بغلیں بجا رہا تھا۔

برنٹی کچھ دیر تک سر جھکائے سوچتی رہی۔ اس کے بعد کافی کا ایک بڑا گھونٹ بھرا اور اس کی طرف دیکھ کر غیر محسوس انداز میں دانت کچکچائے۔ وہ کہنا چاہ رہی تھی کہ مسٹر مارٹن ایک اور بات میں بہت اچھی طرح سمجھ چکی ہوں، تم بالکل بھی قابلِ بھروسا نہیں ہو مگر موقع محل کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے وہ یہ کہنے سے خود کو بڑی مشکلوں سے باز رکھ سکی۔ وہ انکل کے جمع کردہ نوادرات اور ان کی فروخت سے حاصل ہونے والی آمدنی پر پوری توجہ مرکوز کیے بیٹھی تھی۔ کمیشن میں اضافے کے لیے مارٹن کا مطالبہ بھی اسے پریشان کر چکا تھا لیکن جو باتیں وہ جان چکا تھا، اب اس کے بعد اس کی بات ماننے کے سوا کوئی اور راستہ بھی نہ تھا۔ وہ سمجھ گئی کہ کہ مارٹن یہ بھی پتا چلا چکا ہوگا کہ انکل ٹام ان دنوں ریو کے اسپتال میں موت و زندگی کی کشمکش میں مبتلا ہیں ورنہ وہ ان کے نوادرات کی فروخت کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ لیکن، وہ جتنی آمدنی سوچے بیٹھی تھی، اب اس میں پینتیس فیصد کا گھاٹا ہو چکا تھا۔

☆☆☆

پیگی اور ٹیڈ شہر کے ایک مہنگے ریستوران میں شاندار ڈنر کرتے ہوئے کامیابی کا ایک اور جشن منا رہے تھے۔ خوشی ان کے چہروں سے ٹپک رہی تھی۔ "آج کا ٹیمپر بھی خاصا عمدہ رہا۔ کم از کم ایک اور ہفتہ چین سے کٹنے کا بنا کوئی فکر کیے..."

"اور بنا کام کے بھی۔" پیگی نے گلاس منہ سے لگاتے ہوئے لقمہ دیا۔

یہ دونوں وہی تھے، جن سے رالف نے سڑک کنارے خاصی جھک جھک کی تھی اور پانچ سو ڈالر کے بدلے ایک کتاب اور چھوٹا سا مجسمہ حاصل کر کے سمجھ رہا تھا کہ لمبا ہاتھ لگا مگر یہ بھی کم استاد نہیں تھے۔ ویسے بھی آج انہوں نے شہر کے مختلف حصوں میں اپنے "نوادرات" فروخت کر کے خاصی رقم حاصل کر لی تھی۔ بوڑھے لائیڈن نے زبردستی ٹیڈ کے ہاتھ میں دو سو ڈالر تھما کر رالف جیسا ایک مجسمہ خریدا تھا۔ بوڑھے کو نوادرات کی شناخت کا بڑا زعم تھا۔ ایک ادھیڑ عمر عورت نے گوتم بدھ کا ایک اور چھوٹا سا مجسمہ ساڑھے تین سو ڈالر میں خوشی خوشی لیا، جو اس کی دانست کے مطابق کم و بیش ایک ہزار برس پرانا تھا۔ وہ تھی انگریز مگر عیسائیت ترک کر کے بدھ مت اختیار کر چکی تھی۔ اس کے لیے بدھ کا ایسا مجسمہ ملنا، قیمت سے زیادہ خوش نصیبی کی دلیل تھی۔

انہوں نے سب سے کم قیمت پر جو شے فروخت کی، وہ ایک ماچس تھی۔ ٹیڈ نے سگریٹ سلگانے کے لیے ماچس جلائی تھی تبھی وہاں کھڑے ایک گاہک کی نظر اتفاق سے اس پر پڑ گئی۔ وہ ماچسوں کی ڈبیاں جمع کرنے کا شوقین تھا۔ "ذرا دکھاؤ۔" اس نے یہ کہتے ہوئے ٹیڈ کے ہاتھوں سے وہ ماچس اُچک لی۔

ٹیڈ بھانپ گیا۔ "انیسویں صدی کے آخر کی ہے۔"

اور پھر ڈیڑھ سو ڈالر سے بھاؤ تاؤ شروع ہوا اور جاپان کے ایک قصبے میں بننے والی بے نام برانڈ کی وہ ماچس شکریے کے ساتھ ستر ڈالر میں خوشی خوشی خرید لی گئی۔

پیگی اور ٹیڈ نے رالف کو ہاتھ دکھانے کے بعد ایک عجائب گھر مقام کے سامنے سڑک کنارے اپنا خوانچہ لگایا تھا اور اب "ٹیکس فری" آمدنی سے وہ عیاشی کا آغاز کر چکے تھے۔

"ویسے وہ کم بخت خود کو بڑا چالاک سمجھ رہا تھا۔" پیگی نے کھانے کے بعد میٹھے میں کسٹرڈ منگوایا تھا۔ اب اس سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

"ہاں... میں نے دانہ ڈالا اور وہ پھنس گیا۔" یہ کہہ کر ٹیڈ ہنسا۔

"کیسے پیچھے پڑ گیا تھا۔" پیگی بھی مسکرائی۔

"ٹھیک کہا... ففٹی ففٹی۔" یہ کہہ کر وہ رکا۔ "ویسے میں سوچ رہا تھا کہ اگر وہ پچیس سو کے بجائے صرف دو ہزار ڈالر بھی دے دیتا تو سودا برا نہ تھا لیکن کنگلا صرف پانچ سو پر ہی اڑ گیا۔"

"سودا برا نہ رہا، دو ڈالر کی کتاب اور نو ڈالر سے بھی کم کا مجسمہ... تقریباً چار سو نوے ڈالر کا فائدہ ہوا۔" پیگی نے حساب لگا کر بتایا۔

"مجسمہ اتنا سستا تھا۔" ٹیڈ کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"چائنا ٹاؤن کا وہ بوڑھا مجسمہ ساز اچھا آدمی ہے۔ جو بناتا ہے، وہ گھر پر ہی بیچتا ہے، مال لیے لیے نہیں پھرتا۔" پیگی نے بتانا شروع کیا۔ "میں نے درجن بھر خریدے تو رقم اور کم ہو گئی ورنہ ایک لیتی تو شاید پندرہ ڈالر میں پڑتا۔"

"تم تو میری توقع سے زیادہ ہوشیار نکلی ہو۔" ٹیڈ نے اس کی نگاہوں میں جھانکا۔

"یہ سب تمہارے ساتھ ہونے کی وجہ سے ہے۔"

"اسی طرح دھندا چلتا رہے تو کیا برا ہوگا۔ ہنی مون کا ہنی مون اور دھندا بھی ساتھ ساتھ۔"

"تم تو ہو ہی سدا کے بدمعاش..." پیگی نے پیار سے اسے دیکھا۔

"کم خرچ بالانشیں۔" یہ سنتے ہی پیگی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ٹیڈ بھی اس کا بھرپور ساتھ دے رہا تھا۔

☆☆☆

کائٹ نیلام گھر سے نکلا تو ارادہ تھا کہ لنچ کے فوراً بعد گھر جا کر آرام کرے گا لیکن اس کی نوبت ہی نہ آئی۔ وہ برگر شاپ سے پیٹ پوجا کے بعد نکل ہی رہے تھے کہ شیرف کا فون آ گیا۔ اسٹاف کی کمی کے باعث اسے فوراً ایمرجنسی ڈیوٹی پر پہنچنے کو کہا گیا۔

کائٹ پولیس اسٹیشن پہنچا تو وہاں وہی ادھیڑ عمر شخص بیٹھا تھا، جس کی جیب کٹی تھی۔ وہ ملزم کا خاکہ بنوا چکا تھا۔ دوسرے کمرے میں رالف بیٹھا ایشیائی جوڑے کے ہاتھوں اپنے لٹنے کی کہانی شیرف کو سنا رہا تھا لیکن وہ جوڑے کو دی جانے والی دھمکیوں کی تفصیل بیچ سے حذف کر چکا تھا۔ اب وہ صرف مظلوم تھا۔ کائٹ کے آنے سے پہلے وہ خاکہ ساز کے ذریعے ایشیائی نوجوان جوڑے کے خاکے بھی بنوا چکا تھا۔ جب شیرف نے کائٹ کے پاس اسے بھیجا تو کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ اسے دیکھتے ہی کائٹ کے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے ادھیڑ عمر مرد کو پیچھے سے لات اور گھونسا مارا تھا۔ کائٹ ایک نظر میں ہی اسے پہچان گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ گرفتار ہو چکا تھا۔

رالف کی تلاشی لینے پر اس کی جیب سے بٹوا مل گیا، جسے فوراً شناخت کر لیا گیا مگر اس میں سے بوڑھے کے ساڑھے پانچ سو کے بجائے صرف پچاس ڈالر برآمد ہوئے۔ باقی کے پانچ سو ڈالر تو ٹیڈ کی جیب میں جا چکے تھے۔ رالف کی کار کی تلاشی میں مجسمہ، ایک کتاب، پرل کا نیکلس بھی برآمد ہوا، جس کی رسید موجود تھی لیکن کتاب اور مجسمہ... وہ کھاتا "نامعلوم کار سوار جوڑے" کے سر نکلا۔ کائٹ کو اب اس جوڑے کی تلاش تھی۔ تلاش میں مدد کے لیے پولیس کے پاس ان کا صرف حلیہ اور کار کا نمبر تھا۔

☆☆☆

پیگی اور ٹیڈ ڈنر ختم کر چکے تھے۔ انہیں بل کا انتظار

پلیز! غصہ مت کریں۔ میں شادی کی صرف ایک تصویر بنانا چاہتا ہوں

تھا۔ اسی دوران بھاری تن و توش والا بوڑھا ویٹر ہاتھی کی طرح ڈولتا ہوا ان کی طرف بڑھا۔ وہ کیری گرانٹ مووی کے کسی کردار کی طرح لگ رہا تھا۔ "یہ آپ کے لیے محترمہ..." اس نے سفید پلیٹ کے درمیان سجی پیسٹری کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا پیگی کی طرف بڑھایا۔ اس کے اوپر دو حصوں میں کئی چیری سجی ہوئی تھی۔ "منیجر کی طرف سے ہمارے خاص مہمانوں کے لیے تحفہ ہے۔"

"بہت خوب، مجھے میٹھا بہت پسند ہے۔"

"شکریہ..." ویٹر نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ ہماری خاص پیسٹری ہے، کہیں اور نہیں ملتی۔"

"واقعی..." یہ کہتے ہوئے ٹیڈ نے بل لیا اور بٹوے سے پیسے نکال کر بل فولڈر میں رکھا۔ "دس ڈالر کی ٹپ خاص تمہارے لیے۔"

ویٹر نے ایک بار پھر پوری باچھیں کھول دیں، حتیٰ کہ اس کے زرد مائل دانت بھی صاف نظر آنے لگے تھے۔

"چلیں..." اس نے پیگی کی طرف دیکھا۔

"ایک منٹ..." یہ کہہ کر پیگی نے نیپکن سے منہ صاف کیا۔ وہ جھک کر کرسی کے ساتھ رکھا بیگ اٹھا رہی تھی کہ کائٹ بھی وہاں پہنچ گیا۔ وہ وہاں بیٹھے لوگوں کے چہروں پر نظر ڈالتا ہوا، آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا لیکن ٹیڈ کے قریب پہنچتے ہی اس کے قدم رک گئے۔ لمحہ بھر رک کر اس

نے دونوں کو غور سے دیکھا اور پھر ہاتھ میں پکڑے خاکے پر نظر ڈالی۔ ’’یہی ہیں وہ دونوں...‘‘

کانٹ کے اشارے پر دونوں پولیس والے آگے بڑھے۔ پیگی اور ٹیڈ کے ہوش اُڑ چکے تھے۔ ان کے چہرے زرد تھے۔ ان کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا۔ کچھ دیر میں وہ دونوں بھی حوالات پہنچ گئے۔ انہیں خوش آمدید کہنے کے لیے رالف پہلے سے اندر موجود تھا۔

کارروائی مکمل کرنے کے بعد کانٹ گھر جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ شیرف ایک شخص کو ساتھ لیے اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ ’’کانٹ یہ ہیں مسٹر مارٹن... نیلام گھر کے ڈائریکٹر...‘‘

’’اوہ میرے خدا...‘‘ کانٹ نے سر پکڑ لیا۔ ’’کیا ہوا ان کے ساتھ۔‘‘

’’آج دورانِ نیلامی ان کے نیلام گھر سے نوادرات کے دو نمونے چوری ہوئے۔ ایک چاندی کا کٹلری سیٹ اور دوسرا کینڈل لائٹ سیٹ۔‘‘

’’او کے...‘‘ کانٹ نے گہری سانس لی۔

’’میرا خیال ہے کہ جنہوں نے یہ چوری کیا ہے، وہ اسے بیچنے کی کوشش کریں گے۔‘‘ شیرف نے کہنا شروع کیا۔ ’’بہتر ہے کہ تم تفصیل نوٹ کرو اور کل سارا دن تمام نیلام گھروں کی نگرانی کرو۔ ممکن ہے چور پکڑے جائیں۔‘‘

’’کل اتوار ہے...‘‘ یہ سن کر کانٹ منمنایا۔

’’جانتا ہوں، تمہاری چھٹی ہے لیکن مجرم اور قانون کبھی چھٹی نہیں کرتے۔‘‘ شیرف نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ ’’بہتر ہے کہ تم بھی چھٹی کا سوچنے کے بجائے ملزموں کو گرفت میں لانے پر دھیان دو۔‘‘ یہ کہتے ہوئے وہ باہر نکل گیا۔

مارٹن بلا کا چرب زبان تھا۔ اس نے کٹلری اور کینڈل سیٹ کا خاکہ چند منٹوں میں بنوا دیا۔ خاکہ ساز نے خاکہ کانٹ کے سامنے رکھا لیکن اس کا دھیان کہیں اور تھا۔ مارٹن اسی نیلام گھر کا سیل ڈائریکٹر تھا جہاں وہ صبح توکل کے ساتھ موجود تھا۔ وہ خاکے کے بجائے کچھ اور سوچ رہا تھا۔ کڑیاں ملتی جارہی تھیں۔ وہ دونوں خوبرو بہنیں اس کے دماغ پر سوار تھیں۔ مارٹن نے جو کچھ بتایا اس کے مطابق وہی دونوں چور ہو سکتی تھیں۔ وہی دونوں اس بڑی سی آبنوسی ڈائننگ ٹیبل کے ساتھ کھڑی تھیں؛ جہاں وہ دونوں چیزیں رکھی تھیں۔ کانٹ کے دماغ میں ان میں سے ایک کے کندھے پر لٹکا بڑا سا بیگ بھی گھوم رہا تھا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ خاکہ دیکھنے کے بجائے انہیں ڈھونڈنا ہوگا۔ کچھ دیر میں وہ سب کچھ طے کر چکا تھا۔

’’مسٹر مارٹن...‘‘ کافی دیر سوچنے کے بعد اس نے خاکے پر ایک نظر ڈالی اور پھر سر اٹھا کر اسے مخاطب کیا۔ وہ اس کے مقابل کرسی پر بیٹھا تھا۔ ’’سمجھ لو چور پکڑے گئے۔‘‘ وہ مسکرایا۔

یہ سنتے ہی مارٹن کا چہرہ کھل گیا۔ ’’بڑے قیمتی ہیں وہ...‘‘

’’جانتا ہوں...‘‘

’’پکڑے جائیں تو اچھا ہے، ابھی میں نے اس کے مالک کو بھی چوری کی اطلاع نہیں دی ہے، ورنہ اس کی رقم مجھے اپنی جیب سے دینا پڑے گی۔‘‘ چور نہ پکڑے جانے پر مارٹن کو رقم اپنے پلے سے جانے کا ڈر تھا۔

’’تم کل کا انتظار کرو، میں خود تم سے رابطہ کروں گا۔ امید ہے تم ہرجانے سے بچ جاؤ گے۔‘‘ کانٹ نے جواب دیا۔

’’ٹھیک ہے تو پھر میں جاؤں۔‘‘

کانٹ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کے باہر نکلتے ہی کانٹ نے فون ملایا۔

’’ہیلو...‘‘ فون توکل نے اٹھایا تھا۔

’’آج کا آدھا دن تو غارت ہوا لیکن ہم کل سارا دن مختلف نیلام گھروں میں گھومتے پھرتے گزاریں گے۔‘‘

’’کیا کہہ رہے ہو تم...‘‘ یہ سنتے ہی وہ چیخ پڑی۔

’’وہی جو تم نے سنا۔‘‘

’’میں تو آج تم سے جھگڑا کرنے والی تھی مگر...‘‘

’’میری چھٹی حس بھی کہہ رہی تھی۔‘‘

’’کیا کہنے تمہاری چھٹی حس کے۔‘‘ توکل نے ہنستے ہوئے کہا۔

’’ٹھیک ہے...‘‘ کانٹ نے کہا۔ ’’تم تیار رہو، میں پہنچ رہا ہوں اور پھر کل سارا دن...‘‘

’’نیلام گھروں میں بھاؤ تاؤ کرتے گزاریں گے۔‘‘ توکل نے اسے بات مکمل نہ کرنے دی۔

کانٹ ہنس پڑا۔ ’’او کے... میں پہنچ رہا ہوں۔‘‘

گھر جاتے ہوئے کانٹ دل ہی دل میں خود کو داد دے رہا تھا۔ کافی عرصے کے بعد وہ اتوار کا پورا دن نہ صرف چھٹی پر ہوگا بلکہ وہ بھی توکل کے ساتھ۔ دوسری طرف ڈیولی کا میٹر بھی آن رہے گا۔ اسے یقین تھا کہ وہ دونوں کم عمر لٹیری حسینائیں دن میں کسی نہ کسی نیلام گھر میں موقع تلاش کرتے ہوئے ضرور مل جائیں گی۔

سب آسماں پر چمکتے تمام ستارے ہی قسمت میں نہیں ہوتے... مگر وہ دولت مند تھا... کئی ستارے اپنے گھر کے آنگن میں سجا سکتا تھا... اس نے چمکتے دمکتے ایک ستارے کو اپنی زندگی میں شامل کر کے اسے سرخروئی بخشی تھی... مگر ستارے کی تابناکی نے عجیب بہار دکھائی تھی...

بیوی کے اغوا کی واردات جس نے محبت کرنے والے شوہر کی نیند اڑا دی تھی...

زرخرید

سکندر عسکلیم

اردب پیگی ڈیوڈ سورگن اس طرح دکھائی نہیں دے رہا تھا جیسا کہ ٹی وی پر نظر آتا تھا۔ اس کا چہرہ تھکن سے چور اور خستہ حال ہو رہا تھا۔ اس کی تیز چبھ جانے والی نیلی آنکھیں نیند کی کمی کی وجہ سے سرخ ہو رہی تھیں اور ان پر سوجن بھی نمایاں تھی۔

’’میں بس اسے بالکل صحیح سلامت اور ٹھیک ٹھاک دیکھنا چاہتا ہوں۔‘‘ اس نے یہ بات سوویں مرتبہ کہی تھی۔

سراغ رساں اسنادکر نے اس کا شانہ تھپتھپاتے

ہوئے اسے تسلی دی۔ ''میں بھی یہی چاہتا ہوں، مسٹر مورگن! اغوا کرنے والے نے کہا ہے کہ وہ تمہاری بیوی کے بارے میں فون پر بتادے گا کہ وہ کہاں موجود ہے۔''

مورگن کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ''کیا تمہیں یقین ہے کہ رقم اس تک پہنچ گئی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہمیں یقین ہے۔''

سراغ رساں اسٹارکر کا دھیان اس مقام کی طرف چلا گیا جہاں اغوا کرنے والے نے رقم پہنچانے کو کہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں تلملانے لگا۔ دس لاکھ ڈالر کی رقم بے نشان نوٹوں کی شکل میں ایک سوٹ کیس میں بند کر کے ایک پارک شدہ کار میں رکھی گئی تھی جیسا کہ اغوا کرنے والے نے پیغام دیا تھا۔ اس نے پولیس کو یہ تنبیہ بھی کی تھی کہ اگر اسے روکنے یا اس کا سراغ لگانے کی کوئی بھی کوشش کی گئی تو اس کا نتیجہ ڈیوڈ مورگن کی نوجوان بیوی سیلیا مورگن کی موت ہوگی۔

اس کے باوجود بھی سراغ رساں اسٹارکر نے سوٹ کیس کی تہ میں ایک ننھی سی ٹرانسمیٹر چھپادیا تھا جس کا کھوج لگانا ناممکن تھا۔

لیکن رقم پہنچائے جانے والے مقام پر اغوا کرنے والے کی نگرانی کے دوران اسٹارکر نے دیکھا کہ اغوا کرنے والے نے تمام نقد رقم سوٹ کیس سے نکال کر ایک بڑے سے پلاسٹک کے تھیلے میں منتقل کردی تھی اور سوٹ کیس وہیں چھوڑ دیا تھا۔ سوٹ کیس کے ساتھ وہ ننھی سی ٹرانسمیٹر بھی واپس پارکنگ گیراج میں رہ گیا تھا اور پولیس کو اس شخص کا تعاقب کرنا مشکل ہوگیا تھا۔

اب سیلیا کو ڈھونڈنے کی واحد امید یہی تھی کہ اغوا کرنے والا اپنے عہد پر قائم رہے اور اس مقام کی نشاندہی کردے جہاں اس نے سیلیا کو رکھا ہوا تھا۔

''اگر اس نے فون نہیں کیا تو پھر کیا ہوگا؟'' مورگن نے پوچھا۔ اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔ ''جب میری پہلی بیوی مارگریٹ کا انتقال ہوا تھا تو میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ مجھے دوبارہ محبت ملے گی۔ اب مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوگا۔'' اس کی زبان نے الفاظ کا ساتھ چھوڑ دیا اور ایک بار پھر رونا شروع کردیا۔

اسٹارکر نے ارب پتی کی پیٹھ ایک بار پھر تھپتھپاتے ہوئے اسے تسلی دی۔ ''فکر مت کرو، مسٹر مورگن۔ ہم تمہاری بیوی کو تلاش کرلیں گے۔ ایک بار پھر اپنے دشمنوں کے بارے میں بتاؤ؟''

''دشمن؟ میں تمہیں پہلے بتا چکا ہوں۔ میں اس زمین پر قائم سب سے بڑی مینوفیکچرنگ کمپنیوں میں سے ایک کا چیف ایگزیکٹیو آفیسر ہوں۔ میں گزشتہ چالیس سال سے اس کاروبار سے وابستہ ہوں۔ میرے دشمنوں کی تعداد ان ناموں کی تعداد سے کہیں زیادہ ہے جو مین ہٹن کی فون بک میں موجود ہیں۔''

''کیا ان میں کوئی نمایاں دشمن ہے؟ کوئی ایسا جو محسوس کرتا ہو کہ تم نے اس کے ساتھ کوئی زیادتی کی ہے؟ کوئی ایسا جو تم سے رقم حاصل کرنا چاہتا ہو؟'' اسٹارکر نے پوچھا۔

''تم ان کے ناموں کی فہرست دیکھ چکے ہو۔ اس فہرست میں موجود ہر ایک مجھ سے نفرت کرتا ہے۔ میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں سراغ رساں کہ تحقیقات کی راہ اختیار کرنا بے سود ہوگا۔''

''تمہارے اپنے گھر کے بارے میں کیا خیال ہے؟ کیا حال ہی میں کسی کو نوکری سے برخاست کیا ہو؟ کوئی مالی؟ کوئی ملازمہ؟ کوئی شوفر؟'' سراغ رساں نے جاننا چاہا۔

''یہ تمام معاملات سیلیا دیکھتی ہے...... لیکن ایک منٹ! ایک ماہ قبل میں نے اپنے سوئمنگ پول کی صفائی کرنے والے کو نوکری سے نکالا تھا۔ ایک روز میں کام سے جلدی گھر آیا تو اسے اپنے لیونگ روم میں موجود پایا۔ وہ وہاں بیٹھا ٹیلی وژن دیکھ رہا تھا۔ میں نے موقع پر ہی اسے ملازمت سے برخاست کردیا تھا۔''

''اس کا نام کیا تھا؟''

''مجھے یاد نہیں۔ سیلیا کو معلوم ہوگا...... او ڈیئر......''

اپنی بیوی کا ذکر ہوتے ہی مارگن کی آنکھیں دوبارہ چھلک پڑیں۔

اسٹارکر کو اس شخص پر حیرت ہونے کے ساتھ قدرے غصہ بھی آرہا تھا۔

''تمہاری سیلیا سے ملاقات کہاں ہوئی تھی مسٹر مورگن؟'' اس نے سوال کیا۔

''وہ...... وہ میرے گھر کی صفائی کرنے والوں میں سے ایک تھی۔ اپنے کام کے ابتدائی چند ہفتوں تک میں اسے قطعی نظر انداز کرتا رہا تھا لیکن وہ ہمیشہ شفقت کا کوئی بول یا کوئی عمدہ بات کہہ دیتی تھی۔ پھر جلد ہی میں نے دفتر جانے سے قبل اس کے گرد منڈلانا شروع کردیا۔ صبح کی کافی پر اس سے گپ شپ لڑانے لگا۔ میں جانتا ہوں کہ وہ عمر میں مجھ سے ایک تہائی چھوٹی ہے لیکن وہ مجھے جوان ہونے کا احساس دلاتی تھی۔''

اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

اسٹارکر چونک پڑا۔ اس نے سر کی جنبش سے مورگن کو فون اٹھانے کا اشارہ کیا۔

''ہیلو؟ کیا وہ ٹھیک ٹھاک ہے؟ وہ کہاں ہے؟''

سراغ رساں اسٹارکر ایک فون ایکسٹینشن پر ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ اس نے تیزی سے پتا نوٹ کیا جہاں اغوا کرنے والے کے مطابق سیلیا موجود تھی۔ وہ ایک اسٹوریج کا دفتر تھا جہاں اس نے سیلیا کو رکھا ہوا تھا۔

''آؤ، چلیں۔'' اسٹارکر نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔

میرو ویلیو اسٹوریج شہر کے نواح میں واقع تھا لیکن اسٹارکر ایک ریکارڈ ٹائم میں وہاں پہنچ گیا۔ وہ اپنی ٹیم اور بے تاب ڈیوڈ مورگن کے ہمراہ اسٹوریج یونٹ کا ایک سو سولہ کے سامنے جا کھڑا ہوا جہاں اغوا کرنے والے کے مطابق سیلیا پائی جاسکتی تھی۔

وہ ایک بڑے سائز کا یونٹ تھا جہاں فرنیچر رکھا جاتا تھا۔ اس کے دروازے پر ایک کمبی نیشن لاک لگا ہوا تھا۔ اسٹارکر کی ٹیم کے ایک فرد نے بولٹ کٹر کی مدد سے تالا کاٹ دیا اور اسٹارکر نے یونٹ کا دروازہ اوپر اٹھا دیا۔

دروازہ کھلتے ہی اسٹارکر کی آنکھوں میں کیمیکل کی تیز چبھن محسوس ہوئی اور وہ آنکھیں مچکانے لگا۔

اسٹارکر نے اپنی فلیش لائٹ کی روشنی اندر ڈالی تو اسے وہاں بیٹھی ہوئی سیلیا مورگن دکھائی دی۔

وہ اندھیرے میں ایک دفتری کرسی سے بندھی ہوئی بیٹھی تھی۔ اس کے دلکش منہ میں ایک کپڑا ٹھنسا ہوا تھا۔ اس کے عقب میں دو خالی بالٹیاں نظر آرہی تھیں جو سوڈیم بائی سلفیٹ نامی کیمیکل کی تھیں۔ کارڈ بورڈ کا ایک بڑا سا خالی ڈبا بھی موجود تھا جس کے ایک جانب جلی حروف میں برومین چھپا ہوا تھا۔

ڈیوڈ مورگن تیزی سے اپنی بیوی کی جانب دوڑ پڑا۔ پیکنگ میٹریل کے سفید خوردہ ذرات اس کے قدموں میں چرمرا رہے تھے۔

''مسٹر مورگن!'' اسٹارکر نے چیخ کر کہا۔ ''کسی چیز کو ہاتھ مت لگانا جب تک ہم ثبوت اکٹھا نہ کرلیں۔''

اسٹارکر نے اپنی جیب میں سے لیٹیکس کے دستانے

دستک

میں نے اپنی سب سے محبوب شخصیت کے دروازے پر دستک دی۔ ''ٹھک...... ٹھک...... ٹھک۔''

''کون ہے؟'' اس نے پوچھا۔

میں یہ سن کر پلٹ گیا۔ جب اس نے میری دستک ہی نہیں پہچانی تو اب اس سے ملاقات کا کیا فائدہ؟

شگوفے

بیوی ''یہ تیل بالوں کی جڑوں کو مضبوط بناتا ہے۔''

خاوند: ''اوہ ڈارلنگ! بہت اچھا کیا۔ یہ بوتل لے آئیں۔ مجھے اس کی ضرورت تھی۔''

بیوی ''میں چاہتی ہوں آپ یہ بوتل اپنی سیکریٹری کو دے دیں۔ مجھ سے ہر روز آپ کے کوٹ پر سے اس کے لمبے لمبے بال نہیں جھاڑے جاتے۔''

☆☆☆

لڑکا: ''آج ہماری زندگی کا سب سے پرمسرت دن ہے۔''

لڑکی ''لیکن میں کل سے پہلے تم سے شادی نہیں کرسکتی۔''

لڑکا ''اسی لیے میں نے یہ بات کہی ہے۔''

☆☆☆

ایک دوست دوسرے دوست سے۔ ''یار تمہاری بیوی بہت باتونی ہے۔''

دوسرا دوست: ''ہاں یار! یہ بات تو کسی حد تک درست معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ پچھلے دنوں میرے گلے میں ورم ہوگیا اور آواز بالکل بند ہوگئی۔ وہ تین دن تک میری خدمت کرتی رہی لیکن اسے میری آواز بند ہوجانے کا علم تک نہ ہوا۔''

☆☆☆

خاوند: ''چار سال پہلے آج ہی کے دن ہماری شادی ہوئی تھی۔''

بیوی: ''کیا خیال ہے شادی کی سالگرہ منانے کے لیے مرغی کو ذبح کیا جائے؟''

خاوند: ''ہماری غلطی کی سزا غریب مرغی کو نہیں ملنی چاہیے۔''

دانیال حلیم کے شگوفے...... کراچی سے

نکالے اور سیلیا کے پرفیکٹ میک اپ سے سجے چہرے پر سے وہ کپڑا ہٹا دیا جو اس کے منہ میں ٹھنسا ہوا تھا۔ سیلیا بڑے مضبوط اعصاب کی دکھائی دے رہی تھی کیونکہ اس کا مسکارا تک نہیں بہا تھا۔

پھر اسنارکر نے ایک چھوٹے چاقو کی مدد سے اس ڈوری کو کاٹ دیا جس سے سیلیا کو مضبوطی کے ساتھ کرسی سے باندھا گیا تھا۔

''سیلیا! میری جان۔'' ڈیوڈ مورگن نے لپک کر سیلیا کو اپنے سینے سے چمٹا لیا اور پیار کرنے لگا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں، ڈیوڈ۔'' سیلیا نے بے تاب شوہر کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''اس نے مجھے کوئی گزند نہیں پہنچائی۔''

اسنارکر نے اپنی ٹیم کو اندر آنے کا اشارہ کیا اور پھر اس اکلوتے بلب کو بے ڈھب انداز میں ٹٹولنے لگا جو اوپر لٹکا ہوا تھا۔ اس کی انگلیاں بلب سے ٹکراتے ہی جل سی گئیں۔ تب کہیں اس کا ہاتھ بلب جلانے والی ڈوری سے مس ہو گیا۔ اس نے ڈوری کھینچی تو کمرا روشنی میں نہا گیا۔

''کیا تمہیں اپنے اغوا کرنے والے کا چہرہ دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا؟'' اسنارکر نے سیلیا سے پوچھا۔

''نہیں، آئی ایم سوری۔'' میں اس کا چہرہ بالکل بھی نہیں دیکھ پائی۔'' سیلیا نے جواب دیا۔ اس کی نیلی آنکھیں سراغ رساں کا چہرہ ٹٹول رہی تھیں۔ ''میں یہاں گھنٹوں سے اندھیرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔''

''گھنٹوں سے؟'' اسنارکر نے دہرایا۔

''ہاں۔''

اسنارکر نے ڈیوڈ مورگن کی پیٹھ پر آخری بار تھپکی دی اور پھر ان دونوں میاں بیوی کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا۔

''آئی ایم سوری مسٹر مورگن۔'' اسنارکر نے ارب پتی کو ایک جانب لے جا کر آہستگی سے کہا۔ ''مجھے تمہاری بیوی کو حراست میں لینا ہو گا۔''

''وہ کیوں؟'' ڈیوڈ مورگن چونک پڑا۔

''اپنے ہی اغوا کے جرم میں ملوث ہونے کے الزام میں۔'' اسنارکر نے بتایا۔ پھر اسنارکر کے اشارے پر اس کے آدمیوں نے سیلیا کو حراست میں لے لیا۔

ڈیوڈ مورگن اپنی بیوی کی حراست پر چراغ پا ہو گیا۔ جب اس کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو سراغ رساں اسنارکر اسے تفصیل بتانے لگا۔

''سب سے پہلی بات تو یہ کہ سیلیا کا میک اپ بالکل بھی خراب نہیں ہوا تھا۔ وہ پرفیکٹ میک اپ میں تھی۔ اگر وہ اس کمرے میں گھنٹوں سے بند ہوتی تو کمرے میں موجود کیمیکلز کی بُو کی وجہ سے اس کی آنکھیں سرخ ہوتیں اور میک اپ بہہ جاتا کیونکہ دروازہ کھلتے ہی کیمیکلز کی وجہ سے میری آنکھوں میں جلن ہونا شروع ہو گئی تھی۔ پھر اگر وہ روئی ہوتی تو اس کا مسکارا بہہ گیا ہوتا۔ مزید یہ کہ جب میں بلب کو ٹٹول رہا تھا تو میری انگلیاں بلب سے ٹکراتے ہی جل گئی تھیں کیونکہ بلب گرم تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ بلب کچھ دیر پہلے تک روشن رہا تھا۔ اس سے ثابت ہوا کہ سیلیا ہمارے پہنچنے سے کچھ ہی دیر پہلے وہاں پہنچی تھی اور ہم سے جھوٹ بول رہی تھی کہ وہ یہاں گھنٹوں سے اندھیرے میں بند تھی۔''

''لیکن اسے اغوا کرنے والا ساتھی کون تھا؟'' ڈیوڈ مورگن نے جاننا چاہا۔

''چونکہ برومین اور سوڈیم بائی سلفیٹ سوئمنگ پول کی صفائی میں استعمال ہونے والے کیمیکلز ہیں تو مجھے شبہ ہو گیا تھا کہ سیلیا اپنے اغوا کی اسکیم میں سوئمنگ پول کی صفائی کرنے والے اس ملازم کے ساتھ شامل ہے جسے گزشتہ ماہ تم نے اپنی ملازمت سے برخاست کیا تھا۔'' اسنارکر نے بتایا۔

''لیکن میری رقم اور وہ بدمعاش؟''

''اس کی تم چنداں فکر نہ کرو۔'' اسنارکر نے ارب پتی کو دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ ''سیلیا نے سب کچھ اگل دیا ہے۔ میرے آدمی اس کی تلاش میں روانہ ہو چکے ہیں۔ جلد ہی اچھی خبر سننے کو ملے گی۔''

اتنے میں اسنارکر کے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

اس نے فون سننے کے بعد ارب پتی ڈیوڈ مورگن کو بتایا کہ اغوا کا ڈراما رچانے والے شخص کو پولیس نے گرفتار کر لیا ہے۔ وہ فرار ہونے کے لیے ائرپورٹ جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کے پاس سے تمام رقم بھی برآمد ہو گئی ہے۔

''لیکن سیلیا!'' ڈیوڈ مورگن نے کہا۔ ''میں اب بھی اس سے محبت کرتا ہوں۔''

اسنارکر نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''اب تمہاری مرضی ہے کہ تم اس کے خلاف مقدمہ دائر کرانا چاہو گے یا اسے معاف کر دو گے۔ ہم تمہاری محبت کی راہ میں حائل نہیں ہوں گے۔''

آسمان تک

بابر نعیم

اکثر باصلاحیت لوگ گمنامی کی زندگی گزارتے ہیں اور ایسے لوگ جن کے پاس کوئی خاص صلاحیت نہیں ہوتی... بڑی آن بان کے ساتھ سر اٹھا کے چلتے ہیں... ایک قصبے میں رہنے والے بھائیوں کے گرد گھومتی کہانی... وہ آسمان کی وسعتوں میں لایعنی باتوں میں الجھ کے اپنے مقصد کو آسان تر بنانے کا فن جانتے تھے...

پے در پے ایک نیا رخ اختیار کرتی تحریر کے اتار چڑھاؤ

''میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ایسے جرائم بھی وقوع پذیر ہوتے ہیں جو ناقابلِ فہم ہیں اور اس حد تک ناقابلِ یقین کہ کسی مافوق الفطرت شے کی موجودگی کے باوجود ان کی وضاحت نہیں کی جا سکتی۔'' میجر پیٹرک میرل کی

زبان سے یہ الفاظ نکلتے ہی ہیڈز کلب میں گہری خاموشی چھا گئی۔ آتش دان کے ساتھ بیٹھے ہوئے ڈاکٹر ٹوئسٹ اور سپرنٹنڈنٹ چارلس کولن نے نووارد کو حیرت سے دیکھا۔ وہ جن پیچیدہ کیسز پر بحث کر رہے تھے، وہ ہلکے پڑ جاتے اگر

اس خوش اخلاق اور طاقتور مہمان کی بات پر یقین کرلیا جاتا۔ یہاں کسی کو مداخلت کرنے کی اجازت نہیں تھی اس لیے سب لوگ خاموشی سے سنتے رہے۔

سپرنٹنڈنٹ خود بھی ساٹھ سالہ کا مستعد افسر تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ نووارد سے تعارف کر کے اسے کوئی خاص خوشی نہیں ہوئی۔ میجر نے مصافحہ کے لیے اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے بتایا کہ وہ فرانس میں سابق پولیس سارجنٹ رہ چکا ہے جس نے ایک انگریز لڑکی سے شادی کرلی تھی۔ ڈاکٹر ٹوئسٹ اپنے دوست کولن سے عمر میں کچھ بڑا تھا اور اپنے قد کی وجہ سے نمایاں نظر آتا تھا۔ اس نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میرل کو اپنی رائے کی وضاحت کرنے کی دعوت دی۔

میجر کچھ سوچنے کے بعد سیاہ ماربل کے مینٹل پیس کی طرف بڑھا جس پر پرنس آف ڈارک نیس کا مجسمہ ایستادہ تھا۔ ”میں جو کچھ بیان کروں گا، وہ حقائق پر مبنی ہے۔“ اس نے اعلان کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ اس وقت کی بات ہے جب میں بمشکل پچیس سال کا تھا اور مجھے سارجنٹ بنے ہوئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا۔ مجھے کارہوس کے نزدیک ایک گاؤں میں تعینات کیا گیا تھا۔ ہمیں جس واقعے کی تحقیقات کرنے کے لیے کہا گیا اس کی صورتِ حال اتنی مایوس کن تھی کہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ہم کسی آسمانی طاقت سے نمٹ رہے ہیں یا یہ کوئی معجزہ رونما ہوا ہے۔ ایک الگ تھلگ جگہ پر ایک شخص کی لاش ملی تھی جو اس بری طرح ٹوٹ پھوٹ گئی تھی جیسے وہ شخص آسمان سے گرا ہو۔“

ڈاکٹر اور سپرنٹنڈنٹ نے ایک دوسرے کو حیران کن نظروں سے دیکھا۔ کمرے میں مکمل خاموشی تھی اور صرف آتش دان میں لکڑیاں چٹخنے کی آواز آرہی تھی۔ میجر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”مجھے یہ واقعہ اچھی طرح یاد ہے جیسے یہ کل کی بات ہو۔ وہ جولائی کی ایک دوپہر تھی جب پوسٹ مین نے مجھے ایک ارجنٹ ٹیلی گرام دیا جو میرے افسر انسپکٹر جارج کی طرف سے تھا جس میں اس نے کہا تھا کہ میں سارے کام چھوڑ کر کروز کا رٹر پہنچ جاؤں جو گاؤں سے تین چار میل کے فاصلے پر تھا۔ اس وقت سہ پہر کے چار بجے تھے اور موسم خاصا گرم تھا جو کہ ایک غیر معمولی بات تھی کیونکہ سال کے اس حصے میں عموماً اتنی گرمی نہیں پڑتی۔ میں نے اپنی سائیکل اٹھائی اور اس جانب چل دیا جہاں انسپکٹر جارج اپنی کار میں بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا۔ وہ ایک مضبوط اور قابلِ بھروسا شخصیت کا حامل تھا لیکن معاملات پیچیدہ ہو جانے کی صورت میں بہت جلدی غصے میں آجاتا اور ایسی ہی صورتِ حال یہاں بھی تھی۔ اس نے بتایا کہ جان برادرز میں سے ایک بڑے عجیب حالات میں مردہ پایا گیا ہے جس کے بارے میں وہ راستے میں وضاحت سے بتائے گا۔

”جان برادرز اس علاقے میں خاصے مشہور تھے۔ ان کا شمار امیر سوداگروں میں ہوتا تھا جو لوگوں پر ظلم اور سختی کر کے اپنی دولت میں اضافہ کر رہے تھے۔ انہوں نے ہر اس شخص کو تباہ کر دیا تھا جس نے ان کا قرض واپس کرنے سے انکار کیا یا اس میں تاخیر کی۔ دو بڑے بھائی میتھیاس اور جیکب کپڑے کے کاروبار میں بے تحاشا منافع کما رہے تھے۔ اب انہوں نے ایک خشک جھیل کے برابر میں سنسان جگہ پر فارم بنالیا تھا جہاں ہم اس وقت موجود تھے۔ سب سے چھوٹا بھائی ہنری بہت کم یہاں آیا کرتا تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس کے بھائیوں کے ساتھ تعلقات ٹھیک تھے یا نہیں لیکن اس نے اپنے رہنے کے لیے دارالحکومت کا انتخاب کیا تھا جہاں وہ جائداد کی خرید و فروخت کا کاروبار کرتا تھا۔ وہ نرم مزاج، عقل مند اور ہینڈسم تھا اور تینوں بھائیوں میں سب سے زیادہ سوشل تھا۔

بڑا بھائی میتھیاس دبلا پتلا اور لمبے قد کا تھا اور اپنی ذہانت کی وجہ سے خاندان کا دماغ سمجھا جاتا تھا۔ چھوٹا بھائی جیکب چالیس سال کا ہونے کے باوجود کنوارا تھا۔ وہ اپنے بھائی کے مقابلے میں زیادہ مہذب تھا اور تقریباً اس کے ہر فیصلے سے اختلاف کیا کرتا تھا۔ وہ دونوں ہی دین دار تھے لیکن جیکب بائبل کا مطالعہ کرنے کے بعد وہمی ہو گیا تھا۔ اس کے دماغ میں طرح طرح کے خیالات آنے لگے تھے۔ وہ لاش جیکب ہی کی تھی۔

”اس مرحلے پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں اس علاقے کی زمین کے بارے میں بھی کچھ بتا دوں کیونکہ یہ اس معاملے کا اہم پہلو ہے۔ اس علاقے کا بیشتر حصہ بنجر ہے۔ کہیں کہیں گھاس نظر آتی ہے۔ میلوں تک زمین غیر آباد اور پتھریلی ہے البتہ کہیں کہیں جھاڑیاں اور درخت نظر آتے ہیں۔ انسپکٹر اور میں ایک چھوٹی پہاڑی پر کھڑے تھے جو کہ اس علاقے میں بلند ترین جگہ تھی جہاں سے فارم تک ایک ڈھلوان راستہ جاتا تھا۔ وہاں پہنچ کر انسپکٹر نے مجھ سے کہا۔ ”میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے کیونکہ یہ ایک بہت ہی عجیب کیس ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں اس کا احساس ہو گیا ہوگا؟“

”امید ہے کہ تم نے مجھ سے بہت زیادہ توقعات وابستہ نہیں کی ہوں گی۔“

”میں تمہارے گزشتہ دو کیس نہیں بھولا ہوں جنہیں تم نے پلک جھپکتے میں حل کر لیا تھا۔ میں تمہارے سامنے اس کیس کے حقائق بیان کر رہا ہوں۔ مرنے والا جیسا کہ تم جانتے ہو کنوارا اور خواب دیکھنے والا تھا جو اپنے بارے میں بات کر کے خوش ہوتا تھا۔ گزشتہ چند ہفتوں سے وہ کچھ زیادہ ہی خواب دیکھنے لگا تھا۔ کئی بار اس نے دعویٰ کیا کہ اس نے سنہری سیڑھی دیکھی ہے جو آسمانوں تک جاتی ہے۔“

”جیکب کی سیڑھی۔“ میں اونچی آواز سے بولا۔

”ہو بہو وہی جس کا ذکر بائبل میں کیا گیا ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ اس نے شادی کرنے اور بچے پیدا کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔“

”کیا تم نجومی ہو؟“ انسپکٹر نے کہا۔

”نہیں چیف، جیکب کے خواب کی یہی تعبیر نکلتی ہے۔“

”ایسا لگتا ہے کہ جیکب کے دماغ میں اچانک ہی سرائے کے مالک کی بیٹی وکٹورین سے شادی کرنے کا خیال آگیا۔ وہ بہت خوب صورت اور عمر میں جیکب سے آدھی ہے۔ جیکب کو یقین تھا کہ اس نے بالکل صحیح فیصلہ کیا ہے۔ اس نے اپنے بھائی ہنری کو خط لکھا کہ وہ اس سے ملنے کے لیے آجائے کیونکہ اسے کچھ اہم امور پر گفتگو کرنی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ شادی کے بارے میں ہی بات کرنا چاہ رہا تھا۔ ہنری رات گئے یہاں پہنچا اور اس نے سرائے میں قیام کیا اور صبح ہوتے ہی فارم پر چلا آیا۔

”معمول کے مطابق جیکب صبح نو بجے سیر کے لیے نکل گیا۔ اس کے بڑے بھائی میتھیاس نے کوئی غیر معمولی بات نوٹ نہیں کی۔ وہ فارم کے اندر بیٹھا کچھ حساب کتاب چیک کر رہا تھا۔ دس بجے اس نے اپنے بھائی کی چیخ کی آواز سنی جو بڑے پُرجوش انداز میں کہہ رہا تھا۔ ”میتھیاس وہ سیڑھی یہاں ہے بالکل گھر کے سامنے۔ اس بار میں ضرور اس پر چڑھ کر آسمان تک جاؤں گا۔“

”میتھیاس اپنے بھائی کے ہذیان سے خوب واقف تھا۔ وہ دروازے تک گیا اور اس نے باہر کی جانب جھانکا۔ اسے تالاب کے نزدیک کوئی نظر نہیں آیا۔ وہاں جیکب تھا اور نہ کوئی سیڑھی۔ اس نے کندھے اچکائے اور دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ چند منٹ بعد ایک بھیانک چیخ فضا میں ابھری اور اس کے ساتھ ہی ایک بھاری آواز سنائی دی۔ چند سیکنڈ بعد میتھیاس باہر گیا۔ اس نے دیکھا کہ ایک نیلی اسپورٹس کار مکان کی طرف آرہی تھی جسے اس کا چھوٹا بھائی ہنری چلا رہا تھا۔ وہ خود حیران اور بے چین نظر آرہا تھا کیونکہ اس نے بھی وہ خوفناک چیخ سنی تھی۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک شکستہ لاش تالاب کے پتھریلے کنارے پر پڑی ہے۔ وہ جیکب تھا۔ انہوں نے فوراً ہی اندازہ لگا لیا کہ وہ اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ چنانچہ وہ پولیس کو اطلاع دینے چلے گئے۔“

پانچ بجے کے قریب میں اور انسپکٹر جائے وقوعہ پر پہنچے۔ ہم دونوں بری طرح پسینے میں شرابور تھے لیکن کہیں سے بھی کوئی ہوا کا جھونکا نہیں آرہا تھا۔ لاش وہاں سے ہٹائی جا چکی تھی لیکن کئی پولیس والے اب بھی تحقیقات میں مصروف تھے۔ جارج نے گدلے پانی کی چادر کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ ”تالاب کے کناروں کی طرف دیکھو میرل، تمہیں ایک عجیب قسم کا ہالہ نظر آئے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ گزشتہ چند برسوں میں پانی کی سطح کافی بلند ہوئی ہے لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم ان زرد رنگ کے پتھروں کو دیکھو جو کنارے پر پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ لاش انہی پتھروں پر پڑی ہوئی تھی۔ افسوس کہ لاش کو یہاں سے ہٹا لیا گیا ورنہ تم دیکھ سکتے کہ کتنا ہولناک حادثہ ہوا ہے۔ ٹوٹی ہوئی ہڈیاں، شدید نوعیت کی اندرونی ضربات۔“

”لیکن اس کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا۔“ میں نے پوچھا۔ ”کیا اسے ڈنڈے سے مارا گیا یا لوہے کی سلاخ سے۔“

”ان میں سے کوئی چیز استعمال نہیں ہوئی۔“ انسپکٹر نے کہا۔ ”ہمیں کم از کم اب تک کسی ہتھیار کے نشان نہیں ملے۔ اس کے زخموں سے پتا چلتا ہے کہ وہ بہت زیادہ بلندی سے نیچے گرا ہے۔“

”لیکن یہ ممکن نہیں ہے۔“ میں نے سوچے سمجھے بغیر کہا۔ ”جب تک تم سنہری سیڑھی والی کہانی پر یقین نہ کر لو۔“

”میں جانتا ہوں میرل۔“ میرے افسر نے کہا۔ ”لیکن یہ سب میڈیکل ایگزامنر کا ابتدائی نتیجہ ہے لیکن میں کسی حتمی نتیجے پر پہنچنے سے پہلے پوسٹ مارٹم رپورٹ کا انتظار کرنا چاہتا ہوں۔“

یہ کہہ کر میرل رک گیا اور حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ”اب تک کے واقعات سن کر تم کیا سوچ رہے ہو، کیا یہ سب کچھ حیران کن نہیں ہے؟“

”فی الحال کچھ نہیں کہا جا سکتا۔“ ڈاکٹر ٹوئسٹ نے کہا۔ ”میں نے اپنی زندگی میں ایسا غیر معمولی واقعہ نہیں سنا لیکن میں تمہارے افسر کی بات سے اتفاق کرتا ہوں اور پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سننے تک کوئی فیصلہ نہیں ہو سکتا۔“

سپرنٹنڈنٹ کولن نے بھی تائید میں سر ہلایا اور میرل اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''میڈیکل ایگزامنر نے احتیاطاً اپنے کئی ساتھیوں سے بھی مشورہ کیا۔ وہ سب اس پر متفق تھے کہ جیکب کی موت کم از کم ساٹھ فٹ اونچائی سے گرنے کی وجہ سے واقع ہوئی ہے۔ اس کے جسم کے اعضا الگ ہو گئے تھے۔ کئی فریکچر ہو گئے تھے اور کئی جگہ اندرونی چوٹیں آئی تھیں۔ ایسا صرف اس صورت میں ہوتا ہے جب کوئی بہت زیادہ بلندی سے نیچے گرے۔''

ڈاکٹر ٹوئسٹ اور سپرنٹنڈنٹ کے درمیان نگاہوں کا تبادلہ ہوا پھر کولن نے اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کسی نے جیکب کو کھڑکی سے دھکا دیا ہو اور اس کی لاش کو احتیاط سے تالاب کے کنارے رکھ کر چلا گیا ہو۔''

''ہم نے اس امکان کا بھی بغور جائزہ لیا ہے۔'' میرل مسکراتے ہوئے بولا۔ ''وہاں دس میل تک اتنی اونچی کوئی عمارت نہیں تھی ماسوائے چرچ کے اور نہ ہی کوئی اتنا اونچا ٹیلا یا پہاڑی۔ جس جگہ سے ہم نے اپنی کارروائی شروع کی تھی وہی اس علاقے میں سب سے اونچی پہاڑی تھی۔ جہاں تک درختوں کا سوال ہے تو ان کی تعداد بھی کچھ زیادہ نہیں اور ان میں سے صرف دو درخت ہی تیس فٹ اونچے تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ماہرین جائے واردات کے بارے میں مکمل اتفاق رکھتے تھے۔ تالاب کے اردگرد کی زمین پر زرد چاک اور پتھر موجود ہیں۔ اس کے نشانات مقتول کے زخموں پر بھی پائے گئے جس کے بعد شک کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ ان سب شواہد کو جمع کیا جائے تو یہی نتیجہ سامنے آتا ہے کہ جیکب کی موت بہت زیادہ بلندی سے گرنے کی وجہ سے واقع ہوئی۔''

کمرے میں گہری خاموشی تھی جسے ڈاکٹر ٹوئسٹ نے توڑا۔ اس کی آواز میں ہلکا سا ارتعاش تھا۔ ''ایسی صورت میں ہمارے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ ہم کہانی کا بقیہ حصہ بھی سنیں۔''

میرل اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''سب سے پہلا گواہ میتھیاس تھا جس سے میں نے کچھ سوالات کیے۔ وہ خاصا مشکل انسان تھا اور لگتا تھا کہ سہ پہر میں ہونے والی تحقیقات سے برہم ہے۔ ہم اس وقت کچن میں تھے جہاں وہ وقوعہ کے وقت بیٹھا ہوا تھا۔ اس جگہ سے مکان کے اردگرد کا حصہ یا تالاب کا کنارہ واضح طور پر نظر نہیں آتا تھا پھر کھڑکیوں پر پڑے ہوئے لیس کے پردوں کی وجہ سے باہر کا نظارہ مدھم ہو گیا تھا۔ اس کا بھائی جیکب معمول کے مطابق صبح نو بجے سیر کے لیے چلا گیا اور دس بجے کے قریب اس نے اپنے بھائی کی آواز سنی جو چلا چلا کر کہہ رہا تھا کہ اس نے سنہری سیڑھی دیکھی ہے۔

''میرا خیال ہے۔'' میتھیاس نے کہا۔ ''کہ بائبل کے مسلسل مطالعے سے اس کا ذہن پراگندہ ہو گیا تھا۔ گو کہ میں اس سے متفق نہیں تھا پھر بھی میں نے اس کی شادی کی مخالفت نہیں کی.... میں نے اسے بعد میں ہونے والی مشکلات کے بارے میں آگاہ کر دیا تھا لیکن اس نے میرے اعتراض کو حقیر جانا۔ اس کی نظر میں اس بات کی کوئی اہمیت نہیں تھی کہ اس کی ہونے والی بیوی اس سے آدھی عمر کی ہے اور اس کا ایک مختلف پس منظر ہے۔ سنہری سیڑھی کا تصور اس کے لیے جنت میں جانے کا اشارہ تھا اور وہ اس بارے میں اتنا غیر لچک دار اور پرعزم تھا کہ میں نے اس کی باتوں پر دھیان دینا ہی چھوڑ دیا۔ اس لیے جب میں نے اس کے چلانے کی آواز سنی تو میں نے اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ وہ اس سے پہلے بھی گزشتہ چند روز میں یہ دعویٰ کر چکا تھا کہ اس نے سنہری سیڑھی دیکھی ہے۔ اس نے اشارہ کر کے مجھے بھی بتایا لیکن مجھے کچھ نظر نہیں آیا سوائے سورج کی روشنی کے جو تالاب کی سطح پر پڑ کر منعکس ہو رہی تھی۔''

''جب اس نے تمہیں دس بجے پکارا تو تمہیں اسے نہ دیکھ کر حیرانی نہیں ہوئی؟''

میتھیاس کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''وہ کہیں بھی جا سکتا تھا، مثلاً کسی پہاڑی یا جھاڑی کے پیچھے۔ میں تمہیں بتا دوں کہ کاروبار کا سارا بوجھ میرے کندھوں پر ہے۔ اس لیے میں کسی اور معاملے میں الجھنا نہیں چاہتا تھا۔''

''اور اس کے فوراً بعد تم نے جو چیخ سنی کیا وہ تکلیف دہ تھی جیسے کوئی انتہائی بلندی پر سے نیچے گرا ہو؟''

''ہاں، میں ایسا ہی سمجھتا ہوں لیکن مجھے اعتراف ہے کہ اس وقت میں نہیں پہچان سکا کہ وہ کیسی چیخ تھی۔''

''اور گرنے کی آواز؟''

''اس بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا اور میرا فوری خیال یہ تھا جیسے زمین ہل گئی ہو۔ میں باہر گیا اور اسی وقت ہنری اپنی کار میں وہاں پہنچ گیا۔ میرے لیے اس کا آنا حیران کن تھا کیونکہ میں نے اسے کافی عرصے سے نہیں دیکھا تھا۔''

''جب میں میتھیاس کا بیان سن رہا تھا، میں نے دیکھا کہ ایک بڑے سائز کی بائبل چھوٹی سی میز پر رکھی ہوئی

ہے۔ میں نے اسے اٹھایا اور نشان زدہ صفحہ کھول کر پڑھنے لگا۔ جس میں ایک روشن سیڑھی کا ذکر تھا جو آسمان تک جاتی تھی اور جس کے ذریعے فرشتے زمین پر آتے اور واپس جاتے تھے۔ میں نے مزید صفحات پلٹے اور ایک جگہ مجھے ڈیلا تھیلا کی خوب صورت تصویر نظر آئی جسے دیکھ کر مجھے اس لڑکی وکٹورین کا خیال آ گیا جس سے جیکب شادی کرنے کی پلاننگ کر رہا تھا۔ میں نے میتھیاس سے پوچھا کہ وہ اپنی شادی کے بارے میں کیا سوچ رہی تھی؟''

''دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے۔'' میتھیاس نے ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ ''کہ کیا وہ بھی جیکب کی طرح اس پر اتنی ہی فریفتہ تھی یا وہ صرف اس کی خوب صورت آنکھوں کی وجہ سے شادی کر رہی تھی۔''

''ہاں۔'' میں منہ ہی منہ میں بولا۔ ''تم اس طرح سوچ سکتے ہو۔''

''بہتر ہو گا کہ تم یہ سوال براہِ راست اس عورت سے کرو۔''

اس تلخ جملے کے ساتھ ہی یہ انٹرویو ختم ہو گیا۔ اس کے بعد ہم سب سے چھوٹے بھائی ہنری سے تفتیش کے لیے باہر چلے گئے۔ میں نے اس سے پہلی بات یہی کہی کہ وہ حتی الامکان صحیح بتائے کہ اس کے فارم پر پہنچنے کے بعد کیا ہوا؟ اس نے بتایا کہ وہ مکان سے تیس گز کے فاصلے پر تھا جب اس نے خون کو جما دینے والی چیخ سنی۔ کیونکہ اس وقت اس کی توجہ سڑک اور عمارت پر تھی۔ اس لیے اس نے تالاب یا اس کے کناروں کی طرف نہیں دیکھا۔ خاص طور پر مشرقی کنارے کو جہاں بظاہر یہ جرم واقع ہوا تھا۔ یہ جگہ جزوی طور پر مٹی کے بڑے بڑے ٹیلوں کے پیچھے چھپی ہوئی ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے بھائی کو گرتا ہوا نہیں دیکھ سکا گو کہ اسے پورا یقین تھا کہ کوئی ایسی سیڑھی نہیں دیکھی جو آسمان کی طرف جاتی ہو۔ اس نے گرنے کی آواز ضرور سنی لیکن وہ واضح نہیں تھی۔ شاید اس کی وجہ موٹر کے انجن کی آواز ہو۔ اس نے دس سیکنڈ بعد میتھیاس کو باہر آتے دیکھا۔ جہاں تک میں اندازہ لگا سکا، اس کا بیان حقائق پر مبنی تھا۔ میں نے اس سے وہ خط مانگا جو اسے دو دن قبل موصول ہوا تھا اور جس میں اس کے بھائی جیکب نے لکھا تھا کہ وہ جتنی جلد ممکن ہو سکے اس کے پاس آ جائے کیونکہ وہ اس سے ایک اہم معاملے پر گفتگو کرنا چاہتا ہے۔ گو کہ خط میں اس معاملے کی تفصیل بیان نہیں کی گئی تھی لیکن اس کے پُرجوش انداز سے شبہ کیا جا سکتا تھا کہ یہ معاملہ اس کی ہونے والی شادی سے متعلق ہے۔''

''مجھے یہ خط دیکھ کر بہت حیرانی ہوئی۔'' ہنری نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تقریباً چھ ماہ یا اس سے بھی زیادہ عرصے سے کوئی خبر نہیں ملی تھی اور سچ تو یہ ہے کہ ہماری گزشتہ ملاقات بھی کافی ناخوشگوار رہی تھی۔ حالانکہ ایسی کوئی سنجیدہ بات نہیں بس ان اثاثوں کے انتظام کے بارے میں کچھ اختلافات تھے جو والد ہمارے لیے چھوڑ گئے تھے۔ میتھیاس اور جیکب نے اس سلسلے میں ایکا کر لیا اور ہمارے راستے جدا ہو گئے۔ گزشتہ رات میں دیر سے پہنچا لہٰذا میں نے سرائے میں قیام کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اسی دوران میری ملاقات سرائے کے مالک مورس سے ہوئی اور میں نے کچھ وقت بار میں جولین کے ساتھ بھی گزارا جس نے مجھے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ جب میں نے وکٹورین کو دیکھا تو مجھ پر واضح ہو گیا کہ اس شادی کے معاملے میں سب کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ لیکن میں یہ بات کس طرح کہہ سکتا تھا، جیکب کی شخصیت ایسی نہ تھی کہ کوئی خوب صورت لڑکی اس پر فدا ہو جاتی اور نہ ہی میں نے وکٹورین کے چہرے پر خوشی کے آثار دیکھے۔ میں یہ سوچ کر سو گیا کہ صبح اٹھ کر اس بارے میں مزید معلومات حاصل کروں گا۔ میں صبح نو بجے وہاں سے روانہ ہوا لیکن اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ گاڑی کا ایک ٹائر پنکچر ہے۔ اسے بدلنے میں مجھے توقع سے زیادہ وقت لگ گیا لہٰذا میں تاخیر سے یہاں پہنچا۔ اس کے بعد کے واقعات تو تم جانتے ہی ہو۔''

اس شام انسپکٹر اور میں نے سرائے میں کھانا کھایا اور جولین سے بات کرنے کے لیے انتظار کرتے رہے۔ وکٹورین اپنی غیر حاضری کی وجہ سے موضوعِ گفتگو بن گئی تھی۔ وہاں موجود کچھ گاہکوں کا خیال تھا کہ اس نے جیکب کا سوگ منانے کے لیے خود کو کمرے میں قید کر لیا ہے۔ جب سرائے میں چند گاہک رہ گئے تو جولین کو فراغت نصیب ہوئی اور ہمیں اس سے کچھ سوال کرنے کا موقع مل گیا۔ وہ دیکھنے میں خاصا شرمیلا سا لگ رہا تھا۔ اس نے مرنے والے کا عزت سے نام لیا لیکن اس کی آنکھوں سے جیکب کے لیے ناراضی جھلک رہی تھی۔

''وہ ایسا شخص نہیں تھا جسے کوئی ناپسند کرے۔'' اس نے کہا۔ ''وہ پڑھا لکھا اور باتیں کرنے کا شوقین تھا۔ وہ اپنے آپ کو خدا سمجھنے لگا تھا اور اس نے کبھی مجھے ٹپ نہیں دی۔ بہرحال میں اس کی برائی نہیں کروں گا کیونکہ اب وہ مر چکا ہے۔''

"تم اس کی وکٹورین کے ساتھ شادی کے بارے میں کیا سوچتے تھے؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

اس کی آنکھوں میں ناراضی کی جھلک ابھری۔ وہ بولا۔ "یہ میرا مسئلہ نہیں اور میرا خیال ہے کہ تم اس کی تہ تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتے ہو۔"

"تمہارا اشارہ کس جانب ہے؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"موریس سے پوچھو۔"

یہ ایک چبھتا ہوا جواب تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ وہاں سے اٹھ جاتا، میں نے موضوع بدلنے کا فیصلہ کیا اور اس سے پوچھا کہ گزشتہ شب ہنری سے اس کی کیا بات ہوئی تھی۔ اس نے تسلیم کیا کہ اس نے ہنری سے بات کی تھی۔ ہنری نے اس سے کئی سوالات کیے۔ خاص طور پر اپنے بھائی جیکب کے منصوبوں کے بارے میں، لیکن وہ اسے رام کرنے میں ناکام رہا۔

"وہ دیکھنے میں اپنے دونوں بھائیوں کے مقابلے میں کم لالچی نظر آرہا تھا۔ لیکن وہ ان سے بہتر بھی نہیں تھا۔ اس نے جس طرح وکٹورین کو محبت بھری نظروں سے دیکھا، مجھے یقین ہے کہ موقع ملنے پر وہ اسے اپنے بھائی سے چھین لیتا۔"

"اب میں سمجھا۔" انسپکٹر نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے سنا ہے کہ دونوں بھائیوں کے تعلقات ٹھیک نہیں تھے۔ ایک بات اور، ہنری کا کہنا ہے کہ وہ صبح نو بجے سرائے سے چلا گیا تھا۔ کیا تم اس کی تصدیق کر سکتے ہو۔" جولین نے لمحہ بھر کے لیے سوچا اور بولا۔

"میں سہ پہر سے پہلے اپنا کام شروع نہیں کرتا۔ تمہیں یہ بات موریس یا وکٹورین سے پوچھنا چاہیے اگر وہ بات کرنے کے قابل ہو۔ ممکن ہے اسے جیکب کی موت کا غم نہ ہوا ہو لیکن اسے صدمہ ضرور ہے۔"

سرائے کے دروازے بند کرنے کے بعد موریس ہمارے پاس آیا اور ہم نے اس سے سوالات کرنا شروع کر دیے۔

"ممکن ہے کہ جیکب کی سیڑھی اوپر سے آنے والا کوئی اشارہ ہو۔" اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔ اس کی عمر پچاس برس تھی۔ سر کے بال سفید ہونا شروع ہو گئے تھے اور آنکھوں میں عجیب طرح کی اداسی تھی۔

"اس بات سے تمہارا کیا مطلب ہے؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"یہی کہ خدا نے میری دعائیں سن لیں اور اس نفرت انگیز شخص کو مجھے بلیک میل کرنے سے روک دیا۔"

"کیا تم اس بلیک میلنگ کی وضاحت کر سکو گے؟" انسپکٹر نے کہا۔

"مجھ پر ان بھائیوں خاص کر جیکب کا بہت قرض چڑھ گیا تھا جس کی خاطر میری بیٹی کو یہ قربانی دینا پڑی۔ میں نے اس سے اچھی خاصی رقم ادھار لے رکھی تھی اور میں اس کی ادائیگی کرنے کے قابل نہ تھا۔ اس نے مجھے اپنی مٹھی میں جکڑ رکھا تھا۔ میں کئی مہینوں سے یہی سوچ کر پریشان ہوتا رہا کہ بیلف کسی وقت بھی آ سکتا ہے، اس طرح میرا کل اثاثہ جس میں یہ سرائے اور چھوٹا سا مکان شامل ہے قرق ہو جائے گا اور ہم دونوں باپ بیٹی سڑک پر آ جائیں گے پھر ایک روز صبح کے وقت جیکب خوشی خوشی میرے پاس آیا۔ یہ کوئی ایک ماہ پہلے کی بات ہے۔ اس کے ہاتھ میں قرض کے کاغذات تھے۔ اس نے کہا کہ وہ اپنے بھائی سے بات کر چکا ہے اور اب یہ مجھ پر منحصر ہے کہ میں کیا جواب دیتا ہوں۔"

"میرا خیال ہے کہ میں سمجھ گیا ہوں۔" میں بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ غصے سے میری مٹھیاں بھنچ گئی تھیں۔

"ہاں، مجھے یقین ہے کہ تم سمجھ رہے ہو گے۔" موریس نے کہا۔ "اس نے صرف ایک ہی شرط لگائی کہ اگر میں اپنی بیٹی کی شادی اس سے کر دوں تو وہ میرا سارا قرض معاف کر دے گا۔ میں یہ سن کر حیران رہ گیا اور اسے گول مول جواب دیتے ہوئے کہا کہ یہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔ اسی لمحے وکٹورین آ گئی۔ شاید اس نے جیکب کا مطالبہ سن لیا تھا۔ اس بدبخت نے بے شرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک بار پھر اپنا سوال دہرایا اور یوں مطمئن نظر آنے لگا جیسے کسی بلی نے دودھ پی لیا ہو۔ اس کے خیال میں یہ محض ایک کاروبار تھا جس میں قیمت کا تعین کرنا تھا۔ میری پیاری اور بہادر بیٹی وکٹورین نے پُرعزم انداز میں کہا کہ اسے یہ سودا منظور ہے اور جیکب کے ہاتھ سے قرض کے کاغذات لے کر ان کے ٹکڑے کر دیے۔"

وہ ایک سیکنڈ کے لیے رکا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "اگر آج اس کی ماں زندہ ہوتی تو وہ مجھے کبھی معاف نہ کرتی۔ مجھے ایک مرد کی طرح برتاؤ کرنا چاہیے تھا اور اس کے منہ پر گھونسا مار کر اسے بھگا دینا چاہیے تھا لیکن میں ایسا نہ کر سکا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے وکٹورین سے پوچھا کہ وہ سب کچھ جانتے بوجھتے یہ قربانی کیوں دے رہی ہے لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے جیکب کو

اپنا منگیتر تسلیم کر لیا تھا اور اب وہ ایک آزاد عورت نہیں تھی۔ جب جولین نے یہ خبر سنی تو اسے شدید غصہ آیا۔ وہ فارم پر جا کر دونوں بھائیوں کا سر توڑنا چاہ رہا تھا اور اگر وکٹورین اسے نہ روکتی تو وہ ایسا کر گزرتا۔"

"میرا خیال ہے کہ اس لڑکے کے دل میں وکٹورین کے لیے نرم گوشہ ہے۔" انسپکٹر نے کہا۔

"ہاں اور میں نہیں سمجھتا کہ وہ مجھے کبھی معاف کر سکے گا کہ میں نے شروع میں ہی جیکب کا کھیل کیوں نہیں روکا۔"

کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد میں نے موریس سے پوچھا کہ کیا وہ ہنری کی روانگی کے وقت کی تصدیق کر سکتا ہے۔

"ہاں، پونے نو بجے کے قریب بل کی ادائیگی کر دی تھی اور میں نے اسے اسپورٹس بیگ سمیت جاتے ہوئے دیکھا۔"

"اس کے بعد تم نے کیا کیا؟"

"کچھ نہیں۔" موریس نے جواب دیا۔ "میں نے تھوڑی سی صفائی کی اور دس بجے کے قریب گاہک آ گئے۔"

"ٹھیک ہے۔ اب ہم تمہاری بیٹی سے کچھ پوچھنا چاہیں گے اگر وہ بات کرنے کے قابل ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ یہ ٹھیک رہے گا۔" موریس نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "وہ اپنے کمرے میں ہے، میں اسے جا کر بتاتا ہوں۔"

تھوڑی دیر بعد ہی ہم خوب صورت وکٹورین کا انٹرویو کر رہے تھے، اس کی اداس نیلی آنکھیں ہر قسم کے تاثر سے خالی تھیں۔ اس کے باوجود اس کی بے پناہ خوب صورتی کو نظرانداز کرنا ممکن نہیں تھا۔

جب ہم نے اسے اپنی تحقیقات کے بارے میں بتایا تو اس نے وقت ضائع کیے بغیر کہا کہ وہ جیکب سے شدید نفرت کرتی تھی۔ گو کہ اس کی موت دردناک تھی لیکن یہی اس کی رہائی کا سبب بن گئی۔ وہ ابھی تک صدمے کی کیفیت سے پوری طرح باہر نہیں آئی تھی لیکن اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ اس نے جذبات میں آ کر جیکب سے شادی کا فیصلہ تو کر لیا تھا لیکن شاید اس میں شادی کرنے کی ہمت نہیں تھی۔

سچ تو یہ ہے کہ میں اس کی زبان سے یہ باتیں سن کر پُرسکون ہو گیا۔ یہ ایک غیر حقیقی صورت حال کا اختتام اور صحت مندانہ عمل تھا۔ جب میں نے اس سے سیڑھی والے معمے کے بارے میں دریافت کیا تو وہ بولی۔

"میری شرم و حیا یہ کہنے کی اجازت نہیں دیتی لیکن میرا خیال ہے کہ جب اس نے مجھ سے شادی کا فیصلہ کیا تو وہ بہت زیادہ بلندی پر جانا چاہ رہا تھا۔ میں اس کی پہنچ سے دور ہوتی جا رہی تھی اور وہ بلندی پر چڑھ کر مجھ تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا جس کے نتیجے میں وہ گر گیا۔"

"جس طرح آئی کیرس گرا تھا۔" مجھے اس وقت یونانی دیومالائی داستان یاد آ گئی۔

"ہاں بالکل اسی طرح۔" وہ اپنے سیاہ بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔ "مجھے یقین ہے کہ یہ خدائی مداخلت تھی۔"

انسپکٹر نے اسے یاد دلایا کہ انصاف کے تقاضے کے تحت اس کا ٹھوس ثبوت درکار ہے۔ اس لیے وہ جاننا چاہے گا کہ جس وقت یہ جرم پیش آیا، وہ کہاں تھی؟

اس نے گستاخ نگاہوں سے انسپکٹر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہیں کہیں اور جا کر ثبوت تلاش کرنا چاہئیں، میں صبح نو بجے سے دس بجے تک بازار میں گھریلو سودا سلف خرید رہی تھی۔ اس دوران قصائی کی دکان اور جنرل اسٹور پر بھی گئی اس کے علاوہ میں نے چرچ میں جا کر عبادت کی اور پادری کے پاس بھی گئی۔ میں نے اس سے کچھ بات بھی کی جیسے خداوند یسوع مسیح نے مجھے ایسا کرنے کے لیے کہا ہو۔"

میرل نے یہ کہہ کر قہقہہ لیا۔ اس کی آنکھوں میں خوش گوار چمک نظر آ رہی تھی۔ پھر وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

"مجھے اعتراف ہے کہ اس وقت میں بھی اس خوب صورت لڑکی سے محبت کرنے لگا تھا۔ اس میں کئی خوبیاں تھیں لیکن اگر نفسیاتی نقطہ نظر سے جائزہ لیا جائے تو اس کے پاس جیکب کو قتل کرنے کا جواز موجود تھا۔ تاہم وہ جائے وقوعہ سے اپنی غیر موجودگی بیان کر چکی تھی اور ہم نے اس کی تصدیق بھی کر لی لہٰذا اب آپ لوگ کیا سوچ رہے ہیں۔ کیا آپ کے لیے یہ ایک معما نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ سب اس سے اتفاق کریں گے۔"

"یہ ایک بہت بڑا ناممکن جرم ہے۔" ڈاکٹر لوئسٹ نے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

سپرنٹنڈنٹ کولن نے نیا سگار سلگاتے ہوئے کہا۔ "صرف حقائق کا معروضی تجزیہ کر کے ہی اس معمے کو حل کیا جا سکتا ہے۔"

"گویا تمہارے پاس پہلے سے اس کا حل موجود ہے۔" میجر میرل نے پوچھا۔

"ہاں، کم از کم ایک ابتدائی خاکہ ضرور ذہن میں آ رہا ہے۔ بظاہر اس کہانی میں جان برادرز ملوث دکھائی دے رہے

ہیں لیکن دیگر تین مشتبہ افراد یعنی سرائے کا مالک، بارمین اور لڑکی، ان کے پاس مقتول کو مارنے کی وجہ موجود تھی لیکن اس کے بھائیوں کی نیت میں بھی فتور تھا جو جیکب کی وراثت پر قبضہ کرنا چاہ رہے تھے۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں وہ خاصے معقول اثاثوں کا مالک تھا۔"

"بالکل ٹھیک۔" میرل نے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ "اس کی وصیت ان کے حق میں تھی اور اس کی رُو سے وہ ایک معقول رقم کے مالک بن سکتے تھے۔"

"میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے جیکب کے بڑبولے پن کا فائدہ اٹھایا۔ یہ بالکل ظاہر ہے کہ انہوں نے جو حقائق بیان کیے وہ جھوٹ کا پلندا تھے۔ وہاں کوئی ایسی سیڑھی نہیں تھی جو آسمان تک جا رہی ہو، نہ ہی کسی نے مدد کے لیے پکارا، نہ کوئی بھیانک چیخ سنائی دی اور نہ ہی کسی کے گرنے کی آواز آئی۔ یہ محض سادہ سی برادر کشی ہے جس پر پردہ ڈالنے کے لیے کہانی گھڑی گئی ہے۔ جان برادرز اس معاملے میں گردن تک پھنسے ہوئے ہیں اور اس کی کوئی دوسری وضاحت نہیں ہو سکتی۔"

"تمہیں معلوم ہے کہ میں بھی اپنے طور پر اسی نتیجے پر پہنچا تھا۔" میرل نے جواب دیا۔ "لیکن میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ مقتول کیسے گرا؟ ہم نے اس واقعے کے دو تین دن کے اندر ہی پورے علاقے کی صفائی کر ڈالی لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ کہیں بھی معمولی سا سراغ نہیں ملا لہٰذا جان برادرز پر الزام عائد کرنے سے پہلے ہمیں اسے ثابت کرنا تھا۔"

"کیا تم نے ہر پہلو پر غور کر لیا تھا؟" کولن نے قدرے گستاخانہ انداز میں پوچھا۔ "کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ فوری طور پر ترتیب دیے جانے والے آلے کی مدد سے مقتول کو فضا میں پھینک دیا گیا ہو۔ جیسا کہ جنگلوں میں رہنے والے کرتے ہیں۔ وہ درخت کی شاخ کو کمان کی شکل میں موڑ کر مقتول کو ڈھیلے انداز میں باندھ دیتے ہیں اور پھر اسے فضا میں چھوڑ دیتے ہیں۔ شاخ کا چابک والا حصہ کسی کو بھی بہ آسانی ساٹھ فٹ دور پھینک سکتا ہے۔"

"ہم نے اس پر بھی غور کیا تھا۔" میرل نے کہا۔ "لیکن اس کے لیے اس علاقے میں پائے جانے والے درختوں کے مقابلے میں دگنے بڑے درخت درکار تھے۔"

"ٹھیک ہے۔" کولن نے کہا۔ "لیکن میرے قیاس کے مطابق ان دونوں بھائیوں نے یہ قتل کیا ہے۔ اس کے لیے ہمیں مزید سوچ بچار سے کام لینا ہوگا۔ تم کیا کہتے ہو ڈاکٹر ٹوئسٹ؟"

ڈاکٹر آتش دان کے پاس بیٹھا ہاتھ سینک رہا تھا۔ وہ اپنے دوست کی طرف مڑا اور سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "اس کی ضرورت نہیں۔ میجر میرل نے ہمیں وہ تمام معلومات فراہم کر دی ہیں جن کی ہمیں ضرورت ہو سکتی ہے، مجھے یقین ہے کہ اپنے طور پر یہ معما حل کر لو گے۔"

میجر اس کی تائید میں مسکراتے ہوئے بولا۔ "میں بالآخر اپنا کام ختم کر چکا ہوں۔ تم اپنے بارے میں کیا کہتے ہو ڈاکٹر ٹوئسٹ؟"

"بالکل، تمہاری معلومات اتنی واضح ہیں کہ حل صاف ظاہر ہو گیا ہے۔ تم نے اس معاملے میں بائبل کے پہلو پر اصرار کیا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جان برادرز بے گناہ ہیں۔"

"تم نے یہ بات کیوں کہی؟" کولن نے غصے سے کہا۔ "تمہارا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔"

ٹوئسٹ نے کندھے اچکائے اور بولا۔ "کیا تم سنجیدگی سے یہ سوچ رہے ہو کہ وہ مجرم ہیں اور اسی لیے انہوں نے یہ طویل کہانی گھڑی ہے۔ نہیں، انہوں نے سچ بیان کیا ہے۔ ان کا اپنے بھائی کے قتل سے کوئی تعلق نہیں۔ ہمیں کسی اور جانب دیکھنا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ مجرم نے قتل سے کئی روز پہلے جال بچھا دیا تھا اور جیکب سے اس کے عجیب خواب اور وکٹورین سے شادی کرنے کا ارادہ سن کر کچھ تیاری بھی کی ہوگی، لگتا ہے کہ اس کا مقصد صرف جان برادرز سے انتقام لینا نہیں تھا بلکہ وہ خاص طور پر جیکب کو شادی سے روکنا چاہ رہا تھا۔ ہنری کی غیر متوقع آمد سے اسے اس شیطانی منصوبے پر عمل کرنے میں جلدی سے کام لینا پڑا۔ اس نے نصف شب کے قریب ہنری کی گاڑی کا ٹائر پنکچر کر دیا تاکہ اگلے روز ہنری صبح دس بجے سے پہلے فارم نہ پہنچ سکے کیونکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ جیکب روزانہ صبح نو بجے چہل قدمی کے لیے نکل جاتا ہے۔"

"یہ ناقابلِ یقین ہے۔" میرل بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ "مجھے اس معما کو حل کرنے میں سات دن لگ گئے اور اس دوران میں ٹھیک سے سو بھی نہیں سکا جبکہ تم نے جائے وقوعہ کا معائنہ بھی نہیں کیا اور یہاں آرام کرسی پر بیٹھے بیٹھے پندرہ منٹ میں مسئلہ حل کر لیا۔"

"یہ بائبل کا مڑا ہوا صفحہ تھا جس سے مجھے اشارہ ملا۔" ٹوئسٹ نے کہا۔ "اس تصویر میں یسوع مسیح کو کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھا ہوا دکھایا گیا ہے۔ یہ بالکل روزِ روشن کی طرح واضح ہو گیا کہ جیکب بہت زیادہ بلندی

سے نہیں بلکہ بہت زیادہ گہرائی میں گرا۔ وہ کنوئیں میں گرا تھا۔ تم نے خود اس کنوئیں کا ذکر کیا تھا جو ویران فارم کے نزدیک واقع ہے۔ کنوئیں کی تہ تقریباً خشک ہو چکی تھی۔ قاتل کو صرف یہ کرنا پڑا کہ اس نے تالاب کے کنارے سے کچھ پتھر اور ریت اٹھا کر کنوئیں میں پھینک دیے تاکہ جو تھوڑا بہت پانی ہو وہ اس ریت کی تہ کے نیچے دب جائے۔ وہ جیکب کو کسی بہانے ورغلا کر کنوئیں تک لے گیا۔ اسے نیچے گرا کر اس کی کمر کے گرد رسی باندھ دی اور اسے کو ساٹھ فٹ گہری تہ میں پھینک دیا اور پھر اسے واپس کھینچ لیا۔ اس کے بعد اس نے لاش اس جگہ رکھ دی جہاں سے وہ پائی گئی تھی۔ یہ سارا کام آدھ گھنٹے سے بھی کم وقت میں ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ کام کوئی مضبوط جسم والا شخص ہی کر سکتا ہے جو لاش کو کنوئیں سے نکال کر تالاب تک لائے جس سے ہمیں قاتل کی شناخت کرنے کا... اشارہ ملتا ہے۔

"اس کے بعد تمام واقعات ترتیب سے ہوتے چلے گئے۔ قاتل ایک چٹان کے پیچھے چھپ گیا۔ جیسے ہی اس نے دور سے کار کی آواز سنی۔ اس نے جیکب کی آواز کی نقل کی۔ ایسی آواز جس میں جوش ہو، اسے نقل کرنا مشکل نہیں ہوتا اور بیتھیا اس کی توجہ بھی اپنی جانب مبذول کرا لی۔ بڑے بھائی کو جیکب کی ان حرکتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اس لیے وہ ایک نظر جھانک کر اندر چلا گیا۔ جیسے ہی ہنری کی کار مکان کے قریب پہنچی تو قاتل نے ایک طویل اور بھیانک چیخ نکالی۔ دھماکے کی آواز نکالنے کے لیے اس نے پہلے سے ایک ٹیلا غیر متوازن پوزیشن میں رکھا ہوا تھا۔ اس نے یہ سب اس لیے کیا کہ جب دونوں بھائی اپنی گواہی دیں تو کسی کو اس پر یقین نہ آئے۔"

میرل نے تائید میں سر ہلایا اور ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولا۔ "مجھے اعتراف ہے کہ پہلے میں بھی دونوں بھائیوں کو قصوروار سمجھ رہا تھا لیکن اس مڑے ہوئے صفحے نے کافی آسانی پیدا کر دی اور احساس ہوا کہ مجھے گمراہ کیا جا رہا تھا۔"

ٹوئسٹ نے تائید میں سر ہلایا اور بولا۔ "اس کی وجہ یہ تھی کہ اگر جان برادرز نے اپنے بھائی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے کوئی منصوبہ بنایا ہوتا تو وہ ایک ظاہری سراغ نہ چھوڑتے۔"

"بالکل صحیح۔" میرل بولا۔ "اور جب میں نے محسوس کیا کہ ان کے خلاف منصوبہ بنایا گیا ہے تو میرے لیے یہ نتیجہ نکالنا بالکل بھی مشکل نہیں تھا کہ اس کے پیچھے کون ہو سکتا ہے۔ صرف ایک ہی مشتبہ شخص تھا جو جائے وقوعہ سے اپنی غیر حاضری ثابت نہیں کر سکتا تھا اور اتنا مضبوط تھا کہ لاش کو کچھ فاصلے تک لے جا سکے۔"

"دوسرے لفظوں میں تمہارا اشارہ جولین کی طرف ہے۔" کولن اونچی آواز سے بولا۔

"اس نے فوراً ہی سب باتوں کا اعتراف کر لیا۔" میرل نے بتایا۔ "لیکن اسے نسبتاً کم سزا ہوئی اور صرف دس سال کے لیے جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھیج دیا گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ مقدمہ بمشکل غیر جانب دارانہ انصاف کا نمونہ تھا۔

مقامی آبادی میں جان برادرز کی ساکھ اچھی نہیں تھی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ایک جیوری ممبر کا تعلق بھی ان کے ظلم کے نتیجے میں ہونے والی ایک خودکشی سے تھا۔ وکٹورین کی قربانی نے بھی جیوری کو متاثر کیا جب اس نے جولین کو معاف کر دیا اور کہا کہ حسد کا جذبہ اس قتل کا محرک بنا۔"

"گویا بالآخر جولین ہی جیکب کی سیڑھی سے گر پڑا۔" کولن نے نیم مزاحیہ انداز میں کہا۔

"تم یہ بات کہہ سکتے ہو۔" میرل نے جواب دیا۔ "لیکن اسے اس کا جرمانہ ادا کرنا پڑا۔ اور یہ چیز اسے دوسری کوشش سے نہ روک سکی اور اس بار وہ کامیاب ہو گیا کیونکہ اب وہ جنت کے قریب پہنچ چکا تھا۔"

"مجھے اندازہ لگانے دو۔" سپرنٹنڈنٹ نے کہا۔ "اس نے جیل سے رہائی پانے کے بعد اپنے خوابوں میں آنے والی لڑکی سے شادی کر لی ہوگی۔"

"نہیں، ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ جیل سے رہائی پانے کے بعد اس نے مقدس احکامات پر عمل کرنا شروع کر دیا اور راہبانہ زندگی گزارنے لگا۔ اس پر بھی جیکب کا اثر ہو گیا اور وہ ہر وقت اس سیڑھی کا خواب دیکھنے لگا جو اسے آسمان تک لے جائے۔"

"وکٹورین کا کیا بنا؟" کولن نے پوچھا۔

"ظاہر ہے کہ وہ یا اس کا باپ دس سال تک انتظار نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے وکٹورین نے جیکب کے چھوٹے بھائی ہنری سے شادی کر لی کیونکہ وہ ایک پُرآسائش زندگی گزارنا چاہتی تھی۔"

یہ کہہ کر میرل نے حاضرین کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ اب تو تمہیں یقین آ جانا چاہیے کہ یہ ایک ناقابلِ فہم کیس تھا۔

انیسویں قسط

جواری

انمد اقبال
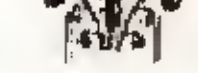
شیکسپیئر کا کہا ہوا ایک ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے کہ زندگی ایک اسٹیج ہے جس پر ہم سب اداکار ہیں جو اپنا اپنا کھیل دکھا کے چلے جاتے ہیں... یہی اداکار زندگی کے آغاز سے انجام تک ایک جوا کھیلتا ہے... جس میں خطرات اور حادثات کی بازی پہلی سانس کے ساتھ لگتی ہے اور آخری سانس تک جاری رہتی ہے... تخلیق کے نقائص ہوں یا بیماریاں... وہ زندگی کے ہر نومولود کو شکست سے دوچار کرنا چاہتے ہیں مگر زندگی مقابلہ کرتی ہے اور یہ کھیل انسانی تدبیر اور نوشتۂ تقدیر کے ساتھ زندگی کے تمام اہم اور غیر اہم فیصلوں میں جاری رہتا ہے... خوشی... غم... نفع... نقصان... دوستی... دشمنی... محبت اور نفرت... سب ہار جیت کی وہ روپ ہیں جن سے ہر انسان ایک جواری بن کے سامنا کرنے پر مجبور ہوتا ہے... جواری... انسانی جذبوں کے ردِعمل سے جنم لینے والی وہ کہانی ہے جو نگر نگر گلی گلی اور گھر گھر نئی بھی لگتی ہے اور پرانی بھی... آپ بیتی بھی اور جگ بیتی بھی... تجسس اور حیرانی کے سارے رنگ دکھلاتی جادو اثر تحریر...

زندگی کی بساط پر اندھا جوا کھیلنے

والے کھلاڑی کی ہوشربا داستان
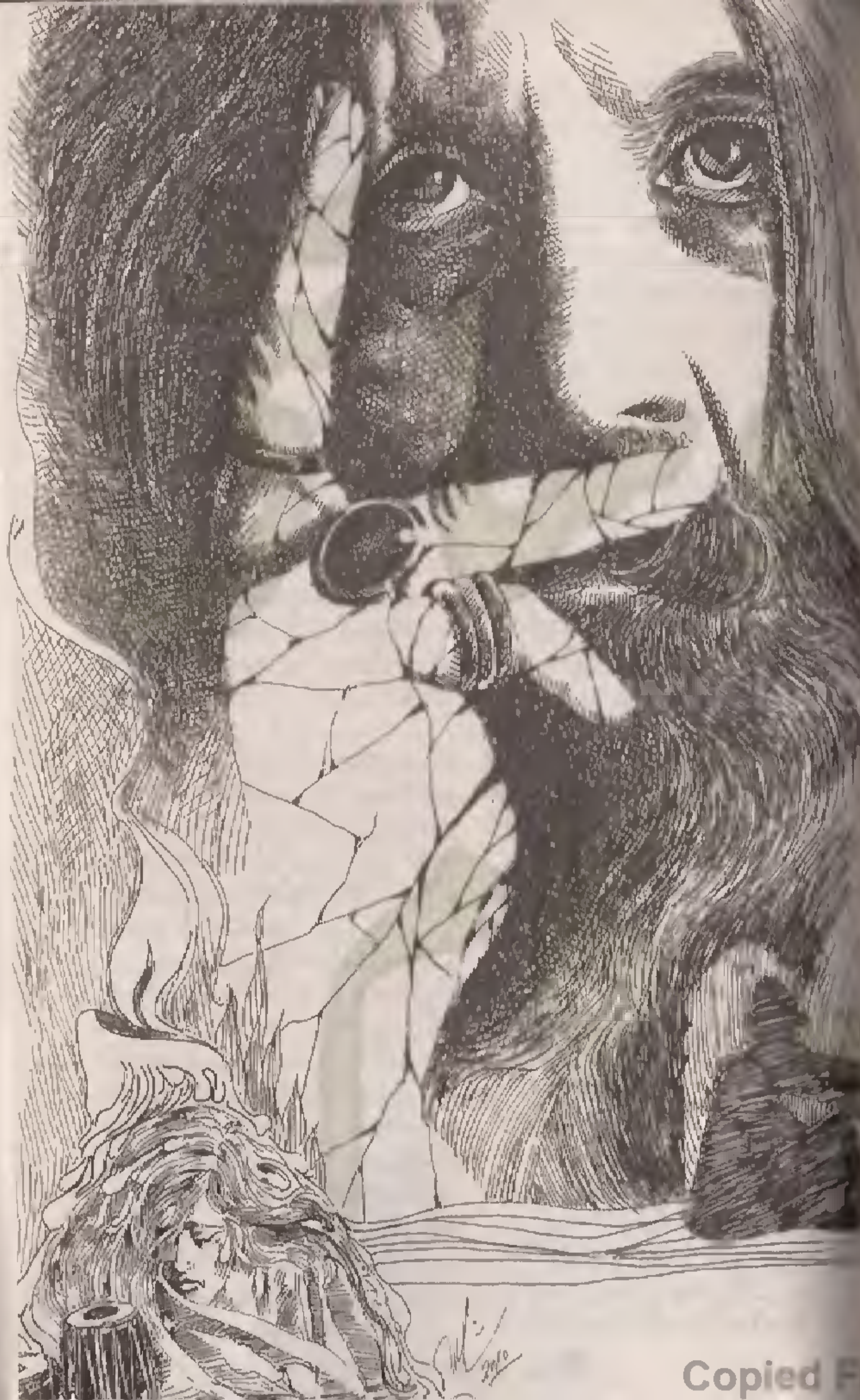
دھماکا اتنی شدید نوعیت کا تھا کہ کچھ دیر تو مجھے اپنے کانوں میں سنسناہٹ سی محسوس ہوتی رہی۔ روشنی گل ہو گئی تھی اور اندھیرے میں نظر کچھ نہیں آ رہا تھا۔ تہ خانے کا کوئی حصہ منہدم ہوا تھا لیکن اینٹوں کے گرنے سے نہ کوئی راستہ بنا تھا اور نہ چھت گری تھی۔ ورنہ باہر کی روشنی کسی سوراخ سے اندر بھی آتی۔ دھول میری ناک اور گلے میں خراش پیدا کر رہی تھی۔

سب سے پہلے میں نے ڈاکٹر کے چلانے کی آواز سنی۔ ”ہائے، مار ڈالا۔“

پھر انور نے کہا۔ ”ملک! تو ٹھیک ہے نا؟“

اس وقت تک میں سنبھل گیا تھا۔ ابھی میں تاریکی میں رانا کی پوزیشن کا اندازہ کر ہی رہا تھا کہ اس نے مجھ پر حملہ کر کے خود اپنی نشان دہی کر دی۔ اس کو لڑنا نہیں آتا تھا۔ وہ نہ پہلوان تھا اور نہ باکسر... اپنے تنور جیسے پیٹ اور تھل تھل کرتے گوشت کے ساتھ وہ چلتا بھی ہاتھی کی طرح تھا۔ اس نے مجھ پر اندازے سے وار کیا تھا مکا میرے شانے پر لگا۔ اس سے میرا کیا بگڑتا۔ میں نے اندازے سے ایک لات گھمائی۔ لات اس کے پیٹ پر لگی اور وہ ذبح ہونے والے بھینسے کی طرح ڈکرا کے زمین پر گر کے واویلا کرنے لگا۔

اس دوران میں انور نے ڈاکٹر صاحب کو دریافت کر لیا تھا۔ انور پوچھ رہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب! کیا ہوا؟ آپ ٹھیک تو ہیں۔

ڈاکٹر ایسی آوازیں نکال رہا تھا جیسے اس پر نزع کا عالم طاری ہو۔ ”آہ مر گئے۔ ہم تو بالکل مر گئے۔ یا اللہ! کس منحوس گھڑی میں ہم نے یہاں آنا منظور کیا تھا، کم بخت ملا نے کیسا قاتل ہاتھ مارا ہے۔ دل، گردے سب تباہ کر دیے۔“

اچانک تاریکی میں ایک ننھا سا شعلہ روشن ہو گیا۔ یہ دیا سلائی انور نے جلائی تھی جس نے کچھ عرصے قبل ہی سگریٹ نوشی شروع کی تھی۔ اندر کا سارا منظر ایک دم واضح ہو گیا۔ رانا پیٹ تھامے فرش پر لوٹ رہا تھا۔ ڈاکٹر بھی کندھا دبا رہا تھا۔ رانا کا مکا اس کے کندھے پر لگا تھا۔ میری نظر نے تہ خانے کے اس گوشے کو دیکھا جو مسمار ہو گیا تھا۔ دھماکا باہر ہوا تھا اور شدت سے تو لگتا تھا کہ کسی نے ایٹم بم پھینک دیا۔ دیواروں کا ایک گوشہ جزوی طور پر ملبے کا ڈھیر بن گیا تھا۔ ایک حصے میں لمبی دراڑیں بھی تھیں مگر آر سی سی کی مضبوط چھت دو طرف کی آدھی آدھی دیواروں پر بھی اسی طرح قائم تھی۔

انور نے دوسری دیا سلائی جلائی۔ ”تو اس حرام زادے پر نظر رکھ، یہ سب اس کی کارستانی ہے۔“

میرا شک بھی یہی تھا۔ ”اس کو چھڑا کر لے جانے والوں نے باہر سے دستی بم پھینکا ہے یا بارود لگا کے اس طرف سے راستہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ پیچھے کیا ہے؟“

”کچھ نہیں، ایک باغ ہے جس میں پھلوں کے درخت ہیں۔ کوئی سو گز لمبا اور پچاس گز چوڑا۔ درخت ابھی زیادہ بڑے نہیں ہوئے۔ اس کے آگے دیوار ہے، اوپر خاردار تار ہیں، ان میں کرنٹ ہوتا ہے رات کے وقت۔“

”اس کا مطلب ہے ادھر سے راستہ بنایا جا سکتا ہے۔ خیر، اب کیا کریں؟“

انور نے کہا۔ ”ہمیں کیا کرنا ہے۔ انتظار کے سوا۔ امدادی کام باہر والے کریں گے، فکر کی کوئی بات نہیں۔“

میں نے سر ہلایا۔

ابھی تک باہر مکمل خاموشی تھی۔ اگر کچھ بھاگ دوڑ ہو رہی تھی تو اس کا نیچے تہ خانے میں پتا نہیں چلتا تھا۔ ڈاکٹر اب بھی سر کو دبا رہا تھا۔ ”ہم کو جانے دو۔ بڑی غلطی کی ہم لانچ میں یہاں آ گئے۔ ابھی ہماری بیوی ہو جاتی بیوہ۔“

میں نے کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب! یہاں سے تمہیں فرشتۂ اجل نہیں لے گیا تو ہم کہاں لے جائیں... کوئی راستہ ہے باہر نکلنے کا۔ یہ بھی سوچو کہ تمہیں ریسرچ مکمل کرنے کے لیے جرمنی جانا ہے۔ اپنا کام مکمل کرو اور جاؤ ایک لاکھ لے کر۔“

”جان ہے تو جہان ہے۔ ہم ہی نہ رہے تو جرمنی کیا ہماری روح جائے گی۔“ وہ فریادی نظروں سے آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔

”کچھ بھی نہیں ہوگا آپ کو... ابھی کچھ دیر میں ہمیں نکال لیا جائے گا۔“

اس نے پھر چھت کی طرف دیکھا۔ ”اور اس سے پہلے ہی چھت کے نیچے دفن ہو گئے ہم پھر؟“

”چھت بہت مضبوط ہے۔ گرے گی تو ہم بھی آپ کے ساتھ دفن ہوں گے۔“

”نہیں بچو گے تم ظالمو، گنہگارو، ہم پر تشدد کرنے والو... اللہ کا عذاب نازل ہوگا سب پر۔“ رانا نے قہر آلود لہجے میں غرانا شروع کیا۔

ایک لات رسید کر کے میں نے اسے گرا لیا اور پھر اس کی گردن پر پیر رکھ دیا۔ ”چلو ڈاکٹر صاحب! لگاؤ انجکشن...“

پہلے والا انجکشن گر کے ضائع ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر نے دوسرا انجکشن بھر کر رانا کے بازو میں سوئی پیوست کر دی۔ وہ اب حلق سے خرخراہٹ نکال رہا تھا اور انجکشن سے بچنے کی کوشش میں فرش پر ہاتھ پٹخ رہا تھا۔ اس ہاتھ کو انور نے

دبا لیا۔ آہستہ آہستہ ساری دوا رانا کے جسم میں اتر گئی۔ میں نے بھی اسے چھوڑ دیا۔ خوف سے اس کی آنکھیں ابل رہی تھیں اور چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔

”یہ زہر کا انجکشن دیا ہے تم نے۔ تم خونی ہو... قاتل ہو۔“ وہ لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے بولا۔

”مارنا ہوتا تمہیں تو زندہ کیوں رکھتے اب تک۔“ انور نے کہا۔ ”جب تک تم دوسرے دس شیطانوں کے بارے میں نہیں بتاؤ گے ہم تمہیں نہیں مرنے دیں گے۔“

میں نے ڈاکٹر سے پوچھا۔ ”کتنی دیر میں اثر کرے گی دوا؟“

”تین سے پانچ منٹ۔“ وہ بولا۔ ”امداد کب آئے گی؟“

”وقت تو میں نہیں بتا سکتا کہ کتنا لگے گا لیکن باہر والے ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھے ہوں گے۔ صبح ہونے سے پہلے وہ ہمیں نکال لیں گے۔“ انور بولا۔

تشویش انور کے چہرے سے بھی عیاں تھی اور میں بھی یہ سوچ رہا تھا کہ نیچے تہ خانے میں سنائی دینے والے دھماکے کی شدت بہت زیادہ تھی یا مجھے محسوس ہوئی تھی؟ مجھے بھی یہ خیال پریشان کر رہا تھا کہ اوپر اس کی تباہی کتنی ہوگی۔ حالات کے پیش نظر یہی امکان قوی تھا کہ رانا اور اس کے حالی موالی ہی اس تخریب کاری کے ذمے دار ہو سکتے ہیں مگر اس امکان کو یکسر مسترد کرنا بھی مشکل تھا کہ یہ سکندر شاہ کے کسی کاروباری حریف یا دشمن کی تخریب کاری نہ ہو۔ میری طرح انور کو بھی ان کی سلامتی کا خیال پریشان کر رہا ہوگا جو گراؤنڈ فلور پر تھے۔ سکندر شاہ کی بیوی، اس کی بہو روبی اور ریشم۔ یہ وسوسے اس وقت تک ختم نہیں ہو سکتے تھے جب تک کوئی نیچے نہ آئے۔ ابھی تک باہر سے کسی ملبا ہٹانے والی مشینری یا کھدائی کے آلات کی کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ ظاہر ہے ابھی ہمیں نکالنے کا کام شروع ہی نہیں ہوا تھا۔

انور کی حویلی اس سے پہلے اڑائی جا چکی تھی۔ اب سکندر کی باری آئی تھی۔ بظاہر اس کے ان بدمعاش بدکردار مریدوں سے کوئی براہِ راست اختلافات نہیں تھے۔ ان کے اور ہمارے درمیان معاملات طے پا رہے تھے۔ کم سے کم وہ ایسا ہی سمجھتے تھے۔ انہیں یقین ہوگا کہ انور کی ماں کی ہاں کے ساتھ ہی... معاملات طے پا جائیں گے۔ وہ ہم سے اپنی بات منوا لیں گے پھر انہوں نے انتظار کیوں نہیں کیا۔ کیا دوسری دھمکی دباؤ بڑھانے کے لیے تھی کہ ہمارا اگلا ہدف روبی ہو گی۔ خود روبی اپنی زمین پر... دھوکے فراڈ اور عیاشی کا دھندا دوبارہ شروع کرنے کے حق میں نہیں تھی۔

یہ بات بھی انہیں مشتعل کر سکتی تھی کہ خود پیر سائیں کی بیٹی اس کاروبار کے خلاف ہے جو اس کا باپ تمام عمر کرتا رہا۔ اس میں خود روبی کے لیے فائدہ ہی فائدہ تھا۔ عزت، شہرت، دولت اسے ورثے میں ملتی کچھ کیے بغیر... کیونکہ اب اس کے سوا پیر سائیں کا وارث ہی کہاں تھا۔

لیکن یہ بڑی دور کا خیال تھا۔ روبی تمام جائداد کی تنہا وارث ضرور تھی مگر خود بھی تنہا تھی ورنہ یہ الزام بھی مراد کے سر جاتا کہ روبی مجبور ہے کیونکہ اس کا شوہر پیری فقیری کو نہیں مانتا۔ اب روبی کے انکار کے پیچھے صرف انور کا نام آ سکتا تھا جو روبی کا کزن تھا اور باہر کی پڑھائی نے اسے گمراہ کر دیا تھا۔ چنانچہ یہ دوسرا حملہ انور کو سمجھانے کے لیے تھا کہ حویلی سے نکل کے بھی خود کو محفوظ نہ سمجھو، رانا کو چھوڑ دو ورنہ ماں تو جائے گی تم بھی بچ کے نہیں... اور ان تمام خیالات سے الگ ایک خیال تھا کہ اس قسم کی تخریبی کارروائی خود سکندر کے دشمن اور کاروباری حریف بھی کر سکتے ہیں...

ہم سب اپنے اعصاب پر قابو رکھنے کی کوشش میں مصروف تھے اور اس میں ناکام تھے مگر ایک دوسرے کا حوصلہ برقرار رکھنے کے لیے اضطراب کو ظاہر نہیں ہونے دے رہے تھے۔ رو پیٹ کے ڈاکٹر بھی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا اور زیرِ لب دعائیں مانگ رہا تھا یا اس وقت کو کوس رہا تھا جب لانچ میں وہ ایک غیر قانونی کام کرنے ہمارے ساتھ آ گیا تھا۔ رانا کے جلال اور ناقابلِ شکست ہونے کے یقین کا غبارہ اب عرش سے فرش پر اتر آیا تھا۔ معاملہ جسمانی قوتِ برداشت کے مظاہرے سے آگے بڑھ گیا تھا۔ اتنا تو وہ بھی سمجھتا تھا کہ انجکشن دینے کا مقصد اسے جان سے مارنا نہیں۔ یہ کام بہت پہلے زیادہ آسانی سے کوئی بھی کر سکتا تھا۔

آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں مندنے لگیں جیسے اس پر غنودگی غالب آ رہی ہے۔ ”تم... تم نے نیند کا انجکشن دیا ہے مجھے... سؤر کے بچے...“

اس نے آخری بار آنکھیں کھول کے مجھے دیکھا اور پھر فرش پر لڑھک گیا۔ میں نے اسے سیدھا کر دیا۔

ڈاکٹر نے یہ سب بے نیازی اور بیزاری سے دیکھا۔ ”اب تم اس سے کچھ بھی پوچھو یہ بتائے گا۔“

تصدیق کے لیے میں نے رانا سے اس کا اور باپ کا نام پوچھا۔ مجھے کوئی جواب نہیں ملا۔ دوسری بار میں نے اس کے کان سے منہ لگا کے وہی سوال دہرایا۔ اس نے کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔ وہ گہری نیند میں تھا۔ انور نے ڈاکٹر سے پوچھا۔ ”یہ تو بولتا ہی نہیں۔“

"پھر میں کیا کروں؟" وہ چڑ کے بولا۔ "میں نے اپنا کام کر دیا۔"
مجھے اس کے جواب سے مایوسی ہوئی۔ "کوئی وجہ تو ہو گی۔ دوا نے اثر نہیں کیا۔"
"کبھی اسپرین بھی سر درد میں کام نہیں کرتی۔ کسی دوا کی کارکردگی سو فیصد نہیں ہوتی۔"
اس جواب پر مجھے سوچنا پڑا۔ "اس کے سائڈ ایفیکٹ بھی ہوں گے۔ مضر اثرات۔"
"وہ کس دوا کے نہیں ہوتے؟"
اس کی بات غلط نہیں تھی مگر مایوسی کا ردِعمل غصے کی صورت میں ظاہر ہوا۔ "تم کو بتانا چاہیے تھا۔"
"میں انجکشن لگانے آیا تھا۔ تمہیں میڈیکل کی تعلیم دینے نہیں۔ پڑھے لکھے ہو، پڑھ لو خود کہ پرچے پر کیا لکھا ہے۔"
انور ایک کے بعد دوسری دیا سلائی روشن کرتا جا رہا تھا۔ آخری تیلی کے بعد ہمارا گھپ اندھیرے میں بیٹھ کے انتظار کرنے کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ جب تک ہمیں نکال نہ لیا جائے یا روشن دان سے نئے دن کا اجالا اندر نہ پہنچے۔ باہر سے امدادی کام شروع ہونے کی آوازیں اب سنائی دے رہی تھیں۔ میرا اندازہ تھا کہ سکندر کے انجینئر مشینری کی مدد سے ہمیں ایک دو گھنٹے میں نکال لیں گے۔ اس تاریکی میں ہم انجکشن کے اندر سے نکلنے والا پرچہ ترکیب استعمال خاک پڑھتے جو انتہائی باریک انگریزی میں ہوگا اور ہمیں سمجھانے کا بھی تو خود ڈاکٹر۔
"یہ تو ہم نے سوچا ہی نہیں تھا۔ محنت اور وقت ضائع کر کے کچھ حاصل نہیں ہوا۔" انور تاریکی میں بولا۔
"اب رانا کو کچھ نہ ہو۔ یہاں سے نکل کے سوچیں گے کچھ۔"
"یہ کہیں مر نہ جائے۔" انور نے اپنے خوف کا اظہار کیا۔ "پھر ہمارے پاس کیا ہوگا اماں کی رہائی کے لیے؟"
"مایوس مت ہو۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ ہم ان کا مطالبہ مان لیں گے۔ انہیں درگاہ پھر بنانے کی اجازت دے دیں گے مگر اماں کو ہر قیمت پر واپس لے آئیں گے۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "بعد میں ایسی تیسی کر دیں گے سب کی.... جنگ میں کوئی اصول یا ضابطہ نہیں چلتا۔"
تاریکی میں انور کی صورت کے تاثرات کا اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ اس کے دلی جذبات کو میں سمجھ سکتا تھا۔ باہر سے سنائی دینے والی آوازیں اب زیادہ واضح تھیں۔
گڑگڑاہٹ غالباً ملبا ہٹانے والے ٹریکٹر شاول کی تھی پھر کسی نے بھاری ہتھوڑے سے دیوار کو ضرب لگانا شروع کیا۔ اس کی دھمک سے شکستہ حصے کا سیمنٹ جھڑنے لگا تھا۔ امدادی کام میں مصروف لوگوں کی ملی جلی آوازیں بھی میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ انور نے ایک اور دیا سلائی روشن کی۔ اندر سب ویسا ہی تھا۔ رانا فرش پر مگرمچھ کی طرح پڑا تھا۔ ڈاکٹر بیزاری، تھکن اور خوف میں دیوار کے ساتھ سمٹا بیٹھا تھا۔
"یار ڈھائی بج گئے۔" انور نے کچھ حیرانی کے ساتھ کہا۔ "تین گھنٹے پہلے دھماکا ہوا تھا۔"
"بس اب تھوڑی دیر کی بات ہے۔" میں نے کہا۔
ایک ضرب کے ساتھ کونے کی چھت کا ٹکڑا ٹوٹ کے گرا۔ میں نے تہ خانے کے گھپ سیاہ اندھیرے میں باہر کی تاریکی کو دیکھا تو وہ مجھے روشنی لگی۔ بہت اوپر آخر شب کے ہم سفر ستاروں کا سفر جاری تھا اور ایک ستارے کی روشن کرن چھت کے سوراخ سے جھانک رہی تھی۔ اب میں تمام آوازوں کو سن سکتا تھا۔ مشینی کام ختم ہو گیا تھا۔ وہ چار مددگار ہدایات کے مطابق احتیاط سے دیوار کا اوپری حصہ گرانے لگے تھے۔ کسی نے ہم سے چلا کے کہا۔ "دور رہنا صاحب۔"
میں نے دھیان سے سنا۔ ان میں سکندر شاہ کی آواز شامل نہیں تھی۔ اسے نگرانی کرنے والوں کا نگراں بن کے موجود رہنا چاہیے تھا۔ میرا خوف انور کی زبان پر سوال بن گیا۔ "سکندر شاہ کہاں ہے؟"
"یہی میں بھی سوچ رہا تھا۔" میں نے کہا۔
"کہیں وہ بھی زخمی یا...." انور نے اندیشے کو لبوں تک نہ آنے دیا۔ "ان کی بھی آواز سنائی نہیں دیتی.... ریشم بیا روبی کی۔"
"میرا خیال ہے ان کو دور رکھا ہوگا۔ دھماکا اتنا بڑا نہیں تھا کہ پوری عمارت گرتی۔"
"اوپری منزل کے بیڈروم عین ہمارے اوپر ہیں۔" اس نے چھت کی طرف دیکھا۔
"چھت سلامت ہے اسی لیے مجھے یقین ہے کہ وہ محفوظ ہوں گی۔"
اچانک باہر سے کسی نے ایک دردناک چیخ ماری۔ "آہ...." اور یہ آواز دیوار کے شگاف کے بہت قریب سے آئی تھی۔ میرا یہ خیال پانی کے بلبلے سے بھی کم پائیدار ثابت ہوا کہ شاید کوئی زخمی ہوگا۔ ملبا ہٹانے والے احتیاط کے باوجود حادثے کا شکار ہو جاتے ہیں مگر چند سیکنڈ کے وقفے

ڈالی اور چلایا۔ "اوئے، یہ کیا ہے؟" پھر اس کی آواز بلند ہو گئی۔ میری چھٹی حس خطرے کی گھنٹی بجانے لگی۔ انور نے ابھی پوچھا ہی تھا کہ "یہ کیا ہو رہا ہے؟" کہ وقفے وقفے سے دیگر کئی احتجاجی، خوف زدہ اور پُر اذیت آوازیں سنائی دیں۔
میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "انور معاملہ گڑبڑ ہے۔ یہ ہمارے مددگار نہیں ہیں، تو ماچس دے مجھے۔"
وہ مجھ سے پہلے کھڑا ہو گیا تھا۔ "میں تو خالی ہاتھ ہوں۔" اور ماچس مجھے تھما دی۔
میں اس گوشے کی طرف دوڑا جو واش روم تھا۔ "کوئی غلطی مت کرنا۔" اور باتھ روم میں گھس کے دروازے کو اندر سے لاک کر لیا۔ اندر گھپ اندھیرا تھا۔ ایک دیا سلائی جلا کے میں نے واش روم کے اندر کا جائزہ لیا۔ آدھے حصے میں واش بیسن اور شاور تھے۔ دوسری طرف کموڈ تھا۔ میں کموڈ کی ٹنکی پر چڑھا اور ایک ہاتھ اوپر اٹھایا۔ روشن دان میں ہوا باہر پھینکنے والا پنکھا لگا ہوا تھا، اب بھی مجھ سے ایک فٹ اوپر تھا۔ اس وقت میری ساری توجہ اپنے کام کی طرف تھی کیونکہ وقت کم تھا۔ میں باہر سے سنائی دینے والی آوازوں سے اپنا پلان مرتب کر رہا تھا۔ اب شبہے کی بات نہ تھی۔ دھماکا کرنے والوں نے پہلے پیچھے سے راستہ بنایا تھا اور پھر ملبا ہٹانے کے امدادی کارکنوں میں شامل ہو گئے تھے۔ اب وہ اندر آ گئے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ صرف اپنے آدمی رانا کو چھڑا کر لے جانے نہیں آئے تھے بلکہ اس کے ساتھ وہ ہمیں بھی لے جاتے۔
ہاتھوں سے ایک فٹ اوپر رہ جانے والے روشن دان کی کناری کو پکڑنے کا اور کوئی طریقہ نہ تھا۔ سوائے اس کے کہ میں اندازے سے جست لگاؤں اور دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے کناری کو مضبوطی سے پکڑ لوں۔ اس میں بہت سے خطرات تھے مگر سوچنے میں ضائع کرنے کے لیے وقت ہی کہاں تھا، آگے کنواں پیچھے کھائی۔
میں نے آنکھیں بند کر کے اللہ کا نام لیا اور پنجوں کے اسپرنگ پر اچھلا۔ وہ صرف ایک سیکنڈ کا یا اس سے بھی کم وقفہ تھا جس میں میری کوشش سے کچھ نہیں ہوا۔ سب خود بخود ہو گیا اور اس کی رضا سے ہوا جو انسان کے فیصلوں کو ناکامی یا کامیابی سے دوچار کرنے پر قادر ہے۔ میرے ہاتھ فولادی شکنجے کی طرح کنارے پر جم گئے اور میرا جسم اوپر اٹھ گیا۔ روشن دان کی گہرائی ڈیڑھ فٹ کے قریب تھی۔ ایگزاسٹ فین اس طرح لگائے جاتے ہیں کہ ان کی موٹر اندر کی طرف رہے تاکہ بارش کا پانی موٹر کی جالی سے اندر جا کے اسے شارٹ نہ کرے۔ اس کے تین یا چار پروں کو لوہے کے مضبوط حلقے میں باہر سے نٹ بولٹ لگائے جاتے ہیں۔
اگلی کوشش میں میرے ایک ہاتھ نے اس پنکھے کی جالی کو پکڑ لیا۔ لوہے کی گرل کے اندر سے نکل آنا ممکن نہیں تھا۔ ایک مسلسل حرکت میں میرے ہاتھ نے مجھے اتنا اوپر کھینچا کہ میں ڈیڑھ فٹ مربع میں پاؤں رکھ کے تقریباً الٹا لٹک گیا۔ اب سوچتا ہوں تو وہ سب ایک طویل ناممکن سی کوشش تھی جس میں سخت مشقت کے ساتھ بہت وقت لگا۔ وہ گھنٹوں کی ٹینشن تھی لیکن دس سیکنڈ کی جدوجہد.... سانس کو قابو میں کر کے میں نے باہر کی آوازوں پر توجہ دینے کا سوچا تھا کہ کسی نے دھڑ سے دروازے پر لات ماری اور چیخ کے کہا۔ "باہر آجا شرافت سے۔"
میں نے ساری جسمانی توانائی کو ایک نکتے پر مرکوز کر لیا۔ ایک.... دو.... تین۔
ڈور لاک پر ایک فائر ہوا اور دروازے پر دوسری لات پڑی۔ باہر کسی ٹارچ کی روشنی ہوئی جس میں ایک سایہ اندر آیا۔ اس نے باتھ روم میں ادھر ادھر دیکھا اور آگے بڑھا۔ "کہاں گیا؟"
بس وہی فیصلہ کن لمحہ تھا جب میں نے خود کو اس کے اوپر گرا دیا۔ اب اتنا اجالا تھا کہ میں کہیں اور نہیں گر سکتا تھا۔ وہ یوں منہدم ہو گیا جیسے برف کی چٹان پر پتھر کی چٹان آ گرے۔ دوسرے لمحے اس کی کلاشنکوف میرے ہاتھ میں تھی اور اس کا سر کموڈ سے ٹکرا کے کریک ضرور ہوا ہوگا۔ اس کے سر پر گن کا فولادی دستہ لگا۔ میں ایک جست میں دروازے سے نکلا۔ روشنی اوپر کسی ٹارچ سے آ رہی تھی۔ ایک شخص رانا پر جھکا ہوا تھا اور غالباً تصدیق کر رہا تھا کہ وہ زندہ ہے یا بے ہوش۔ ڈاکٹر ثابت کرنے میں لگا ہوا تھا کہ وہ ہمارے ساتھ نہیں مگر اس کی دہائی سننے والا کون تھا۔ انور اس کے ساتھ بے بسی سے ہاتھ اوپر اٹھائے کھڑا تھا۔ اس کے پیچھے تیسرا شخص کلاشنکوف لیے مستعد تھا۔
"نیچے رکھ دے گن۔" اس نے بھاری بیٹھی ہوئی آواز میں مجھے حکم دیا۔
میں اپنی جگہ منجمد ہو گیا۔ میری جدوجہد رائیگاں گئی تھی۔ انور نے بے بسی سے مجھے دیکھا۔
"اوئے شکل کیا دیکھ رہا ہے۔ مرنا چاہتا ہے؟" اس نے ایک گالی کے ساتھ کہا۔
میں نے جیتی ہوئی بازی ہار دی اور آہستہ آہستہ

گھٹنوں کے بل جھک کر کلاشنکوف فرش پر رکھ دی۔ اس نے انور کو دھکیلا۔ میں اور وہ ایک ہی صف میں آگے پیچھے ہو گئے۔ ڈاکٹر مجھ سے چند قدم آگے تھا۔

رانا کا فرش پر طبی معائنہ کرنے والا اٹھ کھڑا ہوا۔ ”یہ تو مر گیا۔“

”اچھی طرح دیکھ لیا؟“

”تم دیکھ لو۔ نہ سانس آرہی ہے نہ نبض چل رہی ہے۔“ طبی رائے دینے والے نے بھی کلاشنکوف اٹھالی جو اب تک اس کے قریب ہی فرش پر رکھی ہوئی تھی۔

”چھوڑو اسے، ہمیں اب نکلنا ہے۔“ میرے پیچھے والا بولا جو انہیں کمان کر رہا تھا۔

فرش پر اینٹوں کے ڈھیر پر قدم رکھتا انور چھت کے شگاف کی طرف چڑھنے لگا۔ دو طرف سے وہ قاتل ہمیں غلط حرکت پر بھون ڈالتے۔ میں حیران تھا کہ سچ تو ہم بے بس اور مجبور تھے اور پر سکندر کی نا قابل شکست سمجھی جانے والی سیکیورٹی کدھر گئی۔ وہ خود کہاں ہے؟ ریشم اور روبی کہاں ہیں؟ کیا ہماری طرح سب پکڑے گئے۔ یہ بات عقل تسلیم نہیں کرتی تھی کہ امدادی کام کرنے والوں میں شامل ہو کے اتنی بڑی مسلح فورس مراد نگر میں داخل ہو گئی کہ انہوں نے تمام سیکیورٹی فورس کو بے بس اور ناکارہ کر دیا۔

ڈاکٹر، میں اور انور اس چھوٹے موٹے محل جیسے گھر کے عقبی حصے میں طلوع ہوئے۔ اس طرف آنے کا مجھے کوئی اتفاق پہلے نہیں ہوا تھا۔ سو گز کے فاصلے پر جو فصیل تھی، وہ دس فٹ اونچی تھی۔ اس پر بھی خاردار تاروں کی تین قطاریں تھیں جس کو ہر آٹھ دس فٹ کی دوری پر نصب لوہے کے ڈنڈوں نے سنبھال رکھا تھا۔ شاید ان میں کرنٹ بھی ہوگا لیکن سب انتظامات دھرے رہ گئے تھے۔ وہ چوروں کی طرح نقب لگا کے آئے تھے۔

باہر ایک ”ایکس کویٹر“ کھڑا تھا جس کا کرین والا فولادی پنجہ مٹی پتھر ملبا سب سمیٹ کر کسی ٹرک میں ڈال سکتا تھا مگر اس کے استعمال کی نوبت نہیں آئی تھی۔ ایک ٹریکٹر نے کچھ راستہ بنایا تھا۔ باقی مزدوروں نے۔ مجھے ادھر ادھر کچھ لوگ بے حس و حرکت پڑے نظر آئے۔ یہ وہی لوگ تھے جو امدادی کام کے لیے طلب کیے گئے تھے۔ وہ سامنے سے اپنی مشینری کے ساتھ پہنچے تھے۔ پچھلی طرف سے داخل ہو کے چار بدمعاش ان میں شامل ہو گئے۔ انہیں پتا بھی نہ چلا۔ اب ان کو اٹھا کے گاڑیوں میں ڈالا جا رہا تھا۔

یہ بڑا دل خراش منظر تھا۔ انور نے پوچھ لیا۔ ”کیا تم نے ان سب کو مار دیا ہے؟“

”ہاں، اب یہ مت پوچھنا کیسے... ورنہ مار کے بتانا پڑے گا۔“ باقی تین کو کمان کرنے والا غرایا۔

ڈاکٹر بھوں بھوں رونے لگا۔ ”ارے ظالمو! مجھے تو جانے دو، قسم خدا کی یہ مجھے گھر سے لائے تھے زبردستی... میں ڈاکٹر ہوں۔“

کچھ فاصلے پر ایک ایمبولینس موجود تھی اور ایک فائر بریگیڈ کی گاڑی۔ ڈرائیور کسی میں نہیں تھا۔ ان میں سے ایک نے ایمبولینس کا پیچھے والا دروازہ کھولا اور انور کو اندر دھکیلا۔ میں نے کوئی مزاحمت لاحاصل سمجھی اور خود ہی چڑھ گیا۔ ڈاکٹر ابھی تک واویلا کر رہا تھا اور ہم سے لاتعلقی ثابت کر کے یہ چاہتا تھا کہ اسے اصل مجرمان سے خارج کر دیا جائے مگر گیہوں کے ساتھ گھن کی طرح وہ بھی اس انجام کی طرف دھکیلا جا رہا تھا جو ہمارا نصیب تھا۔ مجھے واقعی اس پر افسوس ہو رہا تھا کہ خوامخواہ مارا گیا۔ اسے لالچ کی سزا بھی نہیں سمجھا جا سکتا تھا، وہ ایک اچھے مقصد کی خاطر ہمارا ساتھ دینے پہ راضی ہوا تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس مقصد کے حصول سے اس کی اپنی ذات کو مادی فائدہ کچھ نہ تھا۔ اس سے زیادہ بھلائی کا پہلو تمام بنی نوع انسان کے لیے ہو سکتا تھا۔ وہ خود بہت دولت کما سکتا تھا اور اس سے سب کچھ حاصل کر سکتا تھا مگر اس وقت وہ جائز ناجائز کو دیکھتا رہا یہاں تک کہ وقت گزر گیا۔ آج اس نے خود کو قائل کر لیا تھا کہ نیک منزل پر پہنچنے کے لیے غلط راستہ اختیار کیے بنا چارہ نہیں۔ آج ہی اسے سزا مل گئی تھی۔ کچھ لوگ بلکہ اکثر لوگوں کی زندگی اس کے برعکس گزرتی ہے اور قدرت انہیں یوم حساب تک مہلت دیتی جاتی ہے۔

چار افراد کے اس گروہ کی ساری حکمت عملی میری سمجھ میں آچکی تھی جو انتہائی ذہانت سے مرتب کی گئی تھی۔ وہ پیچھے سے داخل ہوئے تھے اور اب اطمینان سے سامنے سے جا رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے فائر بریگیڈ کی گاڑی سنبھال لی تھی۔ دوسرا ایمبولینس ڈرائیو کر رہا تھا۔ یہ دونوں سڑک پہ سے گزرتی ہیں تو سائرن بجاتی کہ راستہ دے دو۔ ایمرجنسی ہے، ہٹ جاؤ اور سائرن کی آواز پر لوگ خود بخود ایک طرف ہو جاتے ہیں۔ پُرشور بازاروں اور مصروف شاہراہوں پر سے یہ گاڑیاں کسی ٹریفک سگنل کی پروا کیے بغیر پوری رفتار سے گزرتی ہیں۔ میں یہ بچپن سے دیکھتا آیا تھا۔ یہ مراد نگر میں بھی ایسے ہی داخل ہوئی ہوں گی۔ اب وہ اسی طرح واپس جا رہے تھے۔ نہ آتے وقت سیکیورٹی ان کی راہ میں حائل ہوئی ہوگی نہ اب ہوگی۔ میں دونوں گاڑیوں کی چلاتے سائرن سن رہا تھا اور مجھے ان کی تیز رفتاری کا بھی اندازہ ہو رہا تھا۔ گیٹ پہلے سے پورے کھول دیے گئے ہوں گے اور تشویش زدہ چہروں والے گارڈ ایک طرف کھڑے دیکھ رہے ہوں گے۔

ہم گیٹ سے گزرتے وقت ایک ساتھ گلا پھاڑ کے چلاتے تب بھی نہ ہماری آواز کوئی سنتا نہ سمجھتا کہ حقیقت کیا ہے اور ایسا ہی ہوا۔ اسٹریچر ایمبولینس کے وسط میں اسپتالی بیڈ کے رخ تھا۔ وہ چالاک لوگ تھے۔ انہوں نے ڈاکٹر کو اسٹریچر پر لیٹنے کا حکم دیا اور وہ فوراً مردے کی طرح لیٹ کے ساکت ہو گیا۔ فریاد و فغاں اور اپنی بے گناہی پر رحم کے جتنے ڈائیلاگ وہ بول سکتا تھا، آنسوؤں کے ساتھ ادا کر چکا تھا اور اب قبر میں پڑے مردے کی طرح تھا۔

اسٹریچر کے دونوں طرف مجھے اور انور کو فرش پر بٹھا دیا گیا تھا۔ ایمبولینس ٹویوٹا کی ہائی ایس تھی۔ ہم ڈرائیور کے بالکل پیچھے درمیانی پارٹیشن سے کمر لگائے بیٹھنے پر مجبور تھے۔ دو موت کے فرشتے ہم سے دور پچھلے گیٹ سے کمر لگائے چوکس کھڑے تھے اور ان کے ہاتھوں میں اب کلاشنکوف نہیں بلکہ جدید خودکار پستول تھے۔ میرے اور انور کے خیالوں کی سمت ایک ہی تھی لیکن یہاں بات کرنا لاحاصل تھا۔ ایمبولینس کی کھڑکیوں کے شیشوں سے اسٹریٹ لائٹس کا اجالا چمک رہا تھا لیکن ٹریفک لائٹس اس وقت نہیں تھیں۔ باہر سے کوئی آواز بھی سنائی نہ دیتی تھی۔ ایمبولینس کا سائرن بھی گیٹ سے باہر آنے کے بعد خاموش ہو گیا تھا۔ خالی سڑکوں پر اس کی ضرورت نہیں تھی۔

انور نے اچانک پوچھ لیا۔ ”باقی سب کا کیا ہوا؟“

میں نے بے خیالی میں جواب دیا۔ ”شاید وہی جو ہمارے ساتھ ہو رہا ہے۔“

گیٹ کے نگراں نے غرا کے ریوالور کو لہرا کے ہمارا منہ بند کرا دیا۔ ”اب حلق سے آواز نکلی تو دوسری طرف سے گولی نکل جائے گی... سمجھا؟“

دوسرے نے اس کی طرح سر بھی ہلایا اور ریوالور بھی لہرایا۔

آپس میں کوئی کام کی بات کرنا یوں بھی لاحاصل تھا۔ میں نے سوچا کہ رونی شکل بنا کے بیٹھنے سے بھی کیا ہو گا۔ ان دونوں میں سے ایک پستہ قد... صورت سے عیار اور چالاک لگتا تھا۔

میں دھمکی دینے والے کی طرف دیکھ کے ہنس پڑا۔

”تم حکم کے غلام۔ آگے اپنے باپ کو کیا جواب دو گے؟ اپنی مرضی سے مکھی نہیں مار سکتے۔“

اس کے حلق سے غرغراہٹ نکلی جیسے سلگتے کوئلوں پر پانی پڑ جائے۔

”اور تم، سر ہلاتے ہو تو اندر سے کنکر بجنے کی آواز آتی ہے۔ حکم کے غلام کے غلام۔“

انور نے خفگی سے مجھے دیکھا۔ ”مت پنگا لے۔ پاگل کتے کی دم پر پیر رکھنا کوئی تماشا نہیں۔“

گاڑی اچانک رک گئی۔ گاڑی کی سمت سے اندازہ ہوتا تھا کہ ہم انور کے گاؤں کی جانب رواں ہیں مگر ابھی مراد نگر سے زیادہ دور نہیں آئے تھے۔ غالباً وہ ایمبولینس کا ڈرائیور تھا جس نے پیچھے والا دروازہ اٹھایا۔ چھوٹی سی نیم پختہ سڑک پر آخر شب کے چاند نے دھندلا سا پھیلا رکھا تھا۔ مراد نگر ایک نئی کالونی تھی جو سکندر شاہ نے بسائی تھی۔ بعد میں دوسرے بلڈر بھی آس پاس کی زمین خرید کے تعمیراتی منصوبے لے آئے تھے۔ ان سب نے پراجیکٹس کو کامیاب بنانے کے لیے مین روڈ سے تقریباً دس کلومیٹر تک سڑک پختہ کرانے کے بعد اس پر لائٹس بھی لگا دی تھیں ورنہ گرد و نواح کی دیہی سڑکوں کا حال خراب تھا۔

مجھے سڑک کے وسط میں تین گاڑیاں نظر آئیں جو دروازے کھولے ایک قطار میں یوں کھڑی تھیں جیسے کوئی بانہیں پھیلائے ہمیں خوش آمدید کہہ رہا ہو۔ ظاہر ہے ہمیں اپنی منزل تک ایمبولینس یا فائر بریگیڈ کی گاڑی میں نہیں لے جایا جا سکتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ ایک گاڑی میں ایک قیدی کو لے جایا جائے گا۔ چار میں سے تین ڈرائیور ہوں گے۔ میں نے سوچا۔ ایک سب کا محافظ کیسے ہوگا۔ میری یہ ساری خوش فہمی تینوں گاڑیوں میں ڈرائیورز کو بیٹھا دیکھ کر دور ہو گئی۔

مجھے آنکھوں پر پٹی اور ہاتھ کمر کے پیچھے باندھ کے ایک گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بٹھایا گیا۔ چار میں سے دو میرے دائیں بائیں دروازے کے ساتھ بیٹھ گئے۔ انور اور ڈاکٹر کے لیے ایک محافظ کافی سمجھا گیا۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اصل خطرہ مجھ سے ہو سکتا ہے۔ میرے بیٹھتے ہی گاڑی چل پڑی۔ وقت اور فاصلے یا سمت کا اندازہ بھی میرے لیے ممکن نہ تھا۔ میں نے خود کو تن بہ تقدیر چھوڑ دیا اور سر سیٹ کے پیچھے لگا کے آنکھیں بند کر لیں۔ ریلیکس... میں نے خود سے کہا۔ آگے کیا ہونے والا ہے کچھ پتا نہیں۔ جسم کے ساتھ میرے دماغ کا پُرسکون ہونا ایک ضرورت ہے۔

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ کوئی چھپاک کھلا اور گاڑی

پارک کی گئی اور مجھے کھینچ کر باہر کھڑا کر دیا گیا۔ "چل۔" کسی نے مجھے دھکیل کے کہا اور میرا بازو تھام لیا۔ میری آنکھوں پر سے پٹی ہٹائی گئی تو وہ کسی عام سے گھر کا کمرا تھا جس میں ایک پرانا بیڈ لگا ہوا تھا، فرش پر پرانا قالین تھا اور ایک پرانا صوفہ... بوسیدگی کمرے کی ہر چیز سے عیاں تھی۔ چھت سے ذرا نیچے ایک ٹیوب لائٹ تھی۔ کمرا بارہ فٹ لمبا چوڑا ہوگا جس کے ایک کونے کا دروازہ باتھ روم کا ہو سکتا تھا۔ ڈاکٹر نے اس کی تصدیق کی۔ وہ سیدھا اندر گیا اور کچھ دیر بعد نکلا تو دھڑام سے بیڈ پر گر گیا۔ وہ بوڑھا سا آدمی تھا۔ اس کی جسمانی قوت برداشت کم تھی۔

میں اور انور صوفے پر ساتھ ساتھ بیٹھے اپنی کلائیاں ملتے رہے جن پر باندھے جانے سے نیل پڑ گئے تھے۔

"یار یہ کیا ہو رہا ہے آخر؟" انور سر پیچھے رکھ کے نیم دراز ہو گیا۔

"پتا چل جائے گا۔"

"یہ کھیل میری سمجھ میں نہیں آیا۔ ہم تو خیر ایک ہی جگہ سے اٹھائے گئے۔"

میں نے کہا۔ "میں اس پلان کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

انور بولا۔ "جو لوگ وہاں پڑے تھے، آٹھ دس تھے۔ سب کو کیسے مار دیا انہوں نے؟"

"ہاں، ایک کو میں نے قریب سے گزرتے ہوئے دیکھا تھا نہ مجھے کوئی زخم نظر آیا نہ خون۔"

انور نے سر ہلایا۔ "گولی چلنے کی آواز بھی نہیں سنائی دی تھی۔ وہ سب آگ بجھانے اور ملبا ہٹانے والے تھے۔ کوئی فائر کرتا تو باقی جان بچانے کے لیے بھاگتے۔"

"ایسا لگتا تھا سب سوئے پڑے ہیں۔ ممکن ہے وہ بے ہوش ہوں۔" میں نے کہا۔

"بے ہوش بھی کیسے ہوئے۔ کچھ وقت لگتا ہے، گولی یا انجکشن کا استعمال سب سے آسان ہوتا ہے۔ وہ ہو نہیں سکتا تھا۔ گیس فوراً اثر کرتی ہے مگر گیس گن ملتی کہاں ہے۔ صرف سنا ہے اس کے بارے میں۔"

میں نے کہا۔ "اس سے بھی زیادہ غور طلب سوال یہ ہے کہ جب ان لوگوں نے یہ کارروائی کی۔ انہیں مار دیا یا بے ہوش کیا تو باقی لوگ کیا تماشا دیکھتے رہے؟ سکندر شاہ، ریشم یا روبی؟"

"ان کے علاوہ بھی بہت لوگ ہوں گے گھر کے ملازم... وہ جو اندر رہتے ہیں۔ مالک باہر پریشان کھڑے ہوں اس قسم کی واردات کے بعد تو وہ اندر کیسے بیٹھے رہ سکتے ہیں؟"

"کیا پتا وہ سب اندر بے ہوش پڑے ہوں۔" میں نے کہا۔ "ورنہ وہ کیسے بے فکر ہو کے بیٹھے رہتے یا چین سے سو جاتے۔ جب تک ہم نکل نہ آئیں، وہ ایک ٹانگ پہ کھڑے رہتے۔"

"انہوں نے رونا دھونا مچایا ہوگا۔ دونوں لڑکیوں نے تو۔ ممکن ہے سکندر نے ان کو اندر بھیج دیا ہو۔ تسلی دے کے یا ڈانٹ کر کہ اس میں آنسو بہانے والی کون سی بات ہے کون سا مکان گر گیا ہے اور وہ ملبے تلے دب گئے ہیں۔ ابھی نکال لیتے ہیں انہیں... چلو تم اندر جا کے بیٹھو... اور ایسی صورت میں وہاں رہ گیا ہو صرف سکندر۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں یار، یہ نہیں ہو سکتا۔ سکندر بھی اکیلا کیوں رہے گا وہاں۔ وہ سب کی پریڈ لگاتا۔ ہمارے نکلنے تک سب پر دہاڑتا رہتا... بلاوجہ ڈانٹ ڈپٹ کرتا کہ حرام خور ہو سب... جلدی کرو۔ اس کے علاوہ فرض کر کہیں بھی ایسی واردات ہو سکندر جیسے وی آئی پی کے محل میں یا اس کے آس پاس... تو کیا صرف فائر بریگیڈ والے آئیں گے؟ اور یہ امدادی فورس جو ملبا ہٹاتی ہے ان کے ساتھ پولیس نہیں آئے گی؟ اخبار والے کوئی بھی نہیں پہنچے گا؟"

"ہو سکتا ہے پولیس آئی ہو اور چلی گئی ہو جائزہ لے کر... اور ضابطے کی کارروائی کر کے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "اول تو سکندر اتنا غیر اہم لاوارث شخص نہیں۔ کوئی ایس پی نہ سہی... ڈی ایس پی آیا ہوگا اور وہ گیا باہر سے ایک نظر ڈال کے چلا جاتا۔ ضابطے کی کارروائی کہاں ہوئی؟ کون آیا پیچھے؟ ہمارے برآمد ہونے تک انہیں رکنا چاہیے تھا۔"

"مجھے واقعی سمجھ نہیں آئی... معلوم ہوتا ہے وہاں ہمارا والی وارث کوئی نہیں، اندر دفن ہو گئے تھے۔ یہ لوگ نکال کے اپنے ساتھ لے آئے۔ کسی نے روکا ٹوکا نہیں۔ چار گھنٹے ہو گئے۔"

میں نے گھڑی دیکھی۔ "پانچ... ایک بہت دور کا امکان ہے، مگر ناممکن نہیں۔"

"وہ کیا؟"

"یہ اندر کا کام ہے۔ ان سائیڈ جاب... بالکل فلمی آئیڈیا۔"

"اندر سے کس نے ان کی مدد کی؟ کیسے؟"

"برخوردار، نمک حرام کہاں نہیں ہوتے؟ قلعہ بند حریف کو فتح کرنے میں ہمیشہ اندر والوں سے مدد لی گئی ہے۔ پیسا سب کچھ خرید لیتا ہے۔ وفاداری، ایمان، عزت، عصمت، فرض کر کچن میں کام کرنے والا کوئی بندہ کھانے یا چائے کافی میں بے ہوشی کی دوا ڈال دے۔ اندر تھے کل چار بندے۔ تین عورتیں، ایک سکندر شاہ... وہ لیٹ گئے، سو گئے، پھر ہوا دھماکا... یہ بات بھی غور طلب ہے کہ دھماکا صرف ایک حصے سے راستہ بنانے کے لیے کیا گیا تھا۔ عمارت کو اڑانے کا منصوبہ نہیں تھا ورنہ جہاں سیر وہاں سوا سیر... وہ آواز گیٹ تک سنی گئی بلکہ سنائی گئی تاکہ جب امدادی ٹیم آئے تو ان کا راستہ نہ آتے ہوئے روکا جائے نہ جاتے ہوئے... تو سو رہا ہے؟"

"میں غور فرما رہا ہوں، نقشہ ٹھیک لگتا ہے۔"

"ایمبولینس اور فائر بریگیڈ کو فون بھی اسی نے کیا۔ سب کو سلانے والے نے اطلاع دی کہ اپنا کام میں نے کر دیا۔ بے فکری سے اندر آؤ اور وہ ایمبولینس لیے تیار کھڑے تھے۔ آگ بجھانے والی گاڑی خود آئی ان کی اطلاع پر... ملبا ہٹانے والی مشینری تو اندر ہی ہوگی شاید... سکندر کی اپنی... ان کا زیادہ کام نہیں تھا۔ پولیس کو فون ہی نہیں کیا تو وہ کیسے آتے۔ جن کو آنا تھا، وہ فوراً پہنچ گئے۔ کچھ سامنے سے کچھ پیچھے سے۔ سیکیورٹی والوں کو پتا تھا کہ پیچھے کہیں کوئی دھماکا ہوا ہے جس سے ایک حصہ گرا ہے، کوئی بھی اپنی ڈیوٹی چھوڑ کے تماشا دیکھنے نہیں آ سکتا تھا۔ جو فارغ ہو سکتے تھے ان کو مزدوری پر لگا دیا گیا اور جب یہ امدادی کارروائی جاری تھی جس کو دیکھنے والوں میں گھر کا کوئی فرد نہ تھا تو اس پر حیران ہونے والا بھی کوئی نہ تھا۔ بروقت اندر سے چائے لائی گئی جو سب نے پی اور اب آنکھ کھلے گی تو سب خواب جیسا لگے گا۔ بے ہوشی کی یا نیند کی دوا کا اثر چھ گھنٹے تو رہے گا۔" میں نے گھڑی دیکھی۔ "ایک دو گھنٹے میں اندر والے بھی رفتہ رفتہ ہوش میں آنے لگے... تو صبح ہو جائے گی... ہلچل اس کے بعد شروع ہوگی جب فائر بریگیڈ اور ایمبولینس کے آنے جانے کی کہانی سمجھ میں آئے گی۔ سکندر شاہ بے وقوف نہیں ہے۔ فوراً سمجھ جائے گا کہ اندر والوں کی بے خبری کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔"

"سب کی شامت آ جائے گی۔ پولیس کھال ادھیڑ کے معلوم کرے گی۔"

"خاک معلوم کرے گی۔ کسی کو کچھ پتا ہوگا تو بتائے گا۔ گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر... یہ کام کرانے والے اپنے مددگار کو بھی ساتھ ہی نکال لے گئے ہوں گے اور ممکن ہے اب تک اسے مار کے کہیں پھینک چکے ہوں۔"

وہ مجھے دیکھتا رہا۔ "پیرو مرشد، بڑی دور کی سوجھی مگر لگتا ہے ٹھیک سوجھی... ایسا ہو سکتا ہے بلکہ ایسا ہی ہوا۔"

"کاش ایسا ہی ہوا ہو۔ یعنی بس ہم دو ہی گرفتار بلا ہوں۔ باقی لوگ محفوظ ہوں۔"

انور یکلخت اداس ہو گیا۔ "یار! اماں کی خبر کوئی نہیں پھر بات ہی نہیں ہوئی ان سے۔ مجھے معاملہ گڑبڑ لگتا ہے۔"

"شک مجھے بھی اسی وقت ہو گیا تھا جب سکندر کی بیوی سے کوئی عورت دیر تک بات کرتی رہی تھی۔ تیری ماں بن کے... وہ تو بہت کم بولتی ہیں۔"

"اور اس قابل کہاں ہوں گی کہ بات کریں۔ انہیں کتنا بھی آرام سے رکھا گیا ہو، اپنی قید کی تکلیف سے زیادہ وہ میرے لیے رو رو کے ہلکان ہو رہی ہوں گی۔" وہ رونے کے قریب ہو گیا۔

"یار سب ٹھیک ہو جائے گا، پریشان مت ہو۔ یہ بات تو مجھے بھی کھٹکی تھی کہ بات انہیں ہم سے کر لی تھی۔ سودا تو کرتا... میں بھی کر لیتا اور بات کرتا تو سکندر کو بھی آتی ہے۔ انہوں نے ادھر سے کس کو فون پکڑا دیا تھا۔"

"امی ہوتیں تو ان کی ایک ہی رٹ ہوتی، وہ رو رو کے کہتی رہتیں کہ انور کو بلاؤ... انور سے بات کراؤ... یہ بڑے بے ضمیر اور سفاک لوگ ہیں سلیم، وہ رانا کا سودا کر رہے تھے۔ اسے وہاں مردہ چھوڑ کے آ گئے۔ مر گیا تو مر گیا۔"

"اب وہ تجھے رکھ لیں یا مجھے... یا دونوں کو... اور سودا کریں سب سے... ریشم سے یا سکندر سے کہ روبی کو راضی کرو... ہمارا دھندا چوپٹ نہ کرے۔ باپ کے حصے کی کمائی اسے ملتی رہے گی۔"

"وہ مزار کیا ہیڈ کوارٹر تھا اس مافیا کا؟"

"شاید... ورنہ اتنا تردد کیسا، اپنا دھندا کہیں اور لے جاتے مگر اپنی جگہ تو کھوکھے یا ٹھیلے والا بھی نہیں چھوڑتا۔ ٹھیا بڑی مشکل سے اور بہت دیر میں بنتا ہے۔ ان کی اصل فورس ہیں وہ سارے مرید جو آس پاس کے علاقے میں آباد ہیں۔ ان کی روحانی عقیدت کا مرکز کوئی اور جگہ نہیں ہو سکتی۔"

"تو مزار کی بات کرتا ہے۔ ایک قبر آ جائے کسی مرکزی شاہراہ کی تعمیر کے راستے میں تو اسے بلڈوز نہیں کیا جا سکتا، شہروں کے وسط میں قبرستان جو تھے، وہ ہیں اور رہیں

گے۔“

میں نے ایک جماہی لی۔ ”یار صبح ہو تو کچھ پتا چلے معاملہ کیا ہے۔ تھکن سے بدن ٹوٹ رہا ہے۔ کیسے بے مروت میزبان ہیں، کسی نے ایک کپ کافی کو نہیں پوچھا۔“

”ضرور پوچھیں گے، پرتکلف ناشتا بھی کرائیں گے ہسسرال ہے نا تیری۔“

”ڈاکٹر کو دیکھ کیسے مزے سے سو رہا ہے جیسے بے ہوش پڑا ہو۔“

انور نے افسوس سے کہا۔ ”بے چارہ کہاں تک برداشت کرتا۔ برا پھنسا، میں سب تلافی کر دوں گا، ایک لاکھ کے دوا کھو دے دوں گا۔“

”حاصل کچھ نہیں ہوا، ہم نے بھی جھک ماری، کچھ بکنے سے پہلے ہی وہ مر گیا۔“ میں نے کہا۔

”ڈاکٹر کی بات غلط نہیں تھی۔ یہ خطرہ تو ہوتا ہے خطرناک دواؤں میں، کیا پتا وہ ایکسپائرڈ ہوں۔ پرانی ہو گئی ہوں۔“

”اب معلوم کرنے کا بھی کیا فائدہ۔ اس کے تو والی وارث کو بھی پتا نہیں چلے گا کہ وہ کہاں گیا۔ پوسٹ مارٹم کیسا اور کیسی تفتیش۔“

ایک کھڑکی کے دھندلے شیشے سیاہ سے سرمئی ہوئے پھر دھوپ سے نیم روشن... میں شاید سو گیا تھا۔ انور ابھی تک صوفے کی پشت سے سر ٹکائے آنکھیں بند کیے اور منہ کھولے سو رہا تھا۔ باتوں میں وقت گزر رہا تھا۔ پھر باتیں بھی ختم ہو گئیں تو خاموشی کے مختصر وقفے میں نیند کی دیوی نے چھاپا مارا اور تھپکی دے کر سلا گئی۔ ایک گھنٹا یا اس سے کچھ زیادہ میں بھی گرد و پیش سے غافل رہا۔ ثابت ہوا کہ نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے۔ یہ بات کچھ اتنی غلط بھی نہیں۔ گزشتہ رات بھی ہم نے کھانا نہیں کھایا تھا چنانچہ اب جسم کی دوسری طلب بھوک کا احساس ہو رہا تھا۔

ڈاکٹر ایک دم یوں اٹھ بیٹھا جیسے اسے بچھو نے کمر میں ڈنک مارا ہو۔

”کیا ہوا ڈاکٹر صاحب؟“ میں نے اخلاقاً پوچھ لیا۔

وہ نیند پوری کرنے کے بعد ری چارج ہو گیا تھا۔ ”کیا ہوا؟ مجھ سے پوچھتے ہو کیا ہوا؟ وہ ہوا جو کبھی سوچا نہ تھا کہ میرے ساتھ ہو گا۔ کیسی منحوس گھڑی تھی جب خدا نے مجھے تمہاری صورت دکھائی۔“

اس کی آواز سے انور بھی جاگا اور سیدھا ہو کے بیٹھ گیا۔ ”اللہ اپنے نیک بندوں کو آزمائش میں ڈالتا ہے۔“

”دو بار کم بخت چھپکلی مجھ پر گری۔“ اس نے چھت کو دیکھا۔ ”ٹھیک وہیں دوبارہ آ گئی۔ نشانہ لیا اور سیدھی میرے منہ پر... ستر سال میں ایسا ایک بار نہیں ہوا تھا۔“

انور نے اسے مزید چھیڑا۔ ”اب آپ تو اس پر گر نہیں سکتے تھے ڈاکٹر صاحب۔“

”وہ... وہ دیکھو... پھر وہیں آ رہی ہے خبیث... تیسری بار سر پر گرے گی؟ تیری تو ایسی تیسی۔“ ڈاکٹر نے جوتا گھما کے چھت پر مارا۔ چھپکلی محفوظ رہی۔ جوتا چھت سے ٹکرا کے سیدھا ڈاکٹر کے سر پر گرا۔ میرا اور انور کا ہنسی سے برا حال ہو گیا۔ ڈاکٹر ہمیں برا بھلا کہتا رہا۔ اس سے معذرت کر کے انور باتھ روم چلا گیا۔ میں نے کھڑکی کھولی۔ باہر کی طرف لوہے کی سلاخیں تھیں۔ میرے سامنے ایک میدان سا تھا۔ بہت دور کہیں اینٹوں کے بھٹے کی مینار جیسی چمنی دھواں اگل رہی تھی۔ قریبی سڑک سے گزرنے والی ٹریفک بھی نظر آ رہی تھی۔

ہاتھ منہ دھو کے انور بھی میرے ساتھ آ کھڑا ہوا۔ ”یہ کیا جگہ ہے ملک صاحب؟“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”کوئی آئے تو پوچھنا۔“

اسی وقت باہر سے دروازے کی کنڈی کھلی اور گز بھر کا گھونگھٹ نکالے ایک دلربا اندر آ گئی۔ ساٹن کی لال شلوار قمیص میں یہ مخلوق نہ عورت تھی نہ مرد۔ اس کی چال بتاتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ناشتے کی ٹرے تھی جس میں ناشتا بھی اس کے جیسا ہی تھا یعنی نیم شہری نیم دیہی... بڑے بڑے پیالوں میں ابلتی چائے کا گاڑھا مشروب، نصف دودھ اور چوتھائی دیسی شکر میں چائے کی پتی کا بگھار... فیملی سائز تندوری پراٹھے دیسی گھی میں تر بتر... اور آملیٹ غالباً درجن بھر انڈوں کا... ہم ندیدوں کی طرح اس پر ٹوٹ پڑے۔

اس حسینہ نے چٹ سے تالی بجائی اور مٹک کے پوچھا۔ ”آئے ہائے تھینک یو نہ بولو... یہ تو بتا دو کہ اور کچھ چاہیے کہ میں جاؤں؟“

”ہائے ابھی سے؟“ میں نے کہا۔ ”ابھی نہ جاؤ چھوڑ کے کہ دل ابھی بھرا نہیں۔“

”اگر ایسی اچھی لگ رہی ہوں تو نکاح پڑھوا لے مجھ سے...“ آگے جو اس نے کہا ناقابلِ بیان۔ مجھے پسینا آ گیا۔ غلطی میری تھی جو بھول گیا کہ شرم اس مخلوق کے لیے کوئی چیز ہی نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر نے میری گلوخلاصی کرائی اور اسے دفع ہونے پر مجبور کر دیا۔ میرے ذہن میں بھی سوال اٹھ رہا تھا کہ اب کیا ہو گا۔ دوپہر، پھر شام، پھر رات... سوچنے کے سوا کرنے کو کچھ بھی نہیں؟ غالباً مجھے فرار کے امکانات کا جائزہ لینا چاہیے۔

میرے دل کی بات انور کی زبان پر آ گئی۔ ”یار! ہم نکل نہیں سکتے یہاں سے؟“

”مکھی مچھر بن کے نکل سکتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”یا جن بھوت بن کے۔“

”وہاں، مراد ہاؤس میں کیا سین ہو گا اس وقت؟“

”وہی جو ہونا چاہیے۔ زنان خانے میں رونا دھونا۔ باہر سکندر نے پولیس بلا کے سارے حرام خوروں کو ان کے حوالے کر دیا ہو گا کہ نمک حرام کا پتا چلائیں اور وہ بڑی پھرتی دکھا رہے ہوں گے، بھاگ دوڑ، حاصل صفر۔“

سب سالے بندر... اس بندر کی طرح جس کی چالاکی اور پھرتی دیکھ کے جانوروں نے جنگل کا بادشاہ بنا لیا تھا۔ کچھ دن بعد کہیں سے کوئی شیر آ گیا اور جانور ہر روز اس کا لقمہ بننے لگے۔ سب نے بادشاہ سے فریاد کی کہ اس کا کچھ تدارک فرمائیے۔ فریادی سارا دن سنتے رہے کہ سب ٹھیک ہو جائے گا اور بادشاہ سلامت کو ایک درخت سے دوسرے پر چڑھتے اترتے چھلانگیں مارتے دیکھتے گئے۔ رات ہونے لگی تو جانوروں نے کہا کہ آپ نے ابھی تک کچھ کیا نہیں۔ بندر نے غرا کے کہا۔ ”ناشکرو، دیکھ تو رہے ہو، میں کتنی بھاگ دوڑ کر رہا ہوں۔ اب کیا جان دے دوں اپنی... جاؤ اسی کو بادشاہ بنا لو۔“

ڈاکٹر نے آہ بھر کے فریاد کی۔ ”اپنا سوچ رہے ہو، لطیفے سنا رہے ہو۔ مسخرے سے مذاق کر رہے ہو، میری فکر کسی کو نہیں کہ بڑھیا رات بھر روتی رہی ہو گی۔“

”ہم تلافی کر دیں گے ڈاکٹر صاحب، شرمندہ زندگی۔“

انور بولا۔ ”یار آخر مقصد کیا تھا اس کارروائی کا؟ اتنا بندوبست صرف اس لیے تھا کہ ہمیں یہاں لا کے بٹھا دیں۔“

”جلدی تجھے ہے، انہیں نہیں۔ تاخیر تو ان کا ایک ہتھیار ہے۔ وہ کچھ نہ کریں، وقت گزارتے رہیں، مہینا دو مہینا چھ مہینے سال۔ بالآخر ہم ہتھیار ڈال دیں گے اور ہمیں کیا معلوم ان کا پلان کیا ہے۔ وہ سکندر سے یا روبی کے سامنے اپنا مطالبہ پہنچا چکے ہوں۔“

انور نے کمرے میں چکر کاٹتے ہوئے دروازے کو ہلا کے اس کی مضبوطی کا اندازہ لگانا چاہا تو وہ کھل گیا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ ”بلاوجہ ہی خود کو اسیر سمجھے بیٹھے رہے

ہم۔"

اس کے ساتھ میں دوسرے کمرے میں گیا۔ یہ روایتی کوارٹر ٹائپ مکان تھا۔ دو کمرے ساتھ ساتھ۔ پھر برآمدہ جس میں ایک طرف تیسرا کمرا بیٹھک یا ڈرائنگ روم بنانے کے لیے... دوسری طرف کچن... سامنے مختصر پکا صحن اور چار دیواری میں ایک دروازہ باہر کھلنے والا۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ دوسرے کمرے سے گھونگھٹ میں چہرہ چھپائے تیم حسینہ نکل آئی۔

"ہائے ہائے، کچھ چاہیے تھا تو حسینہ کو پکار لیتے۔" اس نے اپنے اسٹائل کی تالی بجا کے کہا۔

میں نے کہا۔ "اچھا تو حسینہ ہے تمہارا نام... چاہیے تو ہمیں بہت کچھ مگر شرم آتی ہے کہتے ہوئے۔"

"میں قربان جاؤں، ابھی اتارتی ہوں تیری شرم۔ اپنے یار سے کہو منہ دوسری طرف کر لے۔"

میں گھبرا کے پیچھے ہٹ گیا۔ "حسینہ! مجھے شک ہے کہ تم وہ نہیں ہو جو خود کو ظاہر کر رہی ہو، یہ اوور ایکٹنگ ہے۔"

انور باہر کے دروازے کی کنڈی کھولتے کھولتے رک گیا اور پلٹ کر دیکھنے لگا۔ حسینہ کی ساری شوخی ختم ہو گئی تھی۔ اس نے پل بھر کے لیے گھونگھٹ اٹھا کے اپنا چہرہ دکھایا اور پھر آنچل گرا لیا۔ زبان سے اقرار کیے بغیر اس نے میرے شک کی تصدیق کر دی تھی۔

"تمہارا چہرہ دیکھا ہوا لگتا ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ وہی ہے۔" انور نے روانی میں کہا۔

حسینہ نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش کر دیا۔ یہ امید کی پہلی کرن تھی۔ حسینہ کے روپ میں ہمارا کوئی ہمدرد تھا۔ انور مسکرایا اور پلٹ کر دروازہ کھولنے لگا۔ باہر کچھ بھی نہیں تھا۔ بظاہر ہماری نگرانی پر مامور کوئی نظر نہ آتا تھا لیکن یہ ناممکن تھا۔ کسی نے اتنا تردد بے وجہ نہیں کیا تھا۔

"یہ سراب ہے ملک صاحب۔" میں نے کہا۔ "نظر نہیں آتا لیکن کوئی ہو گا ضرور۔"

"نظر نہ آنے والی مخلوق بندوں کی سیکیورٹی ڈیوٹی نہیں کرتی۔" انور بولا۔ "مگر بات میں تیری لاجک ہے۔ فرض کر ہم فرار کی کوشش کا ڈراما کریں۔"

"اور نظر نہ آنے والی گولی کا نشانہ بن کے اللہ کو پیارے ہو جائیں۔ لو سر... ابھی میں خودکشی کے موڈ میں نہیں ہوں۔"

"پھر پتا کیسے چلے گا؟"

"جلدی کیا ہے دوست، صبر کا میٹھا پھل پک جائے گا دوپہر تک یا شام تک۔"

"اونچا بولنا منع ہے۔"

میں نے آہستہ آواز میں کہا۔ "مجھے شک ہے کہ ان درختوں میں ماہر نشانہ باز چھپے بیٹھے ہیں۔"

"گولی مارنے کے لیے انہیں اتنے تکلف اور اہتمام کی کیا ضرورت تھی۔"

میں نے کہا۔ "تو نے دیکھا ہو گا نیشنل جیوگرافک کی فلموں میں جنگلی شیروں اور ہاتھیوں کو کیسے پکڑتے ہیں۔ بے ہوش کرنے والی گن سے گولی چلا کے۔ وہ انجکشن ہوتا ہے جو کھال میں گھس جاتا ہے اور بس... کچھ دیر میں ہاتھی ڈھیر، شیر کسی چوہے سے زیادہ بے ضرر۔"

"دیکھا تو ہے فلموں میں۔"

میں نے کہا۔ "وہ سب چڑیا گھر والے رکھتے ہیں کہ کوئی غلام بے قابو ہو جائے تو قابو کیا جا سکے۔ آزما کے بھی دیکھ لیں گے مگر ابھی نہیں، تھوڑا سا انتظار۔" میں نے اسے ہاتھ پکڑ کے اندر کھینچ لیا۔ اگر نادیدہ آنکھیں ہم پر نگراں تھیں تو انہیں غلط اندازہ ہوا ہو گا کہ ہم بزدل، بے حوصلہ اور فرمانبردار قیدی ہیں۔

یہ خطرہ اندر بھی تھا کہ خفیہ آنکھیں یا کان موجود ہوں۔ میں نے چلا کے حسینہ کو پکارا۔ "حسینہ، حسینۂ عالم۔"

"ہائے کیا دہائی مچا دی آتے آتے۔" وہ کمر لچکا کے دروازے میں کھڑی ہو گئی۔

ہاتھ سے میں نے اشاروں کی زبان بولی۔ اس سے کان اور آنکھوں کو چھو کر پوچھا کہ کیا یہاں ہم دیکھے اور سنے جا سکتے ہیں اور زبان سے کہا۔ "تم نے تو ایک نظر میں دیوانہ بنا دیا ہے۔ نظروں سے اوجھل ہوتی ہو تو دل کو کچھ ہونے لگتا ہے۔"

"اسے وہ نہیں کہتے میرے بھولے مجنوں۔" اس نے بڑی بے شرمی سے وضاحت کی اور خاموش زبان میں اقرار کیا کہ دیواروں کے کان ہیں، آنکھیں نہیں ہیں۔ میں نے اشارہ کیا کہ وہ لکھنے کو کچھ لا دے۔

"پھر آج رات آ جاؤ نا خواب میں۔" میں نے ہنس کے کہا۔

"ہائے خواب میں کیوں؟" اس نے اپنی بکواس جاری رکھی اور لوٹ گئی۔

میں نے تھوڑا سا ریڈیو ڈراما کیا۔ "ارے... چھوڑ... لڑکی ہٹ، بے حیا یہ کوئی مذاق ہے۔" جواب میں وہ ہنسے۔

اس نے دوبارہ اندر آ کے مجھے ایک کاغذ اور بال پوائنٹ دے دیا۔ انور نے پہلے لکھا۔ "تم سلونی کے بھائی ہو؟"

اس نے گھونگھٹ ہٹا دیا اور مسکرایا۔ لکھنے کے بجائے اس نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ میرا دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا۔ اگر اس کو زیادہ دیر روک کے خاموشی کی زبان میں لمبی گفتگو کی جاتی تو انہیں جو کہیں کان لگائے بیٹھے تھے، شک ہوتا چنانچہ میں نے اونچی آواز میں کہا۔ "اب جاتی ہے یا میں دھکے دے کر نکالوں؟"

اس نے سمجھ داری سے کام لیا۔ "ہائے شہزادے، پیار کا جواب پیار سے نہیں دیتا غصہ تو نہ کر۔" پھر چٹ سے تالی بجائی اور دروازہ بند کر دیا۔

یہ اطمینان کافی تھا کہ کمرے میں کیمرا نہیں ہے اور کوئی آنکھ دیکھ نہیں سکتی کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ میں نے انور سے ہاتھ ملایا اور کاغذ پر لکھا۔ "میں اب بہت پُرامید ہوں۔ بہتری کی کوئی صورت تو پیدا ہوئی ہے۔"

انور نے لکھنے کے بجائے منہ میرے کان کے قریب لا کے سرگوشی میں کہا۔ "دیکھا کیسا پہچانا میں نے۔"

اب میں نے بھی کان میں کہا۔ "جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے یہ مزار پر تھا اور ایسا ہی تھا۔"

"یعنی مڈل سیکس... نہ مرد نہ عورت؟"

"ہاں، وہاں ڈانس کرتا تھا۔ نام یاد نہیں۔"

"سلونی نے کبھی کسی بھائی کا ذکر نہیں کیا۔ نہ مجھ سے نہ کسی اور سے۔"

میں نے کہا۔ "اس نے خود بتایا تھا کہ سلونی میری بہن ہے اور میری مدد تو خیر نہیں کی تھی لیکن ہمدردی ضرور دکھائی تھی۔"

"ایک تو ماں جی کا کچھ پتا نہیں چل رہا ہے۔ مراد ہاؤس میں کیا ہو رہا ہے، آخر کب تک رکھا جائے گا ہمیں یہاں اس ایک کمرے کے قید خانے میں جو قید خانہ بھی نہیں ہے۔"

"دیکھ انور، یہ اعصاب کے مقابلے کی جنگ ہے۔"

دروازہ کھلا اور حسینہ نے بل کھا کے کہا۔ "آ جا میرے چن ماہی، سواری آ گئی تیری۔"

"کیسی سواری؟ شرافت سے بات کرو۔"

"شرافت تو میری ماں کا نام تھا۔ مرے ہوئے دس سال ہو گئے۔ اس سے کیسے بات کروں؟ گاڑی آئی ہے تمہیں سسرال لے جانے کے لیے... ایسی شاندار۔" اس نے چٹ سے تالی بجائی۔

باہر واقعی ایک سیاہ رنگ کی دھوپ میں لشکارے مارتی مرسیڈیز کھڑی تھی۔ ایک شوفر سفید وردی میں بونٹ کا سہارا لیے کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ سگریٹ پھینک کے اس نے ڈرائیونگ سائڈ کا دروازہ کھولا اور سیٹ پر بیٹھ گیا۔ پیچھے والے دونوں دروازے پورے کھلے ہوئے تھے اور ان پر بھی اجلے سفید سیٹ کور تھے۔ بیٹھنے کے بعد میں نے آگے بیٹھے ہوئے تنومند سیاہ فام کو دیکھا جس نے کالا سوٹ پہن رکھا تھا اور اس کی ٹائی بھی کالی تھی۔ اس کے سر کے بال ہموار کٹے ہوئے لان کی گھاس جیسے تھے۔ جب وہ پلٹ کے مسکرایا تو اس کے سیاہ دانت چمکے۔

"میں جوزف ہوں۔ جوزف ڈی کوسٹا، ہاؤ آر یو سر؟"

میں نے حیران ہوئے بغیر سر ہلایا۔ "تھینکس، آئی ایم فائن، ہم کہاں جا رہے ہیں جوزف؟"

اس نے انگلش میں ہی کہا۔ "زیادہ دور نہیں۔"

انور بولا۔ "اور تم کون ہو؟"

اس نے پھر گول مول جواب دیا۔ "آپ کو معلوم ہو جائے گا۔"

نہ جانے کب اور کہاں سے ایسی ہی دوسری گاڑی ہمارے پیچھے لگ گئی تھی۔ دروازے کھول کے فلمی اسٹائل میں سڑک پر جمپ لگانے کا ابھی تک میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ اتنے اہتمام سے ہمیں لاتے لے جانے والوں نے اس کی گنجائش کہاں چھوڑی ہو گی۔ دروازوں میں ہینڈل نظر آ رہے تھے مگر مجھے یقین تھا کہ وہ ناکارہ بنا دیے گئے ہوں گے۔ ٹرائی کرنے پر یہ خیال درست ثابت ہوا۔ دروازے صرف باہر سے کھولے جا سکتے تھے۔ ایسی کوئی حماقت خودکشی کے مترادف بھی ہوتی کیونکہ پیچھے والی گاڑی میں فرار کی کوشش کرنے والوں کو مارنے یا زندہ سلامت پکڑنے کے ماہرین ہی ہو سکتے تھے۔ اگر حسینہ والوں نے گاڑی بھیجی تھی تو براتی بھی چن کر بھیجے ہوں گے۔

ویسے بھی اب کھیل کسی منطقی انجام کی طرف پہنچ رہا تھا تو بلاوجہ ایڈونچر کر کے وقت ضائع کرنا حماقت ہوتی چنانچہ میں اور انور اس شاندار لگژری کار کی پچھلی سیٹ پر نیم دراز یہ ظاہر کرتے رہے جیسے نہ ہم پریشان ہیں نہ خوف زدہ... اور مسکراتے بھی رہے۔ اصل شیشے وہ تھے جن سے باہر نظر آتا تھا باہر سے اندر نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ بلرائزڈ گلاسز، ان کو باہر بلیک اسٹیکر پیپر لگا کے ہمارے لیے بھی اندھا شیشہ بنا

دیا گیا تھا۔ میں نے ابتدا میں ٹرن یاد رکھنے کی کوشش کی۔ پہلے دائیں، پھر بائیں، پھر بائیں، دائیں، بائیں، اس کے بعد سے خلط ملط ہو گیا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ہم اسی میدان میں گھوم رہے ہوں جو کھڑکی سے دور تک پھیلا ہوا دکھائی دیتا تھا۔

گاڑی رکی اور دروازہ کھولا گیا تو دھوپ کی چمک سے زیادہ میری آنکھیں ایک قصرِ عالی شان کی شان و شوکت سے خیرہ ہو گئیں۔ مراد ہاؤس اس کے مقابلے میں سرونٹ کوارٹر تھا۔ وسط کی عمارت جدید و قدیم کا امتزاج حسنِ تعمیر کا دلکش نمونہ تھا۔ اس کی وسعت زیادہ نہیں تھی۔ اس کے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے تین کاٹیج بنے ہوئے تھے۔ شاید سنگل بیڈ مع دیگر لوازمات، ڈرائنگ روم، کچن، باتھ وغیرہ، ہر کونے میں ایک انیکسی یا گیسٹ ہاؤس۔ چوتھے کونے میں وسیع فولادی گیٹ جسے کھولنے بند کرنے والا دربان مفقود تھا۔ ضرور یہ کسی ریموٹ کنٹرول سے آپریٹ ہوتا تھا اور اسی وقت کھلتا ہوگا جب مانیٹرز والوں کو کسی اسکرین پر دیکھ کے اطمینان ہو جائے کہ آنے والے بے ضرر ہیں۔ ہر کونے کے گیسٹ ہاؤس سے تین فٹ چوڑی سنگ مرمر کی سفید پٹی لان کے سرسبز قالین پر سوئمنگ پول تک بچھی ہوئی تھی۔ چاروں طرف کناروں پر رنگین پٹیوں والے کشن اور ایزی چیئرز لگے ہوئے تھے لیکن وہاں موجود کوئی نہ تھا۔ گیٹ سے سیدھے عقبی حصے میں جانے والے راستے پر صرف وہی گاڑی کھڑی تھی جس میں ہم لائے گئے تھے۔

میں نے انور سے پوچھا۔ ”یہ کس کا گھر ہو سکتا ہے؟“

”یہ گھر ہے؟ کم سے کم محل تو کہو.... میں یہاں آچکا ہوں ایک بار۔“

”پہلے کیا جرم تھا تیرا؟“ میں نے کہا۔

”ابا جی، کے ساتھ آیا تھا۔ اس علاقے کے ایم این اے، جاگیردار، پیر بھی کچھ ہیں۔“

اندر سے ایک بشر قسم کا نکیلی مونچھوں والا شخص نمودار ہوا جس نے سفید شرٹ پر کالی بو لگا رکھی تھی۔ اس نے ہاتھ لہرا کے ہمیں تشریف لانے کا سگنل دیا اور دروازہ پکڑے کھڑا رہا۔ ہم اندر چلے گئے۔ ایک اونچی چھت والے کاریڈور سے گزرے جس کی چھت نیم دائرے میں اور رنگین شیشوں سے مزین تھی۔ شاید دس دس فٹ کی دوری سے عالی شان کرسٹل فانوس آویزاں تھے۔ میں اتنا متاثر اور مرعوب تھا کہ وہ مجھے سوتے کے لگے۔ اس کا اختتام دائٹ

ہاؤس کے ڈوم جیسی چھت والے گول ہال میں ہوا۔ ہال میں بیش قیمت ایرانی کاشانی قالین بچھے ہوئے تھے۔ شاید یہ تقریبات میں ڈنر اور ڈانس وغیرہ کے لیے استعمال ہوتا ہو۔

ہماری قیادت سوانو بجالی نکیلی مونچھوں والا ہی کر رہا تھا۔ وہ ہال سے پہلے اچانک مڑ گیا اور ایک دروازے کو تھام کر کھڑا ہو گیا۔ ہم نے اندر قدم رنجہ فرمایا۔ یہ بھی نشست گاہ تھی۔ ہم ایک شاندار گولڈن صوفے پر بیٹھ گئے جس کے سامنے چائے کی ٹرالی پہلے سے موجود تھی۔ اور اس میں بے حد گرم اور خوشبودار کافی کے علاوہ سب الم غلم تھا مگر میں نے وہ انگلش کراکری کے مگوں میں کالی کافی نکالی اور زہر آلود ہونے کے خوف سے آزاد پینے لگا۔ ”ڈرنے اور پریشان ہونے سے حاصل کچھ نہ ہوتا۔“ میں نے انور سے کہا۔

ابھی میں نے مگ رکھا ہی تھا کہ جیسے بجلی چمکی۔ پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ میری آنکھیں ایک ہی جگہ مرکوز ہو گئیں لیکن میرا جسم پتھر کا ہو گیا۔ بہت دور سے آتی ہوئی ایک آواز میرے کانوں تک پہنچی جو میرے لیے زلزلے کی گڑگڑاہٹ سے کم نہ تھی۔ زمین زلزلے کی زد میں تھی اور ہر چیز اتھل پتھل ہو رہی تھی۔ دیواریں لرزہ براندام تھیں اور مجھ پر گرنے کے لیے جھک گئی تھیں۔ میرا دم گھٹ رہا تھا۔ میرا سارا وجود ایک صدا بن گیا تھا جو ہر سمت گونجی تھی۔ نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ وہم ہے۔ میرا خوف ہے جو ایسا دکھا رہا ہے۔ یہ ایک ڈراؤنا خواب ہے جو ہر جگہ میرا پیچھا کرتا رہا ہے اور آج تعبیر بن کر سامنے آیا ہے۔

پھر گرد و غبار کی دھند چھٹنے لگی اور شور تھم گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے کا منظر واضح ہوا اور میں نے دیکھا تو سب کچھ وہی تھا۔ انور میرے دائیں ہاتھ پر اسی طرح بیٹھا ہوا تھا۔ میرے سامنے میز پر کافی کا خالی مگ موجود تھا۔ تبدیلی ایک تھی جو ناقابلِ یقین تھی۔ میری پتھرائی ہوئی نظر اپنے سامنے صوفے پر بیٹھے بہت پیچھے ماضی میں گم ہو جانے والے ایک چہرے پر ٹھہر گئی تھی۔

میرے مقابل نادر شاہ بیٹھا ہوا لائٹر سے اپنا سگریٹ جلا رہا تھا۔

اس نے مسکرا کے مجھے دیکھا۔ ”کیسے ہو فرید۔“

بالکل۔ وہ نادر شاہ ہی تھا۔ اس کا کوئی ہم شکل نہیں تھا۔ کچھ فرق اس کے ظاہر میں ضرور پڑا تھا۔ وہ پہلے عام سے شلوار قمیص میں رہتا تھا۔ اب وہ بہترین سوٹ اور ٹائی میں تھا۔ سوٹ غالباً اٹالین ہوگا اور جوتے بھی۔ اس کا ہیئر اسٹائل بدل گیا تھا۔ کسی ماہرِ فن نے اس کے بال کچھ مختصر

کیے اور سیاہی میں شامل ہونے والی قدرتی سفیدی کو آرٹسٹک طریقے پر یوں ملایا تھا کہ اس کی شخصیت پُروقار نظر آئے۔ اس نے خوب صورت نازک سنہرے فریم کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ اس کا اندازِ گفتگو اور عادات و اطوار سب بدل گئے تھے۔ اب وہ پاکستان کے کسی جرائم پیشہ گروہ کا سرغنہ یا ہسٹری شیٹر نہیں لگتا تھا۔ وہ اٹلی کی یا میکسیکو کی انٹرنیشنل مافیا کا ڈان... ڈپلومیٹ، کسی بزنس امپائر کا مالک نظر آتا تھا۔

”یہ دنیا بہت مختصر ہو گئی ہے۔“ اس نے سگریٹ کا کش لے کر کہا۔ ”ایک گلوبل ویلج، کبھی نہ کبھی ہمارے راستے کراس کیسے نہ کرتے۔ اتنا عرصے بعد تمہیں دیکھ کے اچھا لگا۔ کافی بدل گئے ہو تم۔“

میں نے اپنی ہمت کو یکجا کیا۔ ”پھر بھی تم مجھے پرانے نام سے بلا رہے ہو۔“

وہ ہنسا۔ ”کیا فائدہ، میں تمہیں خاور کہوں یا ملک سلیم اختر۔“

”یہ بتانا چاہتے ہو کہ تمہیں سب معلوم ہے؟“

”نہیں سب نہیں۔ معلوم ہو سکتا تھا لیکن مجھے دلچسپی نہیں تھی۔ وقت جو گزر گیا، بھول جاؤ۔“

”میں بھول جاؤں؟ وہ وقت جو میرا تھا؟ تم اپنی بات کرو۔“ میں نے تلخی سے کہا۔

”میں نے بھلا دیا فرید۔“ وہ اٹھ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ ”جب تم ملتان میں میرے گھر میں ٹھہرے تھے، دو مہینے پہلے کی بات ہے۔ ایک لڑکی تھی تمہارے ساتھ جو تمہاری بیوی نہیں تھی۔ تم ایک ہی رات ٹھہرے تھے۔“

میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”اچھا، وہاں ہمارے راستے پھر ملے تھے۔ دو مہینے سے میری نگرانی ہو رہی تھی۔“

”ہاں، مجھے پتا چلا تو میں نے سوچا یہ تم ہو کہ پھر غائب ہو جاؤ۔ بالآخر آج ہماری ملاقات بھی ہو گئی۔“ وہ ہنسا۔

میں نے پوچھا۔ ”اب تم کیا کرو گے؟ مجھے واپس جیل بھیج دو گے پھانسی کے تختے پر؟“

”اوہ نو، وہ سب پرانی بات ہو گئی۔ وقت بدل گیا ہے۔ وقت نے مجھے بھی بدل دیا ہے۔“ وہ پھر بیٹھ گیا۔

میں نے انور کی طرف دیکھا۔ ”انور! یہ نادر شاہ ہے۔“

انور نے سر ہلایا۔ ”بتانے کی ضرورت نہیں، میں سمجھ گیا تھا۔“

”کیا میرے بارے میں تمہارا خیال بدل گیا ہے کہ میں نے کوئی جرم نہیں کیا تھا نہ میرے بھائی نے؟“

وہ سوچ کر بولا۔ ”تمہارے بھائی نے جرم یقیناً کیا تھا۔ میرے اعتماد کو دھوکا دیا تھا۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”غلط فہمی تھی تمہاری۔“

”میری بیوی سے اس کا افیئر تھا۔ کالج کے زمانے میں، اور دونوں بہت سیریس تھے۔ یہ بہت لوگ جانتے ہیں۔ ان کی شادی اس لیے نہیں ہو سکی تھی کہ تمہارا بھائی غریب تھا۔ اس کے ماں باپ اپنی ناز و نعمت کی پالی بیٹی کیسے اس کے حوالے کر دیتے۔ اس کا کوئی فیوچر بھی نہیں تھا۔ میری بیوی نے بھی بعد میں اس حقیقت کو دل سے تسلیم کر لیا تھا اور اسے بھول گئی تھی۔ لیکن ایسا ہوتا ہے۔ وہ پھر سامنے آیا تو سوئے ہوئے جذبات پھر بھڑک اٹھے۔ شادی کے چار سال بعد ہم جیسے شوہروں سے جو دن رات مصروف رہیں اور گھر سے زیادہ باہر وقت گزاریں، بے اعتنائی کی شکایت ہو جاتی ہے۔ حالانکہ کامیابی اپنے بیوی کے ساتھ گھر میں لیلیٰ مجنوں کے کھیلنے سے نہیں ملتی۔ بزنس کو زیادہ ٹائم دینا پڑتا ہے۔ ایک نے موقع دیا دوسرے نے فائدہ اٹھایا۔“

میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”مجھے کس جرم کی سزا دی تھی؟“

وہ مجھے دیکھتا رہا۔ ”تم اچھی طرح جانتے ہو کہ تمہارا کیا جرم تھا۔ انتقام لینے کے لیے تم نے مجھے بہت نقصان پہنچایا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تمہاری جگہ میں ہوتا تو میں بھی یہی کرتا۔ میں بھی غصے میں تھا۔ بعد میں اتنا مصروف ہو گیا کہ تمہیں سزا دینے کا خیال کہیں پیچھے چلا گیا۔ نقصان پہلے بھی ہوا۔ بعد میں بھی کئی بار ہوا۔ کاروبار میں ہر بار منافع ہی نہیں ہوتا۔ خیر، یہاں ملنے کا مقصد پرانے معاملات ڈسکس کرنا نہیں تھا۔“

”میں بھی یہی جاننا چاہتا ہوں۔ مجھے اپنے گھر بلانے کا مقصد؟“

”یہ میرا گھر نہیں ہے۔ ایسے کئی گھر ہیں یہاں بھی اور باہر بھی۔ جو میرے نہیں... پھر بھی میرے ہیں۔“

انور نے نام لے کر کہا۔ ”یہ اس جاگیردار، پیر اور اسمبلی کے ممبر کا گھر ہے۔“

”چودھری صاحب کو سب معلوم ہے۔“ وہ مسکرایا۔ ”میرے ایسے ہی دوست ہیں۔ اسمبلی کے ممبر تو بہت ہیں مگر پیروں کا حلقۂ اثر بڑا ہوتا ہے اور کسی ووٹر کے مقابلے میں مرید زیادہ جاں نثار ہوتا ہے۔“

”زیادہ بے وقوف ہوتا ہے۔“ میں نے کہا۔

"بے وقوف تو دونوں ہوتے ہیں۔ سمجھ دار صرف ووٹ لینے والا ہوتا ہے اور پیر تو خیر اپنے مریدوں کو نکیل ڈال کے رکھتا ہے، ایسی گرفت ہوتی ہے کہ مرید اس کے لیے جان دینا یا جان لینا عین سعادت سمجھتا ہے۔ انور! تمہارے تایا اچھے خاصے مشہور پیر تھے، تمہیں اندازہ ہو گا؟"

"اللہ ان کی مغفرت کرے یا نہ کرے اس کی مرضی مگر وہ ٹوٹل فراڈ تھے۔ یہ میں جانتا ہوں۔ سادہ لوح عوام کے جان و مال اور عزت آبرو کے لٹیرے۔"

"اور تمہارے مرحوم والد یا تمہارا چھوٹا بھائی اور تم خود پاکباز اور فرشتے ہو؟"

"ہم سب انسان ہیں، عام غلطیاں کرتے ہیں۔"

وہ ہنسا۔ "مثلاً جھوٹ، غیبت، منافقت یہ تو عیب ہیں، جرائم دیکھو تو صرف کم زیادہ کا فرق ہے۔ زر، زن، زمین کی ہوس دیکھو۔ بڑے بھائی نے ایک انچ حصہ چھوڑا جس طرح چھوٹے چودھری نے جاگیر کو پھیلایا۔ بڑے نے بھی پھیلایا۔ کسی نے صرف ایک منکوحہ کے ساتھ شرافت سے گزارا کیا۔ پیر سائیں نے زیادہ عیاشی کی کیونکہ اسے زیادہ دستیاب تھیں۔ تمہارے والد نے..."

"وہ سب مجھے معلوم ہے۔" انور نے درشتی سے کہا۔

"صرف تمہیں نہیں، مجھے بھی معلوم ہے۔ دنیا کو معلوم ہے۔ کتنی اٹھائیں، کتنی خریدیں، مرضی سے یا مرضی کے خلاف۔ یہ نہیں دیکھا کہ وہ کس کی بیوی یا بیٹی تھیں۔ پیر سائیں دس گنا یا سو گنا عیاش بن گئے تھے۔ کام دونوں کا ایک ہی تھا۔ ظلم کس نے کم کیا؟ کس کے ہاتھوں کتنے قتل ہوئے اور پھر ان کا سراغ نہیں ملا۔ وہ مزارعے تھے یا مرید... اپنے سے کمزور پر کس نے مظالم کے پہاڑ توڑے۔"

"میں خود سمیت اپنے بڑے بھائی اور باپ... سب کے مجرم ہونے کا اقرار کرتا ہوں... مگر..."

وہ ٹہلتے ٹہلتے ایک دم پلٹا۔ "اب بھی مگر... کیا اگر مگر... کوئی ایک قتل کرے یا دس، دس عورتوں کے ساتھ جبر کرے یا سو کے ساتھ۔ زمین، جائداد، مال و دولت ایک سے چھینے یا دو سے۔ دونوں ایک ہی طرح کے مجرم ہیں، قانون کی نظر میں اور خدا کی نظر میں۔ سزا چاہے دونوں کو نہ ملی ہو، طاقت اور اقتدار کی خواہش نے ایک کو اسمبلی میں پہنچا دیا، حاکم بنا دیا۔ دوسرے کو پیر بنا دیا۔ غریب اور کمزور پر ان کی دہشت قائم رہی۔"

"او کے، ہم سب ایک سے اخلاقی اور قانونی مجرم تھے۔ اور ہیں۔" انور نے بحث ختم کرنے کے لیے ہتھیار ڈال دیے۔ "تم بھی ہو۔"

اس نے بیٹھ کے دوسری سگریٹ سلگائی پھر ملازم کو بلا کے چائے لانے کے لیے کہا۔ "آدمی کو منطقی انداز میں سوچنا چاہیے۔ اب دیکھو فرق کیا ہے اور کہاں ہے؟ چھوٹے چودھری صاحب مرحوم..." اس کے لہجے کی تلخی ختم ہو گئی۔ "جو کچھ انہوں نے کیا، اپنے فائدے کو مدِنظر رکھ کے کیا۔"

"اور پیر سائیں نے ذاتی مفاد میں کچھ نہیں کیا واہ... کیا منطق ہے۔" انور بولا۔

"چودھری صاحب نے بزنس نہیں کیا۔ ان کا نفع نقصان اپنی ذات کے لیے تھا۔ پیر سائیں نے بزنس کیا۔ بہت کچھ خریدا بیچا۔ اب بزنس بھی جائز اور ناجائز سمجھ لیے گئے ہیں۔ میری نظر میں بزنس از بزنس... منی از منی... اس میں بلیک اینڈ وائٹ کا فرق یہاں ہوتا ہے صرف۔" اس نے انگلی سے کنپٹی پر ناک کیا۔ "سو کا نوٹ صرف سو کا نوٹ ہوتا ہے۔ طوائف ایک رات میں کمائے، ڈاکو بینک سے لائے، منشیات اور اسلحہ بیچنے والا یا بردہ فروشی کی کمائی ہو۔ جب وہی نوٹ کسی مزدور کو دن بھر پتھر کوٹنے کا معاوضہ بن کے ملتا ہے تو رزق حلال ہو جاتا ہے۔ مگر یہ نہ اس کے اوپر لکھا ہوتا ہے نہ دیکھنے سے فرق کا پتا چلتا ہے۔ منی از جسٹ منی۔"

میں اسے حیرانی سے دیکھتا رہا۔ وہ کسی دانشور کی طرح بات کر رہا تھا۔

"اس لیکچر کا مقصد؟ میں نے بھی دنیا دیکھی ہے۔" انور چڑ کر بولا۔

"میں تمہارے سوال کا جواب ہی دے رہا تھا۔ پیر سائیں جو بزنس کرتے تھے دوسروں کے ساتھ مل کے کرتے تھے۔ نفع و نقصان صرف ان کا اپنا نہیں... جیسے ایک پرچون فروش کی دکان نہ رہے تو نقصان ذاتی ہوتا ہے مگر کارخانے میں آگ لگ جائے یا بینک دیوالیا ہو جائے تو سارے شریک متاثر ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "میں سمجھ گیا، پیر سائیں کی درگاہ نہ رہنے سے تمہارا بھی نقصان ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔"

"میرے علاوہ بھی لوگ ہیں۔ ایک سلسلہ ہے۔ خود میں اکیلا نہیں۔ میرے شریک بلکہ کچھ میرے پاس بھی ہیں جن کا بزنس ایک لنک ٹوٹ جانے سے ڈسٹرب ہوا۔" وہ بولا۔

"تم چاہتے ہو کہ وہ لنک بحال کر دیا جائے؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "ایک پُل نہ رہے تو ساری ٹریفک متاثر ہوتی ہے۔"

میں نے اور انور نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ "یعنی تم چاہتے ہو کہ درگاہ دوبارہ تعمیر کرنے دی جائے؟" انور بولا۔ "اور یہ سارا گیم ہم پر دباؤ ڈال کے ہمیں مجبور کرنے کے لیے ہے؟"

میں نے کہا۔ "میری معافی بھی تمہارے خیالات میں تبدیلی کا نتیجہ نہیں۔ ایک رشوت ہے اور میں نہ مانوں بلکہ انور سے نہ منواؤں تو دھمکی کہ مجھے پھر وہیں پہنچایا جا سکتا ہے۔"

اندر سے ایک وردی والا بٹلر ٹائپ شخص نمودار ہوا اور درمیان میں ٹرالی چھوڑ کے چلا گیا۔ ٹرالی میں چائے، کافی کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا۔ نادر شاہ نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور بولا۔ "پلیز مجھے بھی ایک کافی بنا دو۔ بلیک، کچھ تکان سی ہے۔"

ساری بات واضح ہو گئی تھی۔ انور اپنی ماں کی وجہ سے پہلے ہی دباؤ میں تھا۔ اب دباؤ مجھ پر بھی آ گیا تھا کہ میں درگاہ کی تعمیرِ نو کی مخالفت کرنے والوں کو سمجھاؤں۔ سمجھداری کا یہی تقاضا ہے۔ یہ بات انور نے بھی سمجھ لی تھی۔

"ہمارے ساتھ ایک ڈاکٹر صاحب تھے۔" میں نے کہا۔ "وہ کہاں ہیں؟"

"وہ ڈاکٹر تھا؟" اس کے ماتھے پر حیرانی کی شکن آئی۔

"ہاں، دماغ کا ڈاکٹر اسپیشلسٹ۔"

"وہ وہاں کیا کر رہا تھا؟ کس کو ہے دماغ کا مسئلہ؟"

"سکندر کی بیوی کو، مراد کی ماں کو۔" مجھ سے پہلے انور بول پڑا۔ "پاگل خانے کا انچارج تھا۔"

نادر شاہ ہنس پڑا۔ "وہ تو خود بھی پاگل ہو گیا ہے۔ پاگلوں میں رہ کے۔"

"وہ جرمنی جانا چاہتا تھا۔ پی ایچ ڈی کرنے کے لیے۔ ساری عمر رزق حلال کے چکر میں رشوت نہیں لی ورنہ دولت مند بڈھوں کی اولاد انہیں پاگل قرار دے کر پاگل خانے میں بند کرنے کے لاکھوں دیتی تھی۔ اب سکندر نے وعدہ کیا تھا کہ اس کی بیوی کا علاج کرے۔"

"اوہ، ویسے وہ مزے میں ہے۔ میرا مطلب ہے اس کے آرام کا پورا خیال رکھا جا رہا ہے۔"

"پلیز اسے جانے دو۔ وہ بہت پریشان ہے اپنی بیوی کی وجہ سے۔"

"ٹھیک ہے، اسے بھجوا دیتے ہیں اس کے گھر۔" نادر شاد نے خالی مگ میز پر رکھا۔

"میری ماں کیسی ہے؟" انور نے پوچھا۔ "تم اسے جانے دو، مجھے رکھ لو۔"

"ایسا ممکن ہوتا، تب بھی قابلِ عمل نہیں تھا لیکن..."

انور نے تشویش سے کہا۔ "لیکن... کیا؟"

"مجھے افسوس ہے۔ تمہارے لیے اچھی خبر نہیں۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔"

انور کچھ دیر سکتے کی کیفیت میں بیٹھا رہا۔ "تم نے مار ڈالا اسے، اس بوڑھی عورت پر تشدد کیا؟"

"اس پر کوئی تشدد نہیں ہوا۔ اس کے آرام و آسائش کا پورا خیال رکھا گیا۔ ڈاکٹر اور نرس بھی موجود رہے... مگر..."

نادر شاہ کی خاموشی نے کمرے میں موت کی سوگوار فضا میں غم کے سائے گہرے کر دیے تھے۔ انور کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے لیکن اس کا دل رو رہا تھا۔ خود مجھے اس تکلیف دہ انکشاف نے از حد مایوس اور افسردہ کیا تھا۔ ہمیشہ مظلوم اور مرد کے ہاتھوں دکھی رہنے والی اور ساری ذلت کو نوشتہ تقدیر سمجھ کے قبول کرنے والی عورت کو باعزت موت بھی نصیب نہ ہوئی تھی۔ پہلے شوہر کی غلامی، پھر بچوں کی ناز برداری اور آخر میں کسی کے لیے کارآمد نہ رہنے والی ہر عورت اتنی خوش نصیب نہیں ہوتی کہ بڑھاپے کا سکھ دیکھے، بیٹے پوتوں میں کھیلے اور اولاد کی خدمت کی خوشی پائے۔ کچھ ایسی بھی ہوتی ہیں کہ پرانی ہوتے ہی شوہر نئی جوان سوکن لے آتے ہیں تو کچھ بہو کے ہاتھوں ذلت و بے سکونی جھیلتی ہیں۔ چودھرائن کہلانے کے باوجود انور کی ماں نے حکمرانی کسی پر نہیں کی تھی۔

انور کی آواز نے خاموشی کو ختم کیا۔ "کب ہوا ان کا انتقال؟"

"کل، ہم نے انہیں باعزت طریقے پر وہیں دفنا دیا تمہارے پرانے آبائی قبرستان میں۔"

"یہ تم نے اچھا نہیں کیا نادر شاہ۔"

"میں شرمسار ہوں حالانکہ میرا قصور ایک فیصد بھی نہیں۔ کسی کی زیادتی ہوتی تو میں اسے سخت سزا دیتا لیکن اب اور کیا کہوں... بس آخری وقت آ گیا تھا ان کا۔"

"اگر تم انہیں نہ لے جاتے تو کچھ نہ ہوتا۔ وہ صدمے

سے مر گئیں۔" انور نے آنکھوں میں آجانے والے آنسوؤں کو ایک انگلی سے جھٹک دیا۔

"کسی نے مجھے بتایا ہوتا کہ وہ ضعیف العمر ہیں اتنی... اور بیمار بھی تو میں یہ نہ ہونے دیتا۔" نادر شاہ بولا۔

"تم انہیں واپس میرے حوالے تو کر سکتے تھے۔" انور چلّا کے بولا۔ "ان کی تدفین خود کرتا، نماز جنازہ میں تو شریک ہوتا۔"

"انہوں نے خود ہی سب کر لیا۔ وہ ہر بات مجھے نہیں بتاتے... ورنہ... خیر، کچھ نقصان نادانستہ ہوتے ہیں۔"

"اور ناقابل تلافی۔" انور بولا۔ "اس کے بعد کیا کرو گے تم؟"

"اب جو کرنا ہے، تمہیں کرنا ہے۔ اس کے لیے تمہیں کچھ وقت دیا جا سکتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "انور کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔ قانونی طور پر زمین روبینہ کی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔ تمہارا تو دور کا بھی تعلق نہیں مگر تم روبینہ سے اپنی بات منوا سکتے ہو۔"

"وہ نہیں مانے گی۔" انور بولا۔

وہ کچھ دیر ہمیں دیکھتا رہا۔ "کب تک نہیں مانے گی؟ نقصان ہو گیا اور ہو گا ضد میں۔"

"یعنی اس کے بعد تم روبینہ کو اٹھاؤ گے؟"

وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ "کیا ہو گا کیا نہیں ہو گا بعد میں، یہ ابھی نہیں بتایا جا سکتا۔"

میں نے نفرت سے کہا۔ "تم سب کچھ کر سکتے ہو۔"

وہ اٹھا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ "دیکھو فرید! سوری، ملک سلیم تم کو میں جانتا ہوں۔ تم بہت سمجھ دار ہو اور ذہین بھی اور یہاں تمہاری بہت عزت ہے۔ چودھریوں کے گھرانے میں تمہاری بہت اچھی گڈول تھی۔ خود پیر سائیں نے تمہارے بارے میں بہت اچھی رائے دی اور اب یہ ٹھیکے دار... کیا نام ہے اس کا، سکندر شاہ... تم اس کے پارٹنر بن گئے ہو انور کے ساتھ۔"

"مجھے میرے بارے میں بتا کے امپریس کرنے کا فائدہ؟"

وہ بولتا رہا۔ "تمہاری بات سنی جاتی ہے۔ تمہارا مشورہ سب مانتے ہیں۔ تم روبی کو بھی سمجھا سکتے ہو۔ تم اور انور مل کے اسے قائل کر سکتے ہو۔ اس کا کوئی نقصان نہیں ہے اس میں کہ درگاہ کی تعمیر ہونے دے بلکہ فائدہ بہت ہے۔ اس کا باپ تو ہمارا پارٹنر تھا۔ ورکنگ پارٹنر... اسے کچھ کرنا نہیں۔ ہم اسے سلیپنگ پارٹنر بنائے رکھیں گے۔ یہ اجازت ہی اس کی انویسٹمنٹ ہوگی ورنہ زمین تو زیادہ مالیت کی نہیں ہے۔ دس بیس کنال، روبینہ سیکڑوں کنال کی مالک ہے۔"

"تم کوئی اور زمین کیوں حاصل نہیں کر لیتے؟"

"میرا خیال تھا تم خود سمجھتے ہو گے، مزار کسی اور جگہ نہیں بن سکتا۔ لوگوں کی عقیدت ٹرانسفر نہیں ہوتی۔ اس کا حصہ کم سے کم بھی پانچ لاکھ ماہانہ ہو گا۔ ساٹھ لاکھ روپے سالانہ اتنی شاید جاگیر کی آمدنی نہیں ہو گی۔"

میں نے کہا۔ "پانچ لاکھ ماہانہ کے لیے وہ تمہارے اس غیر قانونی، غیر اخلاقی کاروبار میں پارٹنر بن جائے؟"

"یہ میری آفر ہے جو میں کسی سے مشورہ کیے بغیر دے رہا ہوں... ان کی بات مجھ پر چھوڑ دو۔ میں انہیں قائل بھی کر لوں گا لیکن تم زیادہ کی امید مت رکھنا۔ اسے کچھ بھی کیے بغیر یہ رقم ملتی رہے گی... ورنہ ہم جو اس کاروبار کو چلاتے ہیں بہت خطرات مول لیتے ہیں۔ یہ کام آسان نہیں ہے جو ہمارے لیے کام کرتے ہیں پکڑے بھی جاتے ہیں۔ جیل بھی کاٹتے ہیں اور مارے بھی جاتے ہیں۔"

"اگر میں تمہاری بات نہ مانوں؟"

"میں تمہیں موقع دوں گا سوچنے کے لیے... ابھی تم پر جذبات کا غلبہ ہے۔ تم خوف زدہ ہو، پریشان ہو، غصے میں ہو اور دکھی ہو۔ میں تمہیں ایک مہینا بھی دے سکتا ہوں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس سے کچھ حاصل نہیں۔"

"میں اسے تمہارا آخری جواب نہیں مانتا۔ ہفتہ دس دن بعد یا مہینا بھر بعد جب تمہارے جذبات پر عقل غالب ہو گی تو یہ ہو سکتا ہے کہ تم نفع نقصان کو سمجھ سکو۔"

"چلو ٹھیک ہے، فائدہ تم نے بتا دیا۔ نقصان کیا ہو گا؟"

"اندازہ تم بھی کر سکتے ہو۔ کیونکہ تم جانتے ہو مجھے... لیکن میں سب کچھ ابھی کیوں بتاؤں، میرا پلان بھی بدل سکتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "نادر شاہ! میں دوبارہ پھانسی کے تختے پر کھڑا ہونے کے لیے تیار ہوں۔ جو تم چاہتے ہو، وہ میں نہیں کروں گا نہ آج نہ ایک مہینے بعد۔"

انور نے مجھے ٹوکا۔ "سلیم! بے وقوفی کی بات مت کر۔"

نادر شاہ مسکرایا۔ "انور تم سے زیادہ سمجھ دار ثابت

ہورہا ہے۔ جانتا ہے کہ نقصان صرف تمہاری ذات تک محدود نہیں رہ سکتا۔ تمہیں تو میری طرف سے معافی بار رعایت مل رہی ہے۔ ورنہ تمہارے بغیر بھی یہ مقصد حاصل ہوجائے گا۔ پھانسی چڑھنے کا شوق تھا تو فرار کیوں ہوئے تھے وہاں سے... اور ایسے نام بدل بدل کے یہاں چھپ کے زندگی کیوں گزار رہے ہو؟"

"میں اس کو سمجھاؤں گا۔" انور نے کہا۔

"اور مجھے یقین ہے کہ یہ سمجھ جائے گا... آج کی ملاقات کے بعد... تمہیں ڈر ہوگا کہ نہ جانے تمہارے ساتھ کیا ہوگا۔ تم پر کیا تشدد ہوگا؟ اپنی بات منوانے کے لیے... مگر میں صرف بات کر رہا ہوں۔ ایک بزنس ڈیل کر رہا ہوں۔ یہ شرافت ہے میری، یہاں سے تم کو باعزت طور پر واپس پہنچا دیا جائے گا۔"

"اور اگر میں وہاں سے بھاگ جاؤں؟ پھر غائب ہو جاؤں؟"

وہ مجھے دیکھتا رہا۔ "اول تو میں تمہیں اتنا بے وقوف نہیں سمجھتا۔ دوسرے یہ ممکن نہیں۔ اس سے پہلے کہ تم پوچھو کیوں ممکن نہیں، میں بتا دیتا ہوں کہ مراد ہاؤس کے اندر باہر جتنے ملازم ہیں، سیکیورٹی اسٹاف تک، وہ اب ہمارے ہیں۔"

"وہ سب پرانے لوگ ہیں۔ سکندر کے دیکھے بھالے اور وفادار۔"

وہ وِلن کے انداز میں ہنسا۔ "وفاداری، ایمان، ضمیر وغیرہ وغیرہ سب کی پہلے بڑی قدر تھی۔ اب قیمت ہے۔ چنانچہ قدر، قیمت میں قدر ہے سکندر کی نظر میں۔ قیمت ہے ہمارے لیے۔ اور یہ کون نہیں سمجھتا آج کی دنیا میں کہ ہر چیز کی اور ہر انسان کی ایک قیمت ہوتی ہے، کم یا زیادہ جس پر اسے خریدا جا سکتا ہے تنخواہ انہیں سکندر دیتا ہے، کام وہ ہمارے لیے کرتے ہیں۔"

"میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ یہ ان سائڈ جاب ہے۔"

"اپنے چودھری انور صاحب نے تو ساری زمین بانٹ دی غریب مزارعوں میں۔ اللہ انہیں جزا دے۔ یہ باہمت آدمی ہیں۔ حویلی تباہ کرنے والے احمق تھے۔ اس کے بغیر بھی کام ہوجاتا۔"

"تم مجھے یا انور کو راہ چلتے اٹھا سکتے تھے۔ پھر یہ مراد ہاؤس میں کل رات ڈراما کس لیے تھا؟"

"کچھ کام ڈراما کیے بغیر ہوتے نہیں۔ اس علاقے میں اپنی طاقت کی دہشت قائم رکھنا بھی ضروری ہے۔ ایک روحانی غلبہ تو حاصل ہے پہلے سے... یہ شہرت بھی ہونی چاہیے کہ جو پیر سائیں کی نہ مانے اس پر عذاب نازل ہوتا ہے اور اس کو اللہ کا عذاب سمجھا جائے... کوئی بغاوت یا نمک حرامی کرتے ہوئے ان مثالوں کو یاد رکھے جب کسی کو پیر صاحب کے خلاف بولنے پر جنات نے سزا دی تھی جو پیر سائیں کے تابع ہیں۔ سو فیصد لوگ مرید تو نہیں ہوتے۔ کچھ پیری فقیری اور مزارات پر چادر چڑھانے یا منت ماننے کے خلاف ہوتے ہیں۔ وہ دل سے نہ مانیں مگر ڈریں۔"

شاید اس کی بات غلط نہیں تھی۔ اس کے بارے میں مجھے پہلے بھی بہت کچھ معلوم تھا لیکن اب اندازہ ہوا کہ مجھے بہت کم معلوم تھا۔ میں ذہنی طور پر اس سے مرعوب اور دہشت زدہ ہو گیا تھا۔ کس طرح میرے اعتماد کی عمارت دھڑام سے زمیں بوس ہو گئی تھی۔ حالانکہ اتنا وقت گزر جانے کے بعد میرا یقین پختہ ہو چکا تھا کہ اب خطرہ بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ پولیس کیا نادر شاہ بھی سامنے آجائے تو فرید کو پہچان نہ پائے۔ کیونکہ میں ملک سلیم اختر اور میری شناخت پکی ہے۔ مگر حقیقت یہ نہ تھی۔ ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب سے۔ نادر شاہ نے میری ساری خوش گمانی دور کر دی تھی۔

چند منٹ کی خاموشی کے بعد اس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ "او کے، مجھے اب کام ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم میری پیشکش قبول کرو گے اور سمجھو گے کہ یہ محض فراخ دلی ہے میری... ورنہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اجازت دینے والا ہی کوئی نہ رہے۔ دو گھرانوں کے نام لیوا دو ہی ہیں۔ انور اور روبینہ... تم کسی شمار قطار میں نہیں ہو ملک سلیم اختر... عرف فریدالدین... برائی خود آ کے تمہیں لے جاتے... میں تمہیں زندگی کا حق دے رہا ہوں اور روبینہ کو پارٹنر شپ آفر کر رہا ہوں۔" اس نے ہاتھ آگے بڑھایا اور میں نے غیر ارادی طور پر ملا لیا۔ اس کا مجھے افسوس ہوا لیکن تب تک انور بھی میری تقلید کر چکا تھا۔ ہاتھ ملانے کا مطلب دشمنی نہیں، دوستی سمجھا جاتا ہے۔ مفاہمت سمجھا جاتا ہے۔

ہم یہاں اس پوزیشن میں تو نہیں تھے کہ کھل کر اپنے عزائم کا اظہار کر سکتے یا اسے چیلنج دے سکتے مگر خاموش رہنا تو ممکن تھا۔ ہم اس کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو نظرانداز ضرور کر سکتے تھے۔ خواہ اس کا مطلب وہ کچھ بھی سمجھے۔ اب پچھتانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ نادر شاہ کے جاتے ہی وہ شخص نمودار ہو گیا جو ہمیں ایک کار میں ڈرائیو کر کے یہاں لایا تھا۔ ہماری پوزیشن بدل چکی تھی۔ ان پر ذمے داری عائد کی

گئی تھی کہ ہمیں ایک مقررہ وقت پر خیر و عافیت کے ساتھ یہاں پہنچائیں۔ اب ہم معزز مہمانوں کا درجہ حاصل کر چکے تھے۔

"گاڑی آگئی ہے سر۔" اس نے مؤدبانہ کہا۔ لہجے سے وہ سرحد کا باشندہ لگتا تھا۔

وہی گاڑی عین دروازے پر لگی ہوئی تھی۔ واپسی کا سفر ایک مختلف تجربہ تھا۔ مجھے احساس تھا کہ میں نادر شاہ کے احسان کو جھٹلا نہیں سکتا۔ وقت کے ساتھ ساتھ میرے دل میں انتقام کے جذبات کی شدت میں کمی آتی گئی تھی اور شاید اس کا نتیجہ تھا کہ میں نے خواب میں بھائی کو دیکھا جو مجھ سے کہہ رہے تھے کہ مُنا! انتقام کو بھول جا، اپنی زندگی گزار... رہی سہی کسر خود نادر شاہ نے پوری کر دی تھی۔ میں اب محفوظ تھا اور پُرسکون۔ میرے سامنے کامیاب مستقبل تھا۔

انور نے اچانک کہا۔ "ہمارے پاس کوئی چوائس نہیں رہی سلیم۔"

میں چونکا۔ "ہم گھر چل کے بات کریں گے تفصیل سے... بظاہر ایسا ہی لگتا ہے۔"

"ڈاکٹر کا پتا نہیں کیا ہوا؟"

"اسے نادر شاہ نے بھیج دیا ہوگا... وہ خوامخواہ چکر میں آ گیا تھا۔"

"مجھے اس سے کیا ہوا وعدہ نبھانا ہے۔" انور بولا اور باہر دیکھنے لگا۔

میں نے ڈرائیور سے پوچھا۔ "یہ کیا جگہ ہے؟"

اس کی نظر کہیں اور تھی۔ اس نے شاید میری بات سنی ہی نہیں۔ میں نے اس کی نگاہ کا تعاقب کیا تو مجھے بڑا عجیب منظر دکھائی دیا۔ شکستہ اور تنگ سڑک پر یہ واحد کار تھی۔ دونوں جانب کہیں کھیت تھے، کہیں خالی زمین۔ درخت کم تھے مگر ایک جگہ بہت گھنے نظر آرہے تھے۔ یہ شاید کسی کا باغ تھا۔ اس کے وسط میں چھوٹے سے گنبد کی سفیدی چمک رہی تھی اور اس پر سبز رنگ کا تکون جھنڈا ہوا سے لہرا رہا تھا۔ درختوں کے درمیان کوئی قبرستان تھا یا کسی کا مزار... ایسے چھوٹے مزارات ہر جگہ عام نظر آتے ہیں۔

جس بات نے مجھے حیران کیا، وہ کچھ لوگ تھے جو زمین سے نکل رہے تھے۔ یوں جیسے چیونٹے اپنے بلوں میں سے نکلتے ہیں۔ ایک کے بعد دوسرے شخص کا سر نظر آتا تھا۔ پھر وہ پورا نکل آتا تھا۔ ہموار زمین پر کوئی کنواں تھا یا سوراخ جس میں سے ایک جیسے لوگ یکے بعد دیگرے باہر آرہے تھے۔ ان کے چہرے دکھائی نہ دیتے تھے مگر وہ سب نوجوان تھے۔ سب نے سیاہ کپڑے کا شلوار قمیص پہن رکھا تھا اور ان سب کے ایک کندھے پر کلاشنکوف تھی۔ سب کی پیٹھ پر خاکی زمین کا سفری بیگ تھا۔ میں نے رکتے رکتے سے تین افراد کو زمین سے نکل کر درختوں کے اس جھنڈ میں غائب ہوتے دیکھا۔ پھر گاڑی آگے بڑھ گئی۔

یہ منظر ڈرائیور نے بھی دلچسپی سے دیکھا تھا لیکن کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا تو مجھے شاک سا لگا۔ وہ بھی نوجوان تھا اور اس نے بھی سیاہ شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ اس کے چہرے پر حیرانی کے کوئی آثار نہ تھے بلکہ ایک پُراطمینان مسکراہٹ تھی۔ اس نے یہ منظر اتنی توجہ سے دیکھا تھا کہ میرا سوال نہیں سنا تھا۔ میں نے انور کو دیکھا۔ وہ دوسری طرف کی کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا مگر اس کا خیال کہیں اور تھا۔ وہ اپنی ماں کے خیال سے دکھی اور افسردہ تھا اور شاید اس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

میں نے اپنا سوال دہرایا۔ "یہ کس کا مزار تھا۔ کیا نام ہے تمہارا ڈرائیور؟"

"نصیب گل، ہم کو تو نہیں مالوم سر۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ "ہم اس علاقے کا رہنے والا نہیں ہے۔"

میں نے سوچ کے پوچھا۔ "تم افغانستان سے آئے ہو؟"

یکلخت اس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

"نہیں، ہاں جناب... اُدر بہت لڑائی اے۔"

"یہاں کیسے پہنچ گئے... اُدھر جہاد میں حصہ نہیں لیا؟" انور بولا۔

اس نے کچھ سوچ کے جواب دیا۔ "ہمارا بھائی بولا، تم بی بی اور بچہ کو لے کر جاؤ، تم بھی شہید بنے گا تو ان کو خنزیر شراب خور کافر اٹھائے گا۔"

میں نے پوچھا۔ "افغان کیمپ اُدھر سرحد میں ہیں۔ کراچی میں بھی ہیں۔ مہاجر سب اِدھر ہیں۔"

وہ میرے سوال سے کچھ اپ سیٹ نظر آیا۔ "ہم خیرات نہیں لیتا۔ اُدھر کیمپ میں کافر کا امداد آتا ولایت سے۔"

"وہاں جو افغان آئے ہیں۔ کراچی میں، وہ محنت مزدوری کرتے ہیں۔ ٹرانسپورٹ چلاتے ہیں۔ یہاں اس گاؤں میں کیا ہے؟"

اس نے جیسے جان چھڑانے کے لیے کہا۔ "اچھا، ہم چلا جائے گا۔"

سورج غروب ہو چکا تھا۔ مراد نگر میں بظاہر سب کچھ وہی تھا اور ویسا ہی تھا جیسا گزشتہ روز تھا۔ درمیان میں ایک ہی رات آئی تھی مگر اس میں جو ہم پر بیتی تھی، اس نے سب کچھ بدل دیا تھا۔ نصیب گل ہمیں ڈراپ کر کے سلام دعا کیے بغیر واپس چلا گیا۔ میں نے اس کی گاڑی کی نمبر پلیٹ پر نظر ڈالی تو وہ ''ایس ٹی'' تھی یعنی سوات۔ ہمارے اندر داخل ہوتے ہی سکندر سامنے آ گیا۔ وہ ایک لمحے کے لیے رکا اور پھر باری باری اس نے مجھے اور انور کو گلے لگایا۔ ''آ گئے تم... سب خیریت ہے نا... اللہ کا شکر ہے ہم سب کتنے پریشان تھے۔'' کسی سوال جواب کا انتظار کیے بغیر وہ ہیجانی کیفیت میں سوال پر سوال کرتا گیا۔

میں نے محسوس کیا کہ صدمے اور پریشانی نے ایک رات میں اسے بوڑھا کر دیا ہے۔ اس کی آنکھیں لال تھیں۔ چہرے پر فکر و تردد کی لکیریں سی نظر آنے لگی تھیں اور اس کے بکھرے ہوئے بالوں میں سفیدی زیادہ ہو گئی تھی۔ ''آؤ، آؤ۔'' وہ ہمیں کھینچ کر لاؤنج میں لے گیا اور چلانے لگا۔ ''ارے روبی... ریشم دیکھو انور آ گیا، حلیم بھی آ گیا۔'' پھر ہم سے مخاطب ہوا۔ ''دونوں کا رو رو کے حال خراب ہے۔''

میں نے اس کے کندھے تھام کے کہا۔ ''آپ بیٹھو، فکر کی کوئی بات نہیں۔''

انور نے بھی اس کی دلجوئی کے لیے کہا۔ ''ہاں، ہم بالکل ٹھیک ہیں، دیکھ لیں۔''

دونوں لڑکیاں دوڑتی آئیں، وہ زار و قطار رو رہی تھیں۔ ریشم دوڑتی ہوئی آ کے مجھ سے لپٹ گئی۔ ''کہاں چلے گئے تھے تم بھائی، ایسے بتائے بغیر؟''

میں نے اسے تھپکی دی اور سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''ارے کام تھا، بے وقوف، رونے کی کیا بات ہے؟''

روبی دو قدم دور ہی رک گئی تھی۔ ''جھوٹ مت بولو، تمہیں معلوم ہے ہم پر کیا قیامت گزر گئی؟''

انور نے کہا۔ ''اندازہ ہے مجھے بھی۔''

''تمہیں کوئی اندازہ نہیں۔'' میں نے سکندر کی گلوگیر آواز سنی۔ وہ رو رہا تھا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کے چہرے کی جھریوں میں سے گزر رہے تھے۔ ''کام تھا تو بتا کے جاتے۔''

میرا ماتھا ٹھنکا۔ سکندر ہمارے لیے نہیں رو رہا تھا۔ صرف ریشم کی میرے ساتھ جذباتی وابستگی میں اتنی شدت تھی۔

''اچھا، بیٹھو، ہم بیٹھ کے بات کر سکتے ہیں۔ آپ بھی بیٹھیں شاہ جی۔'' میں نے سکندر کو صوفے پر بٹھایا اور خود اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

انور بھی اندازہ کر چکا تھا کہ ہماری عدم موجودگی میں کوئی ایسی ویسی بات ہوئی ہے۔ ''شاہ جی! کیا ہوا؟'' آنٹی کہاں ہیں؟''

سکندر نے مایوسی اور دکھ سے نفی میں سر ہلایا اور ایک انگلی اوپر اٹھائی۔ ''وہیں، جہاں سب کو جانا ہے۔''

''ہاں بھائی، ان کا انتقال ہو گیا تھا کل رات ہی۔'' ریشم نے دوپٹے کے پلو سے آنسو صاف کیے۔

''ہم نے ظہر کے بعد اسے سپردِ خاک کر دیا۔'' سکندر نے ایک گہری سانس لی۔ ''ابھی کچھ دیر پہلے تک تعزیت کے لیے آنے والے تھے۔ اب میں نے منع کر دیا ہے۔''

انور نے بڑے ضبط اور حوصلے کا ثبوت دیا اور ماں جی کا ذکر نہیں کیا۔ ''آخر کیا ہوا اچانک؟''

اس وقت روبی نے گھر کی مالکن بن کے ہمت کی۔ ''میں چائے اور کافی لاتی ہوں۔''

انور نے اور ریشم نے اس کی طرف دیکھا۔ ''لیکن روبی... کیا یہ مناسب ہے؟'' انور بولا۔

''آج ہی چولھا جلانا...'' ریشم نے کہا۔

روبی سے پہلے سکندر شاہ بولا۔ ''کیا فائدہ ایک دوسرے کے سامنے ایسی دنیا داری کی رسم کا... کون سی شرع میں ہے یہ حکم... جاؤ بیٹا اب کون ہے تمہارے سوا اس گھر کا مالک۔''

میں نے کہا۔ ''دنیا داری کی رسم ہے بس۔''

''جو دکھ ہے ہمارا ہے، اس میں دنیا کہیں نہیں۔ کس کے سامنے آنسو بہا کے ہمیں دکھانا ہے کہ ہم کتنے دکھی ہیں۔ کچھ لوگ رسمی طور پر چاہتے تھے کہ سوم تک ہمارے کھانے پینے کا انتظام ان کی طرف سے ہو۔ وہ سب مقابلے پر قورمے اور بریانی کی دیگ لے کر آتے اور دعوت اڑاتے۔ میں نے وہیں قبرستان میں کہہ دیا تھا کہ تدفین میں شرکت فرمانے والوں کا شکریہ۔ اب آپ کو سوئم، چہلم اور رسمی قرآن خوانی میں شرکت کی زحمت کرنے کی ضرورت نہیں۔ ایصالِ ثواب اپنے گھر سے بھی کر سکتے ہیں آپ لوگ۔'' سکندر نے اب خود کو سنبھال لیا تھا۔

''بات آپ کی غلط نہیں۔ مجبوری ہوتی ہے سب کی۔'' میں نے کہا۔

''میں بہت تھک گیا ہوں بیٹا۔ اندر سے ٹوٹ پھوٹ

گیا ہوں بالکل... مرنا ہوتا تو مراد کے ساتھ ہی مر جاتا... مگر اس وقت زندہ رہنا میری مجبوری تھی۔ دنیا داری کے لیے یا اپنے لیے نہیں... اس نیک بخت کے لیے مجھے زندہ رہنا تھا۔ مراد کی ماں کے لیے اور شاید ایسا ہی اس نے میرے لیے سوچا، مگر وہ کمزور اعصاب کی عورت تھی۔ اس میں اتنی برداشت کہاں تھی۔'' وہ پھر چپ ہو گیا۔ فرطِ جذبات سے اس کی آواز گلوگیر ہو گئی تھی۔

''آخر ہوا کیا اچانک؟'' میں نے کہا۔

''ابھی پتا نہیں۔ مگر پتا چل جائے گا۔ ہم تو تمہارا انتظار کر رہے تھے کھانے پر... پتا چلا تم پیچھے کسی سے پوچھ تاچھ کر رہے ہو۔ ایک ملازم نے آ کے تمہارا پیغام دیا کہ ہم لوگ انتظار نہ کریں۔ کھانا کھا لیں... تم نے چائے منگوائی تھی دس بارہ لوگوں کے لیے... وہ بھیج دی اور ہم نے کھانا کھا لیا۔ کچھ دیر بعد مجھے نیند آنے لگی اور میں سو گیا۔ یہی ان کے ساتھ ہوا۔'' اس نے روبی اور ریشم کی طرف اشارہ کیا۔ ''مراد کی ماں تو کمرے سے نکلی ہی نہیں تھی۔ اس نے وہیں کھانا کھا لیا تھا۔ روبی نے صبح مجھے آ کے جگایا اور کہا کہ امی کو دیکھیں۔ وہ میرے اٹھانے پر بھی نہیں جاگی تو اندازہ ہوا کہ بے ہوش ہے۔ ڈاکٹر آیا تو اس نے کہا کہ اسپتال لے جائیں، بی پی بہت کم تھا۔ اسی اور پچاس... آدھے گھنٹے بعد ایمبولینس کے آنے تک ستر چالیس ہو گیا اور بس... چلتے چلتے سانس رک گئی، بیمار تو وہ تھی۔''

میں نے اور انور نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ابھی تک سکندر کو شک نہیں ہوا تھا کہ انہیں خواب آور دوا دی گئی تھی۔ دیگر معاملات کی بات کرنے سے پہلے انور نے کہا۔ ''شاہ جی! اماں بھی نہیں رہیں۔''

روبی ٹرے میں پانچ مگ رکھے اندر آئی اور ٹرے کو میز پر رکھ کے بیٹھ گئی۔ ''کیا کہا تم نے چاچی کے لیے؟''

''وہ فوت ہو گئیں۔'' انور سر جھکا کے بولا۔

''مگر کیسے اور کب؟'' سکندر شاہ نے کہا۔ ''کس نے بتایا تمہیں؟''

''انہی لوگوں نے جو اماں کو لے گئے تھے۔ ان کی تدفین بھی ہو چکی ہمارے قبرستان میں۔ جو لوگ ان کو لے گئے تھے وہی انہیں بھی لے گئے تھے یہ بتانے کے لیے کہ اماں کے ساتھ انہوں نے کوئی زیادتی نہیں کی تھی۔ ان کے آرام کا خیال رکھا، ایک ڈاکٹر بھی موجود رہا لیکن ان کا انتقال ہو گیا۔ بہت صدمات جھیل چکی تھیں وہ... حویلی کی تباہی کے بعد مجھ سے دوری برداشت نہ ہوئی، انہوں نے سمجھا ہو گا کہ یہ جھوٹ ہے اور شاید میں بھی ہلاک ہو چکا، وہ مجھ سے ملنے کے لیے تڑپتی رہیں۔'' انور کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔

''کون لوگ تھے وہ؟'' سکندر دکھ اور غصے سے بولا۔ ''جو تمہاری اماں کو لے گئے تھے؟''

''وہی مجاور ہوں گے۔'' انور نے نفی میں سر ہلایا۔ ''مزار پھر بنانے کے لیے وہ ہم پر دباؤ ڈالنا چاہتے تھے اور معاملے کو طول دے رہے تھے۔ اماں نے ان کی یہ اسکیم ناکام کر دی۔ وہ دباؤ کے لیے زندہ ہی نہیں رہیں۔''

''یہ بات وہ فون پر بتا سکتے تھے؟'' سکندر نے کہا۔ ''کہ ان کا انتقال ہو گیا ہے۔''

''مجھے تو شک ہو گیا تھا پہلے ہی... جب اُدھر سے کسی عورت نے اماں کی جگہ بات کی تھی اور گھنٹا بھر بات کرتی رہی تھی۔ اتنا وہ کہاں بول سکتی تھیں آپ جانتے ہیں۔''

سکندر انہیں گالیاں دینے لگا۔ ''اتنی انسانیت بھی نہیں تھی ان میں کہ مرنے کے بعد انہیں واپس پہنچا دیتے۔''

''شاہ جی۔'' انور نے کہا۔ ''ہم کل بات کریں گے۔ ابھی مجھے قبرستان جانا ہے۔''

دونوں لڑکیوں کا صدمے اور خوف سے حال خراب تھا۔ ان کے اترے ہوئے زرد چہروں پر آنکھوں کے گرد حلقے تھے۔ وہ بار بار رونے لگتی تھیں۔ انور نے عقلمندی سے کام لیا کہ نادر شاہ سے ملاقات کا ذکر نہیں کیا اور اس سے ہونے والے مذاکرات کی تفصیل کو کل پر اٹھا رکھا۔ دو گھروں میں ہونے والی دو افسوسناک اموات کا معاملہ محض مشیتِ ایزدی کے سامنے سر جھکانے کا نہیں تھا اور یہ کہہ کر ختم نہیں ہوتا تھا کہ موت برحق ہے اور انہیں بھی آ گئی تھی۔ انہیں حالات کے ستم نے مار دیا تو یہ بھی اللہ کی مرضی... یہ اس سے کہیں زیادہ گمبھیر معاملات تھے جن پر فرصت سے سوچ سمجھ کے کوئی لائحہ عمل مرتب کرنے کی ضرورت تھی۔

ہم رات کے اندھیرے میں اس قبرستان پہنچے جہاں گزشتہ ایک صدی میں چودھریوں کے گھرانے کے افراد باری باری پہنچے تھے۔ حویلی کا نام و نشان مٹ گیا تھا اور اس کا جلا ہوا کھنڈر جو شان و شوکت اور خوف و ہیبت کی علامت تھا قبرستان سے زیادہ عبرت کی تصویر بنا ہوا تھا۔ سکندر کی بیوی، مراد کی ماں اور روبی کی ساس انہی دو چودھریوں کی بہن تھی اور اسی حویلی سے رخصت کی گئی تھی۔ سکندر نے اسے واپس یہاں پہنچا دیا تھا۔ دونوں قبریں ایک دن کے فرق سے بنی تھیں۔ سکندر نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ

بہن کو بھائی کے ساتھ جگہ ملے۔ انور کی ماں کو تدفین کے لیے.... لانے والے مجرموں کی طرح لاش کو یہاں لائے ہوں گے اور جہاں جگہ ملی گاڑ کے چلے گئے ہوں گے۔ تھوڑا سا تلاش کرنے پر تازہ قبر کا سراغ مل گیا۔ یہ اتفاقات کا کھیل تھا کہ انور کی ماں کو وہ جگہ ملی جہاں ایک پرانی پکی قبر کے کتبے پر نام تو ایک ملازمہ کا لکھا ہوا تھا مگر میں جانتا تھا کہ نیچے اسی ماں کا لختِ جگر سو رہا ہے۔

اس رات کا بھیانک منظر اپنی تمام دہشت زدہ کرنے والی تفصیلات کے ساتھ میری نظروں کے سامنے کسی پرانی فلم کی طرح چلنے لگا۔ انور نے چھوٹے بھائی کو اسی طرح اپنی حویلی کے تہ خانے میں زنجیروں سے باندھ کے رکھا تھا جس طرح بڑے بھائی کو اکبر نے رکھا تھا اور جب بالآخر ایک مصالحتی فارمولے کے تحت اکبر کی رہائی کا فیصلہ ہوا تو اس کی بیوی شاہینہ نے جو شوہر کی اسیری کے زمانے میں اپنی آزادانہ زندگی سے خوش تھی، دوبارہ شوہر کی غلامی اور اس کے ہاتھوں ذلت اٹھانا قبول نہیں کیا۔ اس نے خود شوہر کو کھانے میں زہر دیا اور قتل کا مجرم کچن کی ایک وفادار ملازمہ کو بنا دیا گیا۔ اس ملازمہ کو بھی اسی قبرستان کے ایک دور افتادہ گوشے میں گاڑ دیا گیا تھا۔ بھائی کے قتل کا الزام انور پر آ رہا تھا۔ بیوی پر کسی کو شک نہ تھا۔ اس ڈر سے کہ تفتیش میں لاش کا دوبارہ پوسٹ مارٹم نہ ہو سکے خود انور نے رات کے وقت خاموشی سے دونوں لاشوں کے مدفن بدل دیے تھے۔ ملازمہ کی قبر میں اکبر کو لٹا دیا گیا تھا اور جس پر بعد میں اکبر کا کتبہ لگایا گیا وہاں درحقیقت ایک بے گناہ ملازمہ دفن تھی جسے سزائے موت ہو گئی تھی کیونکہ پھانسی کا پھندا اسی کے گلے میں فٹ ہوتا تھا۔ لاشوں کو ادھر سے اُدھر کرنے کی ساری کارروائی میں نے ریشم اور سلونی کے ساتھ ایک کھڑکی سے دیکھی تھی جو قبرستان کی طرف کھلتی تھی۔

اب مجھے اندازہ تھا کہ انور کے دل پر کیا بیت رہی ہو گی۔ خاندانی پروٹوکول کے مطابق قبرستان کی زمین پر ہر ایک کے مدفن کی جگہ الاٹ کر دی گئی تھی۔ چھوٹے چودھری صاحب کو اپنے والد کے قدموں میں جگہ ملی جو ان کے لیے مخصوص تھی۔ دوسری جگہ بڑے بھائی پیر سائیں کی تھی مگر انہوں نے یہاں آنا پسند نہیں کیا۔ وہ طبعی موت مرتے تب بھی درگاہ کے اندر ان کے مزار شریف کے لیے جگہ مخصوص تھی۔ آج مجھے قدرت انسان کے عزائم پر خندہ زن محسوس ہوتی تھی۔ درگاہ بھی اسی طرح پہلے تباہ ہوئی جیسے حویلی اور مریدوں نے نیا مزار بنانے کے لیے پیر سائیں کو اسی احاطے میں لٹا کے گنبد اور جھنڈا لگا دیا کہ انشاء اللہ اب مزار شریف کی عمارت زیادہ پُرشکوہ ہو گی۔

ایک حویلی کی شان و شوکت، ایک درگاہ کا جاہ و جلال، سب ملبے کا ڈھیر۔ ان کے مغرور مکین جن کی دستار میں غرور کا کلف تھا۔ سب خاک کا ڈھیر، سکندر جب گیا دنیا سے دونوں ہاتھ خالی تھے۔ مجھے واپسی کے خاموش سفر میں عبرت کی صدا سنائی دی۔ پھر رفیع کے گانے کی آواز سنائی دینے لگی۔ جائے گا جب یہاں سے کچھ بھی نہ پاس ہو گا۔ دو گز کفن کا ٹکڑا تیرا لباس ہو گا۔ پھر مجھے بھائی کا کفن پوش کوئلے جیسا بدن یاد آیا۔ وقت کا شاطر ہاتھ سب کو مات دے رہا تھا۔ سکندر بازی ہار رہا تھا۔ انور خود کو بچا رہا تھا۔ نادر شاہ کب تک اپنے غرور کا پرچم لہراتا پھرے گا۔

اس رات ریشم کے ساتھ رو بینہ رہی۔ انور کے ساتھ میں رہا۔ صرف سکندر اکیلا تھا۔ اس کی ذہنی اور جسمانی حالت ایسی تھی کہ وہ کوئی بھی انتہائی قدم اٹھا سکتا تھا۔ وہ انتہائی مضبوط اعصاب کا مالک اور جذبات کو عقل کے تابع رکھنے والا شخص تھا جو زندگی کی جنگ میں سکندرِ اعظم کی طرح فتوحات کرتا آگے بڑھتا گیا تھا اور مسلسل کامیابی کے جھنڈے گاڑتا رہا تھا۔ جنگ کے اصولوں کے مطابق اس نے جائز اور ناجائز میں فرق کو نظر انداز کیے رکھا۔ ایک معمولی حیثیت کے کسان کا بیٹا آج بہت بڑا بلڈر اور کروڑ پتی شخص تھا۔ اس کی طاقت کا سرچشمہ دولت کے ساتھ اثر و رسوخ تھا جو اس نے بڑی کوشش سے استوار کیے تھے یا خریدے تھے۔ معلوم نہیں اس کے خواب اسے کہاں لے جاتے مگر یکلخت تقدیر کے ستاروں نے چال بدلی اور اس کا زوال شروع ہوا۔

پیر سائیں نے اس کے غرور کو پہلی شکست دی اور اس کے بیٹے کا رشتہ ٹھکرا دیا۔ اپنا سب کچھ داؤ پر لگا کے بھی وہ اس شکست کو جیت میں نہ بدل سکا۔ پھر وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا۔ اس کا بیٹا پلک جھپکتے میں غائب ہو گیا۔ ہستی اپنی حباب کی سی ہے۔ یہ نمائش سراب کی سی ہے۔ اچانک ہر طرف سے دشمن امڈ آئے اور اسے محصور کر لیا۔ وہ اکیلا تھا۔ ہماری طرف مدد کا ہاتھ نہ پھیلاتا تو کیا کرتا۔ ایسے میں ایک نادیدہ دشمن نے وار کیا جو درحقیقت اس کا دشمن نہ تھا اور سکندر اپنی رفیقِ حیات سے بھی محروم ہو گیا۔ ایسے میں ہم کیا بتاتے کہ اس قلعے میں جس کو وہ مراد ہاؤس کہتا تھا دشمن اندر تک قبضہ حاصل کر چکا ہے اور اس کے ارد گرد جو نمک خوار نظر آتے ہیں، نمک حرام بن چکے ہیں۔

اس نیم دیوانگی کی کیفیت میں جو انتہائی مایوسی نے پیدا کی تھی وہ اگر زندہ رہنا چاہتا تو صرف ایک موہوم امید پر کہ ایک دن اس کا وارث مراد کا بیٹا ہو گا۔ بیٹے کی جگہ بیٹی بھی ہو سکتی تھی لیکن وہ وقت ابھی بہت دور مستقبل کی دھند میں اوجھل تھا۔

جو کیفیت پہلے اس کی بیوی کی تھی، وہی اب سکندر کی ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے شکستہ قبروں کی ویرانی جھانکتی تھی۔ وہ بیٹھے بیٹھے وقت کے گزرتے لمحے کو چھوڑ کر آگے یا پیچھے نکل جاتا تھا۔ کبھی خود سے کچھ کہتا تھا۔ کبھی سمجھتا تھا کہ بیوی سے ہم کلام ہے تو کبھی مراد سے کچھ کہہ جاتا تھا جیسے وہ سامنے کھڑا ہو۔ مجھے نادر شاہ کی بات یاد آئی کہ ڈاکٹر سے سکندر کی بیوی کا علاج کراؤ... اب یہ مشورہ مجھے سکندر کے لیے درست نظر آتا تھا۔

میں جانتا تھا کہ میری طرح انور بھی اپنے خیالوں کے جنگل میں بھٹک رہا ہے۔ لائٹ آف کر کے ہم دونوں بیڈ پر بیٹھے لیٹے نظر نہ آنے والی چھت کو گھور رہے تھے۔ اس خیال سے خاموش ہیں کہ ایک دوسرے کو سونے کا موقع دینا چاہتے ہیں کیونکہ نیند آج ایک ضرورت ہے۔ ایک دوا ہے مگر بقول شاعر... یہ ستاک مسیحا کسی کے قبضے میں نہ تھی۔

انور پہلے بولا۔ ”یار! ہمیں سکندر شاہ کو اکیلا نہیں چھوڑنا چاہیے۔“

میں نے کہا۔ ”روبی کو معلوم ہو گا۔ گھر میں نیند کی گولیاں ہوں تو اسے دے دیں۔ میں پوچھتا ہوں۔“

کاریڈور میں سامنے والا دروازہ ریشم کے بیڈ روم کا تھا اور وہ دونوں آج وہیں تھیں۔ میں نے ایک انگلی سے دروازے پر خفیف سی دستک دی۔ لائٹ جلی اور میں نے روبی کو اپنے مقابل پایا۔ ”آ جاؤ۔“ اس نے سرگوشی میں کہا۔

”نہیں، مجھے صرف یہ پوچھنا تھا کہ تمہاری آنٹی سکون آور یا خواب آور گولیاں استعمال کرتی تھیں؟“

”ہاں۔“ اس نے چہرے پر آنے والے بالوں کو سمیٹ کر پیچھے کیا۔ پس منظر کی روشنی میں اس کا اجلا چہرہ گہرے سرخ نائٹ ڈریس میں گلابی سا لگا۔ ”کیا کرنا ہے؟“ اس نے شکی لہجے میں مجھے گھور کے کہا۔

”انور کا خیال تھا کہ شاہ جی کو ضرورت ہے۔“

”وہ میں نے دے دی تھیں اور دیکھ آئی ہوں وہ ... وہ سو رہے ہیں، تم کیوں جاگ رہے ہو؟“

”تم کیوں جاگ رہی ہو؟“ میں نے کہا اور پلٹ گیا۔ ”سو جاؤ۔“

”تم بھی سو جاؤ، مجھے نصیحت کرتے ہو۔“ اس نے کہا اور دروازہ بند کر لیا۔

”روبی بہت سمجھ دار لڑکی ہے۔ سکندر شاہ کا ہم سے زیادہ خیال رکھ سکتی ہے۔“ میں نے کہا اور لیٹ گیا۔

اندھیرے میں انور کی آواز آئی۔ ”ہمیں سکندر شاہ کو کچھ نہیں بتانا چاہیے۔“

”دیکھتے ہیں اسے کتنا معلوم ہے۔“ میں نے کہا۔

”کیا میں تیرے لیے بھی گولیاں لاؤں؟“

”لے آ، اور اپنے لیے بھی۔“ انور بولا۔

میں نے پھر روبی کے دروازے پر دستک دی۔

”اب کیا ہے؟“ وہ اسی طرح تھوڑے سے کھلے پٹ کے فریم میں تصویر بنی کھڑی رہی۔

”اچھی لڑکی! مجھے اور انور کو بھی نیند نہیں آ رہی ہے۔ سکندر کی طرح ہمیں بھی سلا دو۔“ میں نے کہا۔

وہ کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی جیسے فیصلہ کر رہی ہو، پھر اس نے پلٹ کے ریشم سے کہا۔ ”میں آتی ہوں ابھی۔ تمہارے بھائی کو سلا کے۔“

وہ میرے ساتھ ساتھ کاریڈور میں چل پڑی۔ خوشبو شاید اس کے لمبے ڈھیلے نائٹ گاؤن میں پہلے سے بسی ہوئی تھی۔ کیا ہوتا اگر انور پڑھنے کے بہانے ولایت فرار نہ ہوتا اور سات سال میں ڈگری کے ساتھ دوسری دنیا کا تجربہ نہ سمیٹتا.... تیسری دنیا کے اس پسماندہ گاؤں میں رہتا اور چودھریوں کی اگلی نسل کے اطوار اپناتا۔ اس کی شادی شاہینہ سے ہوتی اور اکبر کے حصے میں روبی آتی تو آج وہ زندہ ہوتا۔

جو یوں ہوتا تو کیا ہوتا نہ ہوتا یوں تو کیا ہوتا۔ مختصر سے کوریڈور سے گزر کے نیچے جاتے جاتے میں نے بلاوجہ سوچا اور سوچتا رہتا اگر میرے کانوں نے روبی کی آواز نہ سنی ہوتی۔ ”تم ضرور سونا چاہتے ہو؟“ اس نے نیچے کسی الماری سے دواؤں کا ڈبا برآمد کیا تھا اور اس میں سے وہ گولیاں جس کی مجھے طلب تھی۔

”ہاں، کیونکہ کل رات بھی میں نہیں سویا تھا؟“

”کیوں نہیں سوئے تھے؟“

”ابھی نہیں بتا سکتا۔“ میں واپسی کے لیے پلٹا۔

اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”مگر مجھے بات کرنی تھی تم سے۔“

”میری شکل دیکھی تو بات یاد آ گئی؟“ میں نے اپنا

ہاتھ چھڑالیا۔ ”ورنہ سو رہی تھیں۔“

”تم پہلے آگئے ورنہ میں آتی... اور میں سو نہیں رہی تھی۔“

”دیکھو صبح تک قیامت نہیں آجائے گی۔“ میں نے کہا اور چل پڑا۔

”ہاں آجائے گی۔“ اس نے پھر مجھے ہاتھ پکڑ کے روک لیا۔ ”صرف دس منٹ۔“

”اچھا چلو۔“ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ رات کا سوا ایک بجا تھا۔

یہ نچلی منزل کا آخری حصہ تھا جہاں ایک طرف کچن تھا۔ دوسری طرف اسٹور جس میں ایک الماری سے دوا ملی تھی۔ درمیان کا راستہ کاریڈور کے آخر سے شروع ہونے والا زینہ بند کرتا تھا جس پر سے ابھی چند منٹ قبل ہم ایک ساتھ اتر کے آئے تھے۔

”کل تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا۔ تم کو کس نے اغوا کیا تھا؟ تم اپنی مرضی سے نہیں گئے تھے؟“

”روبی یہ کیسی بات ہے، اگر تم جانتی ہو تو تمہیں یہ ضرور معلوم ہوگا کہ مراد ہاؤس کے اندر کیا ہوا تھا؟“

”ہاں۔ مجھے معلوم ہے اور ریشم کو بھی لیکن اس کا پتا شاہ جی کو نہیں چلنا چاہیے۔“

میں نے کہا۔ ”چاہتے تو ہم بھی یہی ہیں لیکن ہو سکتا ہے وہ سب جانتے ہوں۔ ابھی کچھ اندازہ نہیں مجھے بھی۔ اس کے علاوہ معاملات نہ سلجھے ہیں نہ ختم ہوئے ہیں۔ ان کو کہاں تک ان معاملات سے دور رکھا جائے اور کیسے؟ یہ ہم سب طے کریں گے۔“

”کیسے طے کریں گے اور ہم سب سے تمہاری کیا مراد ہے؟“

”ابھی یہاں کھڑے بتاؤں؟ پھر ان گولیوں کی کیا ضرورت تھی۔ صبح تو ہو جائے گی، چلو۔“ میں نے اسے ڈانٹا۔

انور سیدھا لیٹا چھت کو گھور رہا تھا۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر چونکا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”سب نروس بریک ڈاؤن کے قریب پہنچے ہوئے ہیں۔“ میں نے اسے ایک گولی دی اور پانی کا گلاس دیا۔ اس نے گولی نگل لی اور گلاس لیے بیٹھا رہا۔ ”سلیم! مجھے ماں جی کی یاد آرہی ہے۔“ وہ اچانک پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔ ”آج میرا کوئی نہیں رہا۔ نہ ماں باپ نہ بھائی بہن۔“

میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ ”رو لے جتنا رونا ہے۔ دل پر بوجھ مت رکھ۔“

”کتنی بدبخت تھی وہ عورت۔ زندگی میں کوئی سکھ کوئی خوشی نہ دیکھی۔ وہ جو عام غریب عورت کو بھی ملتی ہے، ایک محبت کرنے والا شوہر جو صرف اس کا ہوتا ہے۔ نیک اور شریف اولاد جو اس کو محبت کے ساتھ عزت بھی دیتی ہے۔ اس کا حکم بھی مانتی ہے اور اس کی خدمت بھی کرتی ہے۔ پھر پوتے نواسے، جو بڑھاپے میں اس کا دل بہلاتے ہیں۔“

”ایک بیٹے کی شادی کی تھی۔“

”وہ شادی تھی۔ مجھ سے نہ ہوئی تو اکبر سے کر دی گئی۔ جیسے گائے بھینس کہ... ایک کھونٹے سے کھولی تو دوسرے سے باندھ دی۔ اس سے بھی بڑی آس تھی ماں جی کو مگر وہ انتظار ہی کرتی رہی۔ میرا خیال ہے یہ بھی شاہینہ کا کام تھا۔ وہ اکبر سے نفرت کرتی تھی اور محبت کیسے کر سکتی تھی وہ اس شخص سے جو اسے نفرت اور ذلت کے سوا کچھ نہیں دیتا تھا۔ اس زبردستی کے رشتے کا بدلہ وہ ایسے ہی لے سکتی تھی کہ اس کے بچے کی ماں نہ بنے۔ مایوسی کا عذاب ماں جی نے جھیلا۔“

میں نے کہا۔ ”کیا پتا ان دونوں میں سے کوئی اس قابل ہی نہ ہو۔“

”نہیں، ہمارے خاندان کی سات پشتوں میں یہ مسئلہ پیدا نہیں ہوا کبھی۔ اب انہوں نے مجھ سے امید وابستہ کر لی تھی۔ بہت انتظار تھا ان کو میری شادی کا، میں نے بھی انہیں مایوس کیا۔“

وہ آدھے گھنٹے تک روتا اور ماں کی باتیں کرتا رہا پھر پُرسکون ہو گیا تو میں نے اسے سونے پر مجبور کر دیا۔ جب مجھے یقین آگیا کہ وہ واقعی سو گیا ہے تو میں نے لائٹ آف کر دی۔

صبح میں دستک سے جاگا۔ متوحش اور بدحواس ریشم کے ساتھ روبی میرے سامنے تھی۔ میری نظر انور کے بیڈ کی طرف گئی۔ وہ موجود نہیں تھا۔ ان دونوں نے تقریباً ایک ساتھ چلا کے کہا۔ ”دونوں نہیں ہیں گھر میں۔“

میں سمجھ گیا کہ دونوں سے ان کی مراد سکندر شاہ اور انور سے ہے۔ ”آخر اتنی بدحواس کیوں ہو تم لوگ... دونوں گئے ہوں گے قبرستان۔“

انہوں نے ایک دوسرے کو شرمندگی سے دیکھا اور پھر وہیں انور کے بیڈ پر بیٹھ گئیں۔ ابھی سورج طلوع نہیں ہوا تھا۔ میں نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کے دیکھا تو مشرقی افق پر

ہو چکا تھا۔ صاف نظر آتا تھا کہ وہ موقع سے فائدہ اٹھا کے مجھ سے بات کرنا چاہتی ہیں اور یہ وہی بات ہو سکتی تھی جو میں نے رات ایک بجے نہیں سنی تھی۔ میں غسل خانے سے ہاتھ منہ دھو کے نکلا تو گزشتہ رات کے مقابلے میں پُرسکون تھا۔ چار پانچ گھنٹے کی نیند نے میری ذہنی و جسمانی توانائی بحال کر دی تھی۔ وہ دونوں اب ایک صوفے پر تھیں۔ میں ان کے سامنے بیٹھ گیا۔

”ہم نے کافی منگوالی ہے تمہارے لیے بھی۔“ ریشم نے مجھے اطلاع دی۔

”بڑی مہربانی، لیکن مجھے کچھ دیر اور سونے دیا جاتا تو زیادہ مہربانی ہوتی۔“

روبی نے کہا۔ ”کیا اب میں وہ بات کر سکتی ہوں جو تم نے رات کو نہیں سنی تھی؟“

”آدھی رات کو؟“ میں نے کہا۔ ”دراصل جو تم بتانا چاہتی ہو وہ معلوم ہے مجھے مگر پھر بھی تم بولو۔“

”کیا معلوم ہے تمہیں اور کیسے؟ جب تم رات بھر غائب رہے؟“ وہ بولی۔

میں نے کہا۔ ”مجھے یہ معلوم ہے کہ کل رات تم سب کو کھانے میں خواب آور دوا دی گئی تھی۔ تم بتاؤ کہ دی کس نے؟“

روبی چونکی۔ ”خواب آور دوا کون دے سکتا ہے؟“

”پھر یہ کیا ہوا کہ پہلے شاہ جی پر نیند کا حملہ ہوا۔ پھر تم دونوں پر اور تم نشے میں ٹنا تفصیل ہو گئیں۔“

ریشم نے اعتراف میں سر ہلایا۔ ”یہ تو ٹھیک ہے، دراصل ایک دن پہلے بھی ہم دیر تک جاگے تھے۔“

”کیا تم نے کوئی دھماکا سنا تھا؟“ میں نے کہا۔

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف یوں دیکھا جیسے پوچھ رہی ہوں کہ دھماکا کیا ہوتا ہے۔ ”کہاں ہوا تھا دھماکا؟“

میں نے کہا۔ ”اسی گھر میں، نیچے تہ خانے میں۔“

”تم مذاق کر رہے ہو۔ دھماکا ہوتا تو سب سنتے۔“ ریشم نے کہا۔

”سب کون؟ گھر والے تو بے ہوش پڑے تھے۔“

”ملک صاحب! رات کی سیکیورٹی پر کم سے کم چھ افراد ہوتے ہیں۔ دو گیٹ پر، چار دائیں بائیں۔“

”تم کو یہ تو معلوم ہے نا کہ ہم نیچے ایک شخص سے پوچھ گچھ کر رہے ہیں؟“

”ہاں، پہلے تم نے کہلوایا کہ تم مصروف ہو اس لیے کھانے پر تمہارا انتظار نہ کیا جائے۔ پھر پیغام ملا کہ کسی کام سے جا رہے ہو۔“ روبی نے کہا۔

”دونوں جھوٹ، نہ ہم نے چائے منگوائی اور نہ کوئی پیغام بھیجا، کون لایا تھا پیغام؟“

روبی نے سوچ کے کہا۔ ”شاہ جی خود اٹھے تھے کہ تمہیں بلا کے لائیں۔ انہیں کسی نے باہر ہی بتا دیا۔ دوسری بات ایک ملازمہ نے بتائی تھی۔ وہ کچن سے آئی تھی۔“

”پھر وہ سازش میں شامل ہے۔ اس نے ہی کھانے میں خواب آور گولیاں دیں سب کو۔“

روبی سوچ میں پڑ گئی۔ ”یہ تو معلوم ہو جائے گا۔ باقی سب پرانے ہیں۔ وہ آئی ہے ابھی مہینا بھر پہلے... پہلے والی اپنے شوہر کے ساتھ چلی گئی تھی دبئی، جانے سے پہلے اسے اپنی جگہ رکھوا گئی تھی۔“

”اس کے علاوہ وہ کچن میں کتنے لوگ ہیں؟“

ایک پچیس ستائیس سال کی عورت کافی کی ٹرے کے ساتھ اندر آئی۔ اس کے ساتھ دبلا پتلا سوکھا اور مریل بنگالی دوسری ٹرے میں ناشتا لیے آیا۔ عورت کا لباس ہی نہیں میک اپ بھی شوخ تھا۔ صبح صبح وہ کچن میں ایسی تیاری کے ساتھ آئی تھی جیسے کسی کی شادی میں جانا ہو، پھر مجھے تھوڑے دیکھنے پر نروس ہونے کے بجائے وہ شرما کے مسکرائی۔

”یہ کون تھی؟“ ان دونوں کے جانے کے بعد میں نے پوچھا۔

”نام تو میرانی ہے مگر کہتی ہے مجھے مورنی کہو، جنوبی پنجاب میں شاید راجن پور کی رہنے والی ہے۔“

”اور وہ بنگالی؟“

”وہ بنگالی نہیں۔ ادھر ہی کا ہے۔ مورنی کا فرمانبردار شوہر... خود میں نے دیکھا ایک دن بیوی نے تھپڑ مار دیا تو چوہے کی طرح دبک گیا۔ میں نے اتفاق سے دیکھ لیا تھا۔ پوچھا کہ مورنی یہ کیا بدتمیزی ہے۔ شوہر پر ہاتھ اٹھاتی ہو؟ تو کہنے لگی کہ آپ کے بارے میں ایسی بات کی تھی اس نے میں برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اسے بھی ہو گئے ہیں تین سال سے زیادہ۔“

میں نے کہا۔ ”ابھی کوئی بات نہیں کرنی۔ جب تفتیش ہوگی تو پتا چل جائے گا۔ تفتیش ہم خود بھی کر سکتے ہیں۔ کیونکہ اس میں تو شک کی کوئی بات نہیں کہ کل رات ہم سب ایک سازش کا شکار ہوئے جس میں کچھ نمک حرام شریک تھے۔“

”تم دھماکے کی بات کر رہے تھے۔ کہاں ہوا تھا دھماکا اور کب؟“ ریشم نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ”ہم نے ایک بندہ پکڑا تھا۔ وہ پیر سائیں کا خاص معاون تھا۔ بارہ خاص مریدوں میں سے ایک جو چاہتے تھے کہ انہیں پھر وہیں درگاہ بنانے دی جائے۔ انہوں نے چودھریوں کی حویلی تباہ کی۔ ہمیں دہشت زدہ کرنے کے لیے اور انور کی ماں کو اٹھا کر لے گئے۔ تاوان پر مطالبہ کررہے تھے کہ درگاہ بنانے کی اجازت دلوائی جائے تم سے۔“

”مجھ سے؟“ روبی چونکی

”قانونی وارث اب تم ہی ہو۔“ میں نے کہا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”ہم نے رانا کو پولیس کے حوالے کیا تھا۔ رانا اسی کا نام ہے جسے ہم نے پکڑ رکھا تھا۔ پولیس اعترافِ جرم کرانے میں مشہور ہے کہ پتھر کے بت سے کرالے۔ مگر یہ شخص انتہائی سخت جان اور ڈھیٹ ثابت ہوا۔ پھر ہم نے خود ایک سائنٹیفک طریقہ استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ جو خفیہ ایجنسی والے ہوتے ہیں، یہ ایک انجکشن استعمال کرتے ہیں سچ اگلوانے کے لیے۔ اس سے یہ ہوتا ہے کہ مجرم جھوٹ بول ہی نہیں سکتا۔ سو فیصد تو نہیں مگر اس کے اچھے نتائج ہیں چنانچہ ہم نے کسی ذریعے سے انجکشن حاصل کیا اور ایک ڈاکٹر کو لائے انجکشن لگوانے کے لیے۔“

”پھر، اس نے کچھ بتایا؟“

”نہیں، دوسرے مجاور، مجاور کیا وہ سب دہشت گرد اور جرائم پیشہ لوگ ہیں۔ انہیں فکر تھی کہ رانا کو چھڑا لیں، انجکشن کا تو انہیں علم نہ تھا۔ باقی معلومات اندر والوں نے دیں۔“

”وہی مورنی؟“

”اس کے علاوہ بھی، سیکیورٹی اسٹاف۔“

”ناممکن... وہ سب پرانے آزمودہ لوگ ہیں۔“

”دیکھو، یہ بحث کی بات نہیں۔ دنیا میں ہر شخص کی قیمت ہے۔ جو زیادہ ایمان دار، فرض شناس ہو، اس کی قیمت زیادہ ہوتی ہے۔ ایک جگہ آ کے اس کی مزاحمت دم توڑ دیتی ہے۔ یہ پرانا طریقہ ہے جنگ جیتنے کا۔ میر جعفر اور صادق تو بدنام ہوئے، ورنہ ہوتے ہر جگہ ہیں۔ اندر سے کسی نے ہماری طرف سے کہا کہ ہم کھانا دیر سے کھائیں گے۔ ہم نے ایسی کوئی بات کسی سے نہیں کی، مقصد تھا کہ آپ لوگ کھانا تناول فرما لیں تاکہ جلد از جلد سو جائیں۔ یہ ہو گیا۔ ایک امکان یہ تھا کہ صبح ہم نہ ملے تو شاہ جی سب سے پہلے نیچے جا کے دیکھیں گے۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ ہماری تفتیش ابھی تک چل رہی ہے، چنانچہ یہ بھی کہلوا دیا گیا کہ ہم باہر جارہے ہیں، کسی کام سے۔ اور میرا خیال ہے کہ گیٹ سیکیورٹی سے معلوم کیا جاتا تو کوئی تصدیق ضرور کرتا کہ ہاں وہ دونوں نکلے ہیں باہر۔“

”اف میرے خدا...“ روبی نے اپنا سر تھام لیا۔

”دھماکا بڑا نہیں تھا۔ معمولی تھا۔ اس کا مقصد وہ حصہ تباہ کرنا تھا جس سے راستہ نیچے جاتا ہے۔ ہم اندر پھنس گئے۔ پھر اس وقت تک ایک اور بات ہو چکی تھی۔ رانا کو انجکشن لگا دیا کہ سچ اگلوائیں۔ پتا نہیں کیا ہوا کہ وہ مر گیا۔ ڈاکٹر نے کہا کہ ری ایکشن بھی ہوتا ہے۔ اندر اندھیرا ہو گیا۔ ہم کیا کرسکتے تھے انتظار کے سوا۔ پریشانی کوئی نہیں تھی۔ باہر اتنے لوگ تھے۔ شاہ جی کے لیے ملبا ہٹانا کیا مشکل تھا۔ ان کے پاس مشینری ہوگی۔ وہ بلڈر ہیں اور دھماکا ہوگا تو وہ فوراً پولیس، فائر بریگیڈ اور ایمبولینس سب کو طلب کرلیں گے۔ لیکن ایک تو یہ کارروائی کرنے والے پیچھے سے آئے تھے۔ دیوار توڑ کے۔ پیچھے سیکیورٹی نہیں ہوتی۔۔ اندر ان کے مددگار تھے۔ گھر والوں نے نہیں سنا مگر مرادنگر کے اندر سب نے سنا ہوگا۔ گاڑیاں بلائیں خود ان کے لوگوں نے... اور جب وہ آئے تو انہیں اندر سے چائے منگوا کے تواضع کی گئی۔ وہ بھی لیٹ گئے تو انہیں باندھ کر اپنی گاڑیوں میں ڈالا گیا۔ ایمبولینس میں جو امدادی کارکن بے ہوش پڑے تھے ان کو بھی اٹھا لیا گیا اور گاڑیاں جیسے آئی تھیں ویسے نکل گئیں۔“

”مگر تمہیں کیسے پتا چلا اور کب؟“

میں نے کہا۔ ”ہمیں باہر آتے ہی اندازہ ہو گیا تھا۔ ایک تو ہمارا استقبال کرنے کے لیے نہ شاہ جی، نہ تم میں سے کوئی۔ پھر پولیس غائب، دونوں باتیں ناممکن۔ یہ ہو سکتا تھا کہ دھماکا ہو، ہم تہ خانے میں بند ہو جائیں اور تمہیں پتا نہ چلے اور تم لوگ سوتے رہو مزے سے۔ پھر شاہ جی امداد طلب کرتے تو پولیس کو بھی بلاتے۔ دھماکا کہیں بھی ہو پولیس ضرور پہنچتی ہے تفتیش اور اپنی ایف آئی آر کے لیے۔“

”تمہیں کہاں لے گئے تھے وہ لوگ؟“

”یہ لمبی کہانی ہے۔ ابھی رہنے دو۔ ہمیں بتا دیا گیا کہ انور کی ماں فوت ہو گئیں۔“

”ان پر بھی تشدد کیا ہوگا؟“ ریشم بولی۔

”نہیں، ان کا کہنا تھا کہ ہم نے پوری طرح ان کا خیال رکھا۔ مقصد تو انور پر دباؤ ڈالنا تھا۔ ان کے لیے ڈاکٹر بھی تھا نرس بھی تھی مگر وہ قید بھی کیسے برداشت کرسکتی تھیں۔

حویلی تباہ ہونے کے بعد ان کو نکال لیا گیا مگر ان کو یقین تھا کہ انور دب کے یا جل کے مر گیا۔ یہ صدمہ کافی تھا ان کی جان لینے کو۔ یہاں کیا ہوا، اس کا اب مجھے اندازہ ہے۔“

”تم دونوں نہیں تھے۔ اس کی پریشانی تھی۔ گیٹ پر سیکیورٹی والوں سے پوچھا تو انہوں نے تصدیق کردی کہ وہ واپس نہیں آئے۔ اس دوران میں ماں جی کو دیکھا میں نے تو وہ سوئی پڑی تھیں۔ وہ تہجد سے بہت پہلے اٹھتی تھیں اور آج سات بجے تک سو رہی ہیں؟ نماز بھی نہیں پڑھی۔ میں نے سوچا اور انہیں اٹھانا چاہا تو گھبرا گئی۔ ان کا جسم ٹھنڈا اور سخت تھا۔ پتا تو چل گیا تھا مجھے کہ وہ مر چکی ہیں مگر میں بھاگی ماما جی کی طرف اور انہیں بلا کے لائی۔ میرا خیال درست ثابت ہوا۔“ روبی نے گہری سانس لی۔

”مگر... شاہ جی کہتے ہیں کہ ان کی ڈیتھ اسپتال جا کے ہوئی۔“

روبی نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ماما جی کا بی پی بہت نیچے چلا جاتا تھا۔ وہ چلّانے لگے کہ بی پی دیکھو تو میں نے کہا اچھا، ہمیشہ میں دیکھتی تھی۔ وہ خود بیٹھ گئے اور خود ہی بولے کہ بہت کم ہے۔ بس... لے گئے اسپتال... ڈاکٹرز نے کہا کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا تو وہاں ہنگامہ کیا کہ حرام خوری مت کرو، ورنہ میں یہ کردوں گا وہ کردوں گا۔ کسی نوجوان ڈاکٹر نے کہا کہ اچھا آپ تشریف رکھیں، ہم لے جاتے ہیں آئی سی یو میں۔“

”تم لوگ ساتھ تھیں؟“

”ہاں ہم پیچھے پیچھے پہنچے تھے اپنی گاڑی میں۔ ریشم کو میں نے راستے میں ہی بتا دیا تھا جب ڈاکٹرز نے کہا کہ وہ انہیں نہیں بچا سکے تو ماما جی ڈیڈ باڈی واپس لے آئے۔“

”ظاہر ہے اس وقت ہمارا خیال تو ہوگا انہیں کہ کچھ بتائے بغیر کہاں نکل گئے۔“

”بہت ناراض تھے۔ گالیاں دے رہے تھے کہ اُلو کے پٹھے ہیں دونوں، غیر ذمے دار ہیں۔“ روبی نے کہا۔ ”مگر اس کے بعد کفن دفن کے انتظام میں لگ گئے۔ سب انہیں خود کرنا پڑا۔ جب جنازہ اٹھا تو تسلی نہیں رہی تھی۔ پریشانی شروع ہو گئی تھی انہیں، سارا دن یہی ہوا۔ ایک طرف دکھ دوسری طرف یہ پریشانی کہ تم دونوں کہاں ہو، پاگل سے ہو رہے تھے۔ وہاں قبرستان میں لوگوں سے الجھ گئے۔ کسی نے سوم کا پوچھا تھا۔ سب پر بگڑ گئے کہ مجھ سے ہمدردی نہیں قورمے بریانی کی فکر ہے۔ کوئی سوم نہیں ہوگا۔ اپنے گھر بیٹھ کر قرآن پڑھو، اگر ایسے ہی خیر خواہ ہو۔“

”لوگ تو آج بھی آئیں گے۔ آتے رہیں گے۔“ میں نے کہا۔ ”مگر یہاں اس افراتفری اور پریشانی میں کسی نے پیچھے جا کے نہیں دیکھا ورنہ ملبا نظر آ جاتا اور کسی نے بتایا بھی نہیں۔“

”کون بتاتا اس پریشانی میں... تم کہہ رہے ہو کچھ بکے ہوئے تھے۔“

”کچھ کیا سب بھی ہو سکتے ہیں۔ وہ عمداً خاموش رہے۔ اگر کوئی وفادار تھا تو یہ کیسے فرض کرسکتا تھا کہ رات کو اتنا کچھ ہوا اور شاہ جی کو پتا ہی نہیں۔ اچھا اب میری بات دھیان سے سنو... سوال جواب نہیں۔ شاہ جی کی ذہنی حالت ایسی نہیں کہ ان کو یہ سب بتایا جائے۔ میں اور انور کرلیں گے جو معلوم کرنا ہے۔ تم بس اندر نظر رکھو۔“

”اب کاروبار کا کیا ہوگا؟“ روبی فکرمندی سے بولی۔

”کاروبار گیا بھاڑ میں... شاہ جی پہلے ہی ہمارے حوالے کر چکے تھے۔ کیا ہوگا زیادہ سے زیادہ...؟ کچھ عرصہ بند رہے گا۔ نقصان ہوگا تو کیا ہم دیوالیا ہو جائیں گے۔ ابھی کوئی پروجیکٹ نہیں چل رہا ہے۔ نیا نہیں لیں گے فی الحال... دو چار ملازم ہیں۔ ان کو تنخواہ دے سکتے ہیں کسی کام کے بغیر بھی۔ کام دوبارہ بھی شروع ہو جائے گا۔ میرا خیال ہے وہ لوگ قبرستان سے واپس آنے والے ہوں گے۔“

روبی نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کے جھانکا۔ ”تعزیت کے لیے آنے والوں سے بھی تم ہی نمٹنا۔“

”وہ ہم کرلیں گے، پہلے ڈاکٹر کو بلاؤ۔ وہ جو اس دن آیا تھا سوٹا سا۔ شاہ جی کو دیکھنے۔ روبی تم ان کے پاس رہو گی۔ مجھے اعتماد ہے تم پر کہ انہیں سنبھال لو گی۔ انہیں سکون اور آرام کی ضرورت ہے۔“

”انور بھی تو پریشان ہوں گے بہت؟“ ریشم بولی۔

”اس کی پریشانی جائز ہے۔ وہ بڑی ہمت سے کام لے رہا ہے۔ دکھ مجھے اس بات کا بھی ہے کہ ماں جی تم کو رخصت کرا کے اپنے ساتھ نہ لے جا سکیں۔ آج تم انور کو سنبھال سکتی تھیں۔ خیر، جو اللہ کو منظور۔“

روبی نے کہا۔ ”ریشم! تم بھی چھوڑ دو یہ فضول شرم و حیا کا ڈراما۔ انور کی دلجوئی کرو۔ شادی ہو جانے کی جب ہونی ہوگی۔ آخر پہلے بھی تم اس کے ساتھ رہتی تھیں۔ اس غلام محمد کی بیوی نے یہ رسم و رواج کا چکر چلایا تھا تو حالات مختلف تھے۔ شادی کے سارے چونچلے ہو سکتے تھے۔ دیکھو آ کر

میں نے بھی تو مراد کے غم کا بوجھ اٹھا رکھا ہے اور اپنی ذمے داری بھی نبھا رہی ہوں۔ کیسے بیٹھ جاؤں میں بیوہ بن کے اس دنیا کو دکھانے کے لیے۔"

میں نے کہا۔"روبی بالکل ٹھیک کر رہی ہے اور ٹھیک کہہ رہی ہے۔"

روبی نے کہا۔"ہم دو بول بھی پڑھا دیں گے۔ دھوم دھام کے حالات نہیں ہیں۔"

میں نے گھڑی دیکھی۔ سورج طلوع ہوتے دیر ہو گئی تھی۔ آٹھ بج چکے تھے۔ نیچے میں نے کچن کی طرف سے ہنسنے کی آواز سنی۔ میں نے دبے پاؤں جا کے دیکھا۔ سورنی اپنے مجازی خدا کے ہونٹوں پر کاجل سے مونچھیں بنا رہی تھی اور ہنس ہنس کے دہری ہوئی جا رہی تھی۔ شوہر نامدار گھٹنوں کے بل بیٹھے تھے اور اپنی زوجہ کی اجازت سے ایک غیر شریفانہ حرکت سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

میں نے دروازے میں رک کے چند سیکنڈ بعد کہا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟"

سورنی بڑی ادا سے ہائے کہہ کے اور سینے پر ہاتھ رکھ کے پلٹی۔ اس کا شوہر گھبرا کے کھڑا ہوا اور مونچھوں کو مٹانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے ہونٹوں کی سیاہی منہ پر پھیل گئی۔

"تمہیں اندازہ نہیں کہ اس گھر میں سوگ ہے؟" میں نے سختی سے کہا۔

"غلطی ہو گئی سر جی۔" سورنی نے یوں اٹھلا کے کہا کہ معافی کی ادا میں بھی شوخی کا پہلو اجاگر رہا۔ بلاشبہ وہ خود کو مشکوک کردار کی عورت ثابت کر رہی تھی۔ مزید کچھ کہے بغیر میں پلٹا اور باہر گیا تو ڈرائنگ روم میں ایک درجن کے قریب تعزیت کے لیے آنے والے سوگوار چہرے بنائے چپ بیٹھے تھے۔ اس خیال سے مجھے مزید غصہ آیا کہ سورنی کے ہنسنے کی آواز ان تک بھی پہنچی ہوگی۔

ایک شخص اٹھ کھڑا ہوا جس نے مجھے شناخت کر لیا تھا۔

"ملک صاحب! ہم شاہ جی سے تعزیت کرنے آئے تھے۔"

میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔"شاہ جی قبرستان سے نہیں لوٹے ابھی۔"

میں نے فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ درجن بھر افراد کے ہاتھ اٹھ گئے۔ فاتحہ کے بعد میں نے رسما منہ پر ہاتھ پھیرا اور اس سے کہا۔"بہت شکریہ آپ سب کا۔" جس کا مطلب یہ تھا کہ آپ کا اخلاقی فرض پورا ہوا۔ اب آپ جا سکتے ہیں۔ ان سب کو اٹھنا پڑا۔ میں دروازے پر کھڑا ہو کے ایک ایک سے مصافحہ کرتا گیا۔ وہ اپنا نام بتاتے گئے اور میں خدا حافظ کے بعد کہتا رہا کہ میں شاہ جی کو بتا دوں گا۔ جیسے مجھے ان سب کے نام یاد رہیں گے۔ مجھے اندازہ تھا کہ یہ سلسلہ آج سارا دن چلے گا۔ میں نے دو ملازموں کو حکم دیا کہ وہ تعزیت کے لیے آنے والوں کو لان میں بٹھائیں۔ ایک ملازم سے کہا کہ وہ شامیانے والوں کو بلائے۔

آدھے گھنٹے بعد ان کی گاڑی اندر آئی جسے انور چلا رہا تھا۔ انور نے اپنے دکھ کو پیچھے کر دیا تھا اور بڑی ہمت سے شاہ جی کو سنبھالنے کا فرض پورا کر رہا تھا۔ سکندر شاہ کی ظاہری حالت میں بھی دیوانگی کے آثار تھے۔ اس کا چہرہ کھنچا ہوا تھا مگر وہ اچانک کسی بات پر مسکرانے لگتا تھا۔ انور کے ساتھ ناشتا کرتے ہوئے بھی وہ بھول جاتا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ وہ چائے کا مگ اٹھائے سوچتا رہا کہ اس کا کیا کرے۔ اس کے اندر جھانکتا رہا اور پھر ہنس پڑا۔ "یہ تو چائے ہے۔" وہ بولا اور پھر ایک دم غٹ غٹ ساری چائے پی گیا اور بولا۔ "وہ دیکھتی تو کتنا حیران ہوتی، سمجھتی میں پاگل ہو گیا ہوں۔"

اچھی بات یہ ہوئی کہ اسی وقت ایک ملازم نے ڈاکٹر کی آمد کی اطلاع دی۔ میں نے کہا کہ اسے ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ۔

سکندر شاہ نے مجھے اور انور کو دیکھا۔"ڈاکٹر کیوں آیا ہے اب؟"

روبی نے فوراً جواب دے دیا۔"اسے تو معلوم نہیں ماما جی... جو کل ہوا۔"

میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔"میں اسے بتا دیتا ہوں۔ مجھے کچھ آدھے سر کے درد کا مسئلہ بھی ہے۔ آپ ناشتا جاری رکھیں۔"

غنیمت ہوا کہ اس نے ضد نہیں کی ورنہ میرے ساتھ چل پڑتا۔ ڈاکٹر وہ نہیں تھا جس سے ایک بار پہلے میری ملاقات ہو چکی تھی۔ میں نے کہا۔"میں ملک سلیم اختر ہوں۔ سکندر شاہ کے ایک دوست کا بیٹا اور منیجر۔"

وہ چالیس سال کا اسمارٹ اور بُردبار شخص تھا۔"آپ سے پہلے ملاقات نہیں ہوئی۔ میں ڈاکٹر سراج ہوں، ان کی مسز میرے ہی زیرِ علاج تھیں، کیسی ہیں وہ؟"

میں نے کہا۔"میں انتہائی افسوس سے اطلاع دے رہا ہوں، کل صبح ان کا انتقال ہو گیا۔"

اس نے زیرِ لب انا للہ وانا الیہ راجعون کہا اور بولا۔ "حالت تو ان کی روز بروز ابتر ہو رہی تھی۔ علاج کے باوجود۔"

"ایسی کیا بیماری تھی ان کی؟"

"بیماری کچھ نہیں، عمر بھی اتنی زیادہ نہیں تھی لیکن دیگر بہت سے اسباب پیدا ہو گئے تھے۔ بیٹے کی موت کے بعد... کھانا نہ کھانا، کم خوابی، مجھے پتا چلا تھا کہ دوا پھینک دیتی تھیں۔ دوا دینے کی ذمے داری ان کی بہو کی تھی۔ روبی خیال رکھتی تھی ان کا مگر وہ ساس تھیں۔ قابو میں نہیں آتی تھیں۔ بات یہ ہے ملک صاحب کہ مریض خود ہی ٹھیک نہ ہونا چاہے، خود اپنی زندگی کا دشمن ہو تو علاج کیا کرے گا۔"

"میں آپ کی بات سمجھتا ہوں۔ بیٹے کی ناگہانی موت نے ان کے اندر جینے کی خواہش کو مار دیا تھا لیکن اب ایک اور مسئلہ اسی قسم کا پیدا ہو گیا ہے۔ خود سکندر شاہ صاحب کی حالت ویسی ہی ہو رہی ہے۔"

"میں دیکھ لوں گا۔ ان کے لیے ایک کے بعد دوسرا شاک ہے لیکن وہ مضبوط اعصاب کے آدمی ہیں۔ یہ عارضی کیفیت ہے، چند روز میں وہ نارمل ہو جائیں گے۔"

میں نے کہا۔"خدا کرے ایسا ہی ہو۔ ابھی تو ان کا ذہنی توازن بھی ٹھیک نہیں لگتا۔ ہو سکتا ہے وہ علاج میں آپ سے تعاون نہ کریں۔ مشتعل ہو جائیں اور بے عزت کر دیں آپ کو..."

"کوئی بات نہیں... لیکن اچھا کیا آپ نے بتا دیا۔ اب میں ہینڈل کر لوں گا۔"

میں نے کہا۔"میں انہیں بلاتا ہوں۔ وہ نہ آئے پھر؟"

"آپ کہیں کہ ڈاکٹر صاحب تعزیت کے لیے آئے ہیں۔ آفٹر آل شی واز مائی پیشنٹ۔"

یہ چال کارگر ہوئی۔ سکندر شاہ میرے ساتھ آ گیا۔ ڈاکٹر نے مغموم شکل بنا کے افسوس کا اظہار کیا۔"مجھے ملک صاحب نے کہا کہ اب آپ کی ضرورت نہیں رہی۔ تو مجھے بہت صدمہ ہوا۔"

ڈاکٹر نے کوئی ایسی بات نہیں کی تھی۔ سکندر شاہ نارمل ہوتا تو خاموش رہتا مگر وہ بھڑک اٹھا۔"اب کہتے ہو صدمہ ہوا۔ حالانکہ اس کی موت کے تم ہی ذمے دار ہو۔"

ڈاکٹر نے برا مانے بغیر کہا۔"میں؟ میری تو پوری کوشش تھی کہ وہ صحت یاب ہوں، اور ان کو..."

"غلطی تمہاری نہیں میری تھی۔" سکندر شاہ چلانے لگا۔"کہ تمہیں بلا لیا۔ تم تو عطائی بھی نہیں ہو۔ تمہاری ساری ڈگریاں جھوٹی اور جعلی ہیں۔ اس قابل بھی نہیں ہو تم کہ کسی ڈاکٹر کے کلیادو ندر بنو۔"

"آپ کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھائیں... میں نے صحیح دوا دی تھی۔"

"اوئے کھوتے... پاگل دے پتر... صحیح دوا سے کوئی مرتا ہے؟ وہ دوائیں بھی جعلی ہوں گی۔ تو اتنی لمبی چوڑی فیس لیتا ہے اور سستی جعلی دواؤں سے کام چلاتا ہے لالچی آدمی۔"

میں نے کہا۔"شاہ جی، خود کو سنبھالیے۔"

"ملک اس سؤر کے بچے کو دھکے دے کر نکال دے یہاں سے... ورنہ میں جان سے مار دوں گا اسے۔"

میں نے سکندر شاہ کو بازو سے پکڑ کے اٹھا لیا۔"آپ چلیں اندر۔"

اس نے بازو چھڑا لیا۔"نہیں پہلے اسے نکال... آئندہ میں اس کی صورت نہ دیکھوں۔"

ڈاکٹر اٹھ کھڑا ہوا۔"میں جا رہا ہوں شاہ جی۔" اور دروازے کی طرف بڑھا۔ میں اس کے ساتھ گیا۔ سکندر شاہ کی آواز اندر روبی نے بھی سن لی تھی، وہ بروقت آ گئی تو یہ اندیشہ نہ رہا کہ سکندر شاہ میرے پیچھے آئے۔ وہ اگر کسی کے قابو میں آتا تھا تو وہ روبی تھی۔

ڈاکٹر نے باہر آ کے کہا۔"مجھے اندازہ ہو گیا ملک صاحب! ان کی کنڈیشن واقعی خراب ہے۔"

"پھر کیا کرنا چاہیے مجھے؟"

"میں آپ کو ایک دوا لکھ دیتا ہوں۔ یہ وقتی طور پر پُرسکون ہو کے سو جائیں گے۔ چار چھ گھنٹے کے لیے۔ اس دوران آپ انہیں نشتر میڈیکل کالج اسپتال میں داخل کرا دیں۔ میں ریفر کر دیتا ہوں۔"

"یعنی گھر پر علاج نہیں ہو سکتا۔"

"اس میں رسک ہے۔ کسی وقت یہ زیادہ مشتعل نہ ہو جائیں، وہاں سائیکاٹرک وارڈ میں ان کی کنڈیشن کو مانیٹر کرنے والے ہوں گے جو اس قسم کے مریضوں کو ہینڈل کرنا جانتے ہیں لیکن علاج لمبا ہوگا۔"

"کتنا لمبا؟ ہفتہ دو ہفتہ۔"

"زیادہ، ایک مشورہ ہے میرا۔ اصولاً تو جنرل وارڈ اور اسپیشل وارڈ میں علاج ایک سا ہونا چاہیے مگر یہاں ایسا ہوتا نہیں۔ آپ افورڈ کر سکتے ہیں۔ وی آئی پی روم میں رکھیں۔ روپے پیسے کا تو مسئلہ ہے نہیں۔" اس نے تعزیت کے لیے آنے والوں کی لان میں لگی ایک کرسی پر بیٹھ کے پہلے نسخہ لکھا پھر نشتر اسپتال کے لیے ریفرنس لیٹر بنا کے میرے حوالے کیا۔

''تھینک یو سر۔'' میں نے فیس کی ادائیگی کے لیے جیب سے پرس نکالا۔

اس نے میرے بازو پر تھپکی دی۔ ''اس کی ضرورت نہیں۔ خدا کرے وہ ٹھیک ہو جائیں۔''

ڈاکٹر کے جانے کے بعد میں... ایک اژدہام سے نمٹا۔ یہ سب تعزیت کے لیے آنے والے لوگ تھے۔ میں نے سب سے ہاتھ ملایا اور سب کا تعارف حاصل کیا۔ ان میں کچھ معززین بھی تھے۔ میں نے سب سے معذرت کی کہ شاہ جی طبیعت کی خرابی کے باعث ملاقات نہیں کر سکتے۔ ان پر صدمے کا شدید اثر ہے۔ وہ بھی رسمی انداز میں دعا کے لیے ہاتھ اٹھا کے مجھ سے رسمی کلمات کہتے رہے۔ سب جانتے تھے کہ شاہ جی کا بیٹا کچھ عرصہ پہلے حادثے میں مر گیا تھا۔

ڈاکٹر کے نسخے میں کوئی دوا نہیں تھی جو شفا میں مددگار ہوتی۔ یہ مریض کی جنونی یا ہذیانی کیفیت پر قابو پانے کے ذریعے تھے کہ اسے علاج کی جانب لے جانے میں مزاحمت کا سامنا نہ ہو۔ یہ صرف سکون بخش یا خواب آور قسم کی دوائیں تھیں جو گھر میں موجود تھیں خواہ ان کا نام کچھ اور ہو۔ یہ ذمے داری میں نے روبی کو سونپی۔ وہ پہلے بھی سکندر کی جذباتی کمزوری تھی۔ ایک بار اس نے کہا تھا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کی خوشی کیسے لوٹاؤں۔ جب میں اسے دکھی دیکھتا ہوں تو اپنا غم بھول جاتا ہوں۔ وہ روبی کی ہر طرح سے دل جوئی کرتا تھا اور اسے خوش رکھنے کے لیے ہر وقت کوشش ضرور کرتا تھا۔ خود روبی حوصلہ مند اور ذہین لڑکی تھی جس نے اپنے غم کو دکھی ماں کے غم سے زیادہ ترجیح نہیں دی تھی۔ نتیجہ یہ کہ وہ سکندر شاہ کو زیادہ عزیز ہو گئی تھی۔

کسی دشواری کے بغیر روبی نے اپنے سسر کو ایک گولی نگلنے پر راضی کر لیا۔ میں ٹھیک ہوں۔ مجھے کچھ نہیں ہوا کہتے کہتے بھی اس نے روبی کی بات مان لی۔ سیاس کی تیمارداری کرتے کرتے وہ آدھی نرس ضرور بن گئی تھی۔ وہ سکندر شاہ کا بلڈ پریشر چیک کرتی رہی اور اس کو باتوں میں لگائے رکھا۔ دس منٹ بعد اس نے ایک اور گولی دی تو وہ ڈھیلا پڑنے لگا تھا۔ وہ اب بھی مسلسل بول رہا تھا اور اپنے مستقبل کے منصوبوں کے بارے میں بتا رہا تھا جو بالکل شیخ چلی کا خواب لگتے تھے۔

پھر وہ بیٹھے بیٹھے لڑھک گیا۔ اس کے بعد کے مراحل دشوار نہ تھے۔ ہم نے ایمبولینس طلب کی اور اسے نشتر میڈیکل کالج اسپتال لے گئے۔ ایک گھنے سفید بالوں والے خوش مزاج ڈاکٹر نے کیس ہسٹری اس کی فائل میں ریکارڈ کی۔ روبی کے ساتھ میں رہا لیکن ڈاکٹر کے سارے سوالوں کے جوابات روبی نے دیے۔ انور نے اتنی دیر میں داخلے کی دفتری کارروائی مکمل کی۔ سکندر شاہ کو اسپیشل روم مل گیا۔ اس کے لیے اسپتال کی نرسوں میں سے ایک کے ہمہ وقت موجود رہنے کا بندوبست بھی ہو گیا۔

کوئی ڈاکٹر قطعیت کے ساتھ نہیں بتا سکتا تھا کہ سکندر شاہ کی شفایابی کا عمل کتنا وقت لے گا۔ یہ مکمل شفا ہو گی اور وہ پہلے جیسی نارمل زندگی بسر کر سکے گا یا اسے طویل عرصے تک علاج جاری رکھنا ہو گا۔ اس امکان کو مسترد نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ کبھی پہلے جیسا سکندر شاہ نہ بن سکے۔ اس کی بڑھتی عمر خود ایک رکاوٹ بن جائے جس میں اب شریکِ زندگی بھی نہ تھا۔

''آپ بالکل اطمینان رکھیں۔ انہیں بہترین علاج اور توجہ حاصل ہے۔ بہت جلد ان کی حالت میں بہتری آپ خود محسوس کریں گے۔ یہ کوئی سنگین مسئلہ نہیں ہے۔ آپ لوگ پریشان نہ ہوں۔'' ڈاکٹر نے سکندر شاہ کو کمرے میں دیکھنے کے بعد کہا۔

''ہم میں سے کوئی ان کے ساتھ رہ سکتا ہے؟''

''ضرورت تو نہیں... لیکن کسی کے رہنے پر پابندی نہیں۔'' اس نے کہا اور دروازہ بند کر کے نکل گیا۔

''آج اور کل میں رہوں گا یہاں۔ وہاں لوگ آ رہے ہیں تعزیت کے لیے... اور تم بہرحال اس خاندان کے ہو، لوگ جانتے ہیں۔ میرا تو مشورہ ہے کہ رسمِ دنیا کے لیے سوئم کرا دو۔ ماں جی کا بھی اور رامی کا بھی۔''

''سلیم ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ہمیں اسی دنیا میں انہی لوگوں کے ساتھ رہنا ہے۔'' روبی نے کہا۔ ''اور تمہیں کرنا کیا ہے۔ سب انتظام ایک فون پر ہو جائے گا مگر لوگوں سے تم ہی ملو گے اور یہ رکھو۔'' اس نے ہینڈ بیگ میں سے ایک چیک بک نکالی۔

''یہ کیا ہے؟'' انور بولا۔

''چیک بک ہے۔ سارے دستخط شدہ چیک ہیں۔''

''مگر یہ کس لیے؟''

''بینک اکاؤنٹ ماں جی کا ہے۔ جوائنٹ اکاؤنٹ تھا۔ کاروباری اکاؤنٹ الگ ہے۔ انہوں نے سب میرے سپرد کر دیا تھا، اب گھر کی مالک تم ہو۔ جیسے چاہو چلاؤ اور جتنی ضرورت ہو لے لو۔''

''پھر یہ مجھے کیوں دے رہی ہو، رکھو اپنے پاس۔''

''انور! مجھے معلوم ہے کہ تمہیں پیسے کی کمی نہیں۔ جس

دن نہیں ہو گا میرے پاس تم ہی سے لوں گی... مگر یہ سارے خرچ میری ذمے داری ہیں۔ یہاں اسپتال میں ایڈوانس لیں گے۔ وہاں سوئم کا خرچہ ہے۔ شاید تنخواہیں دینی ہوں گی دفتر والوں کو... ان سے ہی تم ڈیل کرو گے۔ میری خواہش ہے یہ... پلیز، اس وقت تم دونوں کی مدد حاصل نہ ہوتی تو میں کیا کرتی۔ اندر باہر کے سارے معاملات سنبھال رکھے ہیں تم نے۔''

انور نے چیک بک لے لی۔ اس میں سے ایک چیک پھاڑا اور بک اسے واپس کر دی۔ ''ضرورت پڑے گی تو پھر تم سے لے لوں گا۔ نہ میں کہیں جا رہا ہوں نہ تم۔''

جب وہ تینوں رخصت ہوئے تو سہ پہر ہو چکی تھی۔ میرے پاس کرنے کو کچھ نہ تھا۔ سکندر شاہ سو رہا تھا اور یہ ڈاکٹر ہی بہتر جانتے تھے کہ اسے کب جاگنے کا موقع دیا جائے گا۔ اس لگژری روم میں مریض کے ساتھ رہنے والے کے لیے دوسرا بیڈ تھا۔ صوفے تھے۔ اے سی تھا اور ٹی وی تھا۔ میں نے کیفے ٹیریا سے کھانا کھایا جہاں مریضوں کے ساتھ آنے والے اور ڈاکٹر سب سیلف سروس کی لائن میں لگ کر اپنی مرضی کی چیز لیتے تھے۔ باہر دسمبر کی سردی تھی لیکن اسپتال میں سینٹرل ایئر کنڈیشننگ کا نظام تھا۔ رات تک دو ڈاکٹر آیا۔ ایک نرس دن میں کئی بار چکر لگا کے گئی۔ سکندر شاہ سکون سے سو رہا تھا اور کل تک اس کے اٹھنے کا امکان نہیں تھا۔ یہ بات مجھے ڈاکٹر نے بتائی تھی۔ سرہانے کی طرف لگے مانیٹر سے اس کے بلڈ پریشر، دل کی دھڑکن اور دل کی رفتار سب ظاہر ہو رہی تھی۔ اسکرین کے روشن ہندسوں میں خفیف سا رد و بدل جاری تھا۔ لیکن پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔ ایک ڈرپ کے ذریعے سکندر شاہ کو خوراک فراہم کی جا رہی تھی یعنی گلوکوز اس کے جسم میں پہنچ رہا تھا۔ اسے کھانے کی ضرورت نہیں تھی۔

وقت گزاری کے لیے میں نے آواز کھولے بغیر ٹی وی آن کیا تو خبروں میں بے نظیر کے بطور وزیراعظم حلف کی فلم دکھائی جا رہی تھی۔ اس سے مجھے یاد آیا کہ دو دسمبر آ رہی ہے۔ اسی وقت وہ نرس پھر نمودار ہوئی۔ وہ تیس سال عمر کی سانولی سی نرس تھی۔ خوش اخلاقی اس کی عادت تھی ضرورت کہ وہ مسکراتی رہتی تھی۔ روٹین چیک اپ اور فائل اندراج کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ''کتنی خوشی کی بات ہے سر۔''

میں بھونچکا رہ گیا۔ ''کیا خوشی کی بات ہے؟''

''ایک عورت ہمارے ملک کی وزیراعظم بنی ہے۔''

وہ بولی۔ ''دنیا کی پہلی مسلمان وزیراعظم۔''

مجھے اپنے آپ سے خفت ہوئی۔ ظاہر ہے وہ سکندر شاہ کی علالت کو یا حالت میں بہتری کو خوشی کی بات نہیں کہہ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''ہاں خوشی کی بات تو ہے۔''

وہ بڑی مسرت سے بولی۔ ''میری ڈیوٹی اسپتال میں آٹھ بجے تک ہے۔ پھر میں یہاں آ جاؤں گی۔ آپ کے ساتھ رہوں گی رات بھر۔''

اس کی بات نے میرے دماغ میں خطرے کی پہلی گھنٹی بجائی۔ کسی نرس کا رہنا تو طے تھا مگر اس کے بے تکلفانہ انداز اور خوشی کے اظہار نے مجھے کچھ اور سوچنے پر مجبور کر دیا۔ کمرے میں ایک بیڈ تھا اور ایک صوفہ سیٹ، بیڈ پر میں سو جاؤں گا اور وہ رات بھر کیا کرے گی۔ کرنے کو کچھ نہیں ہو گا تو بیٹھ کے کیا کرے گی۔

''رات کا کھانا اگر میں آپ کے ساتھ کھا لوں تو اعتراض تو نہیں ہو گا آپ کو؟'' وہ ٹی وی سے نظریں ہٹا کے میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرائی۔

''اعتراض... نہیں، اعتراض کیسا۔ کھانا تو کھاؤ گی تم... اور میں بھی کھاؤں گا۔''

''میں کینٹین والے سے کہہ دوں گی۔ ویسے تو اجازت نہیں ہے کھانا کمرے میں لانے کی مگر یہ اسپیشل روم ہے۔''

میں نے اسے ٹوک دیا۔ ''اس قانون شکنی کی ضرورت نہیں۔ دن کا کھانا بھی میں نے وہیں کھایا تھا۔ رات کا بھی کھا لوں گا اور تم بھی یہی کرنا۔'' میں نے رکھائی سے کہا۔

اس نے بڑی ادا سے چٹکی بجائی۔ ''آئیڈیا، آپ کا پیشنٹ تو کھانا کھائے گا نہیں... لیکن آپ لے سکتے ہیں۔ اسپیشل روم کا مینو بھی اسپیشل ہوتا ہے۔ میں اس سے کہہ دیتی ہوں کہ ایک گیسٹ کے لیے چاہیے۔ یہاں گیسٹ آ سکتے ہیں کسی بھی وقت۔ ان کے لیے ملاقات کے وقت کی پابندی ضروری نہیں ہوتی۔''

اچانک ایک اچھی نرس کے بجائے وہ خود کو ایک اچھی عورت کے روپ میں پیش کرنے پر تل گئی تھی۔ خوب صورت نہ سہی وہ قبول صورت ضرور تھی اور میں نے اب تک صرف سنا تھا، ایک تجربہ بھی حاصل کیا تھا جب ریشم کو زہر دیا گیا تھا اور وہ اسپتال میں داخل تھی تو اس کے ساتھ میں تھا۔ اس کی میڈیکل رپورٹ حاصل کرنے کے لیے مجھے نائٹ ڈیوٹی پر مامور ایک فاحشہ کے ساتھ رات گزارنی پڑی تھی

جو استقبالیے کاؤنٹر پر رات کے وقت فارغ بیٹھی رہنے سے بہتر یہ سمجھتی تھی کہ کچھ اضافی آمدنی کا وسیلہ بنالے۔ اس نے مجھ پر یہ انکشاف کیا تھا کہ بہت سے شوقین مزاج اسی لیے بعض اسپتالوں کے وی آئی پی روم میں بیمار بن کے لیٹ جاتے ہیں اور نائٹ ڈیوٹی کے لیے دستیاب نرسوں میں سے کسی کا انتخاب کرلیتے ہیں۔

ایسا لگتا تھا کہ کچھ ایسی ہی پیشکش مجھے کی جارہی تھی۔ یہ خطرناک بات تھی۔ کمرے میں اس کے اور میرے سوا کوئی ہے تو اس کا ہونا نہ ہونا برابر۔۔۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر آنکھیں بند کیے پڑا ہوگا۔ نائٹ ڈیوٹی کے لیے نرس ہائر کرتے وقت نہ میرے ذہن میں کوئی غلط بات آئی تھی نہ انور کے لیکن غلط بات تو غلط حالات اور مواقع سے نکلتی ہے۔

میں نے تصدیق کے لیے پوچھا۔ ''تم نے اپنے گھر والوں کو بتادیا ہوگا؟''

''گھر والے کون؟ گھر والا ہوتا تو میں یہاں کیسے ٹھہرتی۔ ایک ماں ہے ایک چھوٹا بھائی۔۔۔ وہ جانتے ہیں۔''

''کیا جانتے ہیں؟''

''یہی کہ نائٹ ڈیوٹی لگ جاتی ہے۔ ویسے تو وہ اور بھی ہیں جو اپنی باری پر آئیں گی مگر چوائس آپ کی ہے۔ میرا خیال ہے وہ آپ کو پسند نہیں آئیں گی میرے مقابلے میں۔۔۔ آپ مجھے مستقل رکھ سکتے ہیں۔''

''تم کو رات بھر اس کرسی پر بیٹھنا ہوگا۔''

''فکر کی بات نہیں سر، نیند آئے گی تو میں سو جاؤں گی۔'' وہ بولی۔ ''مریض کو ضرورت نہیں پڑے گی میری، ہی اِز فائن۔''

''تمہارے پاس کوئی کمبل ہونا چاہیے اس صوفے پر سونے کے لیے۔''

''کمبل آپ کے پاس ہوگا سر، ڈبل ہے۔ میں بھی اس بیڈ پر سو سکتی ہوں اگر آپ کو اعتراض نہ ہو۔'' وہ اٹھلا کے بولی اور کمرے سے نکل گئی۔ اس کے بعد شک و شبے کی گنجائش کہاں رہی تھی۔ جو کہنا تھا وہ بے شرمی سے صاف کہہ گئی تھی۔ کسی ناخوش گوار صورتِ حال سے بچنے کے لیے میں نے ڈاکٹر سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ میری بات سے محظوظ ہوا۔

''آپ بلاوجہ گھبرا رہے ہیں۔ نرسیں رہتی ہیں رات کو۔۔۔ اٹینڈنٹ بھی ہوتے ہیں۔''

''میں کسی آزمائش میں پڑنا نہیں چاہتا۔ کیونکہ میں اس قماش کا آدمی نہیں ہوں اور پھر میں رکا ہوں مریض کے لیے۔ عیاشی کا تصور بھی میرے لیے شرمناک ہے۔''

نے کہا۔

''ایسی صورت میں سر، بہتر یہی ہے کہ آپ

ہم نے تو کہا تھا کہ فکر کی کوئی بھی بات نہیں۔ ایک

نہیں۔ ہم تو کریٹیکل کنڈیشن کے مریض بھی سنبھالتے

یہ صرف یہاں ہوتا ہے ورنہ باہر جاکے دیکھیں، کوئی

میں رہنے کی بات کرے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم پر احسان

لے جاؤ مریض کو بھی گھر۔''

میں نے خفت سے کہا۔ ''بس یہاں کے

رویے ایسے ہی ہیں۔''

''آپ اطمینان سے گھر جائیں۔ ایک فیصد بھی

بات ہوئی تو ہم بلالیں گے آپ کو۔۔۔ لیکن آپ آئی سی

جاکے دیکھیں، کیسی حالت میں ہیں مریض، بالکل زندگی

موت کے درمیان معلق۔۔۔ گھر والے کیا کرسکتے ہیں

سوا۔ اور دعا تو گھر بیٹھ کے بھی کی جاسکتی ہے۔ زیادہ

ہے۔''

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ''اوکے، میں صبح آؤں گا

حافظ۔''

اسپتال کے باہر سے ٹیکسی میں بیٹھ کے میں

بجے مراد ہاؤس جا پہنچا۔ انور مجھے دیکھ کے حیران بھی

پریشان بھی۔

''ملک! خیریت تو ہے نا؟''

میں نے کہا۔ ''سب خیریت ہے۔''

''پھر تو کیسے آگیا؟ کوئی کام تھا تو فون کردیتا۔''

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''فکر

بھی کوئی نہیں۔ اپنی مرضی سے آیا ہوں میں

ہوں۔''

میری آواز کانوں میں پڑی تو اندر سے

ریشم بدحواسی میں دوڑتی آئیں اور ایک بار پھر

جواب ہوئے۔ کوئی جھوٹ نہیں چل سکتا تھا اور سچ

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے سب ذمے

پر لے لی۔

میں نے کہا۔ ''وہاں بعد میں بڑا ڈاکٹر آیا

نے کہا کہ آپ جائیں، یہ بالکل ٹھیک ہیں اور دیکھ

لیے ہم ہیں۔ آپ کے رات بھر جاگنے کا کوئی فائدہ

کسی کو یہ بات اچھی نہیں لگی۔'' یہ تو سب

ایسا۔''

میں نے کہا۔ ''مگر اس نے کہا کہ آپ کر

ا چاہیے۔ نفسیاتی مریض ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اگر کوئی اپنا سامنے ہو جیسے پہلے دن اسکول جانے والا بچہ ماں باپ کے سامنے روتا ہے تو انہیں کہہ دیا جاتا ہے کہ آپ جائیں، ہم سنبھال لیں گے۔ پھر وہ ٹھیک رہتا ہے۔''

انور چونکہ باہر کی دنیا میں یہ سب دیکھ آیا تھا اس لیے میری بات فوراً اس کی سمجھ میں آگئی۔ ''ملک سے ڈاکٹر نے جو کہا بالکل ٹھیک کہا۔ آخر ہم آپریشن تھیٹر اور آئی سی یو میں بھی انہیں اکیلا چھوڑتے ہیں جن کے لیے رو دھو رہے ہوتے ہیں۔''

''اور علاج بہرحال بہتری اور شفایابی کے لیے ہوتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ہم امید کرسکتے ہیں کہ ایک ہفتے بعد وہ ہمارے درمیان ہوں گے۔ نارمل اور صحت مند۔''

میں جو کچھ کہہ رہا تھا، دل سے بھی غلط نہیں کہتا تھا۔ بات اتنی سی نہیں تھی کہ ایک نرس نے چار حاتم تیور دکھائے اور میں ڈر گیا اور بھاگ آیا تھا۔ میں آسانی سے انتظامیہ کو بتا سکتا تھا کہ رات کے وقت خصوصی نرسنگ کی ضرورت اب محسوس نہیں ہوتی چنانچہ روٹین کے مطابق نائٹ شفٹ کی نرس کافی ہے اور وقتِ ضرورت میں اسے طلب کرلوں گا۔

ہماری پرسکون سمندر میں بہنے والی کشتی جیسی زندگی اچانک طوفان اور گرداب میں گھر گئی تھی۔ انور کی حویلی کی تباہی سے شروع ہونے والا آفات کا سلسلہ سکندر شاہ کے ذہنی توازن تک آکے بھی ختم نہیں ہوا تھا۔ انور کی ماں اور سکندر کی بیوی اس طوفان کی نذر ہوگئے تھے اور ہمارے لیے آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔۔۔ والی صورتِ حال درپیش تھی۔

ہمارے سامنے دو اہم چیلنج تھے۔ ایک سکندر شاہ کے کاروبار کی نگرانی۔۔۔ دوسرا نادر شاہ کا مطالبہ جو پہلے پیر سائیں کے چیلوں کا مطالبہ نظر آتا تھا کہ درگاہ کی ازسرِنو تعمیر ہو۔ یہ نیا سوز زیادہ خطرناک تھا۔ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ شہر کی کنٹرلائن کی طرح انڈر گراؤنڈ بزنس کے سلسلے بھی پھیلے ہوئے ہوتے ہیں۔ نادر شاہ سے ملاقات نے جیسے میری آزادی کے احساس کو اور میرے اعتماد کو ختم کردیا تھا۔

اب میرے پاس صرف ایک ماہ کی مہلت تھی۔ اس میں دو دن کم ہوچکے تھے۔ اٹھائیس دن بعد نادر شاہ کے ایک اشارے پر پولیس آئے گی اور مجھے لے جاکے پھر تختۂ دار پر کھڑا کردے گی کہ یہ وہی پرانا شاید انگریزوں کے عہد کا تختہ ہے جس پر سے اب تک سیکڑوں موت کے کنوئیں میں لٹک کے جان دے چکے ہیں۔ آج وہ دن آگیا جس سے بچ کے تم فرار ہوئے تھے تو سمجھے تھے کہ بس اب موت کا فرشتہ تمہیں تلاش نہیں کرسکتا۔

اور اس ہولناک انجام سے بچنا ہے تو گردن میں پھانسی کا پھندا پڑنے سے گردن کو اقرار میں ہلا دو۔ درگاہ کی تعمیرِ نو کے حق میں۔ تمہارے ساتھ دوسروں کے لیے بھی نجات اسی میں ہے۔ مجھے لگتا تھا جیسے ہر وقت ایک آنکھ مجھ پر نگرانی کررہی ہے اور باہر کہیں بھی میں اس آنکھ کے فوکس سے باہر نہیں۔ نادر شاہ کوئی بہت سچا آدمی نہیں تھا۔ اس کے یہ دعوے کہ مراد ہاؤس کے اندر باہر کے سارے نمک خوار اب اس کے زرخرید نمک حرام ہیں اور ہم مراد نگر کے اندر ایک کھلے زنداں میں اسیر ہیں جھوٹ بھی ہوسکتا تھا۔ ہمیں خوف زدہ کرنے کا نفسیاتی حربہ بھی ہوسکتا تھا اور سچ بھی ہوسکتا تھا۔

اس روز گھر کے اندر عجیب سی ویرانی تھی۔ گھر کی مالکن کے بعد مالک بھی حکم چلانے کے لیے موجود نہ تھا۔ اب اس نظام کو چلانے اور نگرانی کے لیے حکم جاری کرنے کا اختیار سب کے پاس تھا اور عملاً کسی کے پاس نہیں تھا۔ قانونی وارث روبی ایک سانحے اور شرعی پابندی کے باعث کمان سنبھالنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ اس کے بعد خون کے رشتے سے انور اس خاندان کی نمائندگی کرتا تھا جس کی بادشاہت ختم ہوگئی تھی۔ سکندر شاہ کے صحت یاب ہوکے واپس آنے تک کسی کو اختیارات کا استعمال کرنا تھا۔ اسی روز شام کے وقت روبی نے اس ضرورت کی طرف توجہ دلائی۔

''ابھی ابا جی۔۔۔ کا کچھ پتا نہیں کتنے دن اسپتال میں رہیں گے۔'' اس نے چائے کے وقت کہا۔

میں نے کہا۔ ''یہ ڈاکٹر بھی نہیں بتاسکتے، وقت لگے گا۔''

''کل سوم کی فاتحہ خوانی کا اعلان کرادو۔'' روبی نے کہا۔ ''اور سب کو بتادو کہ شاہ جی نے خرابیٔ صحت کی بنا پر تمام اختیارات تمہیں سونپ دیے ہیں۔ لوگ پوچھیں گے ضرور کہ شاہ جی کہاں ہیں۔ تم بتاسکتے ہو کہ وہ اسپتال میں ہیں اور دو چار دن میں آجائیں گے مگر ڈاکٹروں کے مشورے کے مطابق انتظامی معاملات کی ذمے داری انھوں نے تم دونوں کو سونپ دی ہے۔''

میں نے اس کی تائید کی۔ ''روبی ٹھیک کہتی ہے۔ اعلان کا مقصد ماتحت عملے کو خبردار کرنا ہوگا کہ اب حکم کس کا چلے گا، کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ پوچھنے والا کوئی نہیں۔''

انور قائل نظر آنے لگا۔ ''معمولات کو بحال کرنا ضروری ہے۔''

روبی نے کہا۔ ''قانونی طور پر تم دونوں پارٹنر تو بن چکے ہو۔''

''وکیل نے کاغذات تیار کر لیے تھے لیکن میرے اور انور کے بیس بیس فیصد شیئرز ہیں۔ کنٹرولنگ شیئرز شاہ جی کے ہی ہیں۔ ساٹھ فیصد۔'' میں نے کہا۔

''شاید مکمل انتظامی کنٹرول کے لیے ہمارے پاس پاور آف اٹارنی ہونی چاہیے۔'' انور نے کہا۔

''ہم وکیل سے بات کر لیں گے۔ لیکن خدانخواستہ ان کا انتقال نہیں ہوا۔ وہ اسپتال میں ہیں۔ ملک سے باہر بھی ہو سکتے ہیں۔ کاروباری معاملات میں منیجر کا حکم بھی چلتا ہے۔ تمہیں کون ہے چیلنج کرنے والا۔'' روبی نے کہا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ابھی تمام معاملات رکے ہوئے تھے۔ دو دن بعد معمولات کا بحال ہونا ضروری تھا ورنہ اندیشہ تھا کہ بدنظمی ہو گی۔ روبی کے سامنے تصویر کا صرف ایک رخ تھا۔ ابھی اسے معلوم نہیں تھا کہ نادر شاہ نے کیا دھمکی دی ہے۔ رات کو فرصت ملی تو انور نے مجھ سے کہا۔

''یار ملک! یہاں تو کسی کو علم ہی نہیں کہ ہم اغوا ہو گئے تھے۔''

''میں نے جتنا ضروری تھا انہیں بتا دیا۔ نادر شاہ کا ذکر نہیں کیا۔ یہ کہا کہ پیر سائیں کے کاروباری شریک دھمکیاں دے رہے ہیں۔ وہ سب ہمیں اور نقصان پہنچا سکتے ہیں۔''

''پھر... روبی نے کیا کہا؟''

''وہ اپنی بات پر قائم ہے۔ جو بدمعاشی وہاں ہوتی تھی اب نہیں ہوں۔'' میں نے کہا۔

''آج اسپتال سے واپس آنے کے بعد انہوں نے بھی بتایا تھا مجھے۔ ذرا فرصت ملے تو انہیں ساری بات سمجھائیں گے۔ اتنی بڑی سازش ہوئی اور سب بے خبر رہے۔ جلدی میں کوئی قدم نہیں اٹھانا ورنہ یہ جتنے نمک حرام ہیں، سب کی چھٹی کر دیتا۔''

''ہو سکتا ہے نادر شاہ نے ہمیں وحشت زدہ کرنے کے لیے جھوٹ بولا ہو، سب اس کے بندے نہ ہوں۔ سب کو بتا دیا تو اسے فوراً خبر ہو جائے گی کہ ہم مقابلے پر آ گئے ہیں اور اس کی دھمکی سے ڈرے نہیں۔ ابھی کچھ دن ہمارا ردعمل سامنے نہیں آنا چاہیے۔ ہم سوچ سمجھ کے قدم اٹھائیں گے۔ روبی کی مرضی اس میں شامل ہو گی۔''

انور بولا۔ ''میں نے بھی انہیں سمجھا دیا کہ ... کچھ نہیں بتانا، ان کے اسپتال سے واپس آنے سے ... مراد ہاؤس کا وہ حصہ ٹھیک کرا دیتے ہیں جو تباہ ہوا تھا۔''

''تو نے اس کا جائزہ لیا؟ اندر جا کے دیکھا؟ ... لاش وہیں پڑی ہو گی؟''

انور نے نفی میں سر ہلایا۔ ''مجھے اس کی مہلت ... ملی۔ ابھی دیکھ لیتے ہیں، چل اٹھ۔''

ہم سامنے سے گھوم کے پچھلے حصے کی طرف ... گیراج کے سامنے مراد ہاؤس کا ایک کونا منہدم ہو کے ڈھیر بنا ہوا تھا۔ یہ وہی تھا جس میں ... زائد نصب تھا ... سیڑھیاں ایک اسٹور روم میں ختم ہوتی ہیں۔ ہم اینٹوں ... ڈھیر پر سے گزر کے نکلے تھے اور اب اندر جانے کے ... بھی ضروری تھا کہ ہم اینٹوں پر قدم جماتے اتریں ... نے عقل مندی کی تھی کہ اپنے ساتھ ٹارچ لے آیا تھا ... احتیاط سے قدم جماتے اترے۔ دیوار کا شگاف دو ... فٹ لمبا اور چوڑا تھا۔ اندر اترنے میں ہمارے کپڑے ... خراب نہیں ہوئے، ہاتھوں پر خراشیں بھی آ گئیں۔

انور پہلے اندر کودا پھر میں نے چھلانگ لگائی ... نے ٹارچ کی روشنی اندر گھمائی۔ رانا کی لاش وہاں نہیں ... وہ اسٹور میں کہیں بھی نہیں تھی۔

''آخر کہاں گیا وہ؟'' انور نے کہا۔ ''مردہ ... گیا۔'' انور بولا۔

میں نے کہا۔ ''وہ لوگ جاتے وقت لاش بھی ... لے گئے ہوں گے۔''

انور نے نفی میں سر ہلایا۔ ''لاش اٹھا کے نکلتے ... دیکھتے۔''

میں نے کہا۔ ''پھر یا تو وہ بعد میں دوبارہ آئے ... سکتا ہے رانا مرا نہ ہو جس نے تصدیق کی، وہ بھی جلدی ... تھا۔''

''ہاں، رانا بعد میں اٹھ کے بھاگ گیا ... پریشانی میں بھول ہی گیا تھا اسے۔ مردیاں نہ ہوتیں ... تو دیتی اور سب کو پتا چل جاتا۔'' انور بولا

میں نے کہا۔ ''کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ یہ ممکن ... انہوں نے جاتے جاتے کسی سے کہہ دیا ہو کہ لاش اٹھا ... یہاں بھی تو ان کے فرمانبردار نمک خوار ہیں۔'' میں نے ...

''اب جو ہوا سو ہوا، آئندہ کی سوچ۔ وہ ... اب زیادہ خطرناک دشمن بن کے سامنے آئے گا۔''

''کم زیادہ کہا۔ نادر شاہ کے مقابلے میں ...

... چلیں۔''

ہم ایک لاحاصل مشن سے ناکام ہوئے تو روبی کا ... کرنا پڑا۔ ''یہ کیا؟ کہاں سے آ رہے ہو؟''

میں نے کہا۔ ''وہ، دراصل ہم باہر دنگل دنگل کھیل ... رہے تھے۔''

اگلے دو دن کافی بھاگ دوڑ اور مصروفیت کے تھے ... ہم نے پچھلے حصے کی مرمت کا کام ایک مستری کے سپرد ... کر دیا تھا۔ اتنی بڑی کنسٹرکشن کمپنی کے لیے یہ چھوٹا سا کام ... گزشتہ رات ہم نے اس واردات کے بارے میں زیادہ ... تفصیل سے بتا دیا تھا۔ ریشم زیادہ پریشان ہوئی۔ روبی ... پر اعتماد رہی۔ انور کے اعلان کے مطابق اس دن ... قرآن خوانی تھی۔ سکندر کی بیوی کے لیے بھی اور انور کی ماں ... کے لیے بھی۔ گرد و نواح سے شریک ہونے والے لوگ سارا ... دن آتے رہے اور منظر کسی تقریب جیسا ہی رہا۔ مگر مجبوری ... دنیا کے ساتھ چلنا پڑتا ہے۔ پیچھے کے حصے میں بریانی اور ... زردے کی دیگیں کھنکتی رہیں، لوگ ڈٹ کر کھانے کے بعد ... ہاتھ داڑھی مونچھوں پر پھیرتے اور دعا کے بعد ہم سے ... رخصت ہو جاتے۔

دن میں وقت نکال کے ایک بار میں اسپتال گیا ... دوسری بار انور۔ ہمیں وہ سوتا ہوا ہی ملا اور ڈاکٹروں نے کہا ... کہ ابھی اس کے ذہن کو بھی سکون کی ضرورت ہے اور جسم کو ... بھی... شام تک فاتحہ خوانی ختم ہوئی تو کرسیاں شامیانے ... والے آ گئے پھر لان کی صفائی ہوتی رہی۔ اس میں ... ہمارا کام صرف حکم دینا تھا لیکن تھکن پھر بھی سب پر غالب ... تھی۔ ہم چار جو دو گھروں کے وارث اور نام لیوا شمار ہوتے ... تھے۔ لاؤنج میں چائے پیتے ہوئے خاموش اور افسردہ ... تھے۔

''یہ ہے زندگی۔'' انور نے جیسے خود سے کہا۔ ''آج ... مرے کل دوسرا دن۔ کل سے سب کچھ بھول کے معمولات ... بحال۔''

''لوگ نہیں رہتے، بس یاد رہ جاتی ہے۔'' ریشم ... بولی۔

''یہ سب سو سال میں بنا ہو گا جو ایک سال میں ختم ہو ... گیا۔'' روبی نے کہا۔ ''یہ جاگیر، حویلیاں، شان و شوکت اور ... نام و نسبت کا غرور... قدرت کے بھی عجیب کھیل ہیں۔''

میں نے محسوس کیا کہ روبی اس غم کے تذکرے سے ... گریز کر رہی ہے جو اس کا ذاتی دکھ تھا۔ مراد کی ناگہانی ... موت کو رسانے الٰہی سمجھنا تو فطری تھا مگر وہ لڑکی جس نے

معاشرے سے بغاوت کی ہو اور محبت کے لیے ماں باپ کا گھر چھوڑ کے ان کی رسوائی کا سامان کیا ہو خود کو احساس جرم سے ماورا نہیں رکھ سکتی اور اس قسم کی صورت حال میں خود بھی اس خیال کو ذہن سے نہیں نکال سکتی کہ جو کچھ ہوا اس کے اعمال کی سزا تھی۔ مراد کو قدرت نے اسے سزا دینے کے لیے اٹھا لیا۔

میں نے کہا۔ ''اس میں کوئی شک نہیں کہ حادثات اور آفات نے ہم سے سب کچھ چھین لیا لیکن تقدیر سے کون لڑ سکتا ہے۔ اب جو بچ گیا ہے اسے بچانے کی ذمے داری ہم سب کی ہے۔''

انور نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''ہاں، دکھ اپنی جگہ، جینے کی مجبوری اپنی جگہ۔''

میں نے کہا۔ ''یہ ہم سب کے لیے بہت بڑا امتحان ہے کہ خود کو بھی سنبھالیں اور دوسروں کو بھی۔ بڑے خاندانوں میں بڑے سب کچھ کر لیتے ہیں۔ یہاں چھوٹے بڑے جو ہیں، ہم ہیں۔''

انور سمجھ گیا کہ میرا مقصد کیا ہے۔ ''خدا کرے شاہ جی جلد از جلد صحت مند ہو کے اپنی ذمے داریاں سنبھالیں اور ہم ان کی مدد کرتے رہیں۔ لیکن ابھی تو سب ہمیں ہی کرنا ہے۔ میں نے آفس والوں سے کہہ دیا ہے کہ کل سے کام پر آ جائیں۔ میں ٹیکنیکل معاملات دیکھوں گا۔ جو پروجیکٹ مکمل ہو گئے وہ بھی۔ جو ہو رہے ہیں ان کی فائلیں دیکھوں گا۔ تم انتظامی اور مالی معاملات کو دیکھو۔''

روبی نے ممنونیت سے ہماری طرف دیکھا۔ ''میں بتا نہیں سکتی کہ اس وقت تم دونوں کا سہارا میرے لیے کتنی بڑی نعمت اور طاقت محسوس ہوتا ہے۔ اکیلی میں کیا کرتی۔''

''یہ بھی قدرت کا بندوبست ہے۔ ورنہ ہم نے ایسا سوچنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی۔ لیکن ہم سب نے ہمت نہ کی تو مزید خرابی کا ڈر ہے۔ ہمیں حالات کا مقابلہ کرنا ہے۔'' میں نے کہا۔

انور جو صوفے پر پیر پھیلائے لیٹا ہوا تھا، اٹھ بیٹھا۔ ''ترجیح کے اعتبار سے تو نہیں۔ مگر ایک فہرست ہے میرے پاس کہ کیا کام کرنے ہیں۔''

''مجھے دکھاؤ یا سب کو پڑھ کے سنا دے۔''

''فہرست میرے دماغ میں ہے۔ کاغذ پر لکھا ہوا کچھ نہیں ہے۔ ایک مسئلہ جس پر تمام فیصلوں کا انحصار ہے درگاہ کا ہے، میرا مطلب ہے اس کی تعمیر کی اجازت دینے کا۔''

روبی نے کہا۔ ''تو اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''جلد بازی میں جذباتی ہو کے فیصلہ مت کرو۔'' انور بولا۔ ''یہ آسان فیصلہ نہیں ہے۔''

''آسان ہو یا مشکل۔ مجھے بتاؤ تم کیا چاہتے ہو، تمہارا کیا فیصلہ ہے؟'' روبی نے کہا۔

''فیصلے کا اختیار صرف تمہارا ہے۔ قانونی طور پر تم وارث ہو۔''

''میں قانون کی بات نہیں جانتی۔ تم کیا چاہتے ہو؟'' وہ خفگی سے بولی۔

''پھر وہی بات، اچھا ابھی اس بات کو رہنے دو۔ ہم اطمینان سے بیٹھ کے ڈسکس کریں گے۔ دوسرا مسئلہ ہوگا قانونی اختیارات کا۔ ہم پارٹنر ضرور ہیں لیکن انتظامی اختیارات ابھی شاہ جی کے پاس ہیں، وہ اختیارات کسی کو منتقل کر سکتے ہیں۔''

''وہ سب کچھ کر چکے۔'' روبی نے کہا۔

''سب کچھ کیا؟'' انور نے پوچھا۔

''اپنی ساری پراپرٹی انہوں نے میرے نام منتقل کر دی۔ جس کا مالک ان کے بعد مراد ہوتا مگر مراد پہلے چلا گیا۔'' وہ اداس ہو گئی اور کچھ دیر بعد بولی۔ ''پراپرٹی میں بینک اکاؤنٹس بھی شامل ہیں۔ کاغذات عدالت میں جمع کرا دیے گئے تھے۔ وکیل لے آئے گا۔''

''انتظامی فیصلوں کے لیے ہمیں پاور آف اٹارنی کی ضرورت ہوگی۔'' انور بولا۔

''اٹارنی میں ہوں۔ تمہیں میری طرف سے ''سب اٹارنی'' کے اختیارات .... ملیں گے۔ یہ کام وکیل کرے گا۔ ابھی تمہیں نہ کوئی روکے گا نہ چیلنج کرے گا۔ اعتراض کرنے والوں کو جواب دینے کے لیے میں ہوں۔'' روبی نے کہا۔

''تمہارا اعتماد ہی ہماری اصل طاقت ہے۔'' میں نے کہا۔

''اب صرف دو ہفتے کی بات اور ہے۔ پھر میں بھی تمہارے ساتھ شامل ہو جاؤں گی۔''

انور بولا۔ ''تم کو گھر کے اندر سارے ملازموں پر نظر رکھنی ہے۔ میں باہر والوں کو دیکھوں گا۔''

روبی نے کہا۔ ''بہتر ہے سب کو بدل دیا جائے۔''

''ابھی نہیں، اتنی جلدی کوئی نہیں۔ سوچ سمجھ کے قدم اٹھانا ضروری ہے۔'' میں نے کہا۔

انور نے کہا۔ ''بعد میں ایک تو اپنی حویلی کی جگہ صاف کرا کے دوسری حویلی تعمیر کرانی ہے۔ بالکل ویسی ہی۔ یہ تو میں بھی کرتا رہوں گا بشرط زندگی۔ وہ دس دفعہ گرائیں میں دس دفعہ حویلی کو پھر کھڑا کر دوں گا۔ تم کیا کرو گی؟''

روبی چونکی۔ ''میں؟ مجھے کیا کرنا ہے، تم بتاؤ۔''

''اپنی زمین کا کیا کرو گی۔ آباد تو وہ ہے۔ کاشت کار بھی اپنا کام کر رہے ہیں۔ اس کا کنٹرول اور حساب کتاب تمہارے ابا رکھتے تھے۔ اسے لاوارث نہیں چھوڑا جا سکتا۔''

''ابھی میں نے اس کے بارے میں سوچا نہیں۔ جو کروں گی تمہارے مشورے سے کروں گی۔''

میں نے کہا۔ ''یہ مت بھولو کہ دشمن ہمارے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ وہ ہمیں کچھ نہیں کرنے دیں گے۔''

''پھر کیا کریں ہم؟ کچھ نہ کریں؟'' انور بولا۔

''میرا مطلب تھا کہ ہم ان سے کیسے نمٹیں گے۔ یہ ہم سوچ ہی نہیں رہے ہیں۔ ان سے نمٹنا بھی آسان نہیں ہے۔ کیونکہ وہ سامنے نہیں ہیں ورنہ پولیس سے کہتے کہ جاؤ فلاں فلاں کو پکڑ لو۔''

انور نے سر ہلایا۔ ''ان کا سراغ لگانا بھی مشکل ہے۔ لیکن یہ بھی تو نہیں ہو سکتا کہ ان کے ڈر سے ہم کچھ بھی نہ کریں۔ میں بھی اکیلا ہوں۔''

''آپ ہمیشہ اکیلے نہیں رہیں گے۔'' روبی نے کہا۔

''اور تم؟ ابھی تو اکیلی ہی ہو نا۔ اگر کچھ نہیں کرنا تو پھر میں جو رہی سہی جائداد ہے اسے ٹھکانے لگاتا ہوں اور تم بھی سکندر شاہ کے بزنس کو کسی کے حوالے کر دو۔ خریدار بہت ملیں گے اور ہم سب یہاں سے کیا اس ملک سے ہی بھاگ جاتے ہیں۔'' انور نے خفگی سے کہا۔

''مگر یہ مت بھولو کہ بھاگنا بھی آسان نہیں۔ ہمارے دشمن بھاگنے کہاں دیں گے۔'' میں نے کہا۔

بھاگنے کا کوئی سوال نہیں۔'' روبی نے جیسے فیصلہ صادر کیا۔ ''ہم مقابلہ کریں گے۔''

''کیسے خاتون؟ اور کہاں۔'' انور بولا۔

''جہاں بھی سامنا ہوگا۔ ہم ان کا سراغ بھی لگائیں گے۔'' میں نے روبی کی حمایت کی۔ ''بزدلوں کی طرح بھاگنا تو کوئی بات نہ ہوئی۔ ویسے انور صاحب، فیصلہ روبی کا ہے یا آپ کا۔ آپ بھی خود مختار ہیں اپنے معاملات میں۔''

''خود مختاری کا یہ مطلب نہیں کہ کسی اور کی کوئی مرضی نہیں چلے گی۔'' ریشم نے بھی بالآخر زبان کھولی۔ ''بھائی اگر روبی کے ساتھ ہیں تو میں بھائی کے ساتھ ہوں۔''

انور اسے دیکھتا رہا اور پھر مسکرایا۔ ”لو جی ریشم نے فیصلہ کردیا۔ کل ای ٹک گئی۔ یہ تو بورا راؤنڈ ہے۔ روبی کے ساتھ ملک صاحب، ملک کے ساتھ ریشم اور ریشم کے ساتھ میں۔“

سب کے چہروں پر اطمینان اور اعتماد کی مسکراہٹ آگئی۔ ابھی تک انور نے اور میں نے نادر شاہ کی دھمکی اور اس کی دی ہوئی مہلت کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اصولی طور پر میں یا انور یہ فیصلہ نہیں کرسکتے تھے کہ روبی کی زمین پر وہ جرائم پیشہ افراد اپنا مذموم کاروبار شروع کریں مگر نادر شاہ کی دھمکی کو نظر انداز کرنا بھی آسان نہ تھا۔ اور جب تک میں پوری طرح روبی کو نادر شاہ کے بیک گراؤنڈ سے آگاہ نہ کروں اس کا فیصلہ بھی آخری نہیں سمجھ سکتا تھا۔ یہ ہوسکتا تھا کہ حقیقت جان لینے کے بعد وہ بھی مصلحت اور مصالحت کی پالیسی اپنانے میں بہتری دیکھے۔ اس کے لیے روبی کو خود اپنے بارے میں بتانا ضروری تھا کہ میں جو آج تک سلیم اختر ہوں درحقیقت فریدالدین ہوں۔ قانون کا وہ مجرم جو پھانسی کے تختے سے فرار ہوا تھا اور جس کی آج بھی پولیس کو تلاش ہے۔ یہ وہی نادر شاہ ہے جس نے میرے گرد اپنا حصار قائم کرلیا ہے اور مجھ پر واضح کردیا ہے کہ میں نے درگاہ کی پھر تعمیر کی اجازت نہ دلوائی تو سب سے پہلے وہ مجھے پھر تختہ دار تک پہنچائے گا۔ اس کے بعد باقی سب سے نمٹے گا۔ اور باقی سب کون، انور کے خلاف اس نے محاذ کھول دیا ہے۔ اس جنگ میں جو انور کی جنگ نہیں وہ اپنی ماں کو گنوا چکا ہے۔ اپنے آباؤ اجداد کی نشانی اپنی خاندانی حویلی ہار کے بے گھر ہوچکا ہے۔ وہ اپنی زندگی بھی ہارنا چاہے تو اس کی مرضی وہ خودکشی کرے گا تو ایک اور بیوہ ریشم کی صورت میں چھوڑ جائے گا۔ دو صفر مساوی صفر۔ دو بیوائیں ان کے مزاحمت کیسے کریں گی۔

مجھے زیادہ امید یہی تھی کہ ساری بات سن کر اور سمجھ کر روبی کے پاس اپنا فیصلہ بدل دینے کے سوا چارہ نہ ہوگا۔ لیکن اپنی زندگی کی خاطر ان سب کی زندگی کو داؤ پر لگانے کا حق مجھے کس نے دیا؟ یہ سوال کسی اور کے ذہن میں نہیں، صرف میرے ذہن میں تھا میرے لیے جان بچا کے بھاگ جانا اور ایک بار پھر کسی نامعلوم مقام پر ایک نئے نام اور نئی شخصیت اختیار کرکے زندگی کی جدوجہد کرنا مشکل نہ تھا لیکن مسئلہ اس سے حل نہیں ہوتا تھا۔ نادر شاہ کا مطالبہ باقی رہتا تھا۔

اس روز نہ انور نے یہ ذکر چھیڑا تھا نہ میں نے۔ اگلے دن کا آغاز پروگرام کے مطابق یوں ہوا کہ سکندر شاہ کی کنسٹرکشن کمپنی کے آفس کا عملہ ڈیوٹی پر حاضر ہوگیا۔ انور انہیں بریفنگ دینے آفس گیا تو مجھے اکیلے ہی اسپتال جانا پڑا۔ دس بجے سکندر شاہ مجھے اپنے کمرے میں نہیں ملا۔ شاید وہ باتھ روم میں ہو۔ یہ سوچ کے میں انتظار کے لیے کرسی پر بیٹھ گیا۔ دس منٹ گزر گئے تو مجھے تشویش ہونے لگی۔

میں نے باتھ روم کے دروازے پر دستک دی۔ ”شاہ جی، اندر ہیں آپ؟“ میں نے پوچھا اور پھر دستک دی۔

مجھے کوئی جواب نہ ملا تو میں نے ہینڈل گھمایا اور اندر جھانکا۔ سکندر شاہ اندر نہیں تھا۔ میں نے واپس نیچے جا کے ریسیپشن سے رجوع کیا۔ ایک خوش شکل اور خوش مزاج لڑکی نے کسی نرس کو فون پر طلب کیا اور فون مجھے تھما دیا۔ ”یہ ڈیوٹی روم سے بات کرلیں۔“

کسی نرس نے پوچھا۔ ”جی فرمائیے۔ یہ ڈیوٹی روم ہے۔“

میں نے کہا۔ ”سکندر شاہ صاحب اپنے روم میں نہیں ہیں۔“

”وہ آپ کو گارڈن میں ملیں گے، آپ پیچھے چلے جائیں۔“

میں باہر نکلا اور عمارت کے گرد گھوم کے عقبی حصے میں پھیلے ہوئے پارک میں پہنچا۔ وہاں بہت لوگ تھے۔ کچھ بنچوں پر، کچھ گھاس کے تختوں پر، اپنی وھیل چیئرز میں نرسوں کے ساتھ، کچھ اپنے فیملی ممبرز کے ساتھ بھی تھے۔ میں نے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کا جائزہ لیا اور ہر مریض کی صورت کو غور سے دیکھا۔ سکندر شاہ کہیں بھی نہیں تھا۔ اب مجھے کچھ پریشانی ہونے لگی۔ ایک بار پھر استقبالیہ پر جا کے میں نے شکایت کی۔

”سکندر شاہ صاحب مجھے باغ میں نہیں ملے۔“ میں نے کہا۔

اب اسٹاف نرس کو طلب کیا گیا اور انہوں نے سکندر شاہ کی تلاش شروع کی۔ وہ کینٹین میں ہوسکتا تھا۔ ایک کے بعد دوسری کینٹین میں بھی وہ نہیں ملا۔ اس نے اسپتال کے مریضوں کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس لباس میں وہ گیٹ سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ میری تشویش اب اسٹاف کے لیے بھی پریشانی کا باعث بن رہی تھی کیونکہ سکندر شاہ اسپتال میں کہیں نہ تھا۔ میرے ذہن میں اندیشے ناگ بنانے لگے۔

وہ دیوانگی کی کیفیت میں بھاگ گیا؟ یا اسے اغوا کرلیا گیا؟

ہر محاذ پر ایک نئے داؤ کی منتظر
جواری کی تدبیریں اگلے ماہ پڑھیے

چھوٹے ذہنوں کی آبادکاری اور غریبوں کی نسل کشی پر مبنی ایک عہد کُن تحریر

انصاف میں تاخیر انسانیت کی موت ہے... پھر بھی انصاف و قانون کے پیمانے ہر وقت گردش میں رہتے ہیں... طبقۂ عالیہ گرفت میں آجائیں تو میزان ایک طرف جھک جاتا ہے... اور غریب کے لیے تو کیا انصاف کیا قانون کے تقاضے... تاریخ کے جھروکوں... سے سلطنتِ برطانیہ کی سرحدوں میں رونما ہونے والے واقعات کی ایک جھلک۔ عالی نسب... دولت کی چکا چوند... شاہانہ طمطراق طبقۂ اشرافیہ کی رگوں میں لہو کے مانند دوڑ رہے تھے... ان کا جرم ناقابلِ گرفت تھا... چاہے اس کے لیے کتنی ہی زندگیوں کا خراج دینا پڑے... کیونکہ ان کی قائم کردہ برادری اور اس کے مفادات وقوانین پر کاربند رہنا از حد ضروری تھا...

برادری کا انصاف

مریم کے حسان

1888ء کا لندن ایک بڑا لیکن تضادات کا مجموعہ شہر تھا۔ یہ نہ تو نیویارک کی طرح بڑی عمارات کا شان و شوکت والا شہر تھا اور نہ ہی پیرس کی طرح خوب صورت اور روشن تھا۔ اس وقت لندن ایک تنگ و تاریک اور گھٹا ہوا شہر تھا۔ اس کی پتھر سے بنی گلیوں میں بیشتر وقت اندھیرا چھایا رہتا تھا۔ دن میں بھی جب آسمان پر بادل ہوتے تو ان گلیوں میں اندھیرا ہوتا تھا۔ بہت سے علاقے زیرِ زمین تھے جہاں روشن دن میں بھی تاریکی رہتی تھی۔ خراب اقتصادی حالات

کی وجہ سے غربت اور جرائم کا دور دورہ تھا۔ یہ غربت اور جرائم ان تاریک گلیوں میں جنم لیتے اور یہیں دم توڑ دیا کرتے تھے۔ لندن کے چند علاقے جو امرا کے لیے مخصوص تھے، وہ صاف ستھرے اور کشادہ تھے لیکن باقی لندن پسماندگی اور غربت میں لپٹا ہوا تھا۔ جو گلیاں پکی تھیں، وہاں صفائی کا انتظام ناقص تھا اور جہاں گلیاں کچی تھیں، وہاں ہر وقت کیچڑ جمع رہتا تھا۔

ان میں وائٹ چیپل کا علاقہ سرفہرست تھا۔ یہ غربت اور پسماندگی کا مارا علاقہ چاروں طرف سے پوش علاقوں میں گھرا ہوا تھا۔ لندن میں ہونے والے ستر فیصد جرائم کا تعلق اسی علاقے سے تھا۔ غربت اور بیرون ملک جانے اور مارے جانے والے برطانوی فوجیوں کے گھروں کی عورتوں نے جسم فروشی کا پیشہ اپنا لیا تھا۔ ان کا مرکز بھی وائٹ چیپل تھا۔ شام ہوتے ہی یہاں کے گلی کوچوں میں یہ عورتیں منڈلانے لگتی تھیں۔ یہاں جا بہ جا پب اور قحبہ خانے تھے۔ دن بھر کاموں سے فارغ ہونے والے محنت کش پب میں جمع ہوتے...... اور اگر شراب سے کچھ رقم بچ جاتی تو وہ نشے میں وحشت ہو کر کسی طوائف کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے۔ ان میں سے بیشتر طوائفوں کے پاس کوئی ٹھکانا نہیں ہوتا تھا۔ اگر مرد کے پاس لے جاتے کے قابل کوئی جگہ نہیں ہوتی تھی تو وہ تاریک گلی کوچوں کی تلاش کرتے تھے اور اس کی یہاں کوئی کمی نہیں تھی۔

31 اگست 1888ء کی ایک شام جب وائٹ چیپل کی گلیاں پوری طرح آباد تھیں تو ڈن وارڈ اسٹریٹ کی ایک ذیلی گلی میں میری این نکول کی لاش پائی گئی۔ اس کا گلا دائیں سے بائیں دو زخموں سے کٹا ہوا تھا اور اس کے پیٹ کا نچلا حصہ کسی طویل اور نکیلے تیز دھار آلے سے اس طرح کاٹا گیا تھا کہ بیشتر اندرونی اعضا کٹ گئے تھے اور یہ اعضا غائب تھے۔ وائٹ چیپل میں طوائفوں کا قتل کوئی انہونی بات نہیں تھی۔ اکثر ان کا لین دین یا کسی بات پر گاہک سے جھگڑا ہو جاتا تھا اور وہ مشتعل ہو کر عورت کو قتل کر دیتا تھا۔ یہاں بارہ سو طوائفیں ساٹھ کے قریب قحبہ خانوں کے تحت کام کرتی تھیں اور ہر سال ان میں سے دو درجن سے زیادہ قتل کر دی جاتی تھیں۔ زیادہ تر قتل چاقو کے وار سے کیے جاتے تھے۔ اس وقت لندن میں آتشیں اسلحہ بہت کم لوگوں کے پاس تھا۔ کچھ ہاتھوں سے کام لیتے تھے۔ کچھ پتھر اور اینٹ جیسی چیز آلۂ قتل کے طور پر استعمال کرتے تھے مگر یہ پہلی بار ہوا تھا کہ کسی قاتل نے یہ بہیمانہ طریقہ استعمال کیا ہو۔

پھر قتل نہایت پُراسرار تھا۔ کسی نے نہیں دیکھا کہ میری این کس کے ساتھ اس تاریک گلی تک گئی تھی۔ وہ تقریباً چالیس برس کی عام صورت والی عورت تھی۔ صرف تیسرے درجے کے غریب اور محنت کش یا چھوٹے درجے کے جرائم پیشہ جن کے پاس زیادہ رقم نہیں ہوتی تھی، اس کے پاس آنا پسند کرتے تھے۔ البتہ کچھ لوگوں نے ایک بگھی کو اس گلی کی طرف مڑتے دیکھا تھا مگر کسی کو یقین نہیں تھا کہ درحقیقت وہ قاتل کی تھی کیونکہ بگھی نہایت شاندار تھی۔ پولیس کے شعبہ خصوصی تحقیق کے سارجنٹ فریڈ کلے فر نے لاش کا معائنہ کیا۔ اس نے انگلی سے خون چھوا جواب بھی گیلا تھا۔ عورت کو قتل ہوئے تین گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔ لاش گلیوں میں گشت کرنے والے ایک کانسٹیبل نے دیکھی تھی۔ فریڈ فربہ اندام اور بڑے چہرے والا شخص تھا۔ اس کی نیلی آنکھوں سے ذہانت جھلکتی تھی۔ وہ اپنی ذہانت اور صلاحیت سے سارجنٹ کے عہدے تک پہنچا تھا۔

عورت کا گلا کاٹنے والا آلہ نہایت تیز اور شاید استرا تھا کیونکہ دونوں زخم نہایت صفائی سے ایک سیدھ میں تھے۔ کھال کے کنارے نمایاں تھے اور گوشت اندر تک کٹ گیا تھا۔ پھر وہ جسم کے زیریں حصے کے زخم کی طرف متوجہ ہوا۔ یہ کھلی جگہ تھی اس لیے گلی کے دونوں سروں پر لوگوں کا ہجوم جمع ہو گیا تھا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں اضافہ ہو رہا تھا۔ سپاہیوں کی وجہ سے کوئی آگے نہیں آ پا رہا تھا لیکن دور سے وہ سب دیکھ رہے تھے۔ فریڈ نے پردہ کرنے کا حکم دیا اور چار کانسٹیبل دو بڑی چادریں تان کر کھڑے ہو گئے۔ تب فریڈ نے اسکرٹ اوپر کیا اور زخم دیکھ کر اس نے بہ مشکل اپنے اوپر قابو پایا۔ وہ تیس سال سے لندن پولیس کے لیے کام کر رہا تھا مگر اس نے آج تک کسی لاش کی ایسی حالت نہیں دیکھی تھی۔ قاتل نے درندگی کی انتہا کر دی تھی۔

فریڈ لاش کا معائنہ مکمل کر کے کھڑا ہو گیا اور اس نے حکم دیا۔ ''اسے چادر سے ڈھک دو۔ اس گلی میں دو طرف دس دس قدم کے فاصلے پر کوئی نہ آنے پائے۔''

فریڈ اپنی پولیس بگھی کی طرف آیا تو کانسٹیبل لوگوں کو گلی سے پیچھے دھکیلنے لگے۔ رات ایک بجے کا وقت تھا لیکن پریس کے نمائندے پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے فریڈ کا راستہ روکنے اور سوال کرنے کی کوشش کی لیکن وہ انہیں نظرانداز کر کے بگھی میں سوار ہو گیا۔ اس نے ڈرائیور کو نزدیکی قحبہ خانے چلنے کا حکم دیا۔ بگھی روک کر وہ اندر گیا لیکن اس قحبہ خانے میں اس کا کام نہیں ہوا۔ وہ واپس آیا اور ڈرائیور کو

اگلے قحبہ خانے چلنے کا حکم دیا۔ وہ چوتھے قحبہ خانے میں داخل ہوا تو اس کے چینی مالک نے اس کا راستہ روک لیا اور آواز دبا کر بولا۔ ''میں ادائیگی کر چکا ہوں اس لیے اس چھاپے کا مطلب؟''

فریڈ نے اس کی پہلے سے دبی ناک مزید دبائی اور بولا۔ ''یہ چھاپا نہیں ہے...... وہ کہاں ہے؟''

''کون؟'' مالک نے اپنی ناک سہلائی۔

''تم جانتے ہو میں کس کو پوچھ رہا ہوں۔'' فریڈ اسے ایک طرف دھکیل کر آگے بڑھ گیا۔ وہاں منشیات کا دھواں پھیلا ہوا تھا اور جگہ جگہ چینی اور مقامی انگریز لڑکیاں آنے والے گاہکوں کا دل بہلا رہی تھیں۔ فریڈ کونے کھدروں میں جھانکتا پھرتا رہا۔ بالآخر اسے چمڑے کے ایک صوفے پر دراز ایلڈر کولن ووڈ نظر آ گیا۔ وہ نیم وا آنکھیں کیے لیٹا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ میز پر واڈکا کی بوتل کے ساتھ افیون نوشی کا پائپ بھی رکھا ہوا تھا۔ اس میں افیون کی راکھ شدہ گولی بھی موجود تھی۔ فریڈ نے جھک کر کہا۔ ''اٹھ جاؤ۔''

مگر ایلڈر اسی طرح لیٹا رہا تو فریڈ نے زوردار تھپڑ رسید کیا اور اس بار زور سے بولا۔ ''اٹھ جاؤ انسپکٹر کولن ووڈ۔''

ایلڈر چونک کر اٹھا مگر اس کی آنکھوں میں غنودگی تھی۔ چند منٹ بعد چینی مالک کے دفتر میں سرد پانی کے پیالے میں سر ڈبونے پر اسے پوری طرح ہوش آ گیا تھا۔ وہ نچوڑے تولیے سے منہ پونچھ رہا تھا۔ اس نے فریڈ سے پوچھا۔ ''سارجنٹ! ایسی کیا ضرورت پیش آ گئی کہ تم مجھے تلاش کرتے ہوئے یہاں چلے آئے؟''

''ایک طوائف کا قتل۔''

ایلڈر نے منہ بنایا۔ ''اس کے لیے تمہارے پاس انسپکٹروں کی کمی نہیں ہے۔''

''ہاں لیکن یہ عام قتل نہیں ہے۔ میرے ساتھ چلو، لاش ابھی وہیں پڑی ہے۔''

فریڈ، ایلڈر کو جائے وقوع پر لے کر آیا۔ تماش بین ایوس ہو کر جا چکے تھے کیونکہ پولیس نے لاش چھپانے کے لیے مستقل اسکرین کھڑی کر دی تھیں۔ البتہ چند عورتیں کھڑی تھیں اور ان کے حلیے بتا رہے تھے کہ وہ مرنے والی کی ہم پیشہ تھیں۔ فریڈ اور ایلڈر انہیں نظرانداز کر کے لاش تک آئے۔ ایلڈر نے چادر ہٹا کر پہلے لاش کے جان لیوا زخم کا معائنہ کیا اور آہستہ سے بولا۔ ''سرجن نائف......''

''کیا مطلب؟'' فریڈ نے پوچھا۔

''جس آلے نے اس کا گلا دو بار کاٹا ہے، وہ کوئی استرا نہیں بلکہ سرجن والا چاقو تھا۔ یہ کام اس کی نوک سے لیا گیا ہے۔ اگر استرے سے کاٹا جاتا تو ایک وار کے بعد یہ کھڑی نہیں رہتی جبکہ زخم بتا رہے ہیں کہ دونوں وار ایک سیکنڈ کے وقفے سے ہوئے ہیں۔ اتنی تیزی سے صرف سرجن کا چاقو ہی کام کر سکتا ہے، استرا نہیں......''

''نچلے زخم کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

ایلڈر نے اسکرٹ اوپر کیا۔ زیریں حصے کے زخم کا معائنہ کیا، اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔ معائنہ کر کے اس نے سر ہلایا۔ ''یہاں بھی سرجنوں والا ایک اوزار استعمال ہوا ہے۔ یہ لمبا چاقو ہوتا ہے جو اندرونی سرجری کے کام آتا ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے قاتل کوئی سرجن ہے؟''

''میں نے صرف اوزاروں کا ذکر کیا ہے جو یہاں استعمال ہوئے ہیں۔'' ایلڈر کھڑا ہو گیا۔ اس نے سپاہیوں سے کہا۔ ''لاش اٹھوا دو اور کوئی چیز رہ نہیں...... اس کا لباس بھی مکمل محفوظ رہنا چاہیے۔''

ایلڈر آگے بڑھا تو فریڈ اس کے پیچھے آیا۔ ''تم کہاں جا رہے ہو؟''

''اپنے گھر...... میرا کتا انتظار کر رہا ہوگا، وہ بھوکا ہوگا۔''

''میں تمہیں چھوڑ دیتا ہوں۔'' فریڈ نے کہا۔ وہ دونوں بگھی میں آ گئے۔ راستے میں فریڈ نے کہا۔ ''تم خودکشی کے راستے پر ہو...... واڈکا کے ساتھ افیون کا نشہ کسی دن تمہارا دل بند کر دے گا۔''

ایلڈر نے بگھی کے باہر دیکھتے ہوئے شانے اچکائے۔ پانچ سال پہلے جب اس کی بیوی ریبا، اس کے پہلے بچے کو جنم دیتے ہوئے جان سے گزر گئی تھی، تب سے ایلڈر ایسی ہی بے پروا زندگی بسر کر رہا تھا۔ دن میں اپنے فرائض انجام دینے کے بعد وہ شام کے وقت ایسے ہی کسی قحبہ خانے کا رخ کرتا تھا جہاں اسے نشے میں ڈوب جانے کا موقع ملے۔ بعض اوقات وہ دو دو دن گھر نہیں جا پاتا تھا۔ اسے اپنے کتے میگنڈر کا خیال نہ ہوتا تو وہ گھر کا رخ ہی نہ کرتا۔ انسپکٹر ایلڈر کا گھر وائٹ چیپل سے ذرا دور ایک پوش علاقے میں تھا۔ بگھی سے اترتے ہوئے اس نے فریڈ سے کہا۔ ''سارجنٹ! خیال رہے، صبح دس بجے تک پولیس سرجن اپنا کام مکمل کر لے، مجھے مکمل رپورٹ چاہیے۔''

''اس میں صرف چھ گھنٹے رہ گئے ہیں۔'' فریڈ نے ملائمت سے کہا۔

''مجھے معلوم ہے، میں دس بجے آ جاؤں گا۔''

فریڈ اسے جاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ پولیس میں اپنے تجربے کی روشنی میں وہ یقین سے کہہ سکتا تھا کہ آج تک ایلڈر جیسا ذہین پولیس افسر اس کی نظر سے نہیں گزرا تھا مگر وہ نشے اور اپنی تنہائی کے ہاتھوں برباد ہو رہا تھا۔ اگر اسے کوئی اچھی عورت مل جاتی تو وہ اسے سنبھال سکتی تھی۔ فریڈ نے کوچوان سے بگھی آگے بڑھانے کو کہا۔

☆☆☆

اینا رین تو سخت افسردہ تھی۔ قتل ہونے والی میری اس کی بہترین دوست اور ہم پیشہ تھی۔ اسے اطلاع ملی لیکن تاخیر سے اس لیے وہ لاش نہیں دیکھ سکی تھی۔ اب لاش پولیس کی تحویل میں تھی اور جب تک وہ تدفین کے لیے ملتی۔ وہ دیکھنے کے قابل نہیں رہتی۔ اینا سوچ رہی تھی کہ قاتل نے میری جیسی اچھی فطرت کی عورت کو کیوں قتل کیا۔ عام طوائفوں کی طرح وہ بدزبان تھی اور نہ ہی رقم کے پیچھے جھگڑتی تھی۔ گاہک جو دیتا، خاموشی سے لے لیا کرتی تھی۔ اسے بیکر کارل مین کا خیال آیا۔ بیکر اس قحبہ خانے کا مالک تھا جس علاقے میں وہ کام کرتی تھیں اور ان کی آمدنی کا نصف سے زائد وہی ہتھیا لے جاتا تھا۔ وہ سخت مزاج اور سنگ دل شخص تھا۔ طوائفوں کو اپنے قابو میں رکھنے کے لیے وہ انہیں بلاوجہ بھی دھمکاتا اور تشدد کا نشانہ بناتا رہتا تھا۔ اس کے پاس ایک چھوٹا سا چاقو تھا جس سے انہیں کاٹ ڈالنے کی دھمکیاں دیتا تھا۔ اینا سوچ رہی تھی کہ شاید اس بار بیکر نے اپنی دھمکی پر عمل کر دیا ہو۔ اینا نے اپنی ساتھی عورتوں سے کہہ بھی دیا تھا۔ میری این کے قتل کے دوسرے دن اینا کام کرنے کے بجائے ایسے ہی پھر رہی تھی۔ کئی افراد نے اس میں دلچسپی ظاہر کی مگر وہ انہیں نظرانداز کرتی رہی۔ دس بجے اس نے اپنی ساتھی عورتوں اینی اور الزبتھ سے کہا۔

”میں جا رہی ہوں۔“

”اتنی جلدی، ابھی تو رات شروع ہوئی ہے۔“

”ہاں، لیکن میرا موڈ نہیں ہو رہا ہے۔“ اس نے بے دلی سے کہا اور سڑک پار کر کے چھوٹی گلی کی طرف بڑھی۔ جیسے ہی وہ ایک موڑ سے مڑی کسی نے اسے پکڑ کر کھینچا اور دھکیل کر دیوار سے لگا دیا۔ اینا نے دیکھا وہ بیکر کا گرگا شارپر تھا۔ اس کی حریص نگاہیں اینا کے گریبان پر لگی ہوئی تھی۔ اس نے چاقو اینا کی گردن سے یوں لگایا تھا کہ نوک سے بچنے کے لیے وہ گردن اوپر کرنے پر مجبور ہو گئی... اسی لمحے بیکر بھی وہاں آ گیا۔ اس نے اپنے تمبا کو زدہ دانت نکال کر اینا کو دیکھا اور نرم لہجے میں بولا۔ ”کیا بات ہے ڈیئر... آج تم نے دھندا نہیں کیا۔“

”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

”تمہاری طبیعت۔“ اس کا لہجہ زہریلا ہو گیا۔ ”شاید میری کے بارے میں جان کر تمہاری طبیعت خراب ہوئی ہے۔ اسے میں نے قتل کیا ہے۔“

”میں نے... یہ...“ اینا نے کہنا چاہا لیکن تھپڑ نے اس کا منہ پھیر دیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے کہ تم میرے بارے میں کیا کہہ رہی ہو۔“ بیکر اپنے اصل روپ میں آ گیا۔ ”لیکن تم نے گزشتہ تین دن سے مجھے ایک پینی بھی نہیں دی ہے، مجھے اس کی بہت تکلیف ہے۔“

”میں وعدہ کرتی ہوں، کل سے کام پر آ جاؤں گی۔“

”اسی میں تمہاری بہتری ہے۔ میں بیکار چیزیں رکھنے کے بجائے انہیں ٹھکانے لگا دینے کا قائل ہوں۔“ بیکر نے کہا اور سر سے شارپر کو اشارہ کیا تو اس نے اینا کو چھوڑ دیا مگر اس سے پہلے جان کر اس کی قمیص کا اگلا بٹن چاقو کی نوک سے نکال دیا۔ اینا نے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔ ان کے جانے کے بعد اس نے بٹن تلاش کیا اور اسے مٹھی میں دبا کر وہاں سے روانہ ہو گئی۔ دو سال پہلے وہ اسکاٹ لینڈ سے لندن ... آئی تھی۔ اس کا گاؤں طاعون کی زد میں آ گیا تھا اور لوگ اپنی زندگی بچانے کے لیے وہاں سے نکل بھاگے تھے۔ اینا کا باپ اور ایک بہن اس وبا کی نذر ہو گئے اور اب اس کا کوئی نہیں تھا۔ لندن آنے کے بعد اس نے کوشش کی کہ اسے کوئی کام مل جائے مگر کوئی کام نہیں ملا اور اسے مجبوراً یہ پیشہ اختیار کرنا پڑا تھا۔ پہلے اسے خود سے گھن آتی تھی لیکن رفتہ رفتہ وہ اس کی عادی ہو گئی۔ اس کے باوجود وہ کوشش کرتی کہ کم سے کم کام کرے۔

یہی وجہ تھی کہ اس کے پاس زیادہ رقم نہیں تھی اور کوئی مستقل رہائش بھی نہیں تھی۔ وہ ایک سرائے میں رات گزارتی تھی جہاں ایک شلنگ کے بدلے بینچ پر بیٹھ کر سونے کی جگہ مل جاتی تھی۔ اس بینچ پر اس کے ساتھ مزید پانچ یا چھ افراد سوتے تھے اور ان کو گرنے سے بچانے کے لیے رسی باندھ دی جاتی تھی۔ اس طرح اینا چھ سات گھنٹے کی نیند پوری کر لیتی تھی۔ اس کے بعد اس کا سارا دن گھومتے پھرتے گزرتا تھا۔ ایک احاطے میں بنی کوٹھریوں میں اس کی ساتھی عورتیں رہتی تھیں۔ وہ ان کے پاس چلی جاتی۔ شام تک کا وقت ان کے ساتھ گزر جاتا اور پھر شام کو دھندے کا وقت ہو جاتا۔ صبح سرائے کے نگراں نے رسی کھولی تو اینا گرتے

گرتے بچی۔ نگراں کرخت آواز میں چلاتے ہوئے سوتے لوگوں کو اٹھا رہا تھا جن کے پاس رقم تھی، وہ پلنگوں پر سو رہے تھے، اوپر تلے کئی منزلہ پلنگ تھے۔ کمبل کے بدلے اضافی رقم دینا پڑتی تھی۔ سردیاں اینا اور اس جیسے مفلوک الحال لوگوں کے لیے بہت اذیت ناک ہو جاتی تھیں۔ وہ آنکھیں ملتی باہر آئی اور ساتھی عورتوں کے احاطے میں آ گئی جہاں وہ پانی کے ٹب کے سامنے منہ صاف کر رہی تھیں۔

”ہائے اینا۔“ کیتھرائن نے پکارا۔

اینی آئینے میں اپنے دانت دیکھ رہی تھی۔ وہ ان کے گروپ میں سب سے تنگ مزاج اور نخرے والی تھی۔ کیتھی نے اس سے آئینہ لیا تو اس کا موڈ خراب ہو گیا۔ اس نے آئینہ تقریباً چھین کر واپس رکھ لیا۔ الزبتھ اینا کی طرف آئی۔

”بہت دنوں سے میریا کی خبر نہیں آئی ہے۔“

”اس کی خبر کیا آئے گی۔“ اینا مسکرائی۔ ”اسے اس کے خوابوں کا شہزادہ مل گیا ہے۔ اب تو وہ ہمیں یاد بھی نہیں کرے گی۔“

ابھی جملہ اینا کے منہ میں تھا کہ ایک بگھی آ کر احاطے کے پاس رکی اور اس سے میریا رتھ لیلڈ اتر کر ان کی طرف آئی۔ اس کی گود میں ایک بچہ تھا۔ وہ سب بیک وقت اس کی طرف لپکیں۔ اینا اس سے لپٹ گئی۔ ”میریا! تم کہاں تھیں اور یہ بچہ؟“

”میرا ہے۔“ میریا کھلی پڑ رہی تھی۔ ”لڑکی ہے۔“

”تب تو یہ یہیں آئے گی۔“ اینی نے دور سے پکار کر کہا۔ وہ آگے نہیں آئی تھی۔ میریا نے غصے سے اسے دیکھا مگر الزبتھ بولی۔

”دفع کرو اسے... کب ہوئی اور اس کا نام کیا ہے؟“

”فاریا۔“ میریا نے کہا۔ ”یہ ایک ہفتے کی ہے۔ ہنری کو اس کے بارے میں علم نہیں ہے۔“

”حیرت ہے، وہ اب تک تم سے ملتا ہے۔“ اینی نے پھر کہا۔

”وہ میرا شوہر ہے۔“

اینی ہنسی۔ ”جو مہینے میں ایک بار تم سے چوروں کی طرح ملنے آتا ہے؟“

”وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔“ میریا بولی۔ اینا، الزبتھ اور کیتھی، میریا کو ایک طرف لے آئے انہوں نے بچی کو دیکھا۔ اینا نے اسے گود میں لے لیا۔

”بہت پیاری ہے۔“

”سنو، میں ایک دن کے لیے اسے تم لوگوں کے پاس چھوڑ کر جاؤں گی۔“ میریا نے کہا۔ ”کل ہنری مجھ سے ملنے آ رہا ہے۔ میں نے اسے بچی کے بارے میں نہیں بتایا ہے۔“

وہ حیران ہو گئیں۔ ”لیکن کیوں؟“

”کیونکہ اس کی شرط یہی تھی کہ ہماری اولاد نہ ہو، جب میں امید سے ہوئی تو میں نے ممکنہ حد تک اس سے چھپایا، جب اسے پتا چلا تو وہ ناراض ہوا مگر میں نے اسے منا لیا۔ اس نے کہا نہیں لیکن مجھے لگا کہ وہ میرے بچے کو مجھ سے لے کر کہیں دور بھیج دے گا۔ میں اپنی بچی کو خود سے جدا نہیں کر سکتی۔ اس لیے میں اسے یہی بتاؤں گی کہ بچہ مردہ پیدا ہوا تھا۔“

”تم کب تک اس سے چھپاؤ گی؟“

”جب تک ممکن ہوگا۔“ میریا نے کہا۔ ”پلیز! اسے ایک دن کے لیے رکھ لو۔“

”تم فکر مت کرو، ہم اسے سنبھال لیں گے۔“ اینا نے کہا۔ الزبتھ اور کیتھی ہچکچا رہی تھیں لیکن جب اینا نے انہیں آنکھیں دکھائیں تو وہ مان گئیں۔ میریا خوش ہو گئی۔ اس نے فاریا کو پیار کیا اور اپنی شال اوپر کرتے ہوئے بگھی کی طرف بڑھ گئی۔ اس کے بیٹھتے ہی بگھی روانہ ہو گئی۔ اینی قریب آئی اور اس نے بچی کو دیکھا۔

”لو اب تم دھندے کے بجائے اسے سنبھالنا... بیکر بہت خوش ہوگا کہ مستقبل کی ایک اور طوائف آ گئی۔“

”تم اور بیکر دونوں جہنم میں جاؤ۔“ اینا نے غصے سے کہا۔ ”اسے تم نے بتایا تھا کہ میں اسے میری این کا قاتل سمجھ رہی ہوں؟“

اینی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے بجائے اس نے صرف شانے اچکائے۔

☆☆☆

ایلڈر لاش کا معائنہ کر رہا تھا۔ لندن کے سرکاری اسپتال میں قتل کے بعد آنے والی لاشوں کے لیے ایک الگ شعبہ تھا اور ڈاکٹر گورڈن اس کا انچارج تھا۔ دو مہینے سے اس کا نائب کام پر نہیں آیا تھا اور اسے سب اکیلے دیکھنا پڑتا تھا اس لیے وہ جھنجلایا ہوا تھا۔ ایلڈر نے اس سے پوسٹ مارٹم کا پوچھا۔ اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”کیسا پوسٹ مارٹم؟ اس کے اندرونی اعضا پہلے ہی نکالے ہوئے ہیں۔“

ایلڈر چونکا۔ ”اعضائے رئیسہ؟“

”بالکل اور کرنے والے نے اس واحد زخم سے سب

نکال لیا جو اس نے زیریں حصے میں کیا۔"

"اس سے پہلے اس قسم کی کوئی اور لاش آئی ہے؟"

"کبھی نہیں۔"

ایلڈر اور فریڈ اسپتال سے باہر نکلے تو ایلڈر سوچ رہا تھا۔ اس نے فریڈ سے کہا۔ "اس معاملے میں ہمیں کسی سرجن کی مدد لینا ہوگی۔"

"سرجن سے مدد لو یا ملکۂ برطانیہ۔۔۔ سے ہمیں اس معاملے میں جلد کچھ کرنا ہوگا۔ گڑبڑ شروع ہوگئی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

فریڈ نے کوٹ سے لندن ٹائمز کا تازہ شمارہ نکال کر اسے تھما دیا۔ فرنٹ پیج اسٹوری اسی کیس کے بارے میں تھی۔ میری این کی تصویر تک شائع ہوئی تھی۔ رپورٹر کے مطابق یہ عام قتل نہیں تھا بلکہ قاتل نے کسی خاص کیفیت میں یہ قتل کیا تھا۔ زیریں حصے سے اعضا کا نکالنا خاص اشارہ تھا۔ ایلڈر نے منہ بنایا۔ "بکواس۔۔۔ ابھی کسی قسم کا کوئی اشارہ نہیں ملا ہے۔"

"اشارہ تو ہے، یہ دیکھو۔" فریڈ نے اسی صفحے پر ایک آرٹیکل کی طرف اشارہ کیا۔ اس آرٹیکل میں صحافی نے روس اور مشرقی یورپ سے یہودی آباد کاروں کی برطانیہ آمد کو ایک خطرہ قرار دیا تھا۔ صحافی کا کہنا تھا کہ قدامت پرست یہودی آباد کار لندن کے کھلے معاشرے کو پسند نہیں کریں گے۔ خاص کر مرد اور عورت کے آزادانہ اختلاط کے بارے میں ان کے سخت نظریات برطانوی معاشرے میں بے چینی کا سبب بن سکتے تھے۔"

"بکواس، یہودی یا کسی کمیونٹی کا اس قتل سے کوئی تعلق ثابت نہیں ہوا۔ ابھی تو کیس کی تفتیش جاری ہے۔"

"تم جانتے ہو پریس کیا قوت رکھتا ہے۔۔۔ وہ تاج برطانیہ سے لے کر جیٹی پر کام کرنے والے مزدور تک کو قائل کر سکتا ہے۔ اس سے پہلے کہ افواہیں فساد کا موجب بنیں، ہمیں کچھ کرنا ہوگا۔"

"فساد روکنا ہمارا کام نہیں ہے۔ ہمارا کام قتل کی تفتیش کرنا ہے۔" ایلڈر نے بگھی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کہاں جانا ہے؟"

"وہیں جہاں قتل ہوا ہے۔" ایلڈر نے کہا۔

"تب مجھے دفتر اتار دو۔ ابھی مجھے چیف کانسٹیبل کو رپورٹ دینی ہے۔"

"اسے ایک معمولی طوائف کے قتل سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟"

فریڈ نے شانے اچکائے۔ "کیا کہا جا سکتا ہے؟"

☆☆☆

لندن کالج آف سرجری لیکچر ہال میں ڈاکٹر سرجن ڈاکٹر ایڈورڈ رچرڈ لیکچر دے رہا تھا۔ تقریباً ستر سالہ ڈاکٹر رچرڈ کا شمار برطانیہ کے قابل ترین سرجنوں میں ہوتا تھا۔ دبلا اور نحیف جسم کا ڈاکٹر ایڈورڈ اپنے شعبے کا سربراہ تھا۔ لیکچر کے بعد وہ اپنے شاگردوں اور رفقا کے ہمراہ باہر نکلا تھا کہ اسے سامنے سے اسمتھ گزرتا دکھائی دیا۔ اس نے آواز دی۔

"ڈاکٹر اسمتھ۔"

"سر رچرڈ۔" اس نے کہا اور تیزی سے آگے آیا۔ "کیا آپ آج کی میٹنگ میں شرکت کریں گے؟"

"میں بھی تم سے یہی پوچھنے والا تھا۔"

اسمتھ جھکا اور آگے چلا گیا۔ اسی لمحے کسی نے عقب سے ڈاکٹر ایڈورڈ کو آواز دی۔ "سر رچرڈ۔"

اس نے مڑ کر دیکھا۔ ایلڈر اس کی طرف آرہا تھا۔ اس نے پاس آکر تعارف کرایا اور بولا۔ "سر رچرڈ! مجھے آپ سے اکیلے میں بات کرنی ہے۔"

ڈاکٹر ایڈورڈ اسے اپنے عالی شان دفتر میں لے آیا۔ "کہو انسپکٹر، میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

ایلڈر نے میری این کا کیس اس کے سامنے رکھا۔ ڈاکٹر ایڈورڈ غور سے سن رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "انسپکٹر میں اس معاملے میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

"مجھے شبہ ہے قتل کرنے والا نہ صرف سرجری جانتا ہے بلکہ اس کے پاس سرجری کے مخصوص آلات بھی ہیں۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ ایک بار لاش کا معائنہ کر لیں اور میرے شک کی تصدیق کر دیں۔"

ڈاکٹر ایڈورڈ سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے کہا۔ "ویل انسپکٹر! مجھے ذاتی طور پر کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن میں اس شعبے کے سربراہ کی حیثیت سے یہ کام نہیں کر سکتا۔۔۔ کم سے کم سرکاری حیثیت میں۔۔۔ تم سمجھ رہے ہو نا؟"

"بالکل۔" ایلڈر نے سر ہلایا۔ "یہ معائنہ بالکل غیر سرکاری ہوگا اور میری رپورٹ میں اس کا ذکر نہیں آئے گا۔"

"تب مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" ڈاکٹر ایڈورڈ خوش ہو گیا۔

"اگر آپ کے پاس وقت ہے تو ابھی دیکھ لیجیے۔ لاش یہاں سے صرف تین سو گز کی دوری پر ہے۔"

"کیوں نہیں۔" ڈاکٹر ایڈورڈ کھڑا ہو گیا۔ آدھے

گھنٹے بعد وہ دوبارہ اسی کمرے میں تھے اور ڈاکٹر ایڈورڈ پہلے سے زیادہ سنجیدہ تھا۔ اس نے کہا۔ "انسپکٹر! میں تمہاری قوت مشاہدہ کی داد دوں گا۔ یہ سچ مچ کسی ایسے شخص کا کام ہے جو سرجن یا کم سے کم سرجری میں دسترس رکھتا ہے۔ اس کے پاس تمام اوزار بھی ہیں۔" ڈاکٹر ایڈورڈ نے کہتے ہوئے اپنا اوزاروں والا بیگ کھولا۔ یہ بہت نفیس سرخ چمڑے سے بنا ہوا تھا اور اس پر تالا بھی تھا۔ بیگ دو حصوں میں تقسیم ہوا، اس میں دونوں طرف مخصوص خانوں میں سرجری کے اوزار رکھے تھے۔ اس نے اندر سے ایک کسی قدر موٹا لیکن بیک وقت نوک اور دھار رکھنے والا چاقو نکالا۔ "عورت کا گلا اس سے کاٹا گیا ہے۔ یہ وزنی اور غیر لچک دار آلہ ہے جو ایک ہی بار میں گوشت کو گہرائی تک کاٹ سکتا ہے اور دونوں طرف سے یکساں کاٹتا ہے۔ قاتل نے اسی کی مدد سے عورت کا گلا دو بار کاٹا ہے۔" اس نے کہتے ہوئے چاقو واپس بیگ میں بنے اس کے مخصوص خانے میں رکھا اور پھر ایک طویل دھار والا اور پیچھے سے کند چاقو نکالا۔ "اس کی مدد سے اس نے نچلے حصے کو کاٹ کر اندر سے اعضا نکالے ہیں۔" اس نے چاقو ایلڈر کو تھما دیا۔ پھر ایک پلاس نما آلہ اٹھایا۔ "اس کی مدد سے اندرونی اعضا نکالے جاتے ہیں۔ بغیر ہاتھ سے چھوئے۔"

ایلڈر متاثر ہوا تھا۔ اس نے سر ہلایا۔ "اب میں سمجھ گیا کہ قاتل نے کیا کیا ہوگا۔"

"قاتل کا کوئی نشان ملا؟" ڈاکٹر ایڈورڈ نے اپنا بکس بند کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں، ابھی تفتیش جاری ہے۔" ایلڈر نے اپنا ہیٹ سر پر رکھا۔ "سر رچرڈ! میں اس مدد پر آپ کا شکر گزار ہوں۔"

☆☆☆

میریا ہنری کے شانے پر سر رکھے لیٹی تھی۔ ہنری تقریباً تیس برس کا خوش رو اور اوپری طبقے کا نظر آنے والا جوان شخص تھا۔ اس کے صاف ستھرے ہاتھ اور جسم کی نرمی بتا رہی تھی کہ وہ محنت کرنے کا عادی نہیں۔ ڈیڑھ سال پہلے میریا سے اس کی اتفاقی ملاقات ہوئی تھی۔ جلد ہی ملاقات محبت میں بدل گئی۔ پھر ہنری نے میریا کو شادی کی پیشکش کی تو اسے یقین نہیں آیا۔ وہ سمجھتی تھی کہ ہمیشہ وائٹ چیپل کی گلیوں میں پھرتی رہے گی اور چند شلنگ کے عوض لوگوں کا دل بہلاتی رہے گی۔ جب اسے یقین آیا تو وہ دل و جان سے راضی ہو گئی۔ حالانکہ وہ ہنری کے بارے میں صرف اتنا جانتی تھی کہ اس کا نام ہنری ہے اور وہ کسی اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ ہنری نے میریا کو شادی کے بعد ایک چھوٹا لیکن بہت خوب صورت مکان لے کر دیا۔ اس نے پہلے ہی میریا کو بتا دیا تھا کہ وہ اپنے خاندان سے چھپ کر شادی کر رہا ہے اس لیے یہ شادی ہمیشہ خفیہ رہے گی۔ میریا اس پر بھی تیار تھی، اسے صرف ہنری اور اس کی محبت سے غرض تھی۔

ہنری کی دوسری شرط یہ تھی کہ ان کے ہاں بچہ نہیں ہوگا۔ میریا مان گئی لیکن اس میں ماں بننے کی شدید خواہش تھی۔ جب وہ امید سے ہوئی تو اس نے ہنری سے چھپایا۔ حتیٰ کہ بات چھپانا ممکن نہیں رہا۔ ہنری اس سے ناراض ہوا تھا۔ وہ مہینے میں ایک یا دو بار اس سے ملنے آتا تھا مگر یہ خبر سن کر وہ پورے چالیس دن تک نہیں آیا پھر وہ نارمل ہو گیا۔ البتہ اس کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ پیدائش کے بعد بچہ میریا سے لے کر کہیں اور بھیج دیا جائے گا اور میریا اپنا بچہ دینے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھی۔ ہنری کی آمد کا سن کر اس نے بچہ اپنی ساتھیوں کے پاس رکھوا دیا اور جب ہنری آیا تو اسے بتایا کہ بچہ مردہ پیدا ہوا تھا۔ یہ سن کر ہنری نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ خوش تھا کہ اس کا ان چاہا بچہ اس دنیا میں آیا ہی نہیں۔ آج چھتیس گھنٹے پورے ہو رہے تھے۔ ہنری کی بانہوں میں لیٹی میریا سوچ رہی تھی کہ اس کے جاتے ہی جا کر فاریا کو لے آئے گی۔ اسے اپنی بیٹی بہت یاد آرہی تھی۔ وہ کبھی اس کی بانہوں سے دور نہیں ہوئی تھی۔ میریا کی دادی فرانسیسی تھی اور اس نے اسی کے نام پر اپنی بیٹی کا نام فاریا رکھا تھا۔ ہنری اس کے بال سہلا رہا تھا۔ اچانک اس نے کہا۔

"تمہارے لیے ایک اچھی خبر ہے۔ میں آج کا دن اور رات۔۔۔ رکوں گا۔"

☆☆☆

اینا اور کیتھی بچی کو سنبھال رہی تھیں۔ الزبتھ اور کیتھی ایک چھوٹی سی کوٹھری میں رہتی تھیں لیکن انہیں کسی تیسرے فرد کو وہاں لانے کی اجازت نہیں تھی۔ طے ہوا تھا کہ اینا فاریا کے ساتھ ایک رات ان کی کوٹھری میں رہے گی۔ مگر اینا یہ سوچ کر پریشان ہوگئی کہ اگر فاریا روئی تو کوٹھری کا مالک سن لے گا اور وہ اسے اور بچی کو باہر نکال دے گا۔ گزشتہ کئی دن سے جاری بارش کی وجہ سے رات میں موسم بہت زیادہ سرد ہو جاتا تھا۔ الزبتھ نے اسے تسلی دی۔ اس نے کہا۔ "تم فکر مت کرو، ہم اسے دودھ کے ساتھ تھوڑی سی افیم دے دیں گے اور یہ ساری رات آرام سے سوتی رہے گی۔"

''اقیم۔'' اینا نے فکر سے کہا۔ ''یہ بچی ہے کہیں یہ اس کے لیے...''

''میں دو بار ماں بن چکی ہوں۔'' الزبتھ نے کہا۔ ''مجھے تجربہ ہے۔''

اینا دن میں ہی ان کی کوٹھری میں آگئی تھی کیونکہ رات میں ان کوٹھریوں کا مالک خود پہرا دیتا تھا کہ رات کے وقت دوسرے لوگ تو نہیں آرہے ہیں۔ وہ نہایت خبیث شخص تھا۔ وہ بدزبان اور ہاتھ چھوٹ تھا۔ اس کے احاطے کی بیشتر کوٹھریاں طوائفوں کے پاس تھیں اور وہ اس سے بہت ڈرتی تھیں۔ اسے بچوں سے خاص چڑ تھی۔ اگر کوئی عورت ماں بن جاتی تو وہ اسے بے دخل کرنے میں ایک دن کی تاخیر نہیں کرتا تھا۔ الزبتھ کی ترکیب کام آئی اور فاریا سکون سے ساری رات سوتی رہی۔ صبح وہ میریا کی منتظر تھیں کہ وہ اپنی بچی لینے آئے گی مگر میریا نہیں آئی۔ سارا دن گزر گیا۔ وہ بچی سنبھالتی رہیں۔ وہ اس کی خوراک اور صفائی ستھرائی کا پورا خیال رکھ رہی تھیں مگر مشکل سے ایک ہفتے کی بچی کو مستقل سنبھالنا ان کے لیے مشکل تھا۔ خاص طور سے اس صورت میں جب وہ اسے رکھ بھی نہیں سکتی تھیں۔

سارا دن گزر گیا اور میریا نہیں آئی۔ شام کو سب عورتیں دھندے پر نکل گئیں۔ اینا بچی کو بہلا رہی تھی جو بے چین تھی اور رو رہی تھی۔ وہ اسے لے کر گلیوں میں ٹہلتی رہی۔ سردی سے بچانے کے لیے وہ اسے سینے سے لگا رہی تھی۔ الزبتھ اور کیتھی رات گئے واپس آئیں اور جب وہ بچی لے کر اندر لے جانے لگیں تو کوٹھریوں کے مالک نے انہیں اندر جانے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ یہ رات انہوں نے احاطے کے میدان میں آگ کے سامنے ٹھٹھرتے گزاری۔ بچی کو سردی سے بچانے کے لیے وہ اس کے گرد جمع تھیں۔ صبح ہوتے ہی اینا نے الزبتھ سے کہا۔ ''شاید میریا کے ساتھ کوئی مسئلہ ہو گیا ہے۔ ہمیں خود جانا ہو گا بچی کو اس کے سپرد کرنے۔ ہم اس سے زیادہ نہیں سنبھال سکتے۔''

الزبتھ نے اس سے اتفاق کیا۔ ''میں نے اس کا گھر دیکھا ہوا ہے۔''

وہ روشنی ہوتے ہی روانہ ہو گئیں۔ لیکن جب وہ میریا کے گھر کے سامنے پہنچیں تو وہاں دو بگھیاں کھڑی تھیں اور کوئی نصف درجن افراد جمع تھے۔ ان سب نے سیاہ سوٹ پہن رکھے تھے۔ وہ دونوں مکان کے کونے پر رک گئیں۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' اینا نے کہا۔

اسی لمحے اندر سے تین افراد ہنری کو لیے نکلے۔ وہ ان کی گرفت میں مچل رہا تھا اور اس کے جسم پر صرف ایک نیکر تھی۔ انہوں نے اسے ایک بگھی میں ڈالا اور فوراً ہی بگھی وہاں سے روانہ ہو گئی۔ مشکل سے ایک منٹ بعد ایک تنومند شخص میریا کو شانے پر ڈالے باہر آیا۔ اس کے جسم پر صرف ایک چھوٹی سی چادر لپٹی ہوئی تھی۔ وہ بھی مچل رہی تھی اور خود کو آزاد کرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ دونوں میاں بیوی کو ان کے بیڈ روم سے زبردستی لایا گیا ہے۔ تنومند آدمی نے میریا کو دوسری بگھی میں ڈالا۔ کچھ لوگ پہلی بگھی میں گئے تھے اور باقی میریا کے ساتھ اس بگھی میں سوار ہو گئے۔ چند لمحے بعد وہاں کوئی نہیں رہا، سوائے ان دونوں کے جو حیران و پریشان کھڑی تھیں۔ بالآخر الزبتھ نے کہا۔ ''اب کیا ہو گا... اس بچی کا؟''

☆☆☆

میری این نکول کے قتل کے آٹھ دن بعد سب معمول پر آچکا تھا۔ وہ سب دھندے پر آگئی تھیں۔ بیکر نے انہیں وارننگ دی تھی کہ اگر اسے کم رقم ملی تو یہ کمی انہیں اپنے حصے سے پوری کرنی پڑے گی۔ چاہے اس کے لیے انہیں فاقے کیوں نہ کرنے پڑیں۔ اینی غصے میں تھی۔ وہ دبی زبان میں بیکر کو بے نقط سنا رہی تھی کیونکہ گزشتہ روز اسے صرف ایک گاہک ملا تھا اور جب اس نے اینی کو معاوضہ دیا تو بیکر آن دھمکا اور اس نے اینی سے ساری رقم چھین لی۔ اب اس کے پاس کچھ نہیں تھا اور اسے رقم کی اشد ضرورت تھی۔ وہ سرِ شام ہی اپنی مخصوص گلی میں آگئی جبکہ اس کی کوئی ساتھی نہیں پہنچی تھی۔ ساڑھے پانچ بجے ایک مقامی شخص میڈس کارل نے اینی کو آخری بار دیکھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ گہرے رنگ کے بالوں والے کسی شخص کے ساتھ تھی۔ آدمی بھاری بھرکم اور اس نے بہت قیمتی کوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کے آدھے گھنٹے بعد اینی کی لاش ایک مکان کے عقبی صحن تک آنے والی گلی میں پائی گئی۔ قاتل نے اس کا بھی گلا کاٹ دیا تھا اور زیریں حصے کو چیر پھاڑ کر اندرونی اعضا نکال لیے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اینی کا گلا ایک ہی وار میں کاٹ دیا گیا تھا۔

لاش قتل کے فوراً بعد دریافت ہو گئی تھی۔ گھروں میں کوئلہ سپلائی کرنے والے لڑکے نے سب سے پہلے لاش دیکھی۔ اس نے پولیس کو اطلاع دی اور جب ایبلڈر، فریڈ کے ہمراہ وہاں پہنچا تو پریس والے پہلے ہی لاش کی تصویریں لے چکے تھے۔ ایبلڈر نے لاش کی طرف جاتے ہوئے اہلِ محلہ کا ایک ہجوم دیکھا۔ وہ لاش کی طرف آنے کی

کوشش کر رہے تھے لیکن کانسٹیبل انہیں روک رہے تھے۔ ایبلڈر نے لاش دیکھی اور اسے یاد آگیا۔ یہ وہی عورت تھی جو میری کی لاش دریافت ہونے کے بعد ہجوم کے ساتھ موجود تھی۔ اس کے ساتھ کچھ اور عورتیں بھی تھیں۔ ڈیوٹی پر موجود کانسٹیبل نے بتایا۔ ''یہ اینی ہے، ایک طوائف... اور انہی گلیوں میں دھندا کرتی تھی۔''

ایبلڈر نے لاش کا معائنہ کیا اور اس نے محسوس کر لیا کہ یہ اسی قاتل کا کام ہے جس نے میری کو قتل کیا تھا۔ گلا بالکل اسی انداز میں کٹا ہوا تھا۔ زخم نصف انچ سے زیادہ گہرا نہیں تھا لیکن اس نے تینوں نسیں کاٹ دی تھیں۔ عورت کو مرنے میں دو منٹ سے زیادہ وقت نہیں لگا ہو گا۔ سر کے آس پاس خون پھیلا ہوا تھا۔ کانسٹیبل چادریں لے آئے تھے۔ یہاں چھپانا آسان نہیں تھا کیونکہ اس چھوٹی سی گلی اور احاطے کے چاروں طرف مکان ہی مکان تھے اور ہر کھڑکی سے انسانی چہرے جھانک رہے تھے۔ پریس فوٹوگرافرز نے چھتوں پر پوزیشن سنبھال رکھی تھی۔ پھر بھی چادروں سے ممکنہ حد تک چھپانے کے بعد ایبلڈر نے اینی کا اسکرٹ اوپر کیا اور گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اگر کوئی شبہ تھا تو اب وہ بھی باقی نہیں رہا۔ اس نے فریڈ کی طرف دیکھا۔ ''یہ اسی کا کام ہے۔''

ایبلڈر اب زخموں کے بجائے لاش کو ٹٹول کر دیکھ رہا تھا۔ اسے کسی ایسے کلیو کی تلاش تھی جو قاتل تک راہنمائی کرتا۔ اینی کا دایاں ہاتھ اس کی فراک تلے دبا ہوا تھا۔ ایبلڈر نے اسے نکالا تو اس میں کوئی چیز دبی دکھائی دی۔ اس نے مٹھی کھولی تو اس میں انگور کے ایک خوشے کی خالی شاخ دبی تھی۔ اس نے شاخ اٹھا کر دیکھی۔ یہ نایاب اور مہنگے سرخ انگور تھے جو اسپین سے آتے تھے۔ ایبلڈر نے اینی کے ہونٹوں پر ایک انگلی پھیری اور اسے سونگھ کر دیکھا۔ انگور کی مہک واضح تھی۔ اس نے فریڈ کی طرف دیکھا۔ ''اس نے مرنے سے کچھ پہلے یہ خوشہ کھایا تھا۔''

فریڈ نے توجہ نہیں دی۔ وہ پہلے سے زیادہ فکر مند تھا۔ اسے فکر مرنے والی طوائف کی نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس طرح کے اندھے قتل بالآخر لندن کی مختلف کمیونیٹیز اور طبقات کے درمیان دشمنی نکالنے کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ الزامات لگتے ہیں اور لوگ قانون اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں۔ اس بار بھی جہاں قتل ہوا تھا، وہ یہودیوں کا علاقہ تھا۔ دن بھر کاروبار اور دوسرے کاموں میں مصروف یہودی شام ہوتے ہی اپنے گھروں میں مقید ہو جاتے تھے۔ وہ ایک معاشی قوت ضرور بنے تھے لیکن ابھی تک وہ لندن کی سوشل زندگی کا حصہ نہیں بنے تھے۔ حد یہ کہ وہ فری میسن کی سرگرمیوں سے بھی دور تھے حالانکہ فری میسن یہودی دماغوں کی بنائی ہوئی تنظیم تھی اور ملکہ وکٹوریا کے دور میں اسے برطانیہ، خاص طور سے لندن میں بہت عروج حاصل ہوا تھا۔ معائنے کے بعد ایبلڈر نے لاش اٹھوا دی۔

گزشتہ روز ہی میری کی لاش دفن کی گئی تھی۔ اس کی تدفین سرکار کی طرف سے ہوئی تھی۔ اس موقع پر اس کی ساتھی عورتیں بھی موجود تھیں لیکن انہوں نے انسپکٹر ایبلڈر سے بات یا تعاون کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ خاص طور سے اینی نے انہیں خوب سنائی تھیں۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر قاتل نہیں پکڑا گیا تو جلد وہ پھر کسی کو شکار بنائے گا۔ یقیناً یہ کہتے ہوئے اینی نے نہیں سوچا تھا کہ اگلا شکار وہ خود ہو گی۔ فریڈ نے مضطرب لہجے میں کہا۔ ''پلیز کچھ کرو۔ لگ رہا ہے کوئی سیریل کلر متحرک ہو گیا ہے۔ ابھی اور طوائفیں ماری جائیں گی۔''

''میں کیا کر سکتا ہوں۔ میرے پاس کوئی جادو کی چھڑی نہیں ہے۔'' ایبلڈر نے جواب دیا۔ ''قاتل بہت چالاک اور مکار آدمی ہے۔ اس نے اپنا کوئی نشان نہیں چھوڑا ہے۔''

☆☆☆

میریا کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور اس کے ہاتھ پاؤں چار افراد نے پکڑ رکھے تھے۔ وہ گزشتہ چوبیس گھنٹے سے کسی اجنبی جگہ قید تھی۔ اس کے جسم پر وہی چادر تھی۔ اچانک چار افراد اس کمرے میں گھس آئے۔ انہوں نے اسے قابو کیا اور اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔ پھر وہ اسے اٹھا کر کہیں لائے اور کسی دھاتی تختے پر لٹا دیا۔ فوراً ہی اس کے منہ پر لکڑی کا بنا ہوا چھوٹا سا فٹ کر دیا گیا جس کے درمیان میں جالی دار کپڑے کی تہیں لگی تھیں۔ کسی نے کپڑے پر بوتل سے ہلکا سا کلوروفارم ٹپکایا۔ میریا نے چند سانسیں لیں اور وہ بے ہوش ہو گئی۔ اس کے بے ہوش جسم پر چادر ڈال دی گئی۔ یہ دھات کا بنا پہیوں والا اسٹریچر تھا۔ ایک آدمی اسے دھکیلتا ہوا ایک ہال میں لایا جس کے چاروں طرف کئی منزلہ گیلریاں تھیں اور ہال میں چاروں طرف نشستیں لگی تھیں جن پر لوگ بیٹھے تھے۔ گیلریوں میں بھی لوگ جمع تھے اور ایک کمرے میں شیشے کی کھڑکی کے پیچھے ڈاکٹر ایڈورڈ اور سرجن کالج کے دوسرے پروفیسر جمع تھے۔ ہال کے وسط میں اسٹیج موجود تھا۔

''بھائیو!'' ڈاکٹر ایڈورڈ نے بلند آواز سے کہا۔

''آج ہمارے قابلِ فخر سرجن ڈاکٹر اسمتھ آپ کو دماغی بیماریوں میں مبتلا مریضوں کے علاج کے لیے ایک نئے طریقے کا مظاہرہ کر کے دکھائیں گے۔ اس میں مریض کے ماتھے اور کن پٹیوں پر چھینی اور ہتھوڑے کی مدد سے ضربیں لگائی جاتی ہیں۔ یہ خاتون دماغی خلل میں مبتلا ہے۔ جب اسے دورہ پڑتا ہے تو یہ خطرناک ہوجاتی ہے۔''

اسمتھ نے اسٹیل کی چھینی اور ہتھوڑا اٹھایا۔ اس کا دایاں ہاتھ کانپ رہا تھا۔ اس کی وجہ اضطراب نہیں تھا۔ اس کی وجہ اس کے دماغ میں چھپا ہوا مرض تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اچھا سرجن ہونے کے باوجود نارمل سرجری نہیں کرسکتا تھا۔ مگر وہ سرجری کے تجربات ضرور کرتا تھا۔ اس نے چھینی میریا کے ماتھے پر رکھی اور مخصوص قوت سے ضرب لگائی۔ ڈاکٹر ایڈورڈ نے کہا۔ ''شاندار... اب بائیں طرف۔''

بولیور نے اب چھینی دائیں کنپٹی پر رکھی اور اتنی ہی قوت سے ضرب لگائی اور آخر میں اس نے بائیں کنپٹی پر ضرب لگائی۔ ذرا دیر میں اس کا چہرہ پسینے میں شرابور ہوگیا۔

☆☆☆

ایبی کی تدفین کی جارہی تھی۔ اس بار ایلڈر قبرستان میں اکیلا موجود تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ اس بار عورتیں زیادہ دکھی اور ہراساں تھیں۔ ان عورتوں کے علاوہ چند سرکاری اہلکار اور ایک پادری بھی تھا۔ دعا کی گئی اور اس کے بعد ایبی کا تابوت زمین میں اتار دیا گیا۔ جب قبر بند ہوگئی تو وہ سب وہاں سے روانہ ہوگئے۔ اینا، الزبتھ اور کیتھی ایک ساتھ باہر جانے لگیں۔ ایلڈر آگے آیا اور اس نے انہیں آواز دی۔ ''لیڈیز۔''

وہ تینوں رک گئیں۔ پھر کیتھی نے برا سا منہ بنایا اور آگے بڑھ گئی۔ الزبتھ نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ مگر اینا رکی رہی۔ اس کے چہرے پر غصہ تھا۔ ایلڈر اس کے پاس آیا تو وہ اس پر برس پڑی۔ ایلڈر خاموشی سے سنتا اور سگریٹ پیتا رہا۔ بالآخر اینا کو احساس ہوا کہ وہی بولے جارہی ہے اور ایلڈر نے ایک لفظ نہیں کہا۔ اس نے کہا۔ ''تم کیا چاہتے ہو؟''

''تم سے کچھ بات کرنا۔''

''کیا اس سے قاتل پکڑا جائے گا؟'' اینا کا لہجہ زہریلا ہوگیا۔

''امید تو ہے۔'' ایلڈر نے نرمی سے کہا۔ پہلی بار اینا کے تاثرات نرم ہوئے۔

''مجھے امید نہیں ہے۔ وہ اتنا دیدہ دلیر ہے کہ گلیوں میں کام کر جاتا ہے۔''

ایلڈر نے نیا سگریٹ سلگایا۔ ''تم جانتی ہو... وائٹ چیپل کے علاقے میں بارہ سو عورتیں پیشہ کرتی ہیں۔''

''مجھ سے بہتر کون جان سکتا ہے۔'' وہ بولی۔ ''میں بھی ان میں سے ایک ہوں۔ کیا مجھے ایک سگریٹ مل سکتی ہے؟''

ایلڈر نے ایک سگریٹ اسے دیا اور پھر ماچس سے اسے جلایا۔ ''یہ بات قاتل بھی جانتا ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ وہ باقی سب عورتوں کو چھوڑ کر تمہارے گروپ کے پیچھے پڑا ہے؟''

سگریٹ کا کش لیتے ہوئے اینا کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ اس نے ہکلا کر کہا۔ ''تت... تمہارا مطلب ہے وہ ہمارے گروپ کی عورتوں کو قتل کر رہا ہے؟''

''سامنے کی بات ہے۔''

''نہیں، یہ اتفاق ہے۔''

''یہ اتفاق نہیں ہے۔'' ایلڈر نے نرمی سے کہا۔ اس نے بچ جانے والی سگریٹ پھینک کر اس پر جوتا رکھ دیا۔ ''دو عورتیں ماری گئیں اور ایک ہی انداز میں... یہ اتفاق نہیں ہوسکتا۔''

اینا کا چہرہ مزید سفید پڑ گیا۔ ''اب ہماری باری ہے؟''

''بدقسمتی سے میرا اندازہ یہی ہے۔''

''آخر وہ کیوں ہمارے پیچھے پڑ گیا ہے؟''

''یہی ہمیں جاننا ہے اور پھر اسے روکنا ہے۔''

''میں نہیں جانتی۔'' اینا نے نفی میں سر ہلایا۔

''تم میرے کچھ سوالوں کے جواب دو گی؟''

اینا ہچکچائی۔ ''کیسے سوالات؟''

''تمہارا تعلق کہاں سے ہے؟''

''اسکاٹ لینڈ۔''

''لندن میں کب سے ہو؟'' ایلڈر نے اپنی نوٹ بک نکال لی تھی۔

''تین سال ہوگئے ہیں۔''

''تم میں الزبتھ سب سے پرانی ہے۔ تم شروع سے اس کے ساتھ ہو؟''

اینا نے سر ہلایا۔ ''اسی نے مجھے کام دلایا تھا۔ وہ بہت اچھی ہے۔ اصل میں یہ گروپ اسی نے بنایا تھا۔''

''کیتھی، ایبی، میری...؟''

''یہ سب مجھ سے پہلے کی ہیں۔''

''ان کے علاوہ اور کوئی عورت جو کبھی اس گروپ کا حصہ تھی؟''

اس سوال کا جواب دیتے ہوئے اینا ہچکچائی پھر اس نے سر ہلایا۔ ''میریا تھی، پھر اس نے شادی کرلی اور پیشہ چھوڑ دیا۔''

''کس سے شادی کی اور اب کہاں ہے؟''

اینا نے سوچا اور نفی میں سر ہلایا۔ ''اس نے ہنری نامی شخص سے شادی کی تھی، اس بات کو ایک سال سے زیادہ وقت گزر چکا ہے لیکن وہ کہاں ہے، میں نہیں جانتی۔''

ایلڈر نے پرخیال نظروں سے اسے دیکھا۔ ''واقعی... تم اس سے ناواقف ہو؟''

اینا نے اس سے نظریں چرائیں۔ ''ہاں... اب میں جاؤں گی، میری ساتھی باہر انتظار کر رہی ہیں۔''

اینا جانے لگی۔ ایلڈر اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی تب ایلڈر کو پہلی بار خیال آیا کہ وہ صورت میں اس کی بیوی، ریناسے بہت ملتی تھی۔

☆☆☆

پتھر سے بنی اس عمارت کے سب سے اندرونی حصے کے ہال میں ایک کرسی پر ہنری اس حالت میں بندھا بیٹھا تھا کہ اس کی آنکھوں پر پٹی تھی اور جسم پر ایک معمولی پینٹ اور شرٹ۔ اس کے سامنے ایک شخص جج والی میزن کے پیچھے موجود تھا۔ مصنوعی وگ لگائے ایک شخص ہنری کی طرف آیا اور نرم لہجے میں بولا۔ ''برادر! تم پر الزام ہے تم نے خداوند کے احکام کی خلاف ورزی کی... تم نے ایک طوائف سے شادی کی۔''

''وہ طوائف تھی۔ اب وہ طوائف نہیں ہے۔'' ہنری نے بے چینی سے کہا۔

''لیکن وہ اب بھی اپنی ساتھیوں سے ملتی ہے۔ چند روز پہلے وہ اس احاطے میں دیکھی گئی جہاں اس کی ساتھی عورتیں رہتی ہیں۔''

''ایسا نہیں ہوسکتا۔'' ہنری نے بے یقینی سے کہا۔ ''میریا مجھ سے چھپا کر کوئی کام نہیں کرسکتی۔''

''اس نے کیا ہے۔ وہ تمہارے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ وہ بچہ کہاں ہے؟''

''بچہ مردہ پیدا ہوا تھا۔'' ہنری نے جواب دیا۔

''یہ بھی غلط ہے، وہ بچہ زندہ ہے اور میریا اس بچے کے ہمراہ طوائفوں کے احاطے میں دیکھی گئی۔ وہ بچہ کہاں ہے؟''

''اگر وہ بچہ زندہ ہے تو میریا ہی جانتی ہے کہ وہ کہاں ہے؟''

''بدقسمتی سے وہ بتانے کی پوزیشن میں نہیں ہے کہ بچہ کہاں ہے۔ وہ اپنے ہوش و حواس ہمیشہ کے لیے کھو چکی ہے۔''

''ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟ وہ بالکل ٹھیک تھی۔''

''اسے سزا دی گئی ہے تم سے شادی کرنے پر۔''

ہنری گھبرا گیا۔ ''میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نہیں جانتا تھا کہ شادی کر کے میں تنظیم کے کسی قانون کی خلاف ورزی کر رہا ہوں۔ اگر ایسا ہے تو میں غیر مشروط غلطی کا اقرار کرتا ہوں اور خود کو عدالت کے رحم و کرم پر چھوڑتا ہوں۔''

سوالات کرنے والے آدمی نے پلٹ کر جج کی طرف دیکھا تو اس نے سر کو جنبش دی اور بلند آواز سے بولا۔ ''برادر ہنری نے خود کو عدالت کے رحم و کرم پر چھوڑا ہے اس لیے عدالت اسے بری کرتی ہے لیکن اب اسے میریا کو ہمیشہ کے لیے بھول جانا ہوگا۔''

''میرے لیے برادری سب سے اہم ہے۔'' ہنری نے کہا۔ ''میریا برادری کے سامنے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔''

سوالات کرنے والے نے ہنری کی آنکھوں سے پٹی ہٹا دی اور اس کے ہاتھ کھول دیے۔ ''اب تم آزاد ہو برادر۔''

چاروں طرف موجود بے شمار افراد تالیاں بجانے لگے۔ ہنری خوشی اور اطمینان کے ساتھ چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

اینا ایک دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی تھی۔ یہاں روشنی کم تھی مگر سامنے جاری چہل پہل کی آوازیں اور بیکر کے قہوہ خانے کے باہر جلنے والی روشنی یہاں تک آرہی تھی۔ اچانک ایک بگھی آ کر رکی اور اس کے جوان کوچوان نے اتر کر آس پاس دیکھا اور پھر اینا کی طرف آیا۔ اس نے غور سے اسے دیکھا۔ وہ اینا کو جانا پہچانا لگا تھا۔ شاید وہ اکثر یہاں آتا رہتا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''میرے ماسٹر کو کسی مناسب ساتھی کی تلاش ہے۔''

بگھی شاندار تھی اور اس کے آگے دو قیمتی سیاہ گھوڑے تھے یقیناً بگھی کا مالک اور نوجوان کا ماسٹر دولت مند تھا لیکن اینا نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہ ساتھی میں نہیں ہوسکتی۔''

نوجوان نے اصرار کیا۔ ''تم ضرورت مند ہو، یقین

کرو میرا استر بہت سخت ہے۔"

"وہ عورتیں اس کی سخاوت کی منتظر ہیں۔" اینا نے اشارہ کیا اور آگے بڑھ گئی۔ نوجوان کے چہرے پر سختی نظر آئی۔ ایک لمحے کو لگا وہ اینا پر جھپٹ پڑے گا مگر پھر وہاں جاری چہل پہل نے اسے باز رکھا۔ وہ بگھی کی طرف بڑھ گیا۔ اینا فٹ پاتھ پر چلتی ہوئی اور وہاں موجود تماش بینوں کے جملے نظر انداز کر کے آگے جا رہی تھی۔ اس کے پیٹ میں بھوک سے بل پڑ رہے تھے۔ اس نے گزشتہ تیس گھنٹے سے کچھ نہیں کھایا تھا کیونکہ اپنی ساری جمع پونجی وہ اس دارالاطفال کو دے چکی تھی جہاں اس نے فاریا کو رکھوایا تھا۔ ایک ہفتے سے اس نے کوئی کام نہیں کیا تھا اور اپنی آخری رقم سے اس نے آخری کھانا کھا لیا تھا، اس کے باوجود اس نے نوجوان سے انکار کر دیا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ وہ کیا سوچ کر اس گند میں اتری تھی۔ اس سے تو بہتر تھا کہ وہ اپنے گاؤں واپس چلی جاتی۔ وہاں بھوک یا وبا سے مر جاتی۔ یہ اس زندگی سے بہتر ہوتا جو وہ گزار رہی تھی۔ ایک تاریک گلی کے پاس سے گزرتے ہوئے کوئی اچانک اس کے سامنے آیا تو اس کے منہ سے چیخ نکلنے لگی لیکن آنے والے نے بروقت اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"آرام سے، یہ میں ہوں۔" ایلڈر نے کہا۔

"انسپکٹر۔" اینا نے اپنا بے ترتیب ہو جانے والا سانس سنبھالتے ہوئے کہا۔ "تم نے مجھے ڈرا دیا... کیا تم میرا پیچھا کر رہے تھے؟"

"نہیں، میں اتفاق سے یہاں سے گزر رہا تھا۔ میں نے تمہیں دیکھا تو مجھے لگا تمہیں میری مدد کی ضرورت ہے۔"

"نہیں، مجھے کسی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔" اینا نے کہا اور آگے بڑھی تھی کہ اسے چکر آ گیا۔ ایلڈر نے اسے سنبھال لیا۔ چند منٹ بعد وہ ایک ریستوران میں بیٹھی جلدی جلدی گوشت کے پارچے حلق سے اتار رہی تھی۔ ساتھ ہی سوپ کے پیالے سے گھونٹ بھی لے رہی تھی۔ ایلڈر اس کے سامنے بیٹھا سگریٹ سے شغل کر رہا تھا۔ اس نے صرف اینا کے لیے کھانا منگوایا تھا۔ آدھے گھنٹے میں اینا کا پیٹ بھر گیا۔ اس کی آنکھوں سے سستی جھلک رہی تھی۔ اس نے ایلڈر کو دیکھا اور مسکرائی۔ "انسپکٹر... میں تمہارے لیے کیا کر سکتی ہوں؟"

"کچھ نہیں... اگر تم نے پیٹ بھر لیا ہے تو میں تمہیں گھر چھوڑ دوں۔"

"میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ میں ایک سرائے میں بینچ پر رات گزارتی ہوں۔" اینا نے اسے آگاہ کیا۔

ایلڈر نے سر ہلایا اور کھڑا ہو گیا۔ اس نے چند سکے میز پر ڈال دیے۔ وہ باہر آئے۔ ایلڈر نے ایک نزدیکی ہوٹل کا رخ کیا اور ایک کمرا لیا۔ کمرا دوسری منزل پر تھا۔ وہ اوپر آئے تو اینا سمجھی کہ اب اسے کھانے اور رات گزارنے کے لیے اس کمرے کی ادائیگی کرنی پڑے گی لیکن ایلڈر نے دروازے کے باہر سے ہی ہیٹ کو ہاتھ لگایا۔ "تم سے کل صبح ملاقات ہوگی۔" وہ رخصت ہو گیا۔ اینا کو لندن آمد کے بعد پہلی بار کسی نرم بستر پر سونا نصیب ہوا تھا۔ صبح اس کی آنکھ دستک سے کھلی۔ اس نے بہ مشکل اٹھ کر دروازہ کھولا۔ باہر ایلڈر موجود تھا۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ "اگر سیر کا ارادہ ہے تو جلدی سے تیار ہو کر آ جاؤ۔"

کچھ دیر بعد وہ بگھی میں لندن کے مہنگے ترین علاقے کی طرف جا رہے تھے۔ یہ شاہی خاندان اور امرا کے لیے مخصوص تھا۔ اینا پہلی بار یہاں آئی تھی۔ وہ یہاں کی امارت اور شان و شوکت دیکھ کر حیران تھی۔ وہ ایک باغ کے کنارے اترے۔ ایلڈر چھوٹے کیک پیک کروا کر لایا تھا جو انہوں نے باغ میں بیٹھ کر کھائے۔ اس دوران میں ایلڈر نے ایک بار بھی اس سے کیس پر بات نہیں کی۔ وہ اس کے بارے میں پوچھتا رہا۔ پھر اینا نے اس کے بارے میں پوچھا۔ ایلڈر نے اپنی زندگی کے بارے میں بتایا۔ اس کا تعلق کئی نسلوں سے قانون نافذ کرنے والے اداروں سے رہا تھا۔ اس کے ایک دادا کا اسکاٹ لینڈ یارڈ کی تشکیل میں بنیادی کردار رہا تھا۔ اس کا باپ ڈپٹی پولیس چیف کانسٹیبل تھا۔ اینا دیکھ رہی تھی کہ وہاں ہر طرف دولت مند مرد اور عورتیں بیش قیمت لباس میں گھوم رہے تھے۔ اسے اپنے معمولی سے لباس پر شرمندگی ہونے لگی مگر ایلڈر بالکل نارمل تھا۔ اس نے اینا سے کہا۔ "آؤ، تمہیں شاہی میوزیم دکھاتا ہوں۔"

وہ پیدل شاہی میوزیم تک پہنچے۔ یہ عالی شان عمارت جس کے کئی فلور تھے اور یہاں شاہی خاندان سے متعلق نوادرات اور قیمتی اشیا موجود تھیں۔ ایلڈر اسے تصویروں والے حصے میں لایا ایک جگہ اوپر جاتی سیڑھیوں پر بڑے سائز کی تصویر لگی تھی۔ اینا نے دیکھا اور بے ساختہ بولی۔ "ملکہ وکٹوریا۔"

"آؤ، تمہیں ایک تصویر اور دکھاتا ہوں۔" ایلڈر اسے اوپر لایا اور ایک تصویر کے سامنے رکا۔ اینا نے دیکھا اور دنگ رہ گئی۔ پھر اس کی نظر تصویر کے نیچے لکھے نام پر

گئی۔ "شہزادہ ولیم۔"

پھر اس نے ایلڈر کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "یہی ہنری ہے نا جس سے میریا نے شادی کی تھی؟"

اینا نے اسے گھورا۔ "تو مجھ پر یہ عنایات اس لیے تھیں؟"

"نہیں۔" ایلڈر نے بے پروائی سے کہا۔ "لیکن تم ایسا سمجھ رہی ہو تو اس کے لیے آزاد ہو۔"

"اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"تمہیں معلوم ہے میریا کس حال میں ہے؟"

"نہیں۔"

"وہ پاگل خانے میں ہے۔"

"سچ؟" اینا نے بے یقینی سے کہا۔ "لیکن وہ تو بالکل ٹھیک تھی۔ ابھی چند دن پہلے..."

"وہ تم لوگوں سے ملنے اور اپنا بچہ دینے آئی تھی؟"

"تم جانتے ہو؟" اینا حیران ہوئی۔

"ہاں، میرا کام ہی جاننا ہے۔" ایلڈر نے کہا۔ "تم میریا سے ملو گی؟"

"ہاں ملوں گی۔" اینا بے تاب ہو گئی تھی۔

☆☆☆

پاگل خانے کے نگراں نے ایلڈر سے کہا۔ "اس عورت کے لیے سخت ممانعت ہے کہ کوئی اس سے نہ ملے۔"

"میرا تعلق اسکاٹ لینڈ یارڈ سے ہے۔" ایلڈر نے اسے گھورا۔ "میں کوئی نہیں ہوں۔"

"سوری سر۔" نگراں نے فوراً معذرت کر لی۔ وہ انہیں اس کوٹھری تک لایا جس میں میریا بند تھی۔ انہوں نے لوہے کے دروازے کے اوپر کی جالی سے جھانکا۔ ناکافی لباس میں میریا ایک کونے میں سمٹی بیٹھی تھی۔ اس کا سر سامنے سے نصف گنجا تھا۔ ماتھے اور بائیں کنپٹی پر زخم اور ناخنوں کے نشانات تھے۔ وہ روشن دان کی طرف نظریں جمائے بیٹھی تھی اور زیر لب کچھ کہہ رہی تھی۔ اینا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ حسین و جمیل میریا جسے اس کی ساتھی عورتیں خوش قسمت سمجھتی تھیں، اس وقت بدنصیبی کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ ایلڈر کے اشارے پر نگراں نے دروازے کا تالا کھولا تو اینا اندر آئی۔ وہ میریا کے پاس بیٹھی لیکن میریا نے کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ وہ بدستور زیر لب پتا نہیں کیا کہہ رہی تھی۔ اینا نے اس سے بات کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ نگراں نے کہا۔ "یہ دو دن پہلے آئی ہے اور تب سے اس کی یہی حالت ہے۔"

کچھ دیر میں اینا اور ایلڈر باہر نکل آئے۔ اینا نے پوچھا۔ "ہنری... پرنس ولیم کہاں ہے؟ اس نے میریا کو دھوکا دیا ہے۔"

"میں نے اس سے انٹرویو کی درخواست کی ہے۔"

"کوئی عام آدمی ہوتا تو تم اسے اپنے دفتر بلوا لیتے۔ وہ شہزادہ ہے اس لیے تم کو اس سے درخواست کرنا پڑی۔" اینا نے تلخ لہجے میں کہا۔

"تمہارے خیال میں میریا کی اس حالت کا ذمے دار شہزادہ ولیم ہے؟"

"ہاں..." اینا کہتے کہتے رک گئی۔ اسے وہ منظر یاد آیا جب پُراسرار لوگ ہنری اور میریا کو زبردستی ان کے گھر سے لے جا رہے تھے۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے ایلڈر کو بتایا۔ اس نے سر ہلایا۔

"ممکن ہے یہی لوگ ہوں جنہوں نے میریا کو اس حال تک پہنچایا ہو۔"

"لیکن میریا اور ہنری کے معاملے کا میری اور اینی کے قتل سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟"

"ہو سکتا ہے کوئی تعلق ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے نہ ہو۔" ایلڈر نے سوچتے ہوئے کہا۔ "اب تم میرے علم میں لائے بغیر کہیں نہیں جاؤ گی۔"

"کیا میں حراست میں ہوں؟"

"نہیں، مجھے اب تمہاری فکر ہے۔" ایلڈر نے انکار کیا۔ "آج جو دیکھا اور سنا ہے، وہ خود تک محدود رکھنا۔"

اینا واپس پہنچی تو کیتھی اور الزبتھ بے تابی سے اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ وہ اسے دیکھتے ہی لپکیں۔ "کہاں چلی گئی تھیں؟ بتایا کیوں نہیں؟" الزبتھ بولی۔

کیتھی نے ترخ کر کہا۔ "ہم تو سمجھ رہے تھے کہ اب تمہاری لاش ملے گی۔"

تب اینا نے دیکھا وہاں ایک اور لڑکی موجود تھی۔ وہ نوجوان تھی، مشکل سے بیس سال کی اور بہت خوب صورت۔ اینا نے پوچھا۔ "یہ کون ہے؟"

"یہ میری جین کیلی ہے۔" کیتھی نے تعارف کرایا اور لڑکی کو خود سے لپٹا لیا۔ "مائی ڈارلنگ اور ہمارے گروپ میں اضافہ ہے۔"

"ہائے۔" میری جین نے اینا سے ہاتھ ملایا۔

میری جین کا تعلق بھی اسکاٹ لینڈ سے تھا۔ اینا نے بتایا کہ وہ پچھلے دن ایک گاہک کے ساتھ اس کے گھر چلی گئی

تھی۔ اس نے ایلڈر کی ہدایت پر عمل کیا تھا۔ وہ جب سے آئی تھی، اسے رہ رہ کر ایلڈر کا خیال آرہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کاش وہ طوائف کی حیثیت سے اس سے نہ ملی ہوتی۔

☆☆☆

ایلڈر نے اپنے دفتر میں ایک طرف بورڈ پر اس کیس سے متعلق تصاویر اور دوسری چیزیں لگا رکھی تھیں۔ میری اور ایني کی لاشوں کی تصاویر بھی تھیں۔ فریڈ میز کے دوسری طرف کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ ''قیاس آرائیوں کا سلسلہ دراز ہو رہا ہے۔''

''ہونے دو۔'' ایلڈر نے کہا۔

''ایک صحافی جوزف نے اس قاتل کو جیک دی ریپر کا نام دیا ہے۔ اب یہ کیس وائٹ چیپل مرڈرز کے نام سے جانا جاتا ہے۔''

''ان باتوں سے حقائق پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ جب اصل قاتل سامنے آئے گا تو ساری قیاس آرائیاں خود دم توڑ جائیں گی۔''

''چیف کانسٹیبل اس بارے میں پریشان ہے۔'' فریڈ نے بکس سے سگار نکال کر سلگاتے ہوئے کہا۔ ''اس کی خواہش ہے جلد از جلد اس کیس کو انجام تک پہنچا دیا جائے۔''

ایلڈر جواب تک نیم دراز تھا، کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور ذرا آگے جھک کر بولا۔ ''اس کیس کی تفتیش میرے ذمے ہے اور میں اپنے طریقے سے کام کرتا ہوں۔''

''میں سوچ رہا ہوں ایک بار جوزف سے مل لیا جائے۔''

''اس کے برعکس میں سوچ رہا ہوں کہ ایک بار ڈاکٹر ایڈورڈ سے ملا جائے۔ چیف کانسٹیبل کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''کیا مطلب؟''

''وہ فری میسن کا ممبر ہے؟''

فریڈ اسے گھور رہا تھا۔ ''اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟''

''مجھے یاد آرہا ہے کہ اسمتھ نامی ایک زیر تربیت سرجن کسی کیس میں ملوث پایا گیا لیکن چیف کانسٹیبل نے اس کی تفتیش رکوا دی تھی۔''

''یونانی بچے کار تھین کا کیس....'' فریڈ نے کہا۔ ''اسے دماغی دورے پڑتے تھے اور اسمتھ نے اس کا آپریشن کر دیا تھا۔ اس سے اس کی موت واقع ہو گئی تھی۔''

''بالکل، اس کا مطلب ہے تمہیں یاد ہے۔'' ایلڈر نے خوش ہو کر کہا۔

''ہاں بولیور اسمتھ پر مجرمانہ غفلت کا کیس بنا تھا لیکن پھر وہ کیس ختم کر دیا گیا۔'' فریڈ نے کہا۔ ''کیا تمہیں اس پر شبہ ہے؟''

''کیا وہ قاتل نہیں ہو سکتا؟'' ایلڈر نے سوال کیا۔

''اگر قاتل وہی ہے تو ہمیں اس کے خلاف ثبوت حاصل کرنا ہو گا۔''

''میں نے دو آدمی اس کے پیچھے لگا دیے ہیں۔'' ایلڈر نے اٹھ کر کوٹ پہنتے ہوئے کہا۔ ''ان کی رپورٹ کے مطابق وہ آدھا گھنٹا پہلے ڈاکٹر ایڈورڈ کے گھر پہنچا تھا۔''

''تو تم اس لیے وہاں جانا چاہتے ہو؟''

''ہاں۔'' ایلڈر نے جواب دیا اور باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد وہ بگھی سے ڈاکٹر ایڈورڈ کے عالی شان مینشن کے سامنے اترا۔ دروازہ ایک خادمہ نے کھولا۔ ایلڈر نے اپنا تعارف کرایا تو وہ بولی۔

''سوری، ڈاکٹر ایڈورڈ اس وقت کسی سے نہیں مل سکتے۔''

''یہ ضروری ہے۔'' ایلڈر نے کہا اور اسے نظر انداز کر کے اندر داخل ہو گیا۔ ملازمہ پریشان ہو کر اس کے پیچھے آئی۔ لاؤنج کے دروازے پر اس کا سامنا اسمتھ سے ہوا اور اس نے سخت نظروں سے ایلڈر کو دیکھا۔

''تم اندر کیسے آئے؟ سر رچرڈ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

''مسٹر اسمتھ! انسپکٹر کو آنے دو۔'' ڈاکٹر ایڈورڈ کی آواز آئی۔ وہ صوفے پر دراز تھا۔ ایلڈر اندر آیا تو اس نے خادمہ سے چائے لانے کو کہا۔ اس کے چہرے سے نقاہت ٹپک رہی تھی۔

''سر رچرڈ! کیسی طبیعت ہے؟'' ایلڈر نے کوٹ اتارتے ہوئے کہا۔

''شاید بلڈ پریشر ہائی ہو گیا تھا۔'' اس نے کہا۔ ''بیٹھو''

ایلڈر اس کے سامنے آگیا۔ ''کیا مسٹر اسمتھ آپ کا علاج کر رہے ہیں؟''

''نہیں.... نہیں.... وہ مجھ سے ملنے آیا ہے۔''

''آپ کے خیال میں یہ کیسا شخص ہے؟'' ایلڈر نے پوچھا۔ ''کیا یہ کسی کو قتل کر سکتا ہے؟''

''اگر تمہارا اشارہ وائٹ چیپل مرڈرز کی طرف ہے تو اسمتھ کے لیے یہ ممکن نہیں ہے اس کا دایاں ہاتھ کمزور اور

رعشے کا شکار ہے۔ وہ اتنی قوت اور صفائی سے ان عورتوں کا گلا نہیں کاٹ سکتا جتنی صفائی سے قاتل نے کاٹا ہے۔''

''لیکن یونانی بچے کا کیس....''

''اس کے بعد ہی اس کے ہاتھ کا مسئلہ شروع ہوا اور وہ جب سرجری کے اوزار تھامتا، اس کا ہاتھ کانپنا شروع ہو جاتا تھا۔'' ڈاکٹر ایڈورڈ نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''اگر شروع میں یہ ذہنی مسئلہ تھا تو بعد میں جسمانی بن گیا۔ میں نے خود اس کا علاج کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ وہ اس ہاتھ سے کوئی کام نہیں لے سکتا۔''

خادمہ چائے لے آئی۔ ایلڈر نے خود چائے بنائی اور پہلے ڈاکٹر ایڈورڈ کو پیش کی۔ اس نے پوچھا۔ ''انسپکٹر! کیا تم اسمتھ کی طرف سے مشکوک ہو؟''

''ہاں....'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔ ''میں اس کی نگرانی کرا رہا ہوں۔ ویسے یہ اس کے لیے اچھا ہے اگر وہ قاتل نہیں ہے تو کلیئر ہو جائے گا۔''

''انسپکٹر! خیال رہے وہ لندن سرجن کالج سے منسلک ہے۔'' ڈاکٹر ایڈورڈ نے اسے خبردار کیا۔ ''اگر یہ بات پریس تک پہنچی تو میرے کالج کی بدنامی ہو گی۔''

''بات پریس تک نہیں جائے گی۔'' ایلڈر نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''جو شخص معمولی سرجری نہیں کر سکتا، اس کا سرجن کالج میں کیا کام ہو سکتا ہے؟''

''وہ تحقیق سے منسلک ہے اور انسپکٹر میں تمہیں یقین دلاتا ہوں، وہ بہت ذہین آدمی ہے۔''

''قاتل بھی بہت ذہین ہے۔'' ایلڈر نے چائے کا گھونٹ لیا اور تعریف کی۔ ''سر! آپ کی چائے بہت اعلیٰ درجے کی ہے۔''

''یہ خاص بلینڈ ہے جو صرف میرے لیے آتا ہے۔'' ڈاکٹر ایڈورڈ نے فخر سے کہا۔ ''ساری دنیا سے کھانے پینے کی اعلیٰ ترین اشیا میں خود منگواتا ہوں۔''

''میں جانتا ہوں آپ کا تعلق جدی پشتی دولت مند گھرانے سے ہے، آپ کئی نسلوں سے نہ صرف شاہی خاندان کے معالج رہے ہیں بلکہ پیچھے سے آپ کا سلسلۂ نسب شاہی خاندان سے ہی ملتا ہے۔''

ڈاکٹر ایڈورڈ کا چہرہ چمک اٹھا۔ ''تم نے ٹھیک پہچانا، انسپکٹر۔''

اچانک ایلڈر نے موضوع بدل دیا۔ ''سر! آپ فری میسن کے بارے میں جانتے ہیں؟''

ڈاکٹر ایڈورڈ نے سر ہلایا۔ ''صرف اتنا کہ یہ برادری کے مانند ہیں۔''

''برادری سے کیا مراد ہے؟''

''برادری کے ہر فرد کو بھائی سمجھنا اور اس کا ساتھ دینا، چاہے اس نے کچھ غلط ہی کیوں نہ کیا ہو۔''

''یہ تو قانون کو پس پشت ڈال دینے والی بات ہے۔''

''قانون کو پس پشت ڈالنے کا سلسلہ تو جاری ہے۔'' ڈاکٹر ایڈورڈ نے کہا۔ ''برٹش قانون کے مطابق جسم فروشی جرم ہے لیکن لندن اور پورے ملک میں یہ کام زور و شور سے جاری ہے۔ کیا پولیس اس کی پشت پناہی نہیں کرتی؟''

ایلڈر نے سر ہلایا۔ ''ایسا ہے لیکن یہ عام لوگوں کا معاملہ ہے۔ بڑے لوگوں کو قانون کی لازمی پابندی کرنی چاہیے۔''

''قانون سب کے لیے ایک سا ہوتا ہے۔'' ڈاکٹر ایڈورڈ نے کہا۔

''اس کے باوجود کوئی طوائف گرفت میں آتی ہے تو اسے سزا ہوتی ہے جبکہ اسمتھ ایک بچے کی موت کا ذمے دار ہوتے ہوئے بھی صاف بچ جاتا ہے۔''

''اسے پولیس نے کلیئر کیا تھا۔'' ڈاکٹر ایڈورڈ نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔ ''انسپکٹر! اب میں آرام کروں گا۔ امید ہے تم برا نہیں مانو گے؟''

☆☆☆

میری جین کے آنے سے ان کا کاروبار کسی قدر بہتر ہوا تھا۔ اس کے چکر میں اب زیادہ گاہک بیکر کے قحبہ خانے کا چکر لگانے لگے تھے۔ اس وجہ سے انہیں بھی گاہک مل جاتا تھا۔ مگر دو دن سے مسلسل بارش ہو رہی تھی اور اگر ستمبر کے آخر میں بارش ہو تو موسم بہت سرد ہو جاتا ہے۔ کیتھی بے چین تھی، اس نے پی رکھی تھی اور نشے کی حالت میں میری جین کے ساتھ ڈانس کر رہی تھی۔ اس وقت بھی اس کے ہاتھ میں بیئر کی بوتل تھی۔ ایناد ہیں تھی۔ اس نے احاطے کے مالک سے معاملہ طے کر لیا تھا اور کچھ رقم کے عوض اسے وہاں رکنے کی اجازت مل گئی تھی۔ میری جین تھکی ہوئی تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے کیتھی کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ لیکن جب کیتھی اسے چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوئی تو میری جین نے اسے دھکا دیا۔ ''دور ہو مجھ سے، میں اس سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتی۔''

''کتیا۔'' کیتھی نے نفرت سے کہا۔ ''تو خود کو کیا سمجھتی ہے۔''

"پلیز کیتھی۔" الزبتھ نے کہا۔ "تم کیوں اس بے چاری کے پیچھے پڑی ہو؟"

"لعنت ہو تم سب پر۔" کیتھی نے کہا اور بوتل کھینچ کر ماری جو کھڑکی کے شیشے پر لگی اور شیشے کا نچلا حصہ ٹوٹ گیا۔ کیتھی اپنی شال اوڑھتی ہوئی باہر کی طرف بڑھی۔ الزبتھ نے اسے روکنا چاہا مگر وہ اسے دھکیل کر باہر نکل گئی۔ اینا فرش پر بکھرے شیشے چننے لگی اور پھر اس نے ٹوٹے شیشے میں کپڑا ٹھونس دیا تا کہ باہر سے یخ بستہ ہوا اندر نہ آئے۔

الزبتھ پریشان تھی۔ "یہ اس نے اچھا نہیں کیا۔ باہر اس وقت بالکل سناٹا ہے۔"

"وہ آجائے گی کچھ دیر میں۔" اینا نے اسے تسلی دی۔

☆☆☆

کیتھی نشے کی کیفیت میں زیر لب بڑبڑاتی ہوئی ویران گلیوں میں گھوم رہی تھی۔ اسے بارش کی بھی پروا نہیں تھی۔ اچانک ایک خوب صورت بگھی اس کے پاس آکر رکی۔ اس کا دروازہ کھلا۔ اندر تاریکی تھی۔ کسی نے بھاری آواز میں پوچھا۔ "کیا تم کو گاہک کی تلاش ہے؟"

"ہاں۔" وہ خود کو نمایاں کرتے ہوئے بولی۔ "کیا تم میرے گاہک بنو گے؟"

"کیوں نہیں۔" اندر سے ایک ہاتھ باہر آیا جس میں چھوٹے سے گلاس میں سبز شراب تھی۔ "یہ لو، فرانس کی شراب ہے۔"

کیتھی نے خوش ہو کر ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا۔ شراب بہت تیز تھی، اس کا سر گھومنے لگا۔ بگھی کے اندر موجود شخص نیچے اتر آیا۔ اس نے کیتھی کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے کر نزدیکی گلی کی طرف بڑھ گیا۔ بگھی کا نوجوان کوچوان اتر کر بگھی اندر لے آیا۔ اس وقت تک کیتھی اپنا کٹا ہوا گلا سنبھالتے ہوئے زمین پر گر چکی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا جسم بے جان ہو گیا اور اوور کوٹ پہنے شخص نے اپنا سرجیکل بیگ کھولا۔ اس میں سے اوزار نکال کر وہ اپنے کام میں لگ گیا مگر چند منٹ بعد ہی کوچوان نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔ "ماسٹر! کوئی اس طرف آرہا ہے۔"

"شٹ اپ۔" وہ غرایا۔

آنے والے کے قدموں کی آہٹ بالکل پاس آگئی تھی۔ کوچوان دوبارہ بولا تو اوور کوٹ والا کھڑا ہو گیا۔

☆☆☆

الزبتھ مضطرب تھی۔ وہ بار بار کہہ رہی تھی کہ کیتھی کو اس وقت باہر نہیں جانا چاہیے تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنی شال لی تو اینا چونکی۔ "اب تم جا رہی ہو؟"

"ہاں اسے تلاش کرنا ضروری ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ اس قاتل کے ہتھے نہ چڑھ جائے۔"

اینا بھی فکر مند تھی۔ اس نے الزبتھ سے کہا۔ "تم اپنا خیال رکھنا۔"

الزبتھ باہر آئی۔ اس نے بارش سے بچنے کے لیے اپنی شال شانوں پر لپیٹ لی تھی۔ اسے علم نہیں تھا کہ کیتھی برنر اسٹریٹ کی طرف گئی تھی۔ وہ اس کی مخالف سمت میں چل پڑی۔ بارش اور سردی کی وجہ سے گلیاں سنسان تھیں۔ ماحول دھندلایا ہوا تھا اور چند گز سے آگے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ برستی پھوار سے بچنے کے لیے الزبتھ دیوار کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ وہ ایک دیوار کے کونے تک پہنچی تھی کہ اچانک کونے سے ایک سایہ نکلا اور اس کے سامنے سے گزرا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "معاف کرنا خاتون۔"

الزبتھ کو ذرا دیر سے احساس ہوا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ اس نے اپنا گلا پکڑا جس سے خون پھوٹ رہا تھا اور پھر وہ وہیں ڈھیر ہو گئی۔ چند سیکنڈ بعد اس کا جسم کھینچ کر قریبی تاریک گلی کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ مرنے سے پہلے الزبتھ نے اپنے قاتل کا چہرہ دیکھ لیا تھا۔

☆☆☆

30 ستمبر 1888ء کی رات لندن پولیس کے لیے خاصی مصروفیت کی تھی۔ خراب موسم کے باوجود تقریباً پندرہ سو پولیس والے ڈیوٹی پر تھے اور انہوں نے وائٹ چیپل کا پورا علاقہ گھیر رکھا تھا۔ دونوں لاشیں تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے فرق سے دریافت ہوئی تھیں۔ کیتھی کا گلا کاٹ دیا گیا تھا اور زیریں حصہ بھی چیرا گیا تھا مگر ایسا لگ رہا تھا کہ قاتل کو اپنا کام ادھورا چھوڑ کر جانا پڑا تھا۔ اور وہ ان ہی گلیوں میں گھوم رہا تھا کہ اسے الزبتھ مل گئی۔ اس کا قتل مرکزی سڑک پر ہوا تھا اور پھر اس کی لاش کھینچ کر اندرونی گلی میں لے جائی گئی تھی جہاں اس کے جسمانی اعضا نکال لیے گئے تھے۔ ایلڈر نے کیتھی کی لاش دیکھی اور اس کا کسی قدر کھلا منہ سونگھا۔ اس سے قیمتی فرانسیسی شراب کونیاک کی بو آرہی تھی۔ نشے کے زیر اثر اس نے مزاحمت نہیں کی تھی اور خاموشی سے ماری گئی تھی۔ الزبتھ کو مزاحمت کا موقع نہیں ملا تھا کیونکہ شہ رگ کٹنے سے اس کی موت بہت تیزی سے واقع ہوئی ہوگی۔ دونوں اموات واضح طور پر مفروضہ جیک دی رپر کا کام تھیں۔ جس جگہ الزبتھ ماری گئی وہاں دیوار پر کسی نے چاک سے لکھ دیا

تھا۔ "یہودی وہ لوگ ہیں جنہیں کسی بھی کام پر مورد الزام ٹھہرایا نہیں جاتا۔"

دو قتل معمولی بات نہیں تھی۔ چیف کانسٹیبل سر میکنیٹن خود آگیا تھا۔ وہ جائے واردات پر موجود تھا۔ مگر اس نے عورتوں کے بجائے صرف اس تحریر کے بارے میں کہا۔ "اسے مٹا دو۔"

ایلڈر نے انکار کیا۔ "سر! یہ ایک ثبوت ہے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر۔"

"اگر یہ تحریر کل کے اخبارات میں آگئی تو چند گھنٹے کے اندر پورے لندن میں جگہ جگہ آگ لگی ہوگی اور یہودیوں کو چن چن کر نشانہ بنایا جائے گا۔" سر میکنیٹن نے تیز لہجے میں کہا۔ "یہ میرا حکم ہے، اسے صاف کر دو۔"

"میں یہ حکم نہیں مان سکتا۔" ایلڈر نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ سر میکنیٹن اسے گھورتا رہا۔ پھر اس نے فریڈ سے کہا

"سارجنٹ! اس تحریر کو صاف کر دو اور انسپکٹر ایلڈر کو معطل کیا جاتا ہے۔ یہ کیس اس سے لے لیا جائے۔" یہ کہہ کر سر میکنیٹن وہاں سے چلا گیا۔ چند منٹ بعد ایک کانسٹیبل دیوار صاف کر رہا تھا۔

ایلڈر نے فریڈ سے کہا۔ "یہ صرف اس لیے کیا گیا ہے کہ سر میکنیٹن فری میسن ہے۔ اسے یہودیوں کے مفادات پولیس تحقیقات سے زیادہ عزیز ہیں۔"

فریڈ نے کچھ کہا نہیں لیکن وہ ایلڈر سے متفق تھا۔

☆☆☆

اینا کا رو رو کر برا حال تھا۔ ایک ہی رات میں اس کی آخری دو ساتھی بھی اس کا ساتھ چھوڑ گئی تھیں۔ میری جین نئی تھی اور اینا سے اتنی مانوس نہیں ہوئی تھی۔ اس کے باوجود وہ اسے پسند کرتی تھی اور اس کا ہر ممکن خیال رکھتی تھی۔ دو دن بعد اینا کی ملاقات ایلڈر سے ہوئی تو اس نے بے ساختہ اسے تھپڑ رسید کر دیا۔ وہ سخت طیش میں تھی۔ "اب کیا لینے آئے ہو... انتظار کرو، وہ قاتل مجھے بھی قتل کر دے۔"

"مجھے افسوس ہے، سچ مچ افسوس ہے۔" ایلڈر نے نرمی سے کہا۔ "کاش میں ان کے لیے کچھ کر سکتا۔"

اینا اسی کمرے میں تھی۔ میری جین کام پر گئی ہوئی تھی۔ کچھ دیر بعد اینا کو ندامت ہونے لگی۔

اس نے ایلڈر سے معذرت کی۔

"کوئی بات نہیں میں تمہارے احساسات سمجھ رہا ہوں۔ کیا خیال ہے باہر چلیں؟" ایلڈر نے پوچھا۔

اینا نے بال سنوارے، چہرہ صاف کیا اور شال لے کر ایلڈر کے ساتھ باہر آ گئی۔ باہر دھند تھی۔ اسٹریٹ لیمپ ٹمٹما رہے تھے۔ اینا نے کہا۔ ''اب یہ یقینی ہے کہ اگلی باری میری ہے۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' ایلڈر نے تائید کی۔ ''اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم یہاں سے چلی جاؤ۔''

''میری بھی یہی خواہش ہے۔'' اینا نے کہا۔ ''لیکن میرے پاس رقم نہیں ہے۔''

''میرا خیال ہے تمہارے پاس خاصے عرصے سے رقم نہیں ہے۔ تمہارا گزارہ کیسے ہو رہا ہے؟''

اینا جواب میں خاموش رہی تو ایلڈر نے جیب سے نکال کر مٹھی بھر سکے اسے تھما دیے۔ ''ابھی یہ رکھو۔''

''شکریہ۔'' اینا نے مجوب لہجے میں کہا اور پھر ایلڈر کے چہرے کی طرف جھکی تھی مگر وہ پیچھے ہٹ گیا۔

''نہیں۔''

اینا نے مٹھی کھول دی اور سارے سکے نیچے گر گئے۔ اس نے غصے سے کہا۔ ''تم مجھے کیا سمجھتے ہو؟ کیا میں صرف طوائف ہوں، عورت نہیں ہوں؟''

وہ جانے لگی تو ایلڈر نے اسے ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ چند لمحے بعد ایک ڈیوٹی کانسٹیبل نمودار ہوا اور اس نے ڈنڈا اچھا کر پوچھا۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' ایلڈر نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا تو اس نے جلدی سے کہا۔ ''سوری سر۔''

کانسٹیبل وہاں سے چلا گیا تو اینا ہنس دی۔ اس نے ایلڈر سے کہا۔ ''واپس چلو کمرے میں۔''

ایلڈر اس بار انکار نہیں کر سکا۔ اینا کو پتا نہیں چلا کہ وہ کب واپس چلا گیا۔ پھر میری جین آئی۔ اس نے اینا کو سونے دیا۔ اس کے بعد ایلڈر اس سے نہیں ملا لیکن تین ہفتے بعد اسے ڈاک سے ایک لفافہ ملا۔ لفافہ کسی نامعلوم شخص کی طرف سے تھا اور جب اینا نے اسے کھولا تو اس میں دو سو پاؤنڈز کی خطیر رقم موجود تھی۔ اینا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ایلڈر سے آخری ملاقات کے بعد اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اب مزید یہ کام نہیں کرے گی۔ وہ اب ایک پب میں نوکری کر رہی تھی۔ اس میں محنت بہت زیادہ تھی اور آمدنی کم لیکن وہ خوش تھی۔ اس نے چند پاؤنڈز کی بچت بھی کر لی تھی۔ مگر اب اسے اس نوکری کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ واپس اسکاٹ لینڈ جا سکتی تھی۔

☆☆☆

ایلڈر اپنے دفتر میں تھا جب اسے اوول آفس کی طرف سے خط ملا، جس میں اس کی شہزادہ ولیم سے انٹرویو کی درخواست مسترد کر دی گئی تھی۔ خط پر ملکہ وکٹوریہ کے دستخط اور مُہر تھی۔ اس نے فریڈ سے کہا۔ ''اب مجھے پولیس کے سینٹرل ریکارڈ تک رسائی حاصل کرنی ہے۔''

''سی آئی ڈی برانچ کے پاس اختیار ہے۔ ہم ملکہ معظمہ کے سرکاری ریکارڈ تک بھی رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔'' سارجنٹ فریڈ نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''لیکن عملی طور پر ان اختیارات کا استعمال کتنا مشکل ہے، تم نے دیکھ لیا ہے۔''

''یہ کام ایسے کرنا ہے کہ کسی کو پتا نہ چلے۔''

فریڈ سوچ میں پڑ گیا۔ ''مشکل ہے، تم جانتے ہو آج کل وہاں سارجنٹ اسپنسر ہے۔''

سارجنٹ اسپنسر اور سارجنٹ فریڈ کی آپس میں لگتی تھی۔ ایلڈر نے اصرار کیا۔ ''ہم کوشش تو کر سکتے ہیں۔ رات نو بجے کے بعد وہاں کوئی نہیں ہوتا۔ ہم اس وقت جا سکتے ہیں۔''

رات نو بجے ان کی بگھی پولیس کے مرکزی دفتر سے ذرا دور رکی۔ فریڈ وہیں رک گیا اور ایلڈر اپنی ٹوپی نیچی کر کے سر جھکا کر اندر کی طرف بڑھا۔ کسی نے اس پر توجہ نہیں دی لیکن جب وہ عمارت میں داخل ہوا تو ڈیسک کلرک نے اسے روک لیا۔ ''میں انسپکٹر سر! میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟''

''مجھے انسپکٹر ڈی کاک سے ملنا ہے۔''

''وہ اپنے دفتر میں نہیں ہیں۔''

''ہاں اس نے کہا تھا کہ میں اس کے دفتر میں انتظار کروں، وہ آنے والا ہوگا۔''

''سوری سر! کسی غیر متعلقہ فرد کو اوپر جانے...''

''ٹھیک ہے۔ میں انسپکٹر کو بتاؤں گا کہ مجھے تمہارا انتظار یہاں سیڑھیوں پر بیٹھ کر کرنا پڑا۔''

کلرک گھبرا گیا۔ ''پلیز سر... آپ جا سکتے ہیں، اوپر راہداری میں الٹے ہاتھ پر دوسرا کمرا ہے۔''

لیکن ایلڈر تیسرے فلور کے ایک کمرے میں داخل ہوا۔ یہ وسیع کمرا اس ریکارڈ کے لیے مخصوص تھا جسے مزید استعمال کیے جانے کی ضرورت نہ ہو۔ دوسرے لفظوں میں یہ بند کیے جانے والے کیسز کا قبرستان تھا۔ ایلڈر نے جیب سے ایک موم بتی نکال کر جلائی اور اسے لے کر ریکارڈ روم کے شیلفوں کے درمیان گھومنے لگا۔ اس کے پاس وقت کم تھا۔ اگر سچ مچ انسپکٹر ڈی کاک یا کوئی اور آ جاتا تو وہ پکڑا

جاتا۔ اگرچہ اس نے کوئی جرم نہیں کیا تھا لیکن یوں پکڑے جانے سے اس کی سبکی ہوتی اور یہ اسے برداشت نہیں تھا۔ وہ موم بتی کی روشنی میں فولڈرز پر لکھے نام چیک کر رہا تھا۔ بالآخر اسے یونانی بچے اور بولیورا اسمتھ کا کیس مل گیا۔ اس نے اسے کھولا اور جلدی جلدی اس کے ورق الٹنے لگا۔ بالآخر اسے چیف کانسٹیبل سر میکلینٹن کا حکم نامہ مل گیا جس کی رو سے اس کیس کو داخل دفتر کر دیا گیا تھا۔ اس نے وہ کاغذ فولڈر سے نکالا۔ اسی لمحے باہر کہیں دھماکا ہوا اور وہ تیزی سے نیچے کی طرف لپکا۔ جب وہ باہر آیا تو پولیس والے صحن میں بھڑکنے والی آگ بجھا رہے تھے۔ انسپکٹر ڈی کاک اور سارجنٹ اسپنسر آ گئے تھے اور ڈیوٹی کلرک انہیں بتا رہا تھا کہ سی آئی ڈی برانچ کا انسپکٹر ایلڈر اوپر ڈی کاک کا انتظار کر رہا ہے۔ وہ ان تینوں کے پیچھے سے نکل کر باہر آ گیا۔ جہاں فریڈ اضطراب کے عالم میں اس کا انتظار کر رہا تھا اس نے برہمی سے کہا۔ ''کہاں رہ گئے تھے۔ وہ دونوں مصیبتیں ایک ساتھ آ گئی تھیں۔ وہ تو میں نے تیل کے پیپے کو آگ دکھا دی ورنہ تم پکڑے جاتے۔''

ایلڈر بہت خوش تھا۔ اس نے کہا۔ ''انہیں جہنم میں جھونکو، یہ دیکھو میں اصل چیز لے آیا ہوں۔ کیا تمہیں اندازہ ہوا کہ اس کھیل کے پیچھے کون ہے؟''

کاغذ دیکھ کر فریڈ کی آنکھیں بھی پھیل گئیں۔

☆☆☆

ایلڈر نے دروازے پر دستک دی تو ملازمہ نے دروازہ کھولا اور اسے دیکھتے ہی سر جھکا کر پیچھے ہٹ گئی۔ ایلڈر اندر آیا تو لاؤنج میں ڈاکٹر ایڈورڈ تیار ہو رہا تھا۔ وہ آئینے کے سامنے اپنا معائنہ کر رہا تھا۔ ایلڈر نے پوچھا۔ ''آپ کہیں جا رہے ہیں؟''

''ہاں انسپکٹر! لیکن تمہارے لیے کچھ وقت ہے۔''

''میں نے سوچا بہت دنوں سے آپ سے ملاقات نہیں ہوئی اور اتفاق سے یہاں سے گزر رہا تھا۔''

''تم نے اچھا کیا جو یہاں آ گئے۔'' ڈاکٹر ایڈورڈ نے اپنے بال سنوارتے ہوئے کہا۔

''مسٹر اسمتھ یہاں نظر نہیں آ رہے۔''

''مجھے اس کے بارے میں نہیں معلوم۔''

''حالانکہ آپ نے یونانی بچے والے کیس میں اس کی ضمانت کرائی تھی اور یہ کیس ختم کرایا تھا۔''

ڈاکٹر ایڈورڈ ایک لمحے کے لیے ساکت ہوا، پھر اس نے کہا۔ ''تو تم نے پتا چلا لیا؟''

''ہاں اور یہ بھی جان لیا کہ ان طوائفوں کو کون قتل کر رہا ہے۔''

''تب تم اس شخص کو گرفتار کیوں نہیں کر لیتے؟''

''میں اسے گرفتار نہیں کر سکتا۔''

''تب وہ آخری طوائف کو بھی مار دے گا۔'' ڈاکٹر کا لہجہ معنی خیز تھا۔ ''کیا تمہیں اندازہ ہے، وہ یہ کام الہامی ہدایات کے تحت کر رہا ہے۔ اس کا کوئی دنیاوی مقصد نہیں ہے۔''

''نہیں وہ ایسا نہیں کر سکے گا۔'' ایلڈر نے کہتے ہوئے کوٹ میں چھپا ہاتھ سیدھا کیا۔ اس میں ریوالور دبا ہوا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ گولی چلاتا اس کے سر پر عقب سے چوٹ لگی اور وہ نیچے گر کر بے ہوش ہو گیا۔ ضرب اسمتھ نے اپنی چھڑی سے لگائی تھی۔ وہ بالکل خاموشی سے ایلڈر کے پیچھے آیا تھا۔ ڈاکٹر ایڈورڈ نے کہا۔ ''اسے لے جاؤ اور بے ہوشی کا انجکشن دے کر ٹیمز میں پھینک دو۔''

اسمتھ ہچکچایا۔ ''یہ پولیس مین ہے۔''

''اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔ اگر یہ زندہ رہا تو ہم سب کو مروا دے گا۔'' ڈاکٹر نے کہتے ہوئے اپنا اوور کوٹ اٹھا کر پہنا پھر سرجیکل بیگ اٹھایا اور باہر کی طرف بڑھ گیا۔ یہ مخصوص ساخت کا پھیلا ہوا اوور کوٹ تھا جس میں اس کی جسامت معمول سے زیادہ دکھائی دیتی تھی۔ بگھی پر بیٹھنے سے پہلے اس نے نوجوان کوچوان سے کہا۔ ''تم مجھے چھوڑ کر واپس آؤ گے اور اسمتھ کے ساتھ مل کر انسپکٹر ایلڈر کو ٹھکانے لگاؤ گے۔''

''یس ماسٹر۔'' کوچوان نے کہا اور ڈاکٹر کے بیٹھتے ہی اس نے بگھی آگے بڑھا دی۔ اسے معلوم تھا کہ اسے کہاں جانا ہے۔ کچھ دیر بعد بگھی اس سڑک پر رکی جس پر اینا اور میری جین کا کمرا تھا۔ دھند کی وجہ سے حدِ نظر کم تھی اور کسی نے ڈاکٹر ایڈورڈ کو کمرے کی طرف جاتے نہیں دیکھا۔ اس کے اترتے ہی کوچوان نے بگھی واپس موڑ لی۔ ڈاکٹر نے سڑک عبور کی اور آرام سے ٹوٹے شیشے پر لگا کپڑا ہٹایا اور اندر ہاتھ ڈال کر دروازے کا لاک کھول لیا۔ وہ اندر آیا تو اینا بستر پر دیوار کی طرف منہ کیے سو رہی تھی۔ اس کے سرخ بال تکیے پر پھیلے ہوئے تھے۔ یک دم ڈاکٹر کی آنکھوں میں تاریکی اور وحشت اتر آئی۔ اس نے نیچے رکھ کر اپنا بیگ کھولا اور اس میں سے سرجیکل چاقو نکال کر اینا کی طرف بڑھا۔

☆☆☆

ایلڈر کو ہوش آیا تو وہ ایک بگھی میں تھا اور اس کے

دونوں ہاتھ سامنے رومال سے بندھے ہوئے تھے۔ اسمتھ اس کے برابر میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ایلڈر کو ہوش میں آتے دیکھ کر جلدی سے سرنج نکالی اور اس میں دوا بھرنے لگا۔

ایلڈر نے پیچھے سرک کر کہا۔ ”یہ کیا کر رہے ہو؟“

جواب میں اسمتھ نے سرنج اس کے جسم میں اتارنا چاہی مگر ایلڈر نے اس کا سرنج والا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ زور لگاتے ہوئے اسمتھ اس کے اوپر چڑھ آیا اور ایلڈر کو موقع مل گیا۔ اس نے دونوں پاؤں اس کے پیٹ پر رکھ کر اسے دھکیلا تو وہ بگھی کی کھڑکی توڑتا ہوا سر کے بل باہر لٹک گیا۔ اس کے صرف پاؤں اندر تھے۔ وہ ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ اچانک اس کا ہاتھ بگھی کے گھومتے پہیے میں آیا اور وہ جھٹکے سے باہر گر گیا۔ ہاتھ کے بعد اس کا سر پہیے اور بگھی کے درمیان آ گیا۔ پہیا مسلسل اس کے چہرے پر لگ رہا تھا اور اسے اندر کھینچ رہا تھا۔ پھر اس کا سر درمیان میں آیا تو پہیے پر زور پڑا اور پہیا نکل گیا۔ جھٹکے سے بگھی گری۔ کوچوان اس سے پہلے ہی نیچے گرا تھا اور دہقان کی بنی بھاری بگھی اس پر گری تھی پھر وہ اسے گھسیٹتی ہوئی چلی گئی۔ ایلڈر بگھی میں ہی تھا۔ خاصی دیر گھسٹنے کے بعد بگھی رک گئی۔ پہیے نکلنے کے بعد اسے گھسیٹتے رہنا گھوڑوں کے لیے مشکل تھا۔ ایلڈر نے بمشکل اوپر کا دروازہ کھولا اور باہر نکل آیا۔

اسمتھ کا انجام اس کے سامنے تھا اور کچھ ہی دور کوچوان کی کچلی ہوئی لاش بھی پڑی تھی۔ ایلڈر لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھا۔ اس نے رومال سے اپنا چہرہ چھپا لیا تھا کیونکہ لوگ جمع ہو رہے تھے۔ وہ ان کے درمیان سے نکلتا چلا گیا۔ اس کا رخ واپس وائٹ چیپل کی طرف تھا لیکن وہ خاصا دور نکل آیا تھا۔ اسے رہ رہ کر اینا اور ڈاکٹر ایڈورڈ کا خیال آ رہا تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ اگر ڈاکٹر ایڈورڈ اپنا کام نمٹانے کے لیے نکل گیا تو اینا اب زندہ نہیں ہوگی۔ وہ دوڑنے لگا۔ اس نے وقت دیکھا۔ صبح کے تین بج رہے تھے اور اب گلیاں اور سڑکیں سنسان تھیں۔ اس وقت اسے کوئی بگھی بھی نہیں ملتی۔ اس لیے اسے پیدل ہی جانا تھا۔ وہ دوڑتا رہا۔ تقریباً بارہ میل کا فاصلہ اس نے رک رک کر دو گھنٹے میں طے کیا۔ کثرتِ شراب نوشی اور پھر افیون نے اسے کمزور کر دیا تھا۔ ذرا سی مشقت سے وہ ہانپنے لگتا تھا۔ جب وہ اینا کے کمرے کے سامنے پہنچا تو وہاں پولیس کا ہجوم دیکھ کر اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا آ گیا تھا۔ اس کا خدشہ درست ثابت ہوا۔ وہاں فرید موجود تھا۔ اس نے اسے روکا۔

”نہیں، اندر مت جاؤ۔“

”اینا...“ اس نے کرب سے کہا۔ فرید کا چہرہ بھی ستا ہوا تھا۔ اس نے سر ہلایا۔

”ہاں وہی... اس بار وہ بالکل ہی درندہ بن گیا تھا۔“

ایلڈر روکنے کے باوجود اندر داخل ہوا۔ اندر کا منظر دیکھ کر وہ لڑکھڑا گیا تھا۔ اگر ایک کانسٹیبل اسے نہ پکڑتا تو وہ گر جاتا۔ ایک انسپکٹر جائے وقوعہ کا منظر لکھوا رہا اور اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ لکھنے والے کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ لاش کے ٹکڑے کر دیے گئے تھے۔ اندر کے جسمانی اعضا کے ساتھ دل بھی نکال لیا گیا تھا اور چہرہ بگاڑ دیا گیا تھا۔ ایلڈر گھٹنوں کے بل بیٹھا۔ اس نے اینا کے بالوں کا ایک گچھا اٹھایا جو کٹ کر الگ ہو گیا تھا۔ پھر وہ باہر نکل آیا۔

☆☆☆

چیف کانسٹیبل سر میکلیٹن شاہی دفتر میں شہزادی کے سامنے موجود تھا۔ وہ برہم اور فکر مند تھی۔ اس نے کہا۔ ”مسٹر میکلیٹن یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“

”یور میجسٹی... شہزادے کا افیئر سامنے آنے کے بعد ہم نے اسے تنظیم کی سطح پر حل کرنے کی کوشش کی۔ شہزادہ برادری کا آدمی ہے۔ مگر بدقسمتی سے معاملات غلط آدمی کے سپرد کر دیے۔ یہ سارا بگاڑ سر رچرڈ کا کیا ہوا ہے مگر میں یقین دلاتا ہوں معاملات قابو کر لیے جائیں گے اور عوام تک کچھ نہیں پہنچے گا۔“

”اسی میں بہت سے لوگوں کا بھلا ہے۔“ شہزادی نے سرد لہجے میں کہا۔ ”یہ انسپکٹر ایلڈر معاملے کی تہ تک پہنچ گیا ہے۔“

”یور میجسٹی... میں یقین دلاتا ہوں وہ وفادار ہے اور اپنی زبان بند رکھے گا۔“

شہزادی نے ہاتھ سے ڈس مس کا اشارہ کیا۔ سر میکلیٹن نے جھک کر تعظیم دی اور وہاں سے رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

اسٹون ہاؤس کے مرکزی ہال میں عدالت لگی تھی اور ڈاکٹر ایڈورڈ اس میں ملزم کے طور پر پیش تھا۔ وکیل کا کردار ادا کرنے والے شخص نے فردِ جرم سنائی۔ ”ملزم ڈاکٹر ایڈورڈ نے برادری کے ایک رکن شہزادہ ولیم کی خفیہ شادی کا پردہ رکھنے کے لیے پانچ طوائفوں کو قتل کیا۔ یہی نہیں اس نے ان

کی لاشوں کی بے حرمتی کی اور اس کے عمل سے ایسا لگا جیسے کوئی مذہبی جنونی اس کام میں ملوث ہو۔ اس سے لندن میں آباد یہودی کمیونٹی خطرے میں پڑ گئی۔ تیز اس کے عمل سے تنظیم بھی خطرات سے دوچار ہوئی۔ اس نے ایک سرکاری آدمی کو موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں برادری کا ایک رکن اسمتھ اور ایک کوچوان اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔“

”ڈاکٹر ایڈورڈ! تم کیا کہتے ہو؟“ جج نے پوچھا۔ اس کے ڈائس کے سامنے سر میکلیٹن اور سارجنٹ اسپنسر موجود تھے۔

ڈاکٹر ایڈورڈ نے سر اٹھا کر کہا۔ ”میں نے جو کیا وہ اوپر سے ملنے والی راہنمائی کی روشنی میں کیا۔ مجھے پروا نہیں کہ برادری اور اس کے اصول کیا کہتے ہیں۔ میں نے وہی کیا جو بہترین تھا اور مجھے اس پر کوئی ندامت نہیں ہے۔“

”ملزم نے اقرارِ جرم کر لیا ہے اور اسے تاعمر بے خبری کی سزا دی جاتی ہے۔“ جج نے کہا اور اپنا ہتھوڑا مار کر فیصلے پر مہر ثبت کر دی۔

☆☆☆

چند گھنٹوں بعد ڈاکٹر ایڈورڈ دھاتی بیڈ پر لیٹا ہوا تھا اس کے ہاتھ پاؤں سمیت منہ اس طرح بندھا ہوا تھا کہ وہ اسے معمولی سی جنبش بھی نہیں دے سکتا تھا۔ ایک شخص اس کے پیچھے ہتھوڑا اور چھینی لے کر آیا۔ اس نے پہلے چھینی ڈاکٹر ایڈورڈ کے ماتھے پر رکھی اور ہتھوڑا بلند کر کے مخصوص طاقت کی ضرب لگائی۔ پھر ایک ضرب دائیں کنپٹی پر اور ایک بائیں کنپٹی پر لگائی۔ وہ تینوں بار تڑپا اور آخری ضرب کے ساتھ ہی وہ بے ہوش ہو گیا۔ ایک ہفتے بعد وہ پاگل خانے کی ایک کوٹھری میں ناکافی لباس کے ساتھ یوں بیٹھا ہوا تھا کہ اس کی آنکھیں خلا میں گھور رہی تھیں اور وہ زیرِ لب کچھ کہہ رہا تھا۔ کوٹھری کے دروازے کے اوپر سے جھانک کر ایلڈر نے اسے آخری بار دیکھا اور سر پر ہیٹ رکھ کر وہاں سے نکل آیا۔ فرید باہر اس کا منتظر تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”تم نے دیکھ لیا؟“

”ہاں اور وہ بھی میر یارتھ فیلڈ جیسے انجام کو پہنچا ہے۔“

”اب تم اس بارے میں کسی سے کچھ نہیں کہو گے۔“

ایلڈر نے پُرخیال نظروں سے اسے دیکھا اور بولا۔ ”ہاں میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔ میری زبان بند رہے گی۔ برادرہڈ والوں کی سزا قانونی سزا سے زیادہ بھیانک ہے!“

☆☆☆

سارجنٹ فرید بگھی سے چینی قہوہ خانے کے سامنے اترا اور اندر آیا۔ اس بار اس کے چینی مالک نے اسے نہیں روکا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ فرید کیوں آیا ہے۔ وہ سیدھا صوفے پر دراز ایلڈر کے پاس پہنچا اور بولا۔ ”اٹھ جاؤ... تمہارے لیے ایک اچھی خبر ہے۔“

مگر ایلڈر ساکت لیٹا رہا۔ فرید اسے تھپڑ مارنے جا رہا تھا کہ رک گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ ایلڈر کی نیم وا آنکھیں ہی نہیں، اس کا سینہ بھی ساکت تھا۔ اس کے برابر میں واڈکا کی خالی بوتل کے ساتھ چھوٹا حقہ رکھا تھا جس میں افیون کی گولی کی راکھ موجود تھی۔ فرید اس کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا۔ ”اچھا دوست ہمیشہ کے لیے سو گئے۔ اب تمہیں کوئی نہیں اٹھا سکتا۔“ کہتے ہوئے اس کے لہجے اور آنکھوں میں نمی آ گئی۔ ”تم نے عجلت سے کام لیا میرے دوست... مرنے والی اینا نہیں میری جینن تھی۔ اینا زندہ ہے۔ میں تمہیں اس کی زندگی کے بارے میں بتانے آیا تھا لیکن اب مجھے اینا کو تمہاری موت کے بارے میں بتانا پڑے گا۔“ اس نے ایلڈر کی آنکھیں بند کر دیں اور کھڑا ہو گیا۔

☆☆☆

اینا رین فوسٹر شمالی اسکاٹ لینڈ کے اس چھوٹے سے گاؤں میں اپنے مکان سے باہر نکلی۔ یہاں سے دو سو فٹ نشیب میں پھیلا سمندر دور تک صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے آواز دی۔ ”میری جینن... تم کہاں ہو؟“

پانچ سال کی بچی بھاگتی ہوئی آئی اور اس سے لپٹ گئی۔ وہ بالکل اپنی ماں، میر یارتھ فیلڈ کی طرح خوب صورت تھی۔ اس کی نیلی آنکھیں باپ پر گئی تھیں۔ اس کی رگوں میں شاہی خون تھا، وہ ایک شہزادے کی اولاد تھی جس نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک طوائف سے خفیہ شادی کی۔ اس بدنام بازار کے بھوکے گدھ اس بچی میں مستقبل کی ایک نوخیز طوائف کی تصویر دیکھ رہے تھے لیکن اینا نے مخالفانہ طوفان سے ٹکرا کر اسے غلاظت کے ڈھیر میں جانے سے بچا کر اپنی گود میں پروان چڑھایا تھا۔ اسے ایک باعزت پہچان دی تھی۔ لیکن یہ راز اب ہمیشہ کے لیے چھپ گیا تھا۔ قصبے والے یہ جانتے تھے کہ میری جینن، اینا کی بیٹی ہے۔ اسے لپٹا کر اینا نے دور ڈوبتے سورج کی طرف دیکھا اور لڑکی کو لے کر واپس مکان میں چلی گئی۔

★

مغربی کرداروں کی کمزوریاں جو بڑھ کے جرم کی گھناؤنی صورت اختیار کر لیتی ہیں...

حفظِ ماتقدم

تنویر ریاض

محبت اور کسی کی توجہ زندگی کو رنگین اور خوب صورتی سے ہمکنار کر دیتی ہے... وہ بھی کسی کی چاہ کے حصول کی خواہ تھی... مگر ہر دفعہ اس کے ساتھ قسمت دھوکا دے جاتی... بالآخر اس دھوکا دہی سے بچنے کا حل اس نے ڈھونڈ نکالا...

گھنٹی بجنے پر ایملی نے فون اٹھایا۔ دوسری جانب سے اس کی ماں بول رہی تھی۔ ”تم کبھی میری بات نہیں سنتیں اور اسی وجہ سے پریشان رہتی ہو۔ اس لڑکے کے ساتھ تمہارا رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ تم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں۔ مجھے تو یہ کوئی مشکوک شخص معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے یہ کوئی قاتل ہو۔“

ایملی نے آنکھیں بند کرلیں، وہ تصور میں اپنی ماں کے ماتھے پر شکنیں دیکھ سکتی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اسے منگنی نہیں کرنا چاہیے اور نہ ہی وہ ایسا چاہتی تھی۔ اس کے باوجود وہ اپنے غصے پر قابو نہ رکھ سکی اور بولی۔ ”ہاں، تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میں واقعی بہت بے وقوف ہوں۔ نہ جانے اپنے جوتوں کے فیتے بھی کس طرح باندھ لیتی ہوں۔ واقعی جوائے ایک قاتل ہے، میں نہیں جانتی تھی کہ تمہیں یہ بات کس طرح بتاؤں، بہت بہت شکریہ کہ تم نے مجھے وضاحت کرنے کا موقع دیا۔“

اس نے آنکھیں بند کرلیں اور اپنے آپ کو لعنت ملامت کرنے لگی۔ ”بے وقوف، تم نے یہ کیا کر دیا۔“ اس نے اپنی آواز پر قابو پانے کی کوشش کی اور بولی۔ ”ہوسکتا ہے کہ اب وہ تمہیں قتل کر دے۔“

”یہ سچ ہے ایملی کہ میں ایک اچھی ماں نہیں ہوں کیونکہ اپنے بچوں کے لیے پریشان رہتی ہوں۔ یہ سب میری ہی غلطی ہے۔ تم نے ان برسوں میں کتنی بار مجھے روکنے کی کوشش کی۔“

ایملی اپنی انگلیوں سے پیشانی دبانے لگی، اس کے سر میں درد شروع ہو گیا تھا۔ ”یہ بھی میرا قصور تھا کہ تم سوتی تھیں۔“ اس کی ماں کہہ رہی تھی۔ یہ وہی پرانا راگ تھا جو وہ برسوں سے سنتی آ رہی تھی۔ ”سب کچھ میری غلطی سے ہوا کیونکہ میں ایک بُری ماں ہوں۔“

اس نے اپنے کان فون سے ہٹا لیے اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ شام ڈھل رہی تھی اور اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ اس نے فیصلہ کرلیا کہ اب وہ ماں کی کوئی بات نہیں سنے گی ورنہ اس کی باتیں کبھی ختم نہ ہوں گی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تنگ آ کر وہ اس کا فون سننا ہی چھوڑ دے۔ اپنی بہن ثریا کی طرح جس نے ماں سے بات کرنا چھوڑ دی تھی اور جب کبھی وہ ایملی سے بات کرتی تو اسے بھی ماں سے قطع تعلق کرنے پر زور دیتی۔ ایملی اس حد تک نہیں جانا چاہتی تھی کیونکہ اس کے خیال میں یہ ایک نامناسب فیصلہ ہوتا۔

اس نے ماں کو مزید بولنے کا موقع نہیں دیا اور بولی۔ ”ماں تم نے ہمیشہ میرے ساتھ زیادتی کی اور تم یہ اچھی طرح جانتی ہو۔“ وہ کچن ٹیبل پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”تم تو ابھی تک جوائے سے ملی بھی نہیں ہو پھر اس کے بارے میں رائے کیسے قائم کرلی اور اگر تمہارا یہی رویہ رہا تو مستقبل قریب میں بھی اس کا کوئی امکان نہیں۔“

پھر وہ اپنے آپ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ”اور جوائے یقیناً میرا رکھوالا ہے۔ میں پوری طرح محتاط ہوں اور اب پہلے کی طرح نہیں ہوگا۔“

”میں صرف تمہارے لیے پریشان ہوں۔“ ماں بولی۔ ”میں نہیں چاہتی کہ تم پہلے والی غلطی کرو.....“

ایملی اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔ ”ماں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔ جوائے میرے ساتھ بہت اچھا ہے۔ میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ وہ بہت اچھا انسان ہے۔“

”لیکن کیا تم واقعی اس کے بارے میں سب کچھ جانتی ہو؟“ اس کی ماں ہمیشہ کی طرح اپنی بات پر اصرار کرتے ہوئے بولی۔ ”تم اس سے صرف تین مہینے پہلے ملی تھیں اور اس کے ساتھ رہنا شروع کر دیا۔ کیا یہ بے وقوفی نہیں ہے؟“

”اوہ، بہت وقت ہو گیا۔“ ایملی اپنی آواز میں جوش پیدا کرتے ہوئے بولی۔ ”ماں مجھے جانا ہے۔ تمہیں چند روز میں فون کروں گی۔ میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں۔“

اس نے ماں کے جواب کا انتظار کیے بغیر فون بند کر دیا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور گہرا سانس لیتے ہوئے میز پر جھک گئی۔ وہ دونوں ہاتھوں میں اپنا سر تھامے بڑبڑا رہی تھی۔ ”میں نہیں جانتی کہ وہ مجھ سے خوش کیوں نہیں ہے۔ وہ ہمیشہ بُرے کی امید رکھتی ہے اگر ڈیڈی سے اس کی نہیں بنی تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ ہر مرد کو برا سمجھنے لگے۔“

اس سے پہلے کہ اس کے ذہن میں پرانی یادیں تازہ ہو جاتیں۔ اس نے باپ کے خیال کو جھٹک دیا اور اپنے لیے کافی بنانے لگی۔ گھر میں خاموشی تھی صرف ہوا کی سرسراہٹ سنائی دے رہی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ جوائے کے ساتھ رہنے کا فیصلہ درست تھا۔ ماں اس کے بارے میں غلط سوچ رہی ہے۔

ایک بار پھر اس کے سیل فون کی گھنٹی بجی اور اس کے چند سیکنڈ بعد لیپ ٹاپ بھی آن ہو گیا۔ وہ حیران ہو کر لیپ ٹاپ کی طرف دیکھنے لگی کیونکہ اسے زیادہ تر اپنے کام سے متعلق ای میلز موصول ہوتی تھیں لیکن ان دنوں گھر کی سیٹنگ کرنے کے لیے اس نے چند روز کی چھٹی لے رکھی تھی۔ جوائے اپنے کام کے سلسلے میں شہر سے باہر گیا ہوا تھا اور رات سے پہلے اس کی واپسی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ایملی کچھ دن گھر میں رہ کر اس ماحول کی عادی ہو جائے۔ وہ واقعی ایک خوب صورت مکان تھا اور یہاں رہ کر اسے اپنے گھر جیسا احساس ہو رہا تھا۔

اس نے لیپ ٹاپ کھولا اور ای میلز باکس پر نظر پڑتے ہی اس کی بھنویں تن گئیں۔ ای میل بھیجنے والے نے

یقیناً فرضی نام اختیار کیا تھا۔ وہ اس ای میل کو خارج کر دینا چاہ رہی تھی کہ اچانک اس کی نظر موضوع پر گئی اور وہ اپنی جگہ پر سُن ہو کر رہ گئی۔ وہاں لکھا ہوا تھا۔ ”جوائے ویل وہ نہیں جو تم سمجھ رہی ہو۔“

وہ اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔ ”یہ کیا بکواس ہے؟“ اس نے ایک بار پھر اس ای میل کو نکالنے کے بارے میں سوچا لیکن اندر سے آواز آئی۔ ”یہ بے وقوفی ہوگی، اس ای میل کو پڑھنا چاہیے۔ ویسے یہ کوئی خطرناک بات نہیں ہے ممکن ہے کسی نے شرارت کی ہو۔ یہ جوائے کی کوئی پرانی گرل فرینڈ بھی ہو سکتی ہے۔“

جوائے نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ اس کی ایک سابق گرل فرینڈ کوئی مسئلہ پیدا کر سکتی ہے کیونکہ اس نے خوشی سے اس علیحدگی کو قبول نہیں کیا تھا مجبوراً جوائے کو عدالت سے رجوع کرنا پڑا کہ وہ اس لڑکی کو اس سے دور رہنے کا حکم جاری کرے لیکن یہ اس وقت کی بات تھی جب وہ بیٹن روگ میں رہتا تھا۔ اب وہ نیو اورلینز کے اس مکان میں گزشتہ چھ ماہ سے رہ رہا تھا جب اس نے عدالتی حکم کے بارے میں بتایا تو وہ سوچ میں پڑ گئی کہ پھر جوائے نے بیٹن روگ کیوں چھوڑا لیکن اس نے یہ بات جوائے سے نہیں پوچھی۔

ایملی نے سوچا کہ اسے یہ ای میل ضرور پڑھنی چاہیے اگر یہ اسی لڑکی نے بھیجی ہے تو شاید اسے بھی اس لڑکی کو اپنے سے دور رکھنے کے لیے عدالتی حکم کی ضرورت پڑ سکتی ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسے یہ ای میل ایڈریس کہاں سے ملا؟

اس کے جسم میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں اور وہ پسینے سے شرابور ہو گئی۔ اس نے ایک بار پھر کھڑکی سے جھانک کر دیکھا اور خود کلامی کے انداز میں بولی۔ ”تم پاگل ہو گئی ہو۔ کوئی اندر نہیں جھانک سکتا۔ بیرونی باڑھ بہت اونچی ہے اگر تم ان کی کھڑکیاں نہیں دیکھ سکتیں تو انہیں بھی تمہارے گھر میں کچھ نظر نہیں آئے گا۔“

اس نے بے چینی کے عالم میں اپنا نچلا ہونٹ دبایا اور ایک بار پھر کمپیوٹر اسکرین کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”مجھے اس ای میل کو جوائے کے لیے محفوظ کر لینا چاہیے۔ وہ خود ہی دیکھ لے گا اگر یہ اس لڑکی نے بھیجی ہے تو بہتر ہے کہ جوائے ہی اس سے نمٹ لے۔ شاید اس میں کوئی ایسی بات ہو جسے پڑھ کر میں پریشان ہو جاؤں۔“

اس کے ساتھ ہمیشہ سے ہی یہ مسئلہ تھا کہ جب بھی وہ کسی کشمکش میں مبتلا ہوتی تو اس کے پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگتے۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ بچپن میں وہ جب بھی اپنے ماں باپ کو لڑتا ہوا دیکھتی تو بیمار پڑ جاتی پھر ان کے والدین میں علیحدگی ہو گئی۔ اسکول میں جب دوسرے بچے اسے طنز و تضحیک کا نشانہ بناتے تو وہ ان سے دور بھاگ جاتی اور اس کا دل چاہتا کہ وہ کبھی اسکول نہ جائے۔

اس نے لیپ ٹاپ بند کیا اور کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی پھر وہ لونگ روم میں آئی جہاں فرنیچر کے ساتھ اس کے سامان کے ڈبے رکھے ہوئے تھے۔ اس نے کٹر سے ایک باکس پر لگا ہوا ٹیپ اتارا جس میں کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے اپنے پسندیدہ مصنف کی کتابیں نکال کر الماری کے سب سے اوپری خانے میں رکھ دیں۔ جوائے اس کے لیے کئی بک شیلف لے کر آیا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ایملی پڑھنے کی بہت شوقین ہے اور اس کے پاس کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس مکان میں آنے سے پہلے ہی جوائے نے اس کے لیے کپڑوں کی الماری اور ڈریسنگ ٹیبل کا بھی انتظام کر لیا تھا اور اس کی ضروری اشیا کے لیے باتھ روم میں بھی ایک کیبنٹ خالی کر دیا تھا۔ اسے جوائے سے کسی چیز کے لیے کہنے کی ضرورت نہیں پڑی اور اس نے ایملی کے کہے بغیر ہی تمام انتظامات کر دیے۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے ایملی کا کتنا خیال ہے۔ یہی وہ خوبیاں تھیں جن کی وجہ سے وہ اس پر مرمٹی تھی اور بڑی تیزی سے اس کی محبت میں گرفتار ہو گئی۔

ماں کی طرح اس کی بہترین سہیلی ایلیسن کا بھی یہی خیال تھا کہ وہ بہت تیز جا رہی ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ صرف چھ مہینے میں وہ جوائے کو کس طرح سمجھ سکتی ہے لیکن اس نے ایلیسن کے خیال کو یہ سوچ کر مسترد کر دیا کہ وہ حسد کی وجہ سے ایسا کہہ رہی ہے۔ اسے خود اپنے بوائے فرینڈ سے ڈیٹنگ کرتے ہوئے تین سال ہو گئے تھے لیکن ابھی تک اسے شادی کی انگوٹھی پہننا نصیب نہیں ہوئی تھی اور ایملی کو یقین تھا کہ مستقبل قریب میں بھی اس کا کوئی امکان نہیں۔

اس نے بڑی احتیاط سے کتابیں شیلف میں رکھنا شروع کر دیں۔ وہ ایک کتاب اٹھاتی، اس کے سرورق پر نظر ڈالتی اور اسے ترتیب کے ساتھ مخصوص خانے میں رکھتی جاتی۔ ابھی اس نے بیس پچیس کتابیں ہی رکھی ہوں گی کہ ایک بار پھر فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے لیپ ٹاپ کھول کر دیکھا۔ ایک اور ای میل آ گئی تھی۔ وہ اسے ڈیلیٹ کرنے والی تھی کہ اس کی نظر موضوع پر چلی گئی۔ وہاں لکھا تھا۔ ”جوائے نے میری بہن کو قتل کیا ہے۔“

اس نے غصے میں آ کر ٹیلی فون فرش پر پٹخ دیا پھر اس نے کانپتے ہاتھوں سے اسے اٹھایا اور دوبارہ لیپ ٹاپ کھول لیا۔ باہر تیز ہوا چل رہی تھی اور اندھیرا پوری طرح پھیل گیا تھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے ہمت کر کے ای میل کھولی اور اسے پڑھنے لگی۔ اس میں لکھا تھا۔

”میری تم سے کوئی دشمنی نہیں بلکہ میں تو تمہیں جانتی بھی نہیں ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ تمہیں یہ ضرور معلوم ہونا چاہیے کہ تم ایک قاتل کے ساتھ رہ رہی ہو۔ جوائے ویل نے میری بہن کو قتل کیا ہے لیکن اس وقت اس کا نام جوائے والٹر یلا تھا۔ تم گوگل پر جوائے اور ٹریسی گڈون کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتی ہو۔ یہ میرا فرض تھا کہ تمہیں جوائے کی اصلیت سے آگاہ کر دوں کیونکہ تمہارے لیے یہ جاننا بہت ضروری ہے۔“

اس کا دماغ بوجھل ہو گیا اور آنکھوں کے آگے دھند چھانے لگی۔ اس نے دل میں سوچا۔ ”نہیں، یہ سچ نہیں ہے۔ وہ عورت پاگل ہے۔ مجھے اس ای میل کو ڈیلیٹ کر کے بھول جانا چاہیے۔“ لیکن وہ ایسا کرنے پر خود کو آمادہ نہ کر سکی۔ اس کے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ اس وقت اسے شدت سے کسی ایسی چیز کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی جس سے اسے سکون مل سکے مثلاً چاکلیٹ، آئس کریم یا کوئی مٹھائی لیکن گھر میں اس وقت کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کے لیے اسے کونے پر واقع اسٹور تک جانا پڑتا۔

”نہیں۔“ اس نے با آوازِ بلند کہا اور گہرا سانس لیتے ہوئے بولی۔ ”مجھے مٹھائی یا چاکلیٹ کی ضرورت نہیں۔ میں ایک مضبوط عورت ہوں اور ان چیزوں کے بغیر بھی اس صورتِ حال سے نمٹ سکتی ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے گوگل کھولا اور اس میں دونوں نام ٹائپ کر دیے۔ اسے یقین تھا کہ وہ عورت غلط کہہ رہی ہے۔

فون کی گھنٹی بجی تو وہ کمپیوٹر کو چھوڑ کر اس کی جانب متوجہ ہو گئی۔ اسکرین پر جوائے کا مسکراتا چہرہ نمودار ہوا تو وہ بولی۔ ”ہیلو بے بی۔“

”میرا خیال ہے کہ تم نے سارا سامان کھول لیا ہوگا؟“ وہ بولا۔

جوائے کی آواز سن کر اسے لگا کہ واقعی بہت بڑی بے وقوف ہے جو ایک فضول سی ای میل کو پڑھ کر پریشان ہو رہی ہے۔ جوائے قاتل نہیں ہو سکتا بلکہ روئے زمین پر سب سے پیارا شخص ہے اور وہ خوش قسمت ہے کہ اسے جوائے جیسے شخص کا ساتھ ملا۔

”میرا کام تقریباً مکمل ہو گیا ہے۔“ وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ”میں نے تمہیں پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ تمہارے مکان پر قبضہ کرنے والی ہوں۔ یہ بتاؤ کہ تمہارا ٹرپ کیسا رہا؟“

”بہت اچھا۔“ جوائے کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک تھی۔ ”مجھے کچھ نئے گاہک مل گئے ہیں اور انہوں نے ہماری نئی دواؤں میں دلچسپی ظاہر کی ہے۔ امید ہے کہ مجھے ایک معقول کمیشن مل جائے گا۔“

جوائے ایک دواؤں کی کمپنی میں سیلز سپر ہیڈ تھا جس کی وجہ سے اسے مسلسل شہر سے باہر جانا پڑتا۔ ان دونوں کی ملاقات بھی اسی طرح ہوئی تھی۔ وہ اپنے کام کے سلسلے میں اس کلینک میں آیا تھا جہاں وہ کام کرتی تھی لیکن اس وقت وہ جذباتی طور پر اس حالت میں نہیں تھی کہ کسی کے ساتھ ڈیٹ پر جا سکتی وہ صرف کام پر جاتی اور گھر واپس آ جاتی۔ اس کے علاوہ اسے کسی اور بات سے دلچسپی نہیں تھی۔ وہ بچپن سے ہی بہت موٹی تھی اور اس کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ کوئی لڑکا اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا چنانچہ اس نے اپنا وزن کم کرنے پر توجہ دی اور جب اس میں کامیاب ہو گئی تو اسے کسی مرد کے ساتھ کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ انہی دنوں جوائے سے اس کی ملاقات ہوئی اور اس نے ایملی کو ڈیٹ پر چلنے کی پیشکش کر دی۔ تین مہینے تک وہ اسے ٹالتی رہی لیکن اس کے مسلسل اصرار سے مجبور ہو کر ایک دن اس کے مکان میں چلی آئی۔

”اس وقت میں کچھ دیر کے لیے فارغ ہوں اس لیے سوچا کہ تم سے کچھ باتیں کر لی جائیں۔“ جوائے نے کہا۔

”میں بھی تمہیں ہی یاد کر رہی تھی۔“ ایملی نے جواب دیا۔ ”میری خواہش ہے کہ تم جلدی سے واپس آ جاؤ۔“

جوائے نے پیار بھرے انداز میں کہا۔ ”میں شام تک آ جاؤں گا لیکن میری خواہش تھی کہ اس وقت بھی تمہارے پاس ہوتا۔ ایملی میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔“

”میں بھی تم سے محبت کرتی ہوں۔“ اس نے کہا لیکن اس سے پہلے وہ فون رکھ چکا تھا۔

اس نے بھی اپنا فون رکھ دیا اور مسکرانے لگی۔ ”میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ کسی سے دوبارہ محبت کر سکوں گی۔“ اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ ”اب میری زندگی میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ ایک خوب صورت مکان، محبت کرنے

والا مرڈ کون سوچ سکتا ہے کہ مجھے یہ سب کچھ اتنی آسانی سے مل جائے گا۔ خاص طور پر اس واقعے کے بعد......"

اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور نچلا ہونٹ کاٹنے لگی۔ وہ ماضی کو بھول جانا چاہتی تھی۔ اس نے ذہن کے دریچے بند کردیے تاکہ ماضی کی کوئی یاد باہر نہ آسکے۔ جب اسے یقین ہوگیا کہ وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہوگئی ہے تو آنکھیں کھول دیں اور مسکرانے لگی۔ اس کی نظر لیپ ٹاپ اسکرین پر گئی جہاں وہ نام جگمگا رہے تھے جو اس نے تھوڑی دیر پہلے ٹائپ کیے تھے جوائے ویلز یلا اور ٹریسی گلڈون۔

"ایسا مت کرو۔" اس نے اپنے آپ سے کہا۔ "جس کسی نے بھی ای میل بھیجی ہے وہ صرف تمہیں اذیت دے رہا ہے تمہیں اس بات کو یہیں ختم کردینا چاہیے۔ تم خوشیوں کی حق دار ہو اس لیے خوشیاں سمیٹو۔"

ایک اور آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی جو اس کی ماں سے ملتی جلتی تھی۔ "ٹھیک ہے، تم اپنی آنکھیں بند کرلو کیونکہ تم اس کے بارے میں کچھ جاننا نہیں چاہتیں جیسا تم نے پچھلی بار کہا تھا کہ اگر تم یہ غلطی نہ کرتیں تو اتنی تکلیف نہ اٹھانا پڑتی۔ اب بھی اگر کچھ ہوا تو اس کا الزام کسی اور کو مت دینا۔"

"چپ ہوجاؤ۔" اس نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور کمپیوٹر سے دور چلی گئی۔ اس نے اپنے لیے کافی کا ایک اور کپ بنایا۔ کافی سے ہمیشہ اس کی بھوک مرجاتی تھی حالانکہ اس وقت بھی اس کے دماغ میں کیک، چاکلیٹ اور ڈونٹ کا تصور ابھر رہا تھا۔

ایک بار پھر وہی آوازیں ابھریں۔ "اس طرح نظریں چرانا ٹھیک نہیں۔ تمہاری ماں ٹھیک ہی کہتی ہے۔ تمہارے ساتھ یہی ہونا چاہیے تھا۔"

وہ جھلاہٹ کے عالم میں ایک بار پھر کمپیوٹر کے پاس بیٹھ گئی اور سرچ کا بٹن کلک کردیا۔ سب سے پہلے اس کی نظر اخبار میں شائع ہونے والے ایک مضمون پر گئی جس کا عنوان تھا۔ "محبوبہ کو قتل کرنے والے بوائے فرینڈ کی تلاش۔"

اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ اب وہ اس تحریر کو پڑھے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ پینڈورا بکس کھل چکا تھا۔ اس نے ایک بار پھر کلک کیا۔ اس مضمون میں لکھا تھا۔ "پولیس ٹریسی گلڈون کے بوائے فرینڈ کو تلاش کررہی ہے تاکہ اس سے پوچھ گچھ کرسکے۔ مقتولہ ٹریسی کی لاش جھاڑیوں میں ملی تھی جسے گزشتہ سہ پہر چند راہگیروں نے دیکھا۔ ستائیس سالہ گلڈون کی گمشدگی کی رپورٹ اس کی بہن میلانی میتھوز نے لاش دریافت ہونے سے ایک گھنٹا پہلے درج کروائی تھی۔ گلڈون آخری بار دو دن پہلے اپنی بہن سے ملی تھی دونوں بہنوں نے ایک ساتھ لنچ کیا تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ گلڈون کے تعلقات ہوسٹن کی دواؤں کی کمپنی کے سیلز رپ جوائے ویلز یلا سے تھے......"

ایملی اپنی جگہ سے اٹھی اور گھر کا بیرونی دروازہ کھول کر پورچ میں بیٹھ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ اپنی ٹانگوں پر رکھے اور آگے پیچھے جھولنے لگی۔ پورے علاقے میں سناٹا چھایا ہوا تھا اور سڑک کی روشنیاں جل رہی تھیں۔

"یہ وہ نہیں ہے۔" اس نے اپنے آپ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "بے شک اس کا نام اور کام ملتا جلتا ہے لیکن نام بدلنا اتنا آسان نہیں۔ وہ ایسا کیوں کرے گا۔ یقیناً یہ اس کی سابق گرل فرینڈ کی حرکت ہے۔ وہی مجھے تنگ کرنے کی کوشش کررہی ہے اور ملتے جلتے نام کی وجہ سے اسے یہ فساد کھڑا کرنے کا موقع مل گیا۔"

اس نے گہری سانس لی اور اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ "تم ہمارے لیے مشکل پیدا نہیں کرسکتیں۔ میں تمہیں ہرگز ایسا نہیں کرنے دوں گی۔"

ہوا تیز چل رہی تھی اور ہلکی ہلکی بوندیں پڑنا شروع ہوگئی تھیں۔ یقیناً تھوڑی دیر بعد طوفان آنے والا تھا۔ وہ دوبارہ گھر کے اندر جاکر میز پر بیٹھ گئی اور اس نے ایک بار پھر لیپ ٹاپ پر نظریں جمادیں۔ اس مضمون کے ساتھ تصویریں بھی شائع ہوئی تھیں۔ ٹریسی گلڈون خوب صورت لڑکی تھی اور تصویروں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ یہ کسی مال میں کھینچی گئی تھیں۔ اس کے بال سنہرے، ناک ستواں اور ہونٹ بھرے بھرے تھے۔ وہ ہر لحاظ سے ایک پُرکشش لڑکی تھی۔ دوسری تصویر جوائے ویلز یلا کی تھی جسے وہ جوائے ویلی کے نام سے جانتی تھی۔ وہی آنکھیں، وہی مسکراہٹ، وہی خوب صورت چہرہ۔ وہ اسے پہچاننے میں کیسے غلطی کرسکتی تھی۔

گویا اس نے جھوٹ بولا تھا۔ اس کے علاوہ بھی اس نے نہ جانے کتنے جھوٹ بولے ہوں گے۔ اس کے ساتھ ایک بار پھر دھوکا ہوا تھا۔ اسے بہت زور کی ابکائی آئی۔ وہ سنک کی جانب لپکی اور دوسرے ہی لمحے اس کے معدے نے سب کچھ اگل دیا۔ اس نے کلی کی اور چہرہ دھوکر اس کمرے کی طرف چل دی جسے جوائے اپنے دفتر کے طور پر استعمال کیا کرتا تھا۔ اس کا کمپیوٹر میز پر رکھا ہوا تھا۔ وہ وہاں بیٹھ گئی اور کمپیوٹر آن کردیا لیکن وہ پاس ورڈ نہیں جانتی تھی۔ اس نے سوچا۔ "مجھے اس قصے کو یہیں ختم کردینا چاہیے۔

حفظ ما تقدم

کیا کوئی کریش پروگرام بھی ہے؟ یہ خاتون ایک گھنٹے میں ڈرائیونگ سیکھنا چاہتی ہیں

وہ اسے قاتل نہیں ہوسکتا۔"

اس نے آنکھیں بند کرلیں اور کچھ یاد کرنے لگی پھر اس کی نظروں کے سامنے وہ منظر گھوم گیا۔ جوائے اپنی میز پر بیٹھا ہوا تھا اور وہ کمرے کے دروازے میں کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرایا۔ اس کی انگلیاں کی بورڈ پر چل رہی تھیں۔ وہ لمحہ ایملی کے ذہن میں نقش ہوگیا تھا۔ اس نے اپنی انگلیاں کی بورڈ پر رکھیں اور جوائے کے انداز میں ہی مختلف بٹن دبانے لگی پھر اس کی دائیں انگلی انٹر کے بٹن سے ٹکرائی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ کمپیوٹر آن ہوگیا تھا۔ ایک بار پھر اس کے اندر سے آواز آئی۔

"کمپیوٹر بند کردو اور سب کچھ بھول جاؤ۔ تم یہ سب نہیں کرنا چاہتیں۔ تم تو یہ بھی نہیں جانتیں کہ کیا تلاش کررہی ہو۔"

ڈیسک ٹاپ پر جوائے کے نام کا فولڈر تھا۔ اس نے اسے کلک کیا تو فولڈرز کی ایک فہرست اس کے سامنے آگئی۔ ایک لمحے کے لیے اس کی رگوں میں خون منجمد ہوگیا اور اس کے حلق سے بے اختیار چیخ نکل پڑی۔ ان میں ایک فولڈر ٹریسی کے نام کا تھا۔

اس نے اپنے دل کو تسلی دی۔ "نہیں یہ وہ لڑکی نہیں ہے۔ یہ محض اتفاق بھی ہوسکتا ہے۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا کمپیوٹر بند کردو اور یہاں سے چلی جاؤ۔"

اس نے فولڈر کھولا۔ وہاں کئی فائلیں تھیں ان سب پر ترتیب سے نمبر پڑے ہوئے تھے۔ اس نے اپنا ہاتھ پیچھے ہٹالیا لیکن ان فائلوں کو دیکھ کر انہیں کھولنے کی خواہش ہونے لگی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ میز پر رکھ دیے اور کرسی کو پیچھے دھکیل دیا پھر وہ اٹھی اور دفتر سے باہر جانے لگی لیکن دروازے پر رک گئی۔

"مجھے اس پر بھروسا کرنا چاہیے۔" اس نے سوچا۔

"یہ کہنا آسان تھا لیکن کرنا مشکل۔" اندر سے آواز آئی۔ "یاد کرو پچھلی بار کیا ہوا جب تم نے ایک مرد پر بھروسا کیا تھا۔"

"چپ ہوجاؤ۔" اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"تم کبھی بھی خوش نہیں رہ سکتیں۔" اسی آواز نے سرگوشی کی۔ "تم جیسی عورتیں کبھی مطمئن نہیں ہوتیں۔"

"چپ ہوجاؤ۔" اس بار اس نے با آواز بلند کہا لیکن اسے جاننا چاہیے تھا۔ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ یہ وہی لڑکی ٹریسی تھی جس کی فائل اس کے کمپیوٹر میں ہے جب تک وہ اسے کھول کر نہ دیکھے۔ ممکن ہے کہ کسی نے وہ ای میل بھیج کر اس کے ساتھ مذاق کیا ہو لیکن یہ معلوم کرنا ضروری تھا ورنہ یہ آوازیں ہمیشہ کی طرح اس کا پیچھا کرتی رہیں گی۔

وہ دوبارہ میز کی طرف آئی اور کمپیوٹر پر بیٹھ کر دوبارہ اسی فولڈر کو کلک کیا اور پہلی فائل کھل گئی۔ اس کے سامنے وہی مسکراتا ہوا چہرہ تھا جو وہ مضمون کے ساتھ شائع ہونے والی تصویر میں دیکھ چکی تھی۔ وہ لڑکی کیمرے کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اس کے بال گیلے تھے اور پانی کے قطرے اس کی جلد کو بھگو رہے تھے۔ اس نے تیراکی کا لباس پہن رکھا تھا اور پس منظر میں سوئمنگ پول کا نیلا پانی نظر آرہا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں بیئر کی بوتل پکڑی ہوئی تھی اور یوں لگ رہا تھا کہ اسے دنیا کی کوئی پروا نہیں ہے۔

ایملی کا حلق خشک ہورہا تھا۔ اس نے دوسری تصویر کو کلک کیا۔ وہ سب ٹریسی کی ہی تصویریں تھیں۔ وہ ہر تصویر میں مسکرا رہی تھی۔ ایملی نے ایک ایک تصویر کو غور سے دیکھا اور اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ وہ آخری تصویر پر پہنچ گئی۔ جیسے ہی اس نے وہ تصویر کھولی۔ اس کے حلق سے ایک بھیانک چیخ نکلی۔ وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکی اور کرسی سمیت عقبی دیوار سے جا ٹکرائی۔

کمپیوٹر پر نظر آنے والی تصویر میں ٹریسی بالکل برہنہ تھی۔ اس کا جسم زخمی اور جگہ جگہ سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا اور ہاتھ پاؤں رسی سے بندھے ہوئے تھے۔ وہ بستر پر چت لیٹی ہوئی تھی اور اس کی آنکھوں میں دہشت نمایاں تھی۔

وہ اب بھی جوائے کے بارے میں خوش گمانی میں مبتلا

تھی۔ اسے خیال آیا کہ شاید یہ تصویر اسی شخص نے جوائے کو بھیجی ہو جس نے ٹریسی کو قتل کیا تھا۔ ایک بار پھر اس کے کانوں میں ماں کی طنزیہ آواز گونجی۔

"یقیناً اسی لیے اس نے دوسری اچھی تصویروں کے ساتھ فولڈر میں محفوظ کرلیا۔ عموماً لوگ ایسا ہی کرتے ہیں۔"

ایملی نے کمپیوٹر بند کیا اور دفتر سے باہر چلی گئی۔ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ وہاں مکمل تاریکی تھی اور بارش شروع ہوچکی تھی۔ اس کا معدہ خالی تھا اور اسے بڑی زور کی بھوک لگ رہی تھی۔ وہ راہداری سے گزرتی ہوئی کچن میں آئی لیکن وہاں کھانے کے لیے کچھ نہ تھا۔ آئس کریم، چاکلیٹ یا مٹھائی کیونکہ اس نے یہ چیزیں رکھنا چھوڑ دی تھیں۔ جوائے کا کہنا تھا کہ اسے اپنا طرز زندگی بدل کر صحت بخش غذا لینی چاہیے۔

اس نے کیبنٹ کھول کر بوتل نکالی اور ایک گلاس میں تھوڑی سی جن انڈیل کر اس میں چند ٹکڑے برف کے ڈال دیے۔ اس کا دل اتنی تیزی سے دھڑک رہا تھا کہ وہ خود بھی یہ آواز سن سکتی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں لرزہ طاری تھا۔ وہ گلاس کاؤنٹر پر رکھ کر بڑبڑانے کے انداز میں خود سے مخاطب تھی۔

"تمہیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ تم دوبارہ یہ صدمہ برداشت نہیں کرسکتیں۔ اپنی چیزیں اکٹھی کرو اور یہاں سے چلی جاؤ۔ تم بعد میں واپس آسکتی ہو اگر......"

ایک بار پھر اس کے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور چند سیکنڈ بعد کمپیوٹر میں بھی تھرتھراہٹ پیدا ہوئی۔ اس کے حلق سے ہلکی سی چیخ نکلی۔ اس نے گلاس میں بچی ہوئی باقی ماندہ جن ایک گھونٹ میں ختم کرلی اور میز پر بیٹھنے سے پہلے اسے دوبارہ بھر لیا۔ باہر بڑے زور کی بارش ہورہی تھی اور پانی کے قطرے کھڑکی کے شیشوں سے ٹکرا کر عجیب سی آواز پیدا کررہے تھے۔ اس نے کمپیوٹر آن کیا۔ ایک اور ای میل آگئی تھی اور اس کا موضوع تھا۔

"ضروری۔"

اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ ای میل کھولی۔ اس میں لکھا تھا۔ "مجھے معلوم ہے کہ تم مجھے نہیں جانتیں لیکن میں ہر اس عورت کی طرح تمہارے لیے بھی پریشان ہوں جس کا جوائے کے ساتھ کوئی تعلق ہو کیونکہ تمہیں اس سے خطرہ ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تم میری بات کا یقین نہیں کروگی لیکن اگر تم نے گوگل پر ٹریسی کو تلاش کیا تو معلوم ہوگیا ہوگا کہ جوائے نے میری بہن کے ساتھ کیا کیا۔ پولیس والے اس کے خلاف کوئی ثبوت تلاش نہ کرسکے لہٰذا وہ نیو اورلینز چلا گیا جہاں اس نے اپنا نام بدل لیا ایسا پہلی بار نہیں ہوا۔ تم گوگل پر پامیلا مارشل کو تلاش کرو تو میری بات تمہاری سمجھ میں آجائے گی۔"

اس کا ہاتھ بری طرح کانپ رہا تھا لیکن اس مرتبہ اس نے عمل کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔ اس نے گوگل کھولا اور پامیلا مارشل کا نام ٹائپ کردیا۔ تھوڑی سی تلاش کے بعد ایک خبر پر اس کی نظریں جم گئیں۔

"لیک چارلس کی پولیس [illegible] سالہ پرائمری اسکول ٹیچر پامیلا مارشل کو تلاش کررہی ہے [illegible] کی گمشدگی کی رپورٹ اس کے بوائے فرینڈ جوائے ویل نے درج کروائی ہے۔"

اس کے ساتھ ہی پامیلا مارشل کی تصویریں بھی تھیں۔ اس کے بال سنہرے تھے اور وہ کیمرے کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ بالوں کی ایک لٹ ماتھے پر جھول رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں معصومیت جھلک رہی تھی۔

ایملی زیر لب بڑبڑاتے ہوئے بولی۔ "جوائے ویل۔"

"جوائے ویلنز بیلا۔"

"جوائے ویل۔"

اس نے لیپ ٹاپ بند کردیا اور ڈگمگاتے قدموں سے باتھ روم میں چلی گئی جو کچن کے برابر میں ہی تھا۔ اس نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ سنہرے بال، نیلی آنکھیں، دل میں بس جانے والا چہرہ اس نے چہرے پر پانی کے کئی چھینٹے مارے۔ باہر بارش کی شدت میں اضافہ ہوگیا تھا اور تیز ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور واپس کچن میں آگئی۔ جن کی بوتل اٹھا کر واپس کیبنٹ میں رکھی حالانکہ اس کا دل مزید پینے کو چاہ رہا تھا لیکن اس نے اپنی خواہش کا گلا گھونٹ دیا۔ دروازہ کھلنے کی آواز سن کر وہ اپنی جگہ پر منجمد ہوگئی۔

"ایملی۔" جوائے نے اسے پکارا۔ "کیا تم گھر پر ہی ہو؟"

اس نے زبردستی اپنے چہرے پر مسکراہٹ سجائی اور ننگے پیر ہی دروازے کی طرف چل دی۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور اس سے لپٹتے ہوئے بولی۔ "تم اتنی جلدی گھر کیسے آگئے؟ ابھی تو مجھے کھانا بھی بنانا ہے۔"

وہ اسے اپنی بانہوں میں جکڑتے ہوئے بولا۔ "ٹیلی فون پر بات کرتے ہوئے تم کچھ پریشان لگ رہی تھیں لہٰذا میں نے باقی کام ملتوی کردیے اور گھر چلا آیا۔" پھر

مسکراتے ہوئے بولا۔ "مجھے یہ اچھا نہیں لگا کہ اس بارش اور طوفان میں تم گھر پر اکیلی رہو۔ سب کچھ ٹھیک تو ہے؟"

ایملی کے دل میں نفرت کی لہر ابھری اور وہ دل ہی دل میں کہنے لگی۔ "ہاں ٹھیک ہوں سوائے اس کے کہ میں تمہاری حقیقت جان گئی ہوں۔ جس شخص کے ساتھ میں رہنے آئی تھی، وہ سیریل کلر ہے اور سنہرے بالوں والی لڑکیوں کو اپنی درندگی کا نشانہ بناتا ہے۔"

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ہاں، سوائے اس کے کہ میں تنہائی محسوس کررہی تھی لیکن ایک بات اور بھی ہے آج مجھے کچھ پریشان کن ای میلز ملی ہیں شاید یہ اسی پاگل لڑکی نے بھیجی ہوں جس کے بارے میں تم نے مجھے بتایا تھا لیکن اس کے باوجود......"

"ایملی میں نے تم سے کہا تھا کہ انہیں پڑھے بغیر ضائع کردینا۔" وہ اس کے بازو اپنی گردن سے ہٹاتے ہوئے بولا۔ "وہ صرف تمہیں پریشان کرنا چاہتی ہے۔ تم نے وہ بکواس کیوں پڑھی؟"

"میں جانتی ہوں۔" وہ اس کی جانب پیٹھ کرتے ہوئے بولی تاکہ وہ اس کا چہرہ نہ دیکھ سکے پھر چلتی ہوئی کتابوں کے بکس کی طرف آئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں بھر کر کتابیں اٹھائیں اور انہیں میز پر رکھتے ہوئے بولی۔ "میں صرف یہ دیکھنا چاہ رہی تھی کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ سوری، آئندہ ایسی ای میلز فوراً ضائع کردوں گی۔ یہ میرا وعدہ ہے۔" یہ کہہ کر وہ مڑی اور چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ لاتے ہوئے بولی۔ "مجھے ان سے کوئی پریشانی نہیں ہوئی لہٰذا تمہیں اس بارے میں فکر کرنے کی ضرورت نہیں البتہ انہیں پڑھ کر مجھے تھوڑی سی حیرت ضرور ہوئی بس اور کوئی بات نہیں۔"

جوائے کی آنکھیں سکڑ گئیں اور وہ بولا۔ "اس نے کیا لکھا تھا؟"

"او، اس نے الٹی سیدھی باتیں لکھی تھیں۔ تمہیں جاننے کی ضرورت بھی نہیں۔ اس کے علاوہ میں نے وہ ای میلز مٹادی ہیں اور آئندہ ایسی میلز کو پڑھے بغیر ہی مٹادوں گی، یہ میرا وعدہ ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ اپنا سوٹ کیس اٹھاتے ہوئے بولا۔ "مجھے گرم پانی سے غسل کرلینا چاہیے۔"

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "میں نے گیزر چلادیا تھا پانی گرم ہوگیا ہوگا۔ تم نہالو، تب تک میں اپنا کام ختم کرلیتی ہوں۔"

وہ سوٹ کیس گھسیٹتا ہوا بیڈ روم میں چلا گیا پھر تھوڑی دیر بعد باتھ روم سے پانی گرنے کی آواز آئی وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی اور زیر لب بولی۔ "تم جانتی ہو کہ اب تمہیں کیا کرنا ہے۔ تم یہ کام پہلے بھی کرچکی ہو۔"

"وہ مختلف بات تھی۔" ایملی نے اپنے آپ سے سرگوشی کی اور بقیہ کتابیں شیلف میں رکھنے لگی۔

باتھ روم سے جوائے کی سیٹی بجانے کی آواز آرہی تھی پھر وہ اندر سے چلایا۔ "ایمی، تم بھی آجاؤ پانی گرم ہے۔"

اس نے آخری کتاب شیلف میں رکھی اور بیڈ روم میں چلی گئی۔ باتھ روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ جوائے بڑے سے ٹب میں لیٹا ہوا تھا۔ وہ باتھ روم میں داخل ہوگئی۔ ٹب جھاگ سے بھر چکا تھا۔ جوائے آنکھیں بند کیے آگے کی طرف جھکا ہوا تھا۔ اس کے کندھے پانی سے باہر تھے اور تھوڑا سا جھاگ اس کے بائیں کان پر لگا ہوا تھا۔

آہٹ کی آواز سن کر اس نے آنکھیں کھول دیں اور اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور وہ چلایا۔

"ایملی نہیں۔" لیکن اس وقت تک وہ اپنا ہیئر ڈرائیر ٹب کے پانی میں پھینک چکی تھی۔

اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں پھر ساری آوازیں مدھم پڑ گئیں۔ اب صرف بارش کے قطرے گرنے کی آواز آرہی تھی پھر اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ جوائے بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا اور اس کی نظریں ایملی پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور واپس کچن میں آگئی۔ اس نے سیل فون اٹھا کر ایک نمبر ملایا اور بولی۔

"ماں تم ٹھیک ہی کہہ رہی تھیں لیکن میں نے احتیاط سے کام کیا ہے۔"

دوسری طرف خاموشی رہی پھر اس کی ماں نے کہا۔ "تمہیں یاد تھا کہ یہ ایک حادثہ معلوم ہونا چاہیے؟"

"بالکل۔"

"بہتر ہوگا کہ تم نو گیارہ کو اس کی اطلاع دے دو۔"

اس کے ساتھ ہی فون بند ہوگیا۔

ایملی نے گہری سانس لے کر نمبر ملایا اور آپریٹر کے جواب کا انتظار کرنے لگی۔ اس نے دیکھا کہ بارش کے قطرے کھڑکی پر گر کر نیچے جارہے تھے۔ اس نے اپنا دوسرا ہاتھ کھڑکی پر رکھا اور رنجیدہ ہوگئی پھر اس نے زیر لب کہا۔ "اگلی بار مجھے محتاط رہنا ہوگا، ماں ٹھیک ہی کہتی ہے۔"

محبت کا مارا

منظر امام

محبت کی وسعتوں میں کھو کے کوئی شخص اپنا بھی نہیں رہتا... اس کا خمیر محبت سے گندھا تھا... ہر سال اسے اپنے محبوب کے آنے کا انتظار رہتا... اس کے انتظار کی گھڑیاں تھیں جو طویل سے طویل ہو رہی تھیں... بالآخر ملن کا دن آن ہی پہنچا...

غموں اور اداسیوں سے چور خوشی بانٹنے والے کا فسانۂ عجائب

بکھر سے ترس گیا ہوں میں اک گہری نیند کو
الجھا رہا ہے پھر مجھے خیال میں کوئی
کمرے میں بند ہو کے میں روتا رہوں رات بھر
ہاں یاد آ رہا ہے نئے سال میں کوئی

میں نے یہ قطعہ لکھ کر اپنے کمرے کی دیوار پر چپکا رکھا ہے۔ دسمبر ختم ہونے والا ہے۔ اس کے بعد جنوری ہے اور جنوری کی پہلی تاریخ ہی میرے لیے ڈھیر سارے آنسو لے کر آیا کرتی ہے۔

میں ٹیلی فون اپنے کمرے میں اور اپنے بیڈ کے پاس ہی رکھ کر سویا کرتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ فون کی پہلی گھنٹی اس کی طرف سے ہوگی۔

اور یہی ہوتا۔ فون کی گھنٹی بجتی۔ میں ریسیور اٹھاتا اور دوسری طرف سے اس کی آواز کی گھنٹی بجنے لگتی۔

''کیا بات ہے جانو، سو رہے ہو؟''

''اس امید پر سو رہا تھا کہ تم ہی مجھے جگاؤ گی۔''

''چلو جگا دیا میں نے۔ اب نئے سال کی مبارک باد تو قبول کر لو۔'' وہ کہا کرتی۔

''ایسے نہیں، ایک عدد خوب صورت ملاقات کے وقت یہ مبارک باد قبول کی جائے گی۔''

''کیوں نہیں، تو پھر ہم بلیو ہیون میں ڈنر کر رہے ہیں۔''

بلیو ہیون ایک خوب صورت سا ریستوران تھا۔ وہاں ہلکے نیلے رنگ کا استعمال بہت زیادہ کیا گیا تھا اس لیے اس کا نام بلیو ہیون تھا۔

وہ میرا اور غزالہ دونوں کا پسندیدہ ریستوران تھا۔ ہم نے وہاں بیٹھ کر نہ جانے کتنے خواب دیکھ لیے تھے۔ اپنے آنے والے خوب صورت دنوں کے خواب۔ ان بچوں کے خواب جو ابھی اس دنیا میں نہیں آئے تھے۔ لیکن وہ اس انتظار میں تھے کہ دنیا میں آ کر ہمیں ماما اور بابا کہہ کر پکاریں۔

غزالہ ایک خوش حال گھرانے کی لڑکی تھی۔ شہر کے ایک بڑے کالج میں زیر تعلیم تھی۔

میرا ارادہ انگلش میں ماسٹر کرنے کا تھا اس لیے میں نے اپنی ساری توجہ اس کی طرف لگا دی تھی اور جو وقت ملتا وہ غزالہ کی محبت میں نکل جاتا۔

غزالہ سے میری ملاقات ایک ورک شاپ میں ہوئی تھی۔ میں نے اس ورک شاپ میں شخصیت سازی پر ایک لیکچر دیا تھا۔

ساٹھ ستر مرد، عورتیں، لڑکیاں اور لڑکوں نے وہ ورک شاپ اٹینڈ کی تھی۔ میں یہ بتا رہا تھا کہ اچھی شخصیت کی تعمیر کے لیے قوتِ ارادی کا ہونا بھی ضروری ہوتا ہے۔ پھر اس دوران میں ایک لڑکی نے کھڑے ہو کر سوال کیا۔ ''جناب! آپ یہ بتائیں، کیا حادثے اور اتفاقات انسان کو بے بس نہیں کر دیتے؟''

''بالکل کر دیتے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''تو پھر اس بے بسی میں قوتِ ارادی کہاں کام آتی ہے؟'' اس نے سوال کیا۔ ''کیونکہ حادثہ تو اچانک ہوتا ہے؟''

سوال کرنے والی لڑکی غزالہ تھی۔ ایک خوب صورت سی لڑکی۔ جس کے چہرے کے نقوش اور تیور یہ بتا رہے تھے کہ وہ نہ صرف ذہین ہے بلکہ اس کا تعلق اچھے گھرانے سے بھی ہے۔

''جی، تمہارا یہ سوال بالکل درست ہے۔'' میں نے اس کے خوابیدہ حسن سے اپنے آپ کو نکالتے ہوئے گفتگو آگے بڑھائی۔ ''تمہارا سوال بالکل ٹھیک ہے کہ جب حادثہ ہو جائے تو اس وقت قوتِ ارادی کہاں کام آتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قوتِ ارادی اس حادثے کے بعد اپنے آپ کو سنبھالنے میں کام آتی ہے۔ انسان کو بکھرنے نہیں دیتی، سمجھ گئیں؟''

''جی جناب، سمجھ گئی۔'' وہ بیٹھ گئی۔

یہ میرے لیے نئی بات تھی۔ کسی کا سوال کرنا نہیں بلکہ جناب کہہ کر مخاطب کرنا۔ لیکچر اٹینڈ کرنے والے سر کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے جبکہ وہ مجھے جناب کہہ رہی تھی۔

میں نے اس دن اس بات پر زیادہ دھیان نہیں دیا۔ ورک شاپ ختم ہونے کے بعد میں رکشا یا ٹیکسی کے انتظار

میں بس اسٹاپ پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ اسی وقت ایک گاڑی پاس آ کر رک گئی، اسے غزالہ ہی چلا رہی تھی۔

”جناب! کس طرف جائیں گے آپ؟“ اس نے کھڑکی سے سر نکال کر پوچھا۔

میں نے بتا دیا کہ مجھے کہاں جانا ہے۔

”چلیں، بیٹھ جائیں۔“ اس نے آفر دی۔ ”میں آگے نکل جاؤں گی۔“

میں اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ بہت اچھا لگا تھا اس کے ساتھ بیٹھ کر۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”غزالہ۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”اور آپ کا نام تو جانتی ہوں، کیونکہ آپ کی ورکشاپ اٹینڈ کر چکی ہوں۔“

”کیسی لگی ورک شاپ؟“

”بہت اچھی۔ لیکن آپ اس حادثے کو کیا کہیں گے؟“ اس نے پوچھا۔

”کس حادثے کو؟“

”یہی جو آپ اس وقت میرے ساتھ سفر کر رہے ہیں۔“

”یہ حادثہ نہیں، پلاننگ ہے۔ وقت کرتا ہے پرورش برسوں، حادثہ ایک دم نہیں ہوتا۔“

”چلیں، آپ کی اگلی ورک شاپ کب ہے اور کس موضوع پر ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”پندرہ تاریخ کو اور موضوع وہی ہے۔ گرومنگ۔ کیا تم شریک ہو گی؟“

”ضرور۔“

پھر ہمارے درمیان خاموشی ہو گئی۔ وہ ڈرائیونگ کرتی رہی۔ اس کی نگاہیں سامنے ٹریفک میں الجھی ہوئی تھیں اور میں خود اس میں الجھا ہوا تھا۔

اس نے مجھے میرے علاقے میں اتار دیا اور خود آگے نکل گئی۔ میں اس سے یہ بھی نہیں پوچھ سکا تھا کہ وہ کہاں رہتی ہے۔ بہرحال اس کو ورک شاپ تو اٹینڈ کرنی تھی۔

تو یہ ملاقات کی ابتدا تھی۔ ورک شاپ کا سیشن ختم ہونے کے بعد بھی ہم ملتے رہے اور کہانی آگے بڑھتی چلی گئی۔

وہ زیادہ پیسے والے لوگ نہیں تھے لیکن کھاتے پیتے ضرور تھے۔ غزالہ جس گاڑی کو چلایا کرتی، وہ اس کے باپ کی تھی اور قسطوں پر خریدی گئی تھی۔ سفید پوش لوگ تھے۔

جبکہ میں فری لانس رائٹر تھا۔ لکھنا پڑھنا اور بولنا آتا تھا۔ اس لیے ایک ادارہ مجھ سے مختلف موضوعات پر ورک شاپ کروایا کرتا۔ جس کا معاوضہ بھی مل جاتا تھا۔

اکیلا آدمی تھا اور اب زندگی میں بہت زیادہ کمی محسوس ہونے لگی تھی۔ کسی کے نرم لمس کی کمی، کسی کے پیار کی کمی، کسی کی مہربانیوں کی کمی۔

اور یہ کمی غزالہ پوری کرنے لگی تھی۔ اس سے مل کر، اس سے باتیں کر کے بہت سکون ملا کرتا۔

کسی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میرے خیالات کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ دروازے پر کوئی دستک دے رہا تھا۔

میں جس مکان میں رہ رہا تھا، وہ پرانی طرز کا مکان تھا۔ ایسا مکان جس میں آنگن بھی تھا۔ اس لیے اتنے کم کرائے پر مل گیا تھا ورنہ اس کے برابر والے مکانات بہت اچھے بنے ہوئے تھے۔

میں نے دروازہ کھولا تو نو دس برس کا ایک پیارا سا بچہ ہاتھ میں ایک بیٹ لیے کھڑا تھا۔ ”کیا بات ہے بیٹا؟“ میں نے نرمی سے پوچھا۔

”انکل، ہماری بال آپ کے گھر میں آ گئی ہے۔“ اس نے بتایا۔

اس بچے کے پیچھے دو اور بچے بھی تھے۔ یہ سب شاید محلے کے ہوں گے لیکن میں انہیں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔

”آؤ بیٹا، دیکھ لو۔“

بچے نے اندر آ کر بال ڈھونڈ لی۔ وہ ایک گملے کے پاس پڑی تھی۔ ”تھینک یو انکل۔“ وہ میرا شکریہ ادا کر کے چلا گیا۔

میں دروازہ بند کر کے کمرے میں واپس آ گیا۔ وہ بچہ اچھا لگا تھا۔ مہذب سا، اس کے انداز اور لہجے سے پتا چل رہا تھا کہ اس کی تربیت سلیقے سے ہوئی ہے۔

کمرے کی دیوار پر میرا لگایا ہوا کاغذ بہت کچھ یاد دلا رہا تھا۔ کل نیا سال تھا۔ آج پرانے سال کی آخری شام ختم ہونے جا رہی تھی۔

کھڑکی سے باہر دور اُفق پر مدھم دن کی روشنی کے ساتھ ساتھ شام کی سیاہی پھیلتی جا رہی تھی اور میں تنہا تھا۔

جبکہ ایک شام اس نے میرا ہاتھ تھام کر وعدہ کیا تھا۔ ”زمان! میں وعدہ کرتی ہوں، میں تمہیں کبھی اکیلا نہیں

چھوڑوں گی۔“

”تو پھر کیا کرو گی؟“

”سائے کی طرح ساتھ رہوں گی۔“

”لیکن سائے کی طرح ساتھ دینے کے بجائے وہ زندگی کے اندھیرے میں کہیں گم ہو گئی تھی۔ اس کے باوجود مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں تھی۔

میں نے ایک جگہ کہیں پڑھا تھا کہ تم کو اگر کسی کی محبت کا ایک بھرپور لمحہ بھی مل جائے تو اسے زندگی بھر کی محرومیوں سے زیادہ وزنی سمجھو۔ احترام کرو اس لمحے کا، یاد کرتے رہو اُسے۔

اور میں اس وقت اس دن کو یاد کر رہا تھا جب مجھے کئی دنوں سے شدید بخار تھا۔ آدمی اگر گھر میں اکیلا ہو اور بیمار پڑ جائے تو اس وقت اس سے زیادہ بے بس اور کوئی نہیں ہوتا۔

میں غنودگی کے عالم میں بستر پر لیٹا رہتا تھا۔ اتنی بھی طاقت نہیں تھی کہ میں اٹھ کر باہر جاتا اور کسی قریبی ڈاکٹر کو دکھا دیتا۔

شدید غنودگی اور اس غنودگی میں طرح طرح کے خواب۔ ان خوابوں میں نہ جانے کیسے کیسے چہرے تھے۔ کیسے کیسے لوگ تھے۔ جو مجھ سے الگ ہو گئے تھے۔ وقت نے ان کے نقوش دھندلا دیے تھے لیکن بیماری کے ان خوابوں میں وہ میرے ساتھ ہوا کرتے۔ مجھے تسلی دیتے، میرا دل بہلاتے رہتے۔

ایک شام جب میں سخت بخار کی کیفیت میں تھا تو کسی نے میری پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس عالم میں بھی احساس ہو گیا تھا کہ کوئی ہے جس نے میری پیشانی پر ہاتھ رکھا ہے۔

میں نے آنکھیں کھول دیں۔ غزالہ میرے سامنے تھی۔ پریشانی کی تصویر بنی ہوئی۔ ”زمان! کیا ہوا ہے تمہیں؟ تم تو بخار میں پھنک رہے ہو؟“

”تم، تم کیسے؟“

”کئی دنوں سے تمہارا فون نہیں آ رہا تھا۔ میں بہت پریشان ہو گئی تھی۔ میں نے درجنوں بار فون کیا لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ جانے کیوں دل چاہ رہا تھا کہ تمہیں جا کر دیکھوں۔ کوئی انجانی سی طاقت یہ کہہ رہی تھی کہ تم کسی مشکل میں ہو۔

”پھر میں یہاں آ گئی، دروازہ بند تھا۔ میں واپس جانے لگی تھی کہ کھڑکی کھلی دیکھی تو احساس ہوا کہ شاید تم کسی پرابلم میں ہو۔

”میں ہمت کر کے کھڑکی کے راستے اندر آ گئی اور تم کو اس حال میں دیکھ لیا۔“ اس نے پھر میری پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے دھیرے سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس نے جلتی ہوئی پیشانی پر جو ہاتھ رکھا...... روح تک پھیل گئی تاثیر مسیحائی کی۔

”چلو، تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے چلوں۔“ اس نے کہا۔

”نہیں، اب تم آ گئی ہو تو میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔“

”پاگل نہ بنو۔“ اس نے بڑے پیار سے میرا ہاتھ چوم لیا تھا۔ ”اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو پھر میرا کیا ہو گا؟“

تو وہ دن اور وہ لمحے مجھے ہمیشہ یاد رہے۔ کیونکہ وہ خوب صورت دن اور وہ لمحات میرے وجود کا حصہ بن گئے تھے۔

غزالہ نے ایک ہفتے میری اتنی خدمت کی کہ میں نہال ہو کر رہ گیا۔ ہم نے اس دوران اپنی آنکھوں میں بے شمار خواب ٹانک لیے تھے۔ ہم ایک دوسرے کے ہو کر رہ گئے تھے۔

بہت خوب صورت سایہ تھا، پھولوں کی طرح مہکتا ہوا۔

اس کے بعد کئی دنوں تک اس سے ملاقات نہیں ہوئی اور نہ ہی اس کا کوئی فون آیا۔ اس کا گھر میں دیکھ چکا تھا لیکن وہاں جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

کس بنیاد پر جاتا، کیا کہتا وہاں جا کر کہ میں غزالہ سے ملنے آیا ہوں۔ کیونکہ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔

ایک دن میں بلیو ہیون کے سامنے سے گزر رہا تھا تو میں نے اسے دیکھ لیا۔ وہ اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ایک خوش شکل سا نوجوان بھی تھا۔ دونوں بلیو ہیون میں سے نکل رہے تھے۔ اس ریستوران سے جہاں ہم دونوں بیٹھا کرتے تھے۔ اب وہ کسی اور کے ساتھ تھی۔

وہ مجھے نہیں دیکھ سکی۔ میں ایک آڑ میں کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ سامنے سے گزرتی چلی گئی تھی، اس نوجوان کے ساتھ۔ دونوں بہت ہی خوش دکھائی دے رہے تھے۔

خوشی کی یہ چمک اسی وقت ہوتی ہے جب خواب ایک جیسے ہو جائیں۔ تو کیا وہ نوجوان؟ میں کچھ بھی سوچ نہیں پا رہا تھا۔

"کیا غزالہ مجھ سے بے وفائی کر رہی تھی؟" اس نے اپنے غائب ہونے کی خبر بھی نہیں دی تھی اور نہ ہی اپنی گفتگو میں اس نے کبھی یہ بتایا تھا کہ کوئی اور بھی اس کی زندگی میں شامل ہے۔ جس کے ساتھ وہ بلیو ہیون جا سکتی ہے۔ میرے دل کی عجب کیفیت ہو رہی تھی۔ گھاؤ جتنا گہرا ہو، زخم بھی اتنا ہی گہرا ہوتا ہے۔

اور اسی رات اس کا فون آ گیا۔

"زمان!" وہ کہہ رہی تھی۔ "کیسے ہو تم؟"

"میں تو ٹھیک ہوں۔" میں خشک لہجے میں بولا۔ "اور مجھے امید ہے کہ تم بہت زیادہ خیریت سے ہو گی۔"

"ارے کیا خاک خیریت، پہلے دس دنوں سے گھر کا فون خراب پڑا ہوا ہے۔" اس نے بتایا۔ "اوپر سے ایک مصیبت یہ ہوئی کہ خالہ اپنے صاحب زادے کو لے کر آ گئیں۔ موصوف کی اسی ہفتے شادی ہونے والی ہے۔ اور انہیں میرے حوالے کر دیا گیا ہے کہ میں ان کو ڈھنگ کی شاپنگ کرا کے چھوڑ دوں۔ اور ہاں، ایک بار میں بلیو ہیون بھی چلی گئی تھی ان ہی صاحب زادے کے ساتھ۔ سچ کہتی ہوں تم بہت یاد آئے۔ کیونکہ تمہارے ساتھ کی عادت جو پڑ گئی ہے نا۔"

وہ کہتی رہی اور میں اپنے آپ سے شرمندہ ہوتا رہا۔

میرا خیال ہے کہ ایسا ہر اس کے ساتھ ہوا کرتا ہے جس نے کسی کے ساتھ محبت کی ہو۔ یہ دل کم بخت ذرا ذرا سی بات پر بدگمان ہو جاتا ہے۔ الٹی سیدھی باتیں سوچنے لگتا ہے۔

"اچھا یہ بتاؤ، کب مل رہے ہو؟" وہ کہہ رہی تھی۔ "صاحب زادے کی شاپنگ ختم ہو چکی ہے اور اب میں فری ہوں۔"

"کل ہی آ جاؤ۔" میں نے کہا۔

دوسری شام کو اس سے ملاقات ہوئی۔ اسی انداز سے۔ اسی والہانہ پن سے۔ اسی گرم جوشی کے ساتھ۔ وہ میرا سایہ تھی اور سایہ بچھڑ جائے تو کیسا پھیکا پھیکا سا لگتا ہے۔

ایک بار خود وہ بیمار پڑ گئی۔ اس نے مجھے فون کر کے بتایا تھا کہ اس کا مرض بہت شدید ہے اور وہ اسپتال میں ایڈمٹ ہے۔

اب میں اس کے پاس کیسے جاتا۔ اس کے گھر والے مجھے کہاں جانتے تھے اور مجھے کیسے برداشت کرتے۔ اس کے باوجود میں اس کو ایک نظر دیکھنے کے لیے اسپتال پہنچ گیا۔

اس کو پرائیویٹ وارڈ میں رکھا تھا۔ میں اس وارڈ کے سامنے والی کرسیوں پر دھرنا دے کر بیٹھ گیا اور بھی لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ سب اپنے اپنے مریضوں کے اندیشوں میں مبتلا۔

کسی کا باپ بیمار تھا۔ کسی کی اولاد، کسی کی ماں، کسی کا بھائی اور کسی کی بہن یا بیوی لیکن میری تو محبت بیمار تھی۔

اس سے میرا کوئی رشتہ نہیں تھا۔ اس کے باوجود میرے سارے رشتے اس سے جا کر مل جاتے تھے۔ میں اس کے کمرے میں جا کر اسے دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔

وارڈ سے مریضوں کے تیمار دار باہر نکل رہے تھے، کچھ اندر جا رہے تھے۔ اب ان میں سے کس کا تعلق غزالہ سے تھا، میں یہ بھی نہیں جانتا تھا۔

کاش میں بھی اس کی اتنی ہی خدمت کر سکتا جتنی خدمت اس نے کی تھی۔ میں بہت دل گرفتہ سا واپس آ گیا۔ کئی دنوں تک بے چینی رہی تھی۔

پھر ایک دن اس کا فون آ گیا۔ وہ صحت یاب ہو کر گھر واپس آ چکی تھی اور مجھ سے ملنے کے لیے آنے والی تھی۔

میں نے اس کی آمد کی خوشی میں پورے گھر کی ڈسٹنگ کی اور بازار سے ڈھیر سارے پھول لا کر آنگن سے لے کر کمرے تک بچھا دیے۔

وہ ان ہی پھولوں کے درمیان سے ہوتی ہوئی کمرے میں آئی تھی۔ بہت کمزور دکھائی دے رہی تھی۔ میں اسے سینے سے لگائے بہت دیر تک کھڑا رہا۔ اس کے نازک دل کی دھڑکن سنتا رہا۔

دروازے پر پھر دستک ہو رہی تھی۔

میں نے چونک کر دیکھا۔ گہرا اندھیرا ہو گیا تھا اور میں اندھیرے میں بیٹھا تھا۔ لیکن اندھیرا محسوس اس لیے نہیں ہوا کہ میں نے غزالہ کی یادوں کے چراغ روشن کر رکھے تھے۔

یہ دسمبر کی آخری رات تھی۔ اس کے بعد سال تو نیا ہوتا... لیکن زندگی وہی پرانی۔ دروازے پر پھر دستک ہوئی۔

میں نے جا کر دروازہ کھولا۔ اظہار کھڑا تھا۔ میرے پرانے دوستوں میں سے ایک۔ شاید اب یہی رہ گیا تھا۔

ہم برسوں ایک دوسرے کے ساتھ رہے تھے۔ ہر دسمبر کی آخری شب ہم گھروں سے نکل جایا کرتے۔ آوارہ گردی کرتے... بھٹکتے رہتے۔

پھر رات بارہ بجے کے بعد جب نیا سال شروع ہوتا تھا تو گھروں کو واپس چلے جاتے۔ اظہار مجھے یہی یاد دلانے

اور اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آیا تھا۔

"یار، تم عجب آدمی ہو۔" اس نے کہا۔ "تم نے اپنا موبائل کیوں بند کر رکھا ہے (واضح ہو کہ جب غزالہ سے میری محبت کی ابتدا ہوئی۔ اس وقت موبائل سیٹ عام نہیں تھے۔ فون پر ہی ایک دوسرے سے رابطہ کیا جاتا تھا۔)

"بتاؤ نا، موبائل کیوں بند ہے؟" اس نے دوبارہ پوچھا۔

"بھائی وہ چارج ہو رہا ہے۔" میں نے معذرت کی۔ "اس لیے سن نہیں سکا۔"

"بس اب جلدی سے تیار ہو جاؤ۔" اس نے کہا۔

"جانا کہاں ہے؟"

"کیا؟" اس نے اس طرح میری طرف دیکھا۔ جیسے میرا سوال سن کر اسے حیرت ہوئی ہو۔ "یار! ہم برسوں سے سال کی آخری شب کو گھروں سے نکلتے ہیں اور بہت دیر تک آوارہ گردی کرتے ہوئے پرانے سال کو الوداع کہہ کر واپس آ جاتے ہیں۔ کیا تم اس کو بھول گئے؟"

"نہیں بھائی، بھولا نہیں۔ یاد ہے مجھے۔" میں نے کہا۔ "لیکن ہم وہیں جائیں گے، بلیو ہیون۔"

"ہاں جانتا ہوں۔" وہ ہنس پڑا۔ "تم اس کے علاوہ کہیں نہیں جاتے کیونکہ تم نے اپنی محبت کے یادگار دن وہیں گزارے ہیں۔ ویسے کمال ہے یار، تم اس کو اب تک یاد رکھتے ہو؟"

"میری جان، زندگی اسی وقت فراموش کی جاتی ہے جب وہ ساتھ نہ ہو۔" میں نے کہا۔

"اچھا بھائی مجنوں، ادھر ادھر چکر لگانے کے بعد وہیں چلے جائیں گے۔"

پھر ہم لانگ ڈرائیو پر چل دیے۔ لانگ ڈرائیو اظہار کا شوق تھا۔ گرچہ ہم دونوں ہی وقت کے اس سفر میں آگے نکل چکے تھے۔ اس کے باوجود ہمارے شوق برقرار تھے۔ اظہار کو لانگ ڈرائیو کا اور مجھے غزالہ کو یاد کرنے کا۔

ہم بہت دیر تک سڑکوں پر بھٹکتے رہے۔ طرح طرح کے لوگ سامنے سے گزر رہے تھے۔ مایوس اور غم زدہ لوگ۔ وہ لوگ جنہیں جانے والے سال نے کچھ بھی نہیں دیا ہو گا۔ اور اب انہیں آنے والے سال سے بھی کوئی امید نہیں تھی۔ پھر وہ لوگ جنہوں نے آنے والے سال سے امیدیں باندھ رکھی ہوں گی۔ اسی لیے ان کے چہرے دمک رہے تھے یا پھر وہ نوجوان جنہیں ابھی ماہ و سال کی سختیوں کا کوئی خاص اندازہ نہیں تھا۔ جو صرف اتنا ہی جانتے تھے کہ پرانا

سال جا رہا ہے اور نئے سال میں انہیں ہنگامے کرنے ہیں۔ آج کی شب فائرنگ کرنی ہے۔ اپنی دوست لڑکیوں کو میسج بھیجنا ہے۔ کچھ کو پھولوں کے تحفے دینے ہیں۔

زندگی اسی طرح رواں رہتی ہے۔

میں اظہار کی باتوں میں اتنا الجھا رہا کہ نئے سال کا کیک لانا ہی بھول گیا۔ بارہ سال ہو گئے۔ غزالہ سے جدائی کو لیکن کوئی ایک سال بھی ایسا نہیں گزرا ہو گا جب میں نے اس کی محبت کو یاد کر کے موم بتیاں نہیں جلائی ہوں گی۔

ہر سال ایک موم بتی کا اضافہ ہوتے ہوتے اب بارہ سال ہو چکے تھے۔ اس کی شادی پہلی جنوری ہی کو ہوئی تھی اس لیے میں ہر سال پابندی اور باقاعدگی کے ساتھ اسے یاد کرتا چلا آ رہا ہوں۔

وہ رات اسی طرح سوتے جاگتے ہوئے گزر گئی۔

نیا سال شروع ہو چکا تھا۔

دفتر جانے کا موڈ نہیں ہو رہا تھا۔ (اب میں فری لانس نہیں کرتا تھا۔ بلکہ میں نے ایک جگہ جاب کر لی تھی۔ وہاں بھی لکھنے لکھانے ہی کا کام تھا)

میں نے دفتر والوں کو فون کر دیا۔ ناشتا کر کے کچھ دیر تک کتابیں پڑھتا رہا۔ پھر کیک خریدنے چل پڑا۔

میں جنوری کی ہر پہلی تاریخ کو اپنے فراق کی سالگرہ شام ہی کو منایا کرتا تھا۔ اس میں میرا ساتھ دینے والا کوئی نہیں ہوتا تھا۔ صرف میں ہوتا تھا اور اس کی یادیں ہوتی تھیں۔

میں نے کیک کے ساتھ موم بتیاں بھی خرید لیں۔ بارہ موم بتیاں بارہ سال۔ فراق کی بارہ قیامتیں۔

اس کی شادی کے بعد پھر اس سے ملاقات ہی نہیں ہوئی تھی۔ نہ اس نے کبھی فون کیا اور نہ میں نے۔ یہ بھی اچھا ہی تھا۔ ورنہ ایک دوسرے کی آواز سنتے ہی شاید ہم اپنے آپ میں نہیں رہتے۔

میں کیک لے کر واپس لوٹا تو گلی میں بچے معمول کے مطابق کرکٹ کھیلنے میں مصروف تھے۔ میں ان پر ایک پیار بھری نگاہ ڈالتا ہوا گھر میں آ گیا۔

شام کے پانچ بجنے والے تھے۔ میں نے چھوٹی میز پر کیک رکھا اور بارہ موم بتیاں سلیقے سے لگا دیں۔ پانچ بجے اور دروازے پر دستک ہونے لگی۔

میں نے ایک کوفت کے عالم میں جا کر دروازہ کھولا۔ وہی بچہ کھڑا تھا جو ایک بار پہلے بھی اپنی بال لینے آ چکا تھا۔

"کیا بات ہے بیٹے؟ کیا آج پھر تمہاری بال آ گئی ہے؟"

"جی ہاں انکل۔" اس نے شرماتے ہوئے جواب دیا۔ "سوری انکل! آپ کو ڈسٹرب کر رہا ہوں۔"

"کوئی بات نہیں بیٹے، آؤ آ کر ڈھونڈ لو۔"

میں اسے دیکھتا رہا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا پھر ایک گملے کے پیچھے پڑی ہوئی بال کو تلاش کر لیا۔ "مل گئی انکل، تھینک یو۔"

وہ جانے لگا تو میں نے آواز دے کر اسے روک لیا۔

"بیٹے ایک بات سنو۔"

"جی انکل۔" وہ رک گیا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" میں نے پوچھا۔

"زمان۔" اس نے بتایا۔

"خوب صورت نام ہے بیٹا۔" اس سے باتیں کرتے رہنے کو دل چاہ رہا تھا۔ بعض بچے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ کھینچ لیتے ہیں اپنی طرف۔ اور پھر اس بچے کا نام بھی زمان ہی تھا، جو میرا نام تھا اسی لیے وہ مجھے اچھا لگا تھا۔ کسی اپنے کی طرح۔ جیسے وہ میرے ہی وجود کا سایہ ہو اور سائے سے تو پیار ہو ہی جاتا ہے۔

"انکل! کیا آپ اکیلے رہتے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں بیٹا، بالکل اکیلے۔" میں نے کہا۔ "اب تم جاؤ، تمہارے دوست تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے۔ وہ بھی پریشان ہوں گے کہ تم کہاں رہ گئے۔"

اسی دوران دروازے پر دستک ہونے لگی۔ اس کے ساتھ کسی عورت کی آواز سنائی دی۔ "زمان، زمان۔"

"یہ میری ممی ہیں انکل۔" اس نے کہا۔ پھر بلند آواز میں بولا۔ "میں یہاں ہوں ممی انکل کے پاس۔"

آنگن کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اس کی ممی اندر آ گئی۔ یہ وہی تھی۔ غزالہ...... ہم دونوں ایک دوسرے کو بارہ برس کے بعد دیکھ رہے تھے۔

عمر کے اثرات تو تھے لیکن اس کی دل کشی ابھی تک برقرار تھی جس طرح میں سکتے میں آیا تھا، اسی طرح وہ بھی سکتے میں رہ گئی۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے ہونٹ وا ہوئے۔ ایک آواز آئی۔ "زمان! یہ یہ تم ہو؟"

"ہاں غزالہ، یہ میں ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم سے اس طرح بھی ملاقات ہو جائے گی۔"

وہ میرے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے ہونٹ لرز رہے تھے اور آنکھوں میں ہلکی سی نمی تھی۔

"زمان، میں نے یہ کہا تھا کہ شاید تم مجھ سے ناراض ہو گئے۔" اس نے کہا۔

"کس بات پر؟"

"یہی کہ میں نے شادی کر لی تھی۔" اس نے کہا۔

"ارے، یہ سب تو پارٹ آف لائف ہے۔ زندگی میں ایسا ہوتا رہتا ہے۔"

"لیکن ایک بات بتاؤں۔ میں تمہیں کبھی بھول نہیں سکی۔ اسی لیے میں نے اپنے بیٹے کا نام تمہارے نام پر رکھا ہے کہ جب اس کو پکارتی ہوں تو تم یاد آ جاتے ہو۔" اس نے بچے کے سر پر ہاتھ رکھ دیا جو بہت حیرت سے ہم دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"غزالہ! میں بھی تمہیں کبھی نہیں بھلا سکا۔" میں نے کہا۔ "آؤ میرے ساتھ، میں تمہیں کچھ دکھاتا ہوں۔"

میں ان دونوں کو لے کر کمرے میں آ گیا جہاں میز پر کیک رکھا تھا اور موم بتیاں سجی ہوئی تھیں۔

"یہ کیا ہے زمان؟" اس نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"گن لو۔ پوری بارہ موم بتیاں ہیں۔" میں نے کہا۔ "بارہ سال ہو گئے ہمیں جدا ہوئے۔ اور ہر سال میں تمہاری جدائی کی یاد منایا کرتا ہوں۔ آج بارھواں سال ہے۔ آؤ میرے ساتھ کیک کاٹو۔ میں موم بتیاں جلا دیتا ہوں۔"

میں نے موم بتیاں روشن کر دیں۔ اس کے پورے بدن پر ہلکا سا لرزا تھا۔ وہ شاید مجھ سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتی ہو گی لیکن اس کا زمان اس کے ساتھ تھا۔

ہم دونوں نے مل کر کیک کاٹا پھر اس نے مجھ سے کہا۔ "زمان! میں تم سے ایک بات کہوں۔"

"ضرور کہو۔"

"ہم دونوں ایک دوسرے کی زندگی سے تو نکل ہی چکے ہیں۔ اس لیے تم یہ مکان چھوڑ دو۔ تم یہاں رہے تو شاید کوئی کہانی بن جائے۔ میں شادی شدہ ہوں۔ میرے دو بچے ہیں۔ ایک زمان ہے اور ایک چھوٹی بچی ہے۔ تم چلے جاؤ اور جہاں تک ہمارا تعلق ہے تو یہ زمان میرا سایہ ہے۔" اس نے بچے کا ہاتھ تھام لیا۔ "جب تک یہ ہے، اس وقت تک تمہاری یاد میرے ساتھ رہے گی۔" وہ رو رہی تھی اور کھڑکی سے باہر پہلی جنوری کی رات اترتی جا رہی تھی۔ بہت آہستہ آہستہ، بہت خاموشی سے۔

چُنگل

جمسال رستی

چوروں کے لیے قیمتی ہیرے بیش بہا خزانے سے کم نہیں ہوتے... وہ ہمیشہ اسی تاک میں رہتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ لمبا مال ہاتھ آئے... وہ ماہر فن تھا... چاق چوبند اور زبردست تھا... اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ وہ زیر دست بھی آ سکتا ہے... اس بار نیکلس پر ہی نہیں، اس کی مالکن پر بھی اس کا دل آ گیا تھا...

سرد ماحول میں جذبات و کیفیات کو گرماتی تحریر کا شاخسانہ

جیر اللہ کی نظریں دھیرے دھیرے سرکتی ہوئی اس نوجوان عورت کے سراپا کا جائزہ لے رہی تھیں جو اس کے مقابل بیٹھی ہوئی تھی پھر اس نے اپنی نگاہیں دوبارہ اس نوجوان عورت کے چہرے پر مرکوز کر دیں اور بولا۔ "تم نے کیا بتایا کہ موتیوں کی اس لڑی کی مالیت کیا ہے؟"

عورت نے اپنی گردن میں پڑی ہوئی چمکدار موتیوں کی مالا کو اپنی انگلیوں سے سہلانا شروع کر دیا پھر کچھ یاد آتے ہی تیزی سے اپنے کوٹ کے کالر کو اٹھاتے ہوئے

موتیوں کو اس کی آڑ میں چھپا دیا اور بولی۔ ’’یہ تین لاکھ ڈالرز میں بیمہ شدہ ہیں، مسٹر جیرالڈ۔‘‘

’تم انتہائی غلیظ اور جھوٹی ہو۔‘ جیرالڈ نے دل ہی دل میں کہا۔ ’ان موتیوں کی قیمت تو ایک ہزار ڈالر بھی نہیں ہے۔‘

پھر وہ بلند آواز سے گویا ہوا۔ ’’اور تم چاہتی ہو کہ میں کسی اندھیری شب میں یہ موتی تم سے چھین کر لے جاؤں تاکہ تم بیمہ کمپنی سے اس کی رقم اینٹھ لو؟‘‘

عورت نے کوئی جواب نہیں دیا۔

’’یہ تو بتاؤ کہ میرے بارے میں تمہیں کس نے بتایا ہے؟‘‘ جیرالڈ نے جاننا چاہا۔

’’مسز بینی کوٹ نے۔‘‘ عورت نے جواب دیا۔ ’’اس نے مجھے بتایا کہ تم نے اس کے لیے بھی اس قسم کے... کام کیا تھا۔‘‘

وہ عورت خاصی نوجوان، بے حد دلکش تھی اور نہایت اسمارٹ قسم کا لباس پہنے ہوئے تھی۔ یہ اس کا پرکشش جسم تھا جس کے سحر میں مبتلا ہو کر جیرالڈ اس مختصر سے انٹرویو کو جہاں تک ممکن ہو سکتا تھا، طول دے رہا تھا۔

جیرالڈ کی تیز نگاہیں نیم روشن ٹی روم کا جائزہ لینے لگیں۔ پھر وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ’’تم یہ کام کب چاہتی ہو؟‘‘

’’کل بدھ کا دن کیسا رہے گا؟ میں ہر بدھ کی شب تھیٹر دیکھنے جاتی ہوں۔ تم تھیٹر سے میری واپسی پر مجھے لوٹ سکتے ہو۔‘‘

’’میں کل یہ کام نہیں کر سکتا۔‘‘ جیرالڈ نے کہا۔ ’’مجھے کل کوئی اور کام سرانجام دینا ہے جس کا میں پہلے ہی کسی سے وعدہ کر چکا ہوں۔‘‘

’’اوہ، آئی سی۔‘‘ نوجوان عورت نے کہا۔ ’’تب تم ایک ہفتے بعد اگلے بدھ کو آ سکتے ہو؟‘‘

’’اوکے۔‘‘ جیرالڈ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ اس نے جیب میں سے ایک سگریٹ نکالی اور اسے سلگانے کے بعد ایک لمحے تک اسے غور سے دیکھتا رہا پھر بولا۔ ’’تم مجھے پانچ ہزار ڈالرز ابھی دے دو۔ بقیہ بیس ہزار ڈالرز کام مکمل ہونے کے بعد دے دینا۔‘‘

’’پانچ ہزار؟‘‘ عورت نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ’’اوہ، آئی سی۔ تمہارا مطلب ایڈوانس سے ہے۔ میں تمہیں اس رقم کا چیک دے دیتی ہوں۔‘‘

’’چیک مجھے منظور نہیں۔ مجھے کیش چاہیے، لیڈی، کیش۔‘‘ جیرالڈ نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

’’تب تمہیں انتظار کرنا ہوگا۔ میں بینک سے نقد رقم لے کر آتی ہوں۔‘‘ نوجوان عورت نے کہا۔

’’اوکے، میں انتظار کر لوں گا۔‘‘ جیرالڈ نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ ’’زیادہ دیر مت لگانا۔‘‘

وہ نوجوان عورت کو جاتے دیکھتا رہا۔ حتیٰ کہ وہ باہر ٹریفک کے ہجوم میں گم ہو گئی۔ جیرالڈ کی تیز اور پُرامید نگاہیں آخر تک اس عورت پر جمی رہی تھیں۔ کیا پرکشش عورت ہے یہ مسز وارن! جیرالڈ نے دل ہی دل میں کہا۔ یقیناً اس کا تعلق کسی شاہانہ طبقے سے ہے۔ شاید طلاق یافتہ ہو گی، جیرالڈ نے اندازہ لگایا۔ جبھی تو قدرے متکبرانہ انداز ہیں لیکن کوئی بات نہیں۔ جونہی وہ اس کی خاطر اپنی فرضی ڈکیتی کی واردات سرانجام دے دے گا، اس عورت کی تمام اکڑفوں ختم ہو جائے گی۔ اسے اس بات کا پورا یقین تھا۔ فراڈ کی اس سازش میں شریک کار ہونے کے بعد وہ پوری طرح اس کے ہاتھوں میں آ جائے گی۔ وہ اسے اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے مجبور کر دے گا۔ اس بات کا خیال آتے ہی اس کا چہرہ دمکنے لگا۔

جب وہ عورت بینک سے واپس آئی تو جیرالڈ نے اپنا ٹرمپ کارڈ استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔

اپنی ایڈوانس کی رقم جیب میں رکھنے کے بعد وہ بولا۔ ’’بائی داوے، اب میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ بہتر ہوگا کہ تم مجھے ایک خط کے ذریعے یہ بتا دینا کہ تم تھیٹر سے واپس کب آؤ گی اور دیگر اہم باتیں تحریر کر دینا۔ بس مجھے یہی درکار ہوگا۔ تم اس معاملے میں مجھ پر مکمل اعتماد کر سکتی ہو۔‘‘

’’تم وہ نیکلس واردات کے... میرا مطلب ہے اپنا کام سرانجام دینے کے بعد اگلے روز واپس لے آؤ گے نا؟‘‘ عورت نے سوال کیا۔

’’یقیناً، میں اسے واپس لے آؤں گا۔‘‘ جیرالڈ یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ’’وہ خط لکھنا مت بھولنا تاکہ مجھے علم رہے کہ مجھے وہاں کس وقت پہنچ جانا ہوگا۔‘‘

’’نہیں، میں نہیں بھولوں گی۔‘‘ مسز وارن نے کہا۔ ’’لیکن ایک منٹ مسٹر جیرالڈ۔ مجھے یہ خط کس پتے پر بھیجنا ہو گا؟‘‘

’’جنرل ڈیلیوری کے ذریعے۔ میں وصول کر لوں گا۔ اوکے اب تم سے آئندہ بدھ کو ملاقات ہو گی۔‘‘ جیرالڈ نے انسیت آمیز لہجے میں کہا، اپنی ٹوپی کو چھوتے ہوئے اوپر

اٹھایا اور اپنی راہ چل دیا۔

جب وہ لوگ کی بھیڑ میں آگے بڑھ رہا تھا تو بے حد خوش وخرم اور شادماں تھا۔ اس عورت کا ماخوذ ہونے والا شہادتی خط اپنی تحویل میں آتے ہی وہ عورت پوری طرح اس کے قابو میں آ جائے گی۔ اس بوڑھی لیڈی مسز بینی کوٹ نے اسے ایک ایسا کام سونپا ہے جو نہ صرف مالی طور پر اس کے لیے فائدہ مند ہوگا بلکہ مسز وارن بھی بہ طور بونس اس کے پہلو میں ہو گی۔ اس وقت پانچ ہزار ڈالر اس کی جیب میں آ چکے تھے۔ ایک بار اس عورت کا نیکلس اس کے ہاتھ میں آ جائے تو پھر اس کا مطلب مزید پانچ لاکھ ڈالرز کی آمدنی ہو گی۔

اور پھر اس کے علاوہ... یہ خیال آتے ہی جیرالڈ کی آنکھیں دمکنے لگیں۔ وہ فرحت انگیز، دلکش نوجوان عورت۔

اگلے روز بدھ تھا۔ جیرالڈ نے مسز وارن کا رات کے وقت اپنے اپارٹمنٹ سے تھیٹر جانے اور پھر تھیٹر سے واپس تک پورے انہماک کے ساتھ پیچھا کیا۔ جب مسز وارن آخر میں اپنی اپارٹمنٹ بلڈنگ کی لابی میں داخل ہو گئی تو جیرالڈ نے مطمئن انداز میں سر ہلا دیا اور اپنی سگریٹ کا ٹوٹا ہوا میں اچھالتے ہوئے اپنے کوٹ کے کالر کو اوپر اٹھا دیا اور تیز تیز قدموں سے اس طرف چل دیا جہاں اس نے اپنی کار پارک کی تھی۔

وہ اس شب اپنی کارکردگی سے پوری طرح مطمئن تھا۔

اس بات کی تصدیق ہو چکی تھی کہ مسز وارن ہر بدھ کی شب تھیٹر ضرور جاتی ہے۔ اب وہ اس فرضی ڈکیتی کو سرانجام دینے کے لیے خود کو بالکل محفوظ تصور کر رہا تھا۔

فرضی ڈکیتی۔ اس خیال پر وہ بے ساختہ ہنس دیا۔ اب وہ اس کارنر پر پہنچ چکا تھا جہاں اس کی کار کھڑی ہوئی تھی۔ یہ مسز وارن کی حد تک فرضی ڈکیتی ہو سکتی تھی لیکن جہاں تک جیرالڈ کا تعلق تھا تو یہ واردات فرضی ہرگز نہیں کہی جا سکتی تھی۔

اس رات سے ایک ہفتے بعد رات کے اسی پہر جیرالڈ ایک بار پھر مسز وارن کے اپارٹمنٹ کی عمارت کے سامنے سڑک پار اندھیرے میں کھڑا ہوا تھا۔ اس وقت ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ جیرالڈ نے اپنے کوٹ کے کالر کھڑے کر لیے اور دل ہی دل میں مسز وارن کو کوسنے لگا۔ وہ عورت آخر دیر کیوں کر رہی ہے۔ خط میں مسز وارن نے اپنے تھیٹر سے لوٹنے کا وقت رات بارہ بجے لکھا تھا۔ جیرالڈ نے اپنی گھڑی کو اسٹریٹ لائٹ کی جانب کرتے ہوئے وقت دیکھا۔ اس وقت ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔

آخر کو مسز وارن بھی عورت ہی ہے۔ اور عورتیں کبھی بھی وقت کی پابندی نہیں کرتیں، جیرالڈ نے دل ہی دل میں کڑھتے ہوئے کہا۔

اور پھر جیرالڈ کے ہونٹوں پر خود بہ خود مسکراہٹ ابھر آئی۔ اسے اچانک یاد آ گیا کہ آج کی شب اس کے لیے کتنی منافع بخش ہونے والی ہے۔ اس فائدے کی خاطر اگر اسے اضافی نصف گھنٹا کھڑے رہنے کی زحمت اٹھانی پڑ رہی ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

اس وقت یہ سائڈ اسٹریٹ عملی طور پر ویران پڑی تھی۔ البتہ کبھی کبھار اس گیلی سڑک پر اکا دکا گاڑی دوڑتی دکھائی دے جاتی تھی۔

جیرالڈ نے سڑک عبور کی اور دوسری جانب آ گیا جہاں مسز وارن کی اپارٹمنٹ بلڈنگ واقع تھی۔ وہ اس عمارت کے پہلو میں داخلی دروازے کے قریب ہی سائے میں کھڑا ہو گیا۔

کچھ ہی دیر بعد عمارت کے سامنے ایک ٹیکسی آ کر رکی اور دو عورتیں ٹیکسی سے نیچے اتر آئیں۔ جیرالڈ نے محتاط انداز میں آڑ سے دیکھا تو جو عورت ٹیکسی ڈرائیور کو کرایہ ادا کر رہی تھی، وہ مسز وارن تھی۔ یہ تو بڑی اسمارٹ عورت نکلی۔ جیرالڈ نے دل ہی دل میں کہا۔ یہ اپنے ہمراہ ایک اور عورت کو لے آئی ہے۔ تاکہ واردات کی ایک عینی شاہد بھی ہو اور اس کی کہانی میں مزید جان پڑ جائے۔

جیرالڈ نے اپنی جیب میں سے سیاہ رنگ کا ایک بڑا سا کپڑا نکالا اور اسے اپنے چہرے پر اس طرح باندھ لیا کہ آنکھوں کے سوا باقی تمام چہرہ کپڑے میں چھپ گیا۔ پھر اپنے بغلی ہولسٹر سے ایک آٹومیٹک ریوالور نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا اور انتظار کرنے لگا۔

پھر ٹیکسی کے روانہ ہوتے ہی وہ سائے سے نکل کر ان دونوں عورتوں کے مقابل آ گیا جو عمارت کے دروازے کی جانب بڑھ رہی تھیں۔

’’اس طرف آ جاؤ۔‘‘ وہ ان دونوں عورتوں سے مخاطب ہو کر غرایا۔ ’’اور اپنا اپنا منہ بند رکھنا۔‘‘ اس نے اپنا آٹومیٹک ریوالور لہراتے ہوئے اس اندھیرے گوشے کی جانب اشارہ کیا جہاں کچھ دیر پہلے وہ خود کھڑا ہوا تھا۔

مسز وارن کی ساتھی عورت کے حلق سے ایک وحشی سی خوف زدہ آواز نکل گئی۔ مسز وارن نے فوراً ہی اس کا بازو

تھام لیا اور اسے کھینچ کر اندھیرے میں لے آئی۔

جیر اللہ کو اپنی کارروائی مکمل کرنے میں صرف تین منٹ لگے۔ مسز وارن کا موتیوں کا وہ نیکلس اس کی جیب میں تھا۔ ساتھ ہی دونوں عورتوں کی پاکٹ بکس اور قیمتی جیولری بھی اس کی جیب میں پہنچ چکی تھی۔

پھر فارغ ہونے کے بعد وہ غرایا۔ ''پانچ منٹ تک تم دونوں کوئی حرکت مت کرنا ورنہ میں تمہیں گولی ماردوں گا۔'' یہ کہہ کر وہ پلٹا اور اس کارنر کی سمت دوڑ پڑا جہاں اس نے اپنی کار کھڑی کی تھی۔

☆☆☆

اگلے روز سہ پہر صاف ستھرے لباس میں جیر اللہ معصومیت کے ساتھ اس گھنٹی کا بٹن دبا رہا تھا جس پر ''مسز سی وارن'' کا نام لکھا ہوا تھا۔

ٹیوب میں ہلکی سی آواز میں سوال کیے جانے پر اس نے جواب دیا۔ ''جیر اللہ۔''

فوری طور پر دروازے کا کھٹکا کھلنے پر جیر اللہ بے ساختہ مسکرا دیا۔ تو وہ اس سے ملاقات کرنے کے لیے خود بھی بے چین ہے، جیر اللہ نے دل ہی دل میں کہا۔

''ہیلو۔'' مسز وارن نے اس کا استقبال کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم اندر نہیں آؤ گے؟''

وہ اسے اندر آنے کی دعوت دے رہی ہے، اس بات پر جیر اللہ کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ اس کے پیچھے اپارٹمنٹ میں داخل ہو گیا۔ اس کی آنکھیں مسز وارن کے سراپا سے لطف اندوز ہونے لگیں۔ واقعی کیا زبردست شے ہے۔ اب تو وہ اس پر مائل بہ کرم ضرور ہوگی۔

جب وہ دونوں لیونگ روم کے دیوان پر بیٹھ گئے تو جیر اللہ بولا۔ ''میں نے جس کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا، وہ تمہیں کیسی لگی؟''

''یہ اچھی بات تھی کہ مجھے پہلے سے معلوم تھا کہ تم کون ہو۔ ورنہ میں تو خوف کے مارے مر ہی جاتی۔'' مسز وارن نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''بے چاری مسز وِنسلو تو اس صدمے سے ابھی تک بستر پر پڑی ہوئی ہے۔ یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ وہ تھیٹر میں مجھے مل گئی اور بے حد اصرار کرنے لگی کہ میں اسے اپنی ٹیکسی میں ساتھ گھر لے جاؤں۔''

''ہاں، ویسے میں نے برا نہیں منایا۔'' جیر اللہ نے بے تکلفی سے کہا اور سائڈ ٹیبل پر سے سگریٹ اٹھانے کے لیے مسز وارن پر جھک سا گیا۔

''میرے خیال سے تمہیں برا منانا بھی نہیں چاہیے۔'' مسز وارن نے کہا۔ ''مسز وِنسلو کی جیولری تمہارے لیے ایک قسم کا..... بونس ثابت ہوئی۔''

''ہاں، کہہ سکتے ہیں۔'' جیر اللہ نے جواب دیا اور ساتھ ہی اپنا ہاتھ مسز وارن کی پشت پر لے گیا۔ ''تو تم کچھ سے قدرے خوف زدہ سی تھیں، ہے ناں؟''

''نہیں، حقیقت میں تو ایسی کوئی بات نہیں تھی۔'' مسز وارن نے کہا اور ساتھ ہی جیر اللہ کے برابر سے قدرے پرے سرک گئی۔ پھر دوبارہ گویا ہوئی۔ ''تم وہ نیکلس مجھے دے دو تاکہ میں تمہیں تمہارے معاوضے کا چیک دے دوں۔ مجھے ذرا جلدی ہے۔ میرا آج سہ پہر کا ایک اپائنٹمنٹ ہے۔''

جیر اللہ مسز وارن کے لہجے کے اچانک روایتی انداز پر تن سا گیا۔ تو اب وہ ہٹ دھرمی پر اتر آئی ہے، جیر اللہ نے سوچا۔ اس نے بے تکلفی بڑھانے کے لیے ایک اور کوشش کی۔

''آہ، میں تمہارے عمدہ برتاؤ کا طلبگار ہوں۔'' اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی رجھانے کے انداز میں مسکرانے لگا۔ ''میں ایک غریب اور یتیم ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے مسز وارن کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی لیکن اس نے اپنا ہاتھ جھٹکے سے چھڑا لیا اور تن کر کھڑی ہو گئی۔

''میں وہ نیکلس ابھی چاہتی ہوں۔'' مسز وارن نے کہا۔ ''میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ میں آج بہت مصروف ہوں۔''

''اوہ ہاں؟ لیکن میں مصروف نہیں ہوں۔'' جیر اللہ نے سرد ہیجانی لہجے میں کہا۔ اس نے ظاہری خوش اخلاقی کا لبادہ اتار دیا اور اپنی اصلیت پر آگیا۔ ''ویسے تم موتیوں کا کیا کرنا چاہتی ہو؟ وہ تو نقلی ہیں۔''

''کیا۔'' مسز وارن کا منہ حیرت سے پھٹ گیا۔

جیر اللہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ غصہ اس کے چہرے سے ٹپک رہا تھا۔ اس نے مسز وارن کا بازو جکڑ لیا۔

''تم اپنے آپ کو بے حد چالاک سمجھتی ہو؟'' جیر اللہ نے ترش لہجے میں کہا۔ ''گزشتہ شب تم نے اصلی موتیوں کے نیکلس کے بجائے نقلی موتیوں کا نیکلس پہنا ہوا تھا نا؟ تمام کام ..... سرانجام دے کر مجھے صرف پچیس ہزار ڈالرز ہاتھ آتے اور تم انشورنس کمپنی سے تین لاکھ ڈالرز بٹورنے کے بعد بھی صاف ستھری اور بے داغ رہتیں اور پھر سونے پہ سہاگا یہ کہ اصلی موتیوں کا نیکلس بھی تمہاری تحویل میں رہتا۔ تم نے مجھے کیا سمجھا تھا؟ میں ایک گاؤدی ہوں، میں کوئی گاؤدی نہیں ہوں سمجھیں، بے بی! اب ادھر آجاؤ۔ وہ اصلی نیکلس کہاں ہے؟''

مسز وارن کا آزاد ہاتھ اس کے کوٹ کی داہنی جیب میں تھا۔ اچانک وہ ہاتھ جیب سے باہر آیا تو اس میں ایک چھوٹا سا آٹومیٹک ریوالور دبا ہوا تھا۔ جیر اللہ نے ریوالور پر نظر پڑتے ہی مسز وارن کا بازو چھوڑ دیا اور لڑکھڑاتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے چہرے پر سپاٹ سی حیرت چھائی ہوئی تھی۔

پھر وہ قدرے شیطانی انداز میں مسکراتے ہوئے ذبک گیا اور بولا۔ ''تو تم بھی ہتھیار پاس رکھتی ہو؟ واقعی بڑی دلیر عورت ہو۔''

''اپنے ہاتھ اوپر اٹھالو۔'' مسز وارن نے تند لہجے میں حکم دیا۔

جیر اللہ نے دھیرے دھیرے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ پھر اس کا منہ حیرت سے کھل گیا اور اس کی نگاہیں مسز وارن کے عقب میں دیکھتے ہوئے پھٹ سی گئیں۔ ''تم!'' اس نے دہشت زدہ لہجے میں کہا۔

مسز وارن نے چونکتے ہوئے اپنا سر گھمایا تو جیر اللہ نے اسی لمحے اپنے لمبے بازو کو کام میں لیتے ہوئے مسز وارن کے ریوالور پر ہاتھ مار دیا۔ ریوالور مسز وارن کے ہاتھ سے نکل کر فرش پر گر پڑا۔ جیر اللہ کی ضرب اتنی زوردار تھی کہ مسز وارن درد سے چیخ پڑی اور اپنی کلائی تھام کر کراہنے لگی۔

جیر اللہ نے اپنے پیر کی ٹھوکر سے ریوالور کو ایک کرسی کے نیچے پھینک دیا۔ اب جیر اللہ کے ہاتھ میں اپنا آٹومیٹک ریوالور تھا جس سے اس نے مسز وارن کو اپنی زد میں لے لیا تھا۔

''اب تم ایک اچھی بے بی بن جاؤ۔'' جیر اللہ نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔ ''اس سے پہلے کہ تم وہ اصلی نیکلس میرے حوالے کرو، میں تمہارے لبوں کی چاشنی سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہوں۔'' پھر جیر اللہ نے اپنا بایاں ہاتھ آگے بڑھایا اور مسز وارن کو اپنی طرف کھینچ لیا۔

جیر اللہ کے لیے یہ بات حیرت کا باعث تھی کہ مسز وارن نے کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی۔ جیر اللہ نے اپنا آٹومیٹک ریوالور اپنے عقب میں موجود صوفے پر گرا دیا اور مسز وارن کو اپنے سینے سے چمٹا لیا۔

اچانک مسز وارن کی نظریں جیر اللہ کے عقب میں اٹھ گئیں اور وہ چونکتے ہوئے بے ساختہ بول پڑی۔

''تم۔''

جیر اللہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔ ''یہ ترکیب صرف ایک بار کارگر ثابت ہوتی ہے، بے بی۔'' اس نے بے ساختہ ایک قہقہہ لگایا۔

لیکن جب اسے اپنی پشت پر کسی ٹھوس شے کا دباؤ محسوس ہوا تو اسے یہ بات سمجھ میں آگئی کہ وہ عورت کوئی اداکاری نہیں کر رہی تھی۔

''اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دو۔'' ایک گمبھیر مردانہ آواز نے اسے حکم دیا۔

جیر اللہ کے ہاتھ اوپر چلے گئے۔

''اب گھوم جاؤ۔''

جیر اللہ گھوم گیا پھر اس کے قدم قدرے ڈگمگا گئے اور چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ اس کے سامنے انشورنس کا نامور سراغ رساں جونی ٹول کھڑا ہوا تھا۔

''ہاں جیر اللہ، یہ میں ہی ہوں، جونی ٹول۔'' سراغ رساں نے کہا۔ ''اپنے ہاتھ آگے بڑھا دو۔''

جیر اللہ نے بلا کسی تردد اپنے ہاتھ آگے کر دیے۔ سراغ رساں نے اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنا دیں۔ پھر عورت کی جانب گھومتے ہوئے بولا۔ ''سوری میں نے تمہیں اس معاملے میں ملوث کیا، مسز وارن! میں تازہ ہوا لینے کی خاطر عقبی پورشن میں چلا گیا تھا اور میں بروقت یہاں واپس آگیا تو دیکھا کہ یہ رومیو اپنا کرتب دکھا رہا تھا۔

''بیمہ کمپنیاں گزشتہ ایک سال سے تمہارا پیچھا کر رہی تھیں، جیر اللہ! اور تم اس وقت تک قابو میں نہیں آئے جب تک ہم نے ایک حسین اور دلکش عورت کو اس کھیل میں شامل نہیں کیا۔ یقیناً مسز وارن ہر اس کمپنی کے لیے کام کر رہی ہیں جن سے گزشتہ سال سے تم اور تمہاری خواتین دوست فراڈ کرتی چلی آئی ہیں۔ تمہیں مسز وارن کا کردار کیسا لگا؟''

لیکن جیر اللہ نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا موقع تھا کہ جب باتونی اور طول کلامی کا عادی جیر اللہ گونگا سا بن گیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ان آہنی ہتھکڑیوں نے نہ صرف اس کی کلائیوں کو جکڑا ہوا تھا بلکہ اس کی زبان پر بھی تالے ڈال دیے تھے۔

وہ گم صم خالی نظروں سے مسز وارن کو تکے جا رہا تھا جس کے چنگل میں آکر وہ بازی ہار چکا تھا۔

زنداں شکن

غلام قادر

بعض پیڑ ایسے ہوتے ہیں جو ہر مہینے بدلتے رہتے ہیں اور بعض ایسے جن کا رنگ کبھی نہیں بدلتا... اسی طرح سال بدلنے میں مہینوں لگتے ہیں... جغرافیائی سرحدیں بھی یک دم نہیں... تبدیلی کے طویل عمل سے گزرتی ہیں... صرف دل کا موسم بدلنے میں پل دو پل درکار ہوتے ہیں... یہی پل بھر کی مہلت فکر و سوچ کے ایسے در وا کر دیتی ہے جو محبت کے حصول کو ہمیشہ کے لیے امر کر دیتی ہے... زنداں شکن لڑکی کا ایسا ہی فسانہ جو انتقام اور عداوت کی راہوں کو کھوج بیٹھی تھی...

روایت شکن... دلیر اور باہمت لڑکی کے ٹکراؤ کا سنسنی خیز انجام

''بھائی یقیناً کوئی بہت بڑی غلط فہمی ہوئی ہے آپ کو۔'' میں نے منمناتی ہوئی آواز میں کہا لیکن اس پر میرے لجاجت بھرے لہجے کا بالکل وہی اثر ہوا جو آگ پر پیٹرول ڈالنے کا ہوتا ہے۔ وہ بھڑک کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''کیسی غلط فہمی ہے؟'' اس نے بالکل میرے سامنے آ کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا۔

''یہی بھائی کہ میرا اور نادرہ کا کوئی تعلق ہو سکتا ہے۔'' میں نے اپنے لہجے میں یتیمی اور بے کسی کا آمیزہ بنا کر پیش کیا لیکن اس کا اثر بھی وہی ہوا جو پچھلے جملے کا ہوا تھا۔

''ابے ہم پورے شہر کو چلاتے ہیں اور تو ہمیں......'' اس کی آواز میں مزید شدت آ گئی۔ آواز بلند ہونے کے ساتھ اس نے فقرے کا اختتام ایک بہت بے ہودہ گالی پر کیا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ گالی کے میزائل کا رخ اس کی اپنی جانب تھا۔

''میں آپ کو کس طرح سمجھاؤں کہ میں ایک عام سا صحافی......'' میں جو کچھ کہنا چاہ رہا تھا، وہ اس نے ہاتھ اٹھا کر کہنے سے روک دیا۔

''تو مجھے کچھ نہ سمجھا...... صرف یہ سمجھا دے۔'' اس نے فقرہ مکمل کیا اور ساتھ کھڑے شخص کی جانب ہاتھ بڑھایا اور اس شخص نے ایک تصویر خالی ہاتھ میں تھما دی جو اس نے فوراً ہی مجھے منتقل کر دی۔

تصویر میں میرے ساتھ نادرہ تھی اور اس طرح تھی کہ اس کا ہاتھ میری کمر میں تھا اور میرا ہاتھ اس کی کمر میں تھا۔ تصویر دیکھتے ہی مجھے سب کچھ یاد آ گیا لیکن ساتھ ہی پیروں تلے سے زمین نکلتی چلی گئی۔

''یہ تصویر تو بھائی سیون ہیون ریسٹورنٹ کی ہے۔''

میں نے لڑکھڑاتے ہوئے لہجے میں کہا۔ اس کی غضب ناک آنکھوں نے میرا اعتماد بالکل ہی ختم کر دیا تھا۔

''الو کے پٹھے یہ چاند کی ہے یا مریخ کی... مجھے یہ نہیں جاننا مجھے تو صرف یہ جاننا ہے کہ......'' وہ اتنی زور سے چلایا کہ اس کی آواز پھٹ گئی اور وہ کھانسنے لگا۔

ایک خوشامدی نے فوراً ہی پانی کا گلاس اسے دیا جو وہ ایک سانس میں ہی پی گیا۔ پھر قبل اس کے کہ وہ اپنی تفتیش کا آغاز کرتا، وہ بوڑھا... جو اس کے برابر کی کرسی پر بیٹھا تھا اس نے سمجھایا۔

''غصہ نہ کر اور یہاں آ کر بیٹھ جا۔'' اس نے حکم سنا اور مجھے گھورتا ہوا دوبارہ وہاں جا کر بیٹھ گیا جہاں سے اٹھ کر آیا تھا۔ میرے پاس کہنے کو بہت کچھ تھا لیکن اس وقت خاموش رہنے میں ہی میری عافیت تھی اس لیے میں خاموش رہا۔

''چل بھئی تم بھی یہاں آ کر بیٹھ جاؤ۔'' اس منحنی سے بوڑھے نے اس بار مجھے مخاطب کرتے ہوئے ایک خالی کرسی کی جانب اشارہ کیا اور میں انتہائی سعادت مندی سے وہاں جا کر بیٹھ گیا۔

کمرے میں مکمل خاموشی تھی۔ حالات مکمل طور پر اس منحنی بوڑھے کے ہاتھ میں تھے جو مجھے بٹھانے کے بعد سے خاموش تھا۔

''ہر کام جوش سے نہیں ہوتا منے...... جوش کے ساتھ ہوش بھی چاہیے ہوتا ہے۔'' بوڑھے نے کہا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو میں اس ساڑھے چھ فٹ کے کالے سانڈ کو منا کہنے پر قہقہے لگاتا لیکن اس وقت میں مسکرا بھی نہیں سکا تھا کیونکہ میری نظریں زمین میں ضرور گڑی ہوئی تھیں لیکن مجھے احساس تھا کہ کالا سانڈ مجھے ہی گھور رہا ہوگا۔

''غصے میں آنے کی کیا ضرورت ہے... جو ہم پوچھیں گے وہ یہ سچ سچ بتا دیں گے... اور سچ کیوں نہیں بتائیں گے کیونکہ یہ جانتے ہیں کہ اگر ایک بھی جھوٹ انہوں نے بولا تو ہم دوبارہ انہیں اسی طرح سے بھری سڑک سے اٹھا لائیں گے۔'' بڑے میاں بہت آرام سے گفتگو کر رہے تھے لیکن ان کے ہر لفظ میں واضح دھمکی موجود تھی۔

''کیوں میاں میں سچ بول رہا ہوں نا۔'' منحنی بوڑھے نے اپنے ''منے'' سے گفتگو کرتے کرتے میری جانب رخ کیا۔

''جی، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' میں نے تائید کی۔

''مجھے جانتے ہو؟'' بڑے میاں نے سوال کیا۔

''جی...... نہیں۔'' میں نے وہی کہا جو سچ تھا۔

''میں اس کا یعنی رشید الدین کا باپ ہوں۔'' بڑے میاں نے اپنا تعارف کروایا اور میرے ذہن میں وہ باتیں تازہ ہو گئیں جو اڑتے اڑتے میرے کانوں تک پہنچی تھیں۔

''صدر الدین شیخ صاحب۔'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا اور بڑے میاں نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''صدر الدین شیخ عرف صدو بابا۔'' بڑے میاں نے اپنی عرفیت بھی بتا دی۔

''جی بہتر۔'' میں نے پوری سعادت مندی سے سر ہلا دیا۔

''اب میاں شروع ہو جاؤ پر یاد رکھنا کہ ایک بھی بات جھوٹ نکلی تو میں اپنے ہاتھوں سے تمہیں ذبح کروں گا۔'' بڑے میاں نے بالکل اس انداز میں دھمکی دی جیسے موسم کا حال سنا رہے ہوں۔

''آپ پوچھیں میں بتا دوں گا۔'' میں نے کہا کیونکہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہانی جس کا نہ سر ہے نہ پیر... اسے کہاں سے شروع کروں۔

''تصویر کی کیا کہانی ہے؟'' بڑے میاں نے سوال کیا۔

''چار ماہ پہلے میں نے اپنی نئی نوکری کے سلسلے میں دوستوں کو دعوت دی تھی۔'' میں نے کہنا شروع کیا۔

''یہ نادرہ تمہاری دوست تھی؟'' بڑے میاں نے اچانک سوال کر دیا۔

''اگر آپ اجازت دیں تو میں تفصیل بیان کر دوں تا کہ میں بات سمجھا سکوں۔'' میں نے چند لمحے رکنے کے بعد کہا۔

''بولتے رہو۔ بہت وقت ہے ہمارے پاس لیکن جو کچھ کہنا ہے سچ کہو ورنہ......'' منحنی بوڑھے عرف سدو بابا عرف صدر الدین شیخ نے نرم لہجے میں گرم دھمکی دی۔

''میں جس چینل میں ملازمت کر رہا ہوں، یہ میری چینل کی پہلی ملازمت ہے۔'' میں نے کہنا شروع کیا لیکن سدو بابا ایک بار پھر ٹپک پڑے۔

''سب جانتے ہیں، آگے چلو۔'' اس نے مجھے تفصیل میں جانے سے روکا۔

''چینل کی نوکری کے ابتدائی پندرہ دن مجھے سینئر رپورٹر رخشندہ کے ساتھ رکھا تھا۔'' میں نے کہا اور سدو بابا نے یوں گردن ہلائی جیسے وہ سمجھ رہا ہو کہ میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں۔

''میں دفتر میں رخشندہ کے ساتھ تھا تب نادرہ کا ایک اشتہار ٹی وی پر چل رہا تھا۔ میں نے کہہ دیا کہ ''خوب صورت ماڈل ہے'' میں نے ڈرتے ڈرتے کہا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ فقرے پر سدو بابا کا منتنہ بھڑک اٹھے لیکن جب کوئی ری ایکشن نہ آیا تو میں نے بات آگے بڑھائی۔

''رخشندہ نے مجھے بتایا کہ ماڈل کا نام نادرہ ہے اور وہ اس کی دوست ہے۔'' میں نے کہا اور رک گیا کیونکہ ایک بار پھر سدو بابا کی گردن ہلی تھی۔

''میں جانتا ہوں رخشندہ کو... آگے چلو۔'' سدو بابا نے کہا۔

''پہلی تنخواہ پر جب میں نے دوستوں کو دعوت دی تو رخشندہ اپنے ساتھ نادرہ کو بھی لے آئی تھی۔'' میں نے کہا لیکن اچانک ہی وہ کالا موٹا سانڈ جو اب تک خاموش بیٹھا تھا، بول پڑا۔

''جھوٹ بولتا ہے تو۔'' اس نے تیز لہجے میں کہا اور میرا اعتماد جو بمشکل بحال ہوا تھا، اچانک ختم ہو گیا۔

''تو چپ رہ۔'' سدو بابا جو اب تک آہستہ لہجے میں بات کر رہا تھا، بیٹے پر چیخ پڑا۔

''پہلی ملاقات میں کوئی ایسی تصویر بنواتا ہے؟''

کالے موٹے سانڈ نے اپنے منحنی باپ سے فریاد کرنے والے انداز میں کہا تھا۔

''اسے بات مکمل کرنے دے پھر کچھ بولنا۔'' سدو بابا نے ایک بار پھر بیٹے کو ڈانٹا اور ساتھ ہی مجھے ان نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ ''تم جاری رکھو۔''

''یہ سچ کہہ رہا ہیں۔'' میں بظاہر مخاطب سدو بابا سے تھا لیکن اصل مخاطب اس کا بیٹا تھا۔

''میرے باپ کی بھی ہمت نہیں تھی کہ دس ملاقاتوں کے بعد بھی ایسی تصویر بنواتا جبکہ وہ پہلے ہی مجھے بتا چکی تھی کہ آپ اس کے سرپرست ہیں۔'' میں نے بقیل لفظ کو انتہائی نرم بنانے کی کوشش کی تھی۔

''وہ حرام زادی میری رکھیل تھی۔'' کالا موٹا سانڈ ایک بار پھر بھڑک گیا۔ میری جانب سے نرم لفظ اس کے مزاج پر ناگوار گزرا تھا اور اس نے وہی کہا جو رخشندہ نے مجھے بتایا تھا۔

''وہ طوائف زادی تھی، میں نے اسے ملک کی سب سے بڑی ماڈل بنایا اور وہ کتیا مجھے ہی......'' وہ کچھ اور بھی انکشافات کرنا چاہ رہا تھا لیکن سدو بابا نے ایک بار پھر اسے ڈانٹ دیا۔ ''تو چپ نہیں رہ سکتا تو چلا جا یہاں سے۔''

میری گفتگو میں تو وقفہ آیا ہی تھا لیکن سدو بابا کی ڈانٹ کے بعد اس طرح خاموشی چھا گئی جیسے وہاں کوئی نہ ہو۔

''یہ تصویر نادرہ جی نے اس انداز میں کھنچوائی تھی۔'' میں نے کہا اور میں نے دیکھا کہ سدو بابا کی آنکھ میں اس طرح کی چمک آئی جیسے وہ یہی سننا چاہتے ہوں۔

''تفصیل بتاؤ۔'' میرے خاموش ہونے پر سدو بابا نے کہا۔

''جب تصویریں کھنچ رہی تھیں تو انہوں نے خود کہا تھا کہ ایک تصویر میری اور ان کی الگ سے۔'' میں نے کہا اور سدو بابا کی آنکھوں کی چمک اور تیز ہو گئی۔

''میں اتنا قریب ہو کر تصویر کبھی نہ کھنچواتا لیکن انہوں نے کہا تھا کہ رخشندہ مجھے بتا چکی ہے کہ آپ مجھے خوب صورت کہہ چکے ہیں۔'' میں نے نادرہ کے کہے ہوئے الفاظ میں تھوڑی سی ترمیم کی تھی۔ اگر وہ کہہ دیتا جو نادرہ نے کہے تھے کہ ''رخشندہ کہہ چکی ہے کہ تم میری خوب صورتی پر فدا ہو'' تو کالا موٹا سانڈ بدک ہی جاتا۔

''یہ کمر میں ہاتھ ڈالنے کا آئیڈیا بھی اسی کا تھا؟'' سدو بابا نے سوال کیا اور میں صرف اثبات میں سر ہلا کر رہ

گیا۔

ایک بار پھر وہاں خاموشی کا راج شروع ہو گیا تھا۔ سدو بابا گہری سوچ میں ڈوب گیا جیسے کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا ہو لیکن پہنچ نہ پا رہا ہو۔

''اگر تمہاری بات کی تصدیق نہ ہو سکی تو؟'' سدو بابا نے سوال کیا۔

اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ مجھے اپنا کھویا ہوا اعتماد بحال ہوتا ہوا نظر آنے لگا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے سدو بابا نے میری بات کا یقین کر لیا ہو۔

''بزرگوار کیا میں اس قابل ہوں کہ میں ان کے اخراجات برداشت کر سکوں؟'' میں نے سوال کیا اور سدو بابا کے ساتھ ساتھ اس کے بیٹے کی آنکھوں میں الجھن اتر آئی۔

''میں ترقی کر کے آج اس قابل ہوا ہوں کہ ایک سیکنڈ ہینڈ گاڑی خرید سکا ہوں۔'' میں نے اپنی بات آگے بڑھائی لیکن میرے کچھ کہنے سے قبل سدو بابا نے ہاتھ اٹھا کر مجھے روک دیا۔

''بالے......'' سدو بابا نے آواز لگائی اور ان چار میں سے ایک آگے بڑھا جو مجھے شاہراہ فیصل پر روک کر اپنی گاڑی میں منتقل کر کے یہاں لائے تھے۔

''صاحب کی گاڑی کی چابی انہیں واپس کر دو۔'' سدو بابا نے حکم دیا اور بالے نامی اس شخص نے فوراً ہی اپنی جیب سے چابی نکال کر مجھے دے دی۔

وہاں ایک لمحہ بھی رکنے کا میرا کوئی جواز نہیں تھا لیکن اتنی دیر پھر بھی مجھے وہاں رکنا پڑا کہ سدو بابا یہ کہہ سکے کہ ''میں اس تکلیف دینے پر معذرت خواہ ہوں، کبھی زندگی میں موقع ملا تو اس تکلیف کا ازالہ کر دیں گے۔''

وہاں تو میں نے کچھ نہیں کہا لیکن اپنی گاڑی میں بیٹھنے کے بعد میں نے باپ بیٹوں کو وہ کچھ کہا کہ اگر اس کا پانچ فیصد بھی ان تک پہنچ جاتا تو وہ میری بوٹیاں بنا کر چیل کوؤں کو کھلا دیتے لیکن ایک سوال اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں ابھرا تھا کہ آخر وہ تصویر نادرہ نے کیوں بنوائی تھی۔ اگر بنوائی ہی تھی تو ان بدمعاشوں کے ہاتھ کیسے لگی تھی۔ انہی سوچوں میں گم میں فلیٹ تک پہنچ گیا تب مجھے احساس ہوا کہ میں نے تو کچھ کھایا نہیں ہے لیکن اب دیر ہو چکی تھی، اتنی ہمت نہیں رہی تھی کہ میں گاڑی موڑ کر کھانے کے لیے جاتا۔

فلیٹ میں داخل ہوتے ہی پہلی حیرت ہوئی کہ ڈرائنگ روم کی تمام لائٹس روشن تھیں جبکہ میری عادت تھی

اس کی اٹنگ میں بھی خرابی ہے۔ اسے ریورس نہیں کیا جا سکتا

کہ گھر سے نکلتے ہوئے تمام لائٹس چیک کرتا تھا پھر دوسری حیرت یہ ہوئی کہ بیڈ روم کے ٹی وی کی آواز آ رہی تھی لیکن حیرت کا ایٹم بم اس وقت گرا جب بیڈ روم میں داخل ہوا جہاں بیڈ پر تمام مصیبتوں کی جڑ پورے اطمینان کے ساتھ بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ میں اپنی جگہ ساکت کھڑا رہ گیا لیکن وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی اور پھر پورے اطمینان کے ساتھ اس نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہائے۔''

''تم......'' میں صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

''ہاں...... میں۔'' اس کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی۔

''تم...... داخل کیسے ہوئیں؟'' میں فوری طور پر صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

''دروازے سے۔'' اس نے پورے اطمینان کے ساتھ جواب دیا تھا۔

''میرا مطلب ہے تمہارے پاس چابی کہاں سے آئی...... اور......؟'' میں کچھ کچھ اپنے حواسوں میں واپس آ رہا تھا۔

''ہر سوال کا جواب مل جائے گا۔ پہلے چینج کر لو، کچھ فریش ہو جاؤ۔ اتنی دیر میں کھانا لگاتی ہوں۔'' اس نے کہا اور ساتھ ہی اس نے ٹی وی بند کیا اور بستر سے اتر آئی۔

”تم جانتی ہو کہ میں کس مصیبت سے ہو کر آیا ہوں؟“ میں نے کہا اور وہ ہنس دی۔

”یار، زندگی میں مصیبتیں نہ ہوں تو زندگی کیسی؟“ اس نے نارمل انداز میں کہا۔

”نادرہ پلیز۔“ میں اس سے کہنا چاہ رہا تھا کہ میں مزید کوئی مصیبت مول لینا نہیں چاہ رہا لیکن اچانک اس کے مسکراتے ہوئے چہرے پر سنجیدگی طاری ہوگئی۔

”نادرہ نہیں..... ستارہ۔“ اس نے بھرپور سنجیدگی سے کہا۔

”وہ ستارہ جسے پانچ برس پہلے میں نے مجبوریوں کا کفن پہنا کر سلا دیا تھا... جب مجبوریاں ختم ہوگئیں تو نادرہ کو مار کر ستارہ پھر بیدار ہوگئی۔ اب اگر نادرہ کو مارنے کے جرم میں ستارہ کو بھی مرنا پڑے تو کوئی بات نہیں۔“ اس کے چہرے پر یہ کہتے ہوئے اتنی سنجیدگی تھی کہ اس کے چہرے پر نظر کہیں ٹھہر رہی تھی۔

”تم زیادہ سیریس نہ ہو۔ فریش ہو جاؤ، میں تمہاری پسند کا کھانا لائی ہوں۔“ وہ ایک بار پھر اسی موڈ میں آگئی تھی۔

”میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔“ میں نے وہی کہا جو میری کیفیت تھی۔

”ابھی بہت رات باقی ہے صبح تک سب سمجھ میں آجائے گا اگر درمیان میں تمہارا موڈ تبدیل نہیں ہوا تو...“ اس نے کسی قدر شوخ لہجے میں کہا۔

”کیا بکواس ہے۔“ میں جھینپ گیا۔

”اس میں بکواس کیا ہے؟“ مجھے جھینپتا دیکھ کر وہ اور شوخ ہوگئی۔

”ایک ایسی لڑکی کے ساتھ تم ایک کمرے میں ہو جسے تم خوب صورت بھی کہہ چکے ہو جس کے بارے میں تم جانتے بھی ہو کہ وہ کوئی نیک پروین نہیں ہے تو موڈ تو......“ اس نے اپنا فقرہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ میں نے بہتری اسی میں سمجھی کہ باتھ روم کی جانب بڑھ جاؤں لیکن مجھے اپنی پشت پر اس کی ہنسی کی آواز سنائی دی تھی۔

اس کے فقرے ...... الجھن زدہ ضرور تھے لیکن اس سے زیادہ میں اس بات پر حیرت زدہ تھا کہ شہر کا سب سے بڑا غنڈا اس کی تلاش میں تھا لیکن وہ اتنے اطمینان سے تھی جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

میں چینج کر کے باہر آیا تو وہ کمرے میں نہیں تھی لیکن کچن سے آنے والی آوازیں بتا رہی تھیں کہ وہ کہاں ہے۔

مجھے دیکھ کر وہ مسکرائی اور کچھ کہے بغیر اس نے مجھے ڈائننگ ٹیبل کی جانب اشارہ کیا جہاں اس نے سلیقے سے چیزیں سجائی ہوئی تھیں۔

”تم کب سے یہاں ہو؟“ میں نے سوال کیا اور وہ ہنس دی۔

”اگر تم یہ سوال اس لیے کر رہے ہو کہ مجھے کس طرح معلوم ہے کہ کون سی چیز کس جگہ ہے تو تم یہ بھول رہے ہو کہ تم نے یہ فلیٹ رخشندہ سے لیا ہے اور وہ میری دوست ہے۔“ جواب دیتے ہوئے وہ آخری ڈش لے کر میز تک آچکی تھی۔

”فلیٹ میں داخلے کا سبب بھی شاید یہی ہے؟“ میں نے تصدیق چاہی اور اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”جب مجھے معلوم ہوا کہ شیدے کے لوگ تمہیں لے کر اس کے اڈے پہنچ گئے ہیں تو میں نے جان لیا کہ یہ فلیٹ میرے لیے سب سے محفوظ جگہ ہے۔“ اس نے مزید وضاحت کی۔

”اگر وہ مجھے قتل کر دیتے تو یہ فلیٹ محفوظ ترین ہو جاتا۔“ میں نے طنزیہ انداز میں کہا اور اس نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا... ساتھ ہی ایک ڈش میری جانب بڑھا دی۔

”وہ کچھ بھی کرتے لیکن تم پر جسمانی تشدد کبھی نہ کرتے قتل کرنا تو بہت دور کی بات ہے۔“ اس نے یہ بات اتنے سکون اور اعتماد سے کی کہ میں حیرت سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

جو کچھ وہ کہہ رہی تھی، میرا ذہن اسے قبول کر رہا تھا۔ مجھے یاد آرہا تھا کہ کالا موٹا سانڈ بار بار یہ تاثر دیتا رہا تھا کہ وہ مجھ پر ہاتھ چھوڑ دے گا لیکن ایسا ہوا نہیں۔ گنجی بوڑھے عرف سدو بابا نے بھی ہر طرح کی دھمکی دی تھی لیکن اس کی دھمکیاں بھی لفظوں سے آگے نہیں بڑھی تھیں بلکہ آخر میں اس کی جانب سے معذرت بھی حیرت انگیز تھی۔

”تم اتنے یقین کے ساتھ یہ بات کس طرح کہہ سکتی ہو؟“ ذہنی طور پر اس سے متفق ہونے کے باوجود میں نے سوال کیا۔

”شیدا ایک کم عقل آدمی ہے لیکن اس کا باپ اتنا ہی چالاک اور عیار ہے۔“ اس نے کھانے کے دوران میں اپنی بات جاری رکھی۔

”اس پر میں تم سے متفق ہوں۔“ میں نے اتفاق کیا۔

”کسی بھی شخص کا قتل ان کے لیے ایک معمولی بات ہے لیکن ایک صحافی کو قتل کرنے کا رسک وہ نہیں لے سکتے تھے۔“ اس نے جواب دیا اور میں مسکرا دیا۔

”کچھ فرق نہیں پڑتا زیادہ سے زیادہ ایک کمیشن بن جاتا جس کی رپورٹ کبھی منظرِ عام پر نہ آتی۔“ میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”اس پر بحث ہو سکتی ہے لیکن ہم موضوع سے ہٹ جائیں گے۔“ اس نے کچھ اس انداز میں کہا کہ میں سوچ میں پڑ گیا۔

اس وقت تک وہ میرے لیے ایک طوائف ہی تھی۔ ایک ایسی طوائف جو شہر کے سب سے بڑے غنڈے کی رکھیل رہی ہو لیکن جس انداز میں اس نے آخری فقرہ کہا تھا، وہ اس کے بارے میں میرے تصور سے بالکل مختلف تھا۔

”تم اپنے بارے میں بتاؤ گی؟“ میں نے اس کے آخری جملے کے بعد ابھرنے والے تجسس سے مجبور ہوتے ہوئے کہا۔

”میں نے کہا تھا کہ ابھی بہت رات باقی ہے۔ سب کچھ بتا دوں گی اگر تم کسی اور موڈ میں نہ آگئے تو؟“ اس کی آنکھوں میں شرارت پھر سے نمودار ہونے لگی تھی۔

”چلیں پھر یوں کر لیتے ہیں کہ تمہارے بارے میں کل دن میں کسی وقت بات کر لیں گے۔“ اس بار میں جھینپا نہیں تھا لیکن اس وقت مجھے حیرت ہوئی جب اس نے اچانک منہ دوسری جانب کر لیا۔

یوں اچانک اس کا بے اختیار شرمانا میرے لیے ایک اور حیرت کا باعث تھا پھر اس کے بعد جو اس نے حرکت کی وہ اس سے بھی زیادہ حیرت میں مبتلا کرنے والی تھی۔

اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں پھر اس نے آہستگی سے نظریں اٹھائیں اور مجھے اپنی جانب متوجہ پایا تو نظریں دوبارہ جھکا لیں۔ اس کا چہرہ سرخ ہوتا چلا گیا اور پھر اس نے اچانک کہا۔ ”میں کھا چکی“ اور ساتھ ہی اس نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔

”بیٹھ جاؤ اور جو کچھ پلیٹ میں موجود ہے، وہ ختم کرو۔“ میں نے کہا اور وہ دوبارہ بیٹھ گئی۔

ہم دونوں ہی خاموش تھے۔ وہ کھا تو رہی تھی لیکن بہت آہستہ آہستہ۔ اس کی نظریں بدستور جھکی ہی رہی تھیں۔ میں نے اپنی جگہ چھوڑی تو اس نے بہت آہستگی سے کہا۔

”آپ چلیں میں سمیٹ کر آتی ہوں۔“

بیڈ روم میں جاتے ہی میں نے ٹی وی آن کیا لیکن میرا ذہن اسی کی جانب تھا۔ ایک عجیب سی کیفیت تھی جو مجھ پر طاری تھی... کبھی دل اس کی جانب مائل ہوتے لگتا تو دماغ مخالفت کرنے لگتا پھر جب دماغ کی بات ماننے لگتا تو دل بغاوت کر دیتا۔ میں ابھی اسی الجھن میں تھا کہ وہ چائے کا مگ ہاتھ میں لیے کمرے میں داخل ہوئی۔

”رخشندہ نے بتایا تھا کہ آپ کھانے کے بعد چائے کے عادی ہیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ جو کیفیت اس کی ڈائننگ ٹیبل پر تھی اب اس میں کافی کمی آچکی تھی لیکن دوسری بار اس نے مجھے آپ کہہ کر مخاطب کیا تھا۔

چائے کا مگ اس نے مجھے دیا لیکن خود کچھ دور موجود صوفے پر جا کر بیٹھ گئی۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں جس شوخی کا مظاہرہ اس نے میرے فلیٹ میں داخل ہوتے ہوئے کیا تھا، اس کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ اس کا انداز مجھے کچھ اس طرح محسوس ہوا کہ جیسے کوئی طالب علم ہوم ورک کر کے نہ آیا ہو اور اب استاد کی ڈانٹ کا منتظر ہو۔

”ایک بات بری طرح میرے ذہن میں کھٹک رہی ہے۔“ میں نے بات شروع کرنے والے انداز میں کہا۔ اس کا اندازہ مجھے ہو گیا تھا کہ گفتگو کا آغاز وہ نہیں کرے گی۔

اس نے جواب میں کچھ نہیں کہا لیکن نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا ضرور تھا۔ اس کی آنکھوں میں واضح سوال تھا۔

”وہ کیا؟“

”جس انداز سے وہ تمہیں ڈھونڈ رہے ہیں، وہ کچھ اور ہے۔“ میں نے وہ سب کچھ کہنے سے گریز کیا جو میں کہنا چاہ رہا تھا۔ میرا فقرہ ابھی مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ ہنس دی۔

”آپ کہہ تو صحیح رہے ہیں لیکن آپ کے فقرے میں میرے لیے توہین بھی ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تمہاری توہین کیسے ہوگئی؟“ میں نے حیرت زدہ لہجے میں سوال کیا۔

”آپ نے ایک طرح سے یہ کہا ہے کہ میں اس قابل نہیں کہ مجھے اس طرح تلاش کیا جائے جیسے کوئی قیمتی چیز کو تلاش کرتا ہے۔“ وہ یہ کہتے ہوئے بھی مسکرا رہی تھی۔

میرے پاس اسے مطمئن کرنے کے لیے الفاظ نہیں تھے لیکن پھر بھی میں نے کہہ دیا کہ ”میرا وہ مطلب نہیں تھا۔“

”میں جانتی ہوں۔“ اس نے کہا۔

”شکر ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور وہ ہنس دی۔

”شیدا تو مجھے شاید پوری شدت کے ساتھ تلاش کرتا

لیکن اس کے باپ کا مجھے یوں پاگلوں کی طرح تلاش کرنے کی وجہ کچھ اور ہے۔'' اس نے کہا اور خاموش ہو گئی جبکہ میں منتظر تھا کہ وہ اپنی بات جاری رکھے۔

''اب تم سسپنس پھیلا رہی ہو۔'' میں نے اس کی بڑھتی ہوئی خاموشی کو ختم کرنے کے لیے کہا۔

''سسپنس نہیں پھیلا رہی بلکہ یہ سوچ رہی ہوں کہ کس طرح بیان کروں۔'' اس نے سوچنے والے انداز میں کہا۔

''کسی بھی طرح بیان کرو میرا ابھی سننے کے موڈ کے علاوہ کوئی اور موڈ نہیں ہے۔'' میں نے جواب دیا اور وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ وہ اس طرح ہنسی تھی کہ ہنستی چلی گئی جیسے ہنسنے کے علاوہ دنیا میں اور کوئی کام ہی نہ ہو لیکن پھر اچانک ہی اس کی ہنسی کو بریک لگ گئے۔

''سوری۔'' اس نے ہنستے ہوئے آنکھ میں آجانے والے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے کہا۔

''کس بات پر سوری کر رہی ہو؟'' میں نے سوال کیا اور وہ مسکرا دی۔

''ایک عرصہ بعد... شاید پانچ برس بعد اس طرح ہنسی ہوں۔'' اس نے اپنی ہنسی کے جواز کے طور پر کہا۔

''میں منتظر ہوں۔'' اس کی خاموشی کو میں نے ایک بار پھر ختم کرتے ہوئے کہا۔

''میں یہ سوچ رہی تھی کہ آپ کی بات پر کتنے فیصد یقین کیا جائے۔ خاص طور پر اس صورت میں جبکہ تین راتیں کار کی سیٹ پر گزاری ہوں۔'' اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''تم وہاں سے تین دن سے غائب ہو؟'' میں نے سوال کیا اور اس نے میری حیرت کا جواب سر ہلا کر دیا۔

''آج چوتھی رات ہے۔'' اس نے کہا۔

''وہ چار دن میں تمہیں تلاش نہیں کر سکے؟'' میں نے اپنی حیرت کا مزید اظہار کیا۔

''اس کی ایک وجہ میری احتیاط اور دوسری وجہ بعد میں بتاؤں گی۔'' اس نے جواب میں کہا۔

''اب تک میں کچھ بھی نہیں سمجھ سکا ہوں۔'' میں نے کہا۔ وہ ایک بار پھر ہنس دی لیکن اس بار اس کی ہنسی مختصر ہی تھی۔

''ویسے مرد کی بات پر اعتبار تو نہیں کیا جا سکتا لیکن پھر بھی......'' اس نے مسکراتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''تم میری بات پر اعتبار کر سکتی ہو۔'' میں نے کہا اور اس کے ہونٹوں پر ایک ایسی مسکراہٹ آگئی جسے میں فوری طور پر نہ سمجھ سکا۔

''کہیں آپ یہ تو نہیں کہہ رہے کہ آپ......'' اس نے بظاہر سادہ انداز میں کہا لیکن آنکھوں میں موجود شرارت کچھ اور کہہ رہی تھی۔

ابتدا میں تو میں سمجھ ہی نہیں سکا... کہ اپنے ادھورے فقرے سے وہ کہنا کیا چاہ رہی ہے لیکن جب فقرے کے لفظ اور آنکھوں کی شرارت کو ملا کر سمجھا تو میرا دماغ جیسے بھک سے اڑ گیا۔

وہ میری جانب دیکھ رہی تھی جب میں نے مطلب سمجھ جانے کے بعد اس کی جانب دیکھا تو اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور قبل اس کے کہ میں کچھ کہہ پاتا، وہ کمرے سے نکل چکی تھی۔

وہ ہنستے ہوئے وہاں سے چلی گئی اور میں بھی مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا مگر پھر ذہن کی رو ایک دوسری جانب گھوم گئی۔ اس کالے موٹے سانڈ نے اسے اپنی رکھیل کہا تھا اور یہی اس کی عام شہرت بھی تھی۔ کالے موٹے سانڈ نے اس کی ماں کے بارے میں بھی کچھ اسی طرح کی بات کی تھی لیکن وہ جسے میں پاروہ کے نام سے جانتا تھا اور جو اب اپنا نام ستارہ بتا رہی تھی، اس کے انداز بالکل مختلف تھے۔

وہ واپس ہوئی تو اس کے ہاتھ میں چادر تھی۔ وہ سیدھی بیڈ کی جانب آئی اور دوسری جانب اس طرح آکر بیٹھ گئی کہ تکیے سے ٹیک لگا لی اور چادر اپنے اوپر تان لے لی۔

''تو جناب صحافی صاحب...... انٹرویو کا آغاز کیا جائے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اپنے بارے میں بعد میں بتانا، پہلے یہ بتاؤ کہ وہ تمہیں اس بری طرح صرف اس لیے تلاش کر رہے ہیں کہ تم......'' اس کے آگے مجھ سے کہا نہیں گیا لیکن میرے کچھ نہ کہنے کے باوجود وہ سمجھ گئی۔

''میں ابتدا سے اپنی کہانی کا آغاز کرتی ہوں، باقی باتوں کی وضاحت ہوتی چلی جائے گی۔'' اس نے انتہائی سنجیدہ انداز میں کہا تھا لیکن اس کے بعد وہ خاموش ہو گئی جیسے اپنی آپ بیتی کو ترتیب دے رہی ہو۔

اس کی خاموشی کا وقفہ بڑھتا جا رہا تھا لیکن میں نے بھی اسے ڈسٹرب نہیں کیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ جسمانی طور پر وہاں موجود ہو لیکن ذہنی طور پر ماضی کی کسی بھول بھلیوں میں کھو گئی ہو۔

''میں ستارہ ہوں...... ستارہ ملک۔'' اس نے کہنا شروع کیا لیکن اس طرح جیسے اس کی آواز کہیں دور سے آرہی ہو۔

''ملک غلام حسین ٹرانسپورٹر کی اکلوتی بیٹی۔'' اس نے اپنے فقرے کو جیسے حصوں میں تبدیل کر دیا تھا۔

''ملک غلام حسین جنہیں دن دہاڑے کورٹ کے باہر قتل کر دیا گیا تھا؟'' میں حیرت زدہ اسے دیکھ رہا تھا۔

''آپ جانتے ہیں انہیں؟'' میرے اس طرح بولنے پر اس نے سوال کیا۔

''میں اس وقت نیا نیا اس فیلڈ میں آیا تھا اور کورٹ رپورٹنگ پر مامور تھا۔'' میں نے جواب میں کہا۔

''انہیں کورٹ سے نکلتے ہوئے قتل کیا گیا تھا۔'' اس نے کہا، مجھے سب کچھ یاد تھا۔

''میں اس وقت وہیں تھا جب ان پر گولیاں چلائی گئی تھیں۔'' میں نے کہا اور وہ خالی نظروں سے دیکھتی رہی۔

''جانتے ہیں انہیں قتل کروانے والے کون تھے؟'' اس نے سوال کیا۔

''اڑتی ہوئی کچھ باتیں مجھ تک پہنچی تھیں کہ انہیں قتل کرنے والے ان کے اپنے خاندان کے لوگ تھے۔'' میں نے جواب میں کہا اور اس کی گردن اثبات میں ہل گئی۔

''انہیں ان کی اپنی اولاد یعنی میرے سوتیلے بھائیوں نے قتل کروایا تھا۔'' اس نے غم زدہ لہجے میں کہا۔

''جائداد......؟'' میں نے سوال کیا اور وہ صرف سر ہلا کر رہ گئی۔

''بابا اپنے والد کی اکلوتی اولاد تھے جن کا کاروبار بھی ٹرانسپورٹ ہی تھا۔'' اس نے اپنی بات آگے بڑھائی۔

''مجھ تک یہ بات پہنچ چکی ہے۔'' میں نے کہا لیکن وہ کچھ نہیں بولی تھی۔

''بابا نے اپنے والد کے بعد کاروبار کو عروج تک پہنچا دیا۔'' اس نے کہا۔ لیکن میرے لیے وہ کچھ روکنا مشکل تھا جو اس وقت تک مجھ تک پہنچا تھا۔

''لوگ کہتے ہیں کہ ملک صاحب منشیات اور اسلحے کے معاملات میں بھی کسی حد تک......'' میں نے مزید کچھ کہنے سے بہتر سمجھا کہ خاموش رہوں جو کچھ میں کہنا چاہتا تھا، کہہ چکا تھا۔

''میں کچھ نہیں کہہ سکتی کہ اس میں کتنا سچ ہے...... ہو سکتا ہے کہ ایسا ہو لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایسا بالکل نہ ہو۔'' اس نے جواب میں کہا اور میں صرف سر ہلا کر رہ گیا۔

ڈاکٹر نامہ

ایک موٹے صاحب ڈاکٹر کے منع کرنے کے باوجود ہر چیز کھا جاتے اور ہر روز آکر موٹاپے کا رونا روتے اور ڈاکٹر کے علاج کو ناقص بتاتے۔

تنگ آکر ڈاکٹر نے چٹ پر لکھا۔

''آپ چند روز کے لیے ایتھوپیا چلے جائیں۔''

بی ایم سی کوئٹہ سے بسنت کمار کا نسخہ

رفتار جاناں

کسی زمانے کی بات ہے ایک شخص سخت بیمار ہو گیا۔ اس کے تین بیٹے تھے۔ اس نے ان سے کہا کہ جاؤ قریبی قصبے سے (15 میل دور) میرے لیے دوا لے آؤ۔ جو سب سے آخر میں پہنچے گا، میری جائداد کا وارث وہی ہوگا۔

تینوں بھائی روانہ ہو گئے۔ ایک پیدل اور دوسرے نے گدھا گاڑی کا انتظام کیا۔ گدھا گاڑی والا دوسرے روز پہنچا تو دیکھا والد صاحب فوت ہو چکے ہیں۔ جو پیدل روانہ ہوا تھا، وہ چار دن بعد واپس آیا۔ تیسرے بھائی کا دور دور تک پتا نہ تھا۔ آخر پندرہ دن بعد وہ واپس آیا تو ہڈیوں کا پنجر بن چکا تھا۔

دونوں بھائیوں نے اس کو جائداد ملنے کی مبارک باد دی اور اس سے پوچھا کہ اس نے کس ذریعے سے سفر کیا جو اتنی دیر لگائی۔

تیسرے بھائی نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''پسنجر ریل گاڑی سے۔''

پنڈ دادن خان سے تجمل حسین حیدری کا شگوفہ

غلطی

ایک چور کی سزا پوری ہو گئی اور صبح اس کی رہائی تھی۔ رات کو دوسرے قیدی نے کہا۔

''امید ہے اب تم آئندہ کے لیے سبق سیکھو گے اور یہاں نہیں آؤ گے؟''

رہا ہونے والا چور بولا۔ ''میں پاگل تو نہیں ہوں۔ پچھلی بار تو غلطی سے اندھیرے میں بجلی کے سوئچ کی جگہ ریڈیو کا سوئچ آن ہو گیا تھا اب رہا ہوتے ہی ایک ٹارچ خرید لوں گا۔''

ناصر بیگ، وہاڑی

”شاید مجھے یہ کہنا ہی نہیں چاہیے تھا“ میں نے سوچا لیکن اب کہے ہوئے الفاظ واپس تو نہیں لیے جاسکتے تھے۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

”یہ صحیح ہے کہ میری والدہ کا تعلق اس علاقے سے تھا جہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں لیکن والدہ کی زندگی میں آنے والے واحد مرد میرے والد تھے۔“ اس نے اپنی کہانی کے ایک دوسرے رخ کا آغاز کیا۔

”تم یہ کہہ رہی ہو کہ تمہاری والدہ......“ میں اپنا سوال پورا نہیں کرسکا کیونکہ اس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے مزید کچھ کہنے سے روک دیا تھا۔

”جس محلے سے والدہ کا تعلق تھا وہاں کی اپنی کچھ روایات ہیں۔“ اس نے کہا اور رک گئی۔

”بہت سی روایات کے بارے میں جانتا ہوں۔“ میں نے کہا اور وہ مسکرانے لگی۔

”ان روایات میں سے ایک یہ بھی ہے جب لڑکی کو پہلے گاہک کے حوالے کیا جاتا ہے۔“ اس نے اپنی مسکراہٹ روک کے کہا لیکن اس کا یوں مسکرانا مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔

”تم مسکرائی کیوں تھیں؟“ میں نے سوال کیا اور وہ ایک بار پھر مسکرا دی۔

”آپ بتائیں کہ آپ نے یہ کیسے کہا کہ آپ جانتے ہیں روایات کے بارے میں؟“ اس نے جواب دینے کے بجائے سوال کردیا۔

”میں کچھ عرصے کرائم رپورٹنگ کر چکا ہوں۔“ میں نے کہا لیکن وہ اب تک مسکرا رہی تھی۔

”روایت یہ ہے کہ جس لڑکی کی بولی لگائی جانے والی ہو اسے کچھ روز مجرے میں صرف بٹھایا جاتا ہے۔“ اس نے میرے سوال کو نظر انداز کرکے اپنی بات جاری رکھی۔

”تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟“ میں نے اصرار کیا اور وہ ہنس دی۔

”آپ ناراض ہو جائیں گے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور میں حیرت سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

”اگر میں کہوں کہ نہیں ہوں گا تو......“ میں نے یقین دلانے والے انداز میں کہا اور اس کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہوگئی۔

”بس یونہی ایک بے ہودہ سوال ذہن میں آگیا تھا۔“ اس نے کہا۔

”میں سن سکتا ہوں ؟“ میں نے سوال کیا۔

”بے ہودہ سوال زبان سے کہہ دیا جائے تو اور بے ہودہ ہوجاتا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”تم تجسس بڑھا رہی ہو۔“ میں نے کہا اور نہ جانے کیوں میرا لہجہ تلخ ہوگیا۔

”جس اعتماد سے آپ نے کہا تھا ”میں جانتا ہوں“ تو میرے ذہن میں سوال ابھرا تھا کہ آپ سے سوال کروں کہ ”آپ بھی کبھی رہ چکے ہیں“ اس نے کہا لیکن یہ کہتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر کوئی مسکراہٹ نہیں تھی۔

”کیا بدتمیزی ہے۔“ میں نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہا اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”سوری......“ اس نے معذرت چاہی لیکن اس کی آنکھیں اس کی زبان کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔

”تم کچھ کہہ رہی تھیں۔“ میں نے موضوع بدلنا چاہا۔

”والدہ کو نتھ پہنا کر جب مجرے میں پہلے دن بٹھایا گیا تو وہاں والد صاحب موجود تھے اور والدہ انہیں پہلی ہی نظر میں کچھ ایسی بھائی تھیں کہ انہوں نے نانی سے وہیں کہہ دیا تھا کہ والدہ ان کی ہوگئیں۔“ اس نے اپنی کہانی دوبارہ سے شروع کی۔

”وہ یقیناً بہت خوب صورت ہوں گی؟“ میں نے سوال کیا تو وہ ایک عجیب سے انداز میں ہنسی۔

”ایسی بھی بات نہیں تھی۔“ اس نے میری تردید کی۔

”تو پھر کیا بات ہوئی؟“ میں نے وضاحت چاہی۔

”والدہ سانولے رنگ کی ایک دبلی پتلی سی خاتون تھیں۔“ اس نے جواب میں کہا۔

”لیکن اس کے باوجود بھی......“ میں نے ایک بار پھر اپنا فقرہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔

”والدہ بتاتی تھیں کہ نانی کو والدہ سے کچھ زیادہ امیدیں نہیں تھیں حالانکہ وہ چار بہنوں میں سب سے چھوٹی تھیں۔“ اس نے وضاحت کی۔

”میں کچھ سمجھا نہیں؟“ میں نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

”وہ بتاتی تھیں کہ شروع سے انہیں رقص میں دلچسپی تھی نہ موسیقی میں جبکہ شکل و صورت بھی دوسری بہنوں سے بہتر نہ تھی۔“ اس نے ایک اور وضاحت کی اور بات کسی حد تک میری سمجھ میں آگئی۔

”تمہارے والد کی آفر کو تو نانی نے فوراً قبول کرلیا ہوگا؟“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا لیکن اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

"بات بننے کے بجائے فوراً ہی بگڑ گئی تھی۔" اس نے عجیب سے انداز میں بتایا۔

"ایک اور سسپنس......" میں نے مزاحیہ انداز میں کہا اور وہ ہنس دی۔

"تائی نے جب والدہ کو آفر کا بتایا تو والدہ نے ملنے کی خواہش ظاہر کی اور وہیں معاملہ گڑبڑ ہو گیا۔" اس نے کہا اور چپ ہو گئی۔

"اور گڑبڑ کیا تھی؟" میں اس موقع پر اس کی خاموشی پر الجھ گیا تھا۔

"والدہ نے فرمائش یہ کر دی کہ والد صاحب چاہے واپسی پر طلاق دے دیں لیکن پہلے ان سے نکاح کر لیں۔" اس نے بتایا اور میں چونک گیا۔

"یہ تو شاید......" میں اتنا ہی کہہ سکا تھا کہ اس نے مجھے روک دیا۔

"گڑبڑ یہ ہوئی کہ والد صاحب نے کہا تھا کہ اگر میں نکاح کروں گا تو واپس نہیں آنے دوں گا جبکہ تائی اس کے لیے تیار نہیں تھیں۔" اس نے وضاحت کی۔

"مسئلہ حل کس طرح ہوا؟" میں نے ایک اور سوال کیا۔

"والد نے اپنی طاقت دکھائی اور تائی کو ہتھیار ڈالنے پڑے لیکن پھر بھی وہ خاصی رقم لے مریں۔" اس نے جواب میں کہا شاید وہ بھی تفصیل میں نہیں جانا چاہ رہی تھی۔

"تمہارے والد کی پہلی بیوی نے اعتراض نہیں کیا؟" میں نے سوال کیا۔

"کسی کو کچھ معلوم ہوتا تو اعتراض ہوتا۔" اس نے کہا اور پھر رک گئی۔

"میری پیدائش بلکہ دوسری سالگرہ تک کوئی نہیں جانتا تھا جب معلوم...... ہوا تب بھی کوئی اعتراض نہ کر سکا کیونکہ والد صاحب نے کچھ ایسا ہی رعب رکھا ہوا تھا۔" اس نے اپنا فقرہ مکمل کیا۔

"میں سمجھ گیا۔" وہ کہتے کہتے رکی تو میں نے کہا تاکہ گفتگو میں وقفہ نہ آئے۔

"میرے انٹر کرنے تک حالات معمول پر تھے لیکن اچانک والد صاحب کو ڈاکٹرز نے کینسر تشخیص کیا۔" اس نے بات آگے بڑھائی۔

"لیکن وہ تو......" میں کہنا چاہ رہا تھا کہ اس نے یوں دیکھا جیسے اسے ناگوار گزرا ہو اور میں خاموش ہو گیا۔

"مرض ابتدائی اسٹیج پر تھا اس لیے والد صاحب نے ریکور کر لیا لیکن انہیں یہ احساس ہوا کہ اگر وہ نہ رہے تو ہم ماں بیٹی کے لیے مشکل ہو جائے گی تبھی انہوں نے جائداد کا ایک حصہ ہمارے نام کرنے کا فیصلہ کیا۔" اس نے کہا۔

"اور یہی ان کی موت کا سبب بنا۔" میں نے سمجھ جانے والے انداز میں کہا اور اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

"سوتیلے بھائی اب بڑے ہو چکے تھے، ان کے اپنے کاروبار تھے گھر بار تھے لیکن انہیں یہ گوارا نہ تھا اس لیے انہوں نے بھرپور مخالفت کی۔" اس نے جواب دیا۔

"کیا بہت بڑی جائداد؟" میں نے سوال کیا۔

"ایک بڑی رقم بینک میں میرے نام تھی اور خاصی جائداد والدہ کے نام پر......" اس نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

"لیکن اس سے پہلے ہی......" میں جو کہنا چاہ رہا تھا، وہ اس کی نفی میں ہلتی گردن دیکھ کر نہیں کہہ سکا۔

"انہیں کورٹ سے واپسی پر قتل کیا گیا جب وہ اپنا کام کر چکے تھے۔" اس نے کہا۔

"انہیں کچھ اندازہ تھا تبھی انہوں نے ایک روز بعد کے لیے بھائیوں سے کہا تھا لیکن وہ فیصلہ کر چکے تھے اور انہوں نے ایک دن پہلے ہی کام کر دیا۔" اس نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا اور خاموش ہو گئی۔

"کاش وہ یہ فیصلہ نہ کرتے تو آج میرے ماں اور باپ دونوں سلامت ہوتے اور میں بھی طوائف نہ بنتی۔" اس نے کہا اور اس طرح خاموش ہوئی جیسے کسی اور دنیا میں پہنچ گئی ہو۔

"تمہاری والدہ کو بھی......" میں نے اس کی طویل ہوتی خاموشی کو توڑنے کی غرض سے کہا۔

"والدہ کو بھائیوں نے اس وقت اغوا کیا جب میں کالج میں تھی، ان کا خیال تھا کہ جائداد کے کاغذات والدہ کے پاس ہوں گے لیکن والدہ کو تو کچھ بھی نہیں معلوم تھا۔" اس نے کہا اور میں حیرت سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

"تو کاغذات کہاں تھے؟" میں نے سوال کیا۔

"کاغذات کے بارے میں صرف میں جانتی تھی یا شیدے کا باپ سدو بابا جانتا تھا۔" اس نے کہا اور میں چکرا کر رہ گیا۔

"وہ کس طرح جانتا تھا؟" میں نے کہا لیکن اس نے فوری طور پر اس کا جواب نہیں دیا۔

"کورٹ میں رجسٹری کے وقت میں بابا کے ساتھ تھی۔" اس نے کچھ دیر بعد کہنا شروع کیا۔

"بابا نے مجھ سے کہا کہ میں یہ سدو کے ساتھ جا کر لاکر میں محفوظ کرلوں اور اس کا ذکر کسی سے نہ کروں۔" اس نے کچھ دیر بعد کہا۔

"تم بینک گئیں اور اُدھر تمہارے والد قتل کر دیے گئے؟" میں نے کہا اور اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"وہ اتنا بڑا بدمعاش بنتا ہے اسے تو چاہیے تھا کہ تمہاری اور والدہ کی حفاظت کے لیے کچھ کرتا۔" میں نے کہا اور اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

"والدہ نے بھائیوں سے جنازے میں شرکت کی درخواست کی لیکن ان کا جواب تھا کہ تم والد صاحب کی رکھیل تھیں، تمہارا تعلق والد سے تھا وہ نہیں رہے تو اب ہمارے خاندان کا تم سے کوئی تعلق نہیں رہا۔" اس نے جواب میں کہا۔

"تم مطمئن ہو گئیں کہ معاملہ ختم ہو گیا؟" میں نے سوال کیا۔

"اس وقت شاید میں بھی اس قدر معاملہ فہم نہیں تھی۔" اس نے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔

"لیکن کچھ دن بعد انہوں نے دوبارہ سے کارروائی کی۔" میں نے کہا لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"مجھے والدہ کے اغوا کی خبر ملی تو میں سیدھی سدو کے اڈے پر پہنچی لیکن بدقسمتی یہ ہوئی کہ دو روز قبل ہی سدو گرفتار ہو چکا تھا۔" اس نے جواب میں کہا۔

"تمہاری ملاقات شیدے سے ہوئی؟" میں نے اس کے کچھ کہنے سے قبل کہہ دیا۔

"وہ مدد کرنے کے لیے تیار تو ہو گیا لیکن اس کا معاوضہ بہت بڑا مانگا تھا۔" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

اس نے اس سے آگے کچھ نہیں کہا لیکن کچھ نہ کہنے کے باوجود وہ سب کچھ کہہ گئی تھی۔ ماں کی جان بچانے کے لیے اس نے اپنی قربانی دے دی تھی۔

"شیدے کے لوگ اس کام پر لگ گئے پھر تیسرے دن معلوم ہوا کہ بھائیوں نے اماں کو کہاں رکھا ہے۔ شیدے نے اس مکان پر چڑھائی کر دی جس میں دو بھائی مارے گئے اور اماں کو شیدا برآمد کر لایا۔" وہ ایک سانس میں بولتی چلی گئی۔

"اماں کمزور سی خاتون تھیں اور بھائیوں نے ان پر اس طرح تشدد کیا تھا کہ وہ جانبر نہ ہو سکیں۔ وہ پہلا موقع تھا کہ مجھ میں انتقام کی آگ بھڑکی تھی۔" وہ بولتے بولتے اس طرح رکی جیسے اس کی کہانی مکمل ہو گئی ہو۔

"بدلے کی آگ میں سب کچھ جھلس جاتا ہے۔" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔

"میرے پاس بچا کیا تھا کہ جھلس جاتا۔" اس نے عجیب سے لہجے میں سوال کیا۔

"شاید تم صحیح کہہ رہی ہو۔" میں نے اس کے فقرے کی گہرائی تک پہنچ کر کہا۔

"بھائیوں نے شیدے کو سبق سکھانا چاہا لیکن ایک اور بھائی کے مارے جانے کے بعد دو نے سمجھوتا کرنے کی کوشش کی لیکن شیدا جب تک پوری طرح میری گرفت میں آ چکا تھا۔ اس لیے اس نے انکار کر دیا۔" اس کے لہجے سے نفرت ٹپک رہی تھی۔

"تو کیا وہ دونوں بھی......" میں نے سوال کیا۔

"اگر سدو بابا واپس نہ آ جاتا تو شاید یہ بھی ہو جاتا لیکن سدو نے ان سے کاروبار بیچ کر شہر چھوڑنے کی بات کی اور بھائی تیار بھی ہو گئے۔" اس کا جواب تھا۔

"گویا تمہارا انتقام ابھی باقی ہے۔" میں نے کہا لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"میرے والد سدو اور شیدے کے محسن تھے، یہ بات کسی اور نے نہیں سدو نے مجھ سے معافی مانگتے ہوئے کہی تھی۔" اس نے گفتگو کا رخ کسی اور جانب موڑ دیا تھا۔

"سدو بابا کے بیٹے نے احسان کا بدلہ یہ دیا......" میں ایک بار پھر اپنا فقرہ ادھورا چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔

"برسوں پہلے جب سدو اتنا بڑا بدمعاش نہیں تھا، بابا نے اسے پولیس سے بچاتے ہوئے ٹرک میں روانہ کر دیا تھا اور یہاں پولیس کے تمام معاملات طے کرنے کے بعد انہیں بلوایا تھا۔" اس نے تفصیل بتائی۔

میرا خیال تھا کہ اس کی کہانی ختم ہو گئی ہے کیونکہ اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے نیند کا خمار چھلکنے لگا تھا۔ تبھی میں نے سوال کیا کہ "اب تمہارا کیا پروگرام ہے؟" میں نے گفتگو کو ختم کرنے والے انداز میں سوال کیا۔

"میرا پروگرام پوچھ رہے ہو یا اپنا پروگرام بتانا چاہ رہے ہو۔" اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر شرارت ناچ رہی تھی۔

"میں آج کے بعد کے پروگرام کے بارے میں معلوم کر رہا ہوں۔" میں نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

"فی الحال میرا شہر سے نکلنا ناممکن ہے اور میں آپ

کے سوا کسی پر بھروسا نہیں کرسکتی۔'' اس نے جواب میں کہا اور میں حیرت زدہ سا اسے کچھ کہے بنا دیکھتا رہا۔

''اور مجھ پر یہ مہربانی کیوں؟'' کچھ دیر اسے دیکھتے رہنے کے بعد میں نے سوال کیا۔

''اس پہلی ملاقات میں... تمہاری آنکھوں میں میرے لیے جو پیغام تھے، وہ میں چاہوں بھی تو نہیں بھلا سکتی۔'' اس نے جواب دیا اور میں پوری طرح بوکھلا گیا۔

''تم ہوش میں تو ہو؟'' میں نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا لیکن اس کے ہونٹوں پر ایک ایسی مسکراہٹ آگئی جسے میں کوئی نام نہیں دے پا رہا تھا۔

''میری زندگی میں وہ... پہلی آنکھیں تھیں جن میں میرے لیے ہوس نہیں تھی۔'' اس نے کہا اور میرے رہے سہے اوسان بھی جاتے رہے۔

''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔'' میں یہ کہتے ہوئے بالکل ہی بوکھلا گیا۔

''مجھے پہچاننے میں ایک فیصد بھی غلطی ہوتی تو اس وقت شیدے کے آدمی یہاں موجود ہوتے۔'' اس نے پورے اطمینان کے ساتھ جواب دیا، اس کے لہجے میں بلا کا اعتماد تھا۔

''ایسا شاید میں کبھی نہ کرتا۔'' میں نے جواب دیا۔

''لیکن یہ بھی نہ کرتے کہ مجھے اپنے گھر میں رکھ کر اپنی جان خطرے میں ڈال دیتے۔'' اس نے ایک دوسری طرح سے وار کیا۔

''تم کسی بہت بڑی غلط فہمی کا شکار ہو گئی ہو۔'' میں نے کہا لیکن اپنے لہجے میں موجود شکست کا احساس مجھے فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی ہو گیا تھا۔

''میں جانتی ہوں کہ میں اس قابل نہیں رہی کہ کسی کی زندگی میں شریک ہو سکوں...... لیکن......'' اس نے ایک عجیب سے انداز میں کہا۔

''لیکن کیا......؟'' وہ خاموش ہوئی تو میں چپ نہ رہ سکا۔

''یہ احساس میری تنہا زندگی کے لیے کافی ہے کہ اس زمین پر کوئی ایسا ہے جس نے ایسی نظروں سے مجھے دیکھا جس میں ہوس کے علاوہ سب کچھ تھا۔'' اس نے شکستہ لہجے میں کہا اور میرے لیے خود کو روکنا اب ممکن نہیں رہا۔

میں نہیں جانتا کہ وہ کیا سحر تھا کہ میرا ہاتھ اس کے ہاتھ تک پہنچ گیا، اس نے اپنے ہاتھ کو میرے ہاتھ میں محسوس کر کے نظر اٹھائی تو میں زبان سے کچھ کہے بغیر مسکرا دیا اور اگلے ہی لمحے وہ میرے سینے پر تھی۔

نہ جانے کتنی ہی دیر اس طرح گزری کہ وہ میرے سینے پر سر رکھے سسکتی رہی اور میں اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتا رہا پھر میں نے کہا۔

''اب آرام سے سو جاؤ صبح طے کریں گے کہ ہمیں اس گرداب سے کس طرح نکلنا ہے؟'' میں نے کہا۔

''میں جب وہاں سے نکلی تھی تو جانتی تھی کہ کیسے نکلوں گی۔'' اس نے جواب میں کہا۔

''شیئر کرو گی؟'' میں نے کہا اور اس نے شکایت بھری نظروں سے دیکھا۔

''میں وہاں سے اس طرح نکلی تھی کہ شیدے کو بالکل کنگال کر دیا تھا۔'' اس نے میرے سر پر دھماکا کیا۔

''تم کہہ رہی ہو کہ تم نے چوری کی؟'' میں نے سوال کیا اور اس نے اثبات میں جواب دیا۔

''بیوی کے مرنے کے بعد شیدا زیادہ وقت میرے فلیٹ پر ہی گزارتا تھا اور وہیں اس نے اپنی تجوری بھی منگوا لی تھی۔'' اس نے کہا اور بات میری سمجھ میں آگئی کہ وہ باپ بیٹے اس طرح سے کیوں تڑپ کر اسے تلاش کر رہے تھے۔

''وہ نمبروں والی تجوری تھی اور نمبر میں جان چکی تھی۔'' اس نے تفصیل بتانی شروع کی۔

''تم نے کہاں چھپائی وہ دولت؟'' میں نے تفصیل میں جائے بغیر سوال کیا۔

''وہ دوسرے کمرے میں۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا اور میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''کیا کہہ رہی ہو؟'' میں بالکل بوکھلا گیا تھا۔

''میں گن نہیں سکی ہوں لیکن میرا اندازہ ہے کہ وہ سونا اور نقد رقم کروڑوں میں ہے۔'' اس نے پورے اطمینان سے جواب دیا تھا۔

''اور اسے ساتھ لے کر تم ملک سے کس طرح نکلو گی؟'' میں نے سوال کیا۔

''ملک سے جانے کی بات کب کی میں نے؟'' اس نے کہا اور میں ایک بار پھر حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

''تو پھر......؟'' میں نے سوال کیا لیکن اس نے فوراً ہی کوئی جواب دینے سے گریز کیا۔

''دو روز بعد عید کی چھٹیاں شروع ہوں گی۔'' اس نے کہنا شروع کیا تھا۔

''اس سے کیا فرق پڑے گا؟'' میں نے ایک اور سوال کیا۔

''ہم دونوں تمہاری گاڑی میں اسلام آباد نکل جائیں گے۔ جہاں تم مجھے چھوڑ کر واپس آ جانا۔'' اس نے کہا۔

''پہلی بات تو یہ ہے کہ اسلام آباد ہی کیوں؟'' میں نے سوال کیا۔

''وہاں میرا فلیٹ ایک ایسی بلڈنگ میں ہے جہاں میرے فلیٹ کے علاوہ آفس ہیں۔'' اس کا جواب تھا۔

''عید کی چھٹیوں میں تمہیں کوئی وہاں جاتے ہوئے نہیں دیکھے گا۔'' میں نے وضاحت چاہنے والے انداز میں سوال کیا اور اس نے اثبات میں سر ہلا کر میری تائید کر دی۔

''میں کھانے پینے کا سامان ساتھ لے کر جاؤں گی اور جب تک وہاں رہوں گی، احتیاط کروں گی کہ کسی کے علم میں میری موجودگی ظاہر نہ ہو۔'' اس نے اپنے پروگرام کی تفصیل بیان کی۔

''پہلی بات تو یہ ہے کہ میری کار اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ اتنا طویل سفر کر سکے۔'' میں نے کہا اور وہ سوچ میں ڈوب گئی۔

''ایک صورت ہو سکتی ہے۔'' اس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ میں منتظر تھا کہ وہ آگے کیا کہتی ہے لیکن پھر خود ہی اس نے اپنی بات کی تردید کی۔ ''اس میں بھی خطرہ ہے۔''

''خود کہہ رہی ہو، خود ہی تردید بھی کر رہی ہو۔'' میں نے کہا لیکن اس کے چہرے کی سنجیدگی میں نہ کوئی فرق آیا نہ اس نے میرے جواب میں کچھ کہا۔

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تم ایک نئی کار خرید لو۔'' اس نے کہا لیکن میں نے انکار میں گردن ہلا دی۔

''نئی کار کی رجسٹریشن وغیرہ......'' میں نے کہنا چاہا لیکن اس نے درمیان میں بات کاٹ دی۔

''بہت اچھی کنڈیشن کی کوئی قیمتی کار یا لینڈ کروزر قسم کی جیپ تو لی جا سکتی ہے۔'' اس نے کہا اور میں خاموش ہو گیا۔

''میں نے سوچا تھا کہ کرائے کی کار لی جائے لیکن اس میں خطرہ ہے۔'' اس نے اب اپنے خیال کی تردید کرنے والے انداز میں کہا۔

''باقی باتیں صبح کریں گے۔ اب مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔'' میں نے موضوع کو ختم کرنے والے انداز میں کہا۔

وہ خاموش ہو گئی جیسے میری تردید نہیں کرنا چاہتی ہو لیکن مجھے یہ محسوس ہوا جیسے کچھ کہنا بھی چاہ رہی ہو اور کچھ دیر بعد اس نے اس کا اظہار کر بھی دیا۔ ''مجھے اپنے قریب آنے دو گے؟''

اعتراف

''میں تمہاری خاطر ساری دنیا سے ٹکر لے سکتا ہوں...... کیونکہ مجھے تم سے محبت ہے...... اتنی محبت کہ دنیا کا کوئی بھی شخص کسی سے اتنی محبت نہ کرتا ہوگا۔ میں تمہارے لیے اپنی جان تک قربان کر سکتا ہوں۔''

''کیا تم کو بھی مجھ سے اتنی ہی محبت ہے ڈارلنگ؟'' نوجوان نے اپنی محبوبہ سے کہا۔

''سچ پوچھو تو اس سے کہیں زیادہ۔'' لڑکی نے نوجوان کے گلے میں باہیں ڈالتے ہوئے کہا۔

''مگر...... مگر میں کیسے یقین کر لوں؟'' نوجوان نے اضطراب سے پوچھا۔ ''کہیں تم میری طرح جھوٹ تو نہیں بول رہی ہو؟''

افتخار حسین، چیچہ وطنی

''نہیں۔'' میں نے جواب دیا اور اس کے چہرے پر حیرت نمودار ہوئی۔

''ایک نئی زندگی کے آغاز میں گناہ کی بنیاد نہیں ہونی چاہیے۔'' میں نے جواب دیا تو وہ مجھے خاموشی سے دیکھنے لگی۔

''میں تو صرف یہ چاہتی تھی کہ......'' اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''ہم ایک بیڈ پر مجبوراً ساتھ ہیں۔'' میں نے جواب میں کہا اور وہ خاموش ہو گئی۔

''میں نے صرف قریب آنے کی بات کی تھی۔'' میں نے اس کی آواز سنی لیکن یہ بات اس نے بہت آہستگی سے کہی تھی۔

''میں انسان ہوں، فرشتہ نہیں۔'' میں نے جواب دیا اور وہ خاموش رہی۔

میں نے رخ بدل کر سونے کی کوشش شروع کی اور پھر مجھے نیند کی وادیوں میں اترتے ہوئے زیادہ دیر بھی نہیں لگی تھی۔ مجھے بیدار کرنے والی بھی وہی تھی لیکن وہ رات والے ڈریس میں نہیں تھی۔

''ناشتا تیار ہے۔'' مجھے بیدار ہوتا دیکھ کر اس نے کہا۔

''تم کب اٹھ گئی تھیں؟'' میں نے اسے پوری طرح فریش دیکھ کر سوال کیا۔

''میں سو نہیں سکی تھی۔'' اس کا جواب تھا۔

''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''جو لمحات رات میں آئے ہیں، وہ کسی بھی لڑکی کی زندگی میں آتے تو کیا وہ سو سکتی تھی۔'' اس نے عجیب سے لہجے میں سوال کیا۔

''چونکہ میں لڑکی نہیں ہوں اس لیے کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' میں نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا اور وہ ہنس دی۔

''میں نے اپنا پلان تبدیل کر دیا ہے۔'' اس نے اچانک کہا اور میں .... خالی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

''ہم کہیں نہیں جارہے۔'' اس نے دوٹوک انداز میں کہا۔

''لیکن وہ کالا موٹا سانڈ اور اس کا باپ......؟'' میں نے کہنا چاہا۔

''آپ آرام سے دفتر جائیں۔'' اس کا انداز اب بھی فیصلہ کن تھا۔

''تم کہنا کیا چاہ رہی ہو؟'' میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ اس اچانک تبدیلی کی وجہ کیا ہے۔

''تمہاری ذات پر میں اب کوئی رسک نہیں لے سکتی۔'' اس نے کہا لیکن یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا چہرہ دوسری جانب کرلیا تھا۔

''اپنا تبدیل شدہ پلان ہی بتا دو۔'' میں نے کہا۔ یہ اندازہ میں کر چکا تھا کہ وہ جو فیصلہ کرتی ہے، اسے تبدیل نہیں کرتی۔

''دفتر سے واپسی پر سب کچھ بتا دوں گی۔'' اس کا انداز وہی فیصلہ کن رہا تھا۔

جس انداز میں وہ گفتگو کر رہی تھی، اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ مزید کوئی گفتگو نہیں کرے گی۔

میں دفتر پہنچا تو وہاں پر ایک عجیب سی کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ ہر شخص اس خبر پر تبصرہ کر رہا تھا کہ کسی نے شیدے اور اس کے باپ سدو بابا کو ان کے گھر میں گھس کر گولیاں ماری تھیں۔ شیدا تو موقع پر ہی ہلاک ہو گیا تھا لیکن سدو بابا انتہائی نازک حالت میں اسپتال لے جایا گیا تھا جہاں اب بھی اس کی حالت خطرے سے باہر نہیں تھی۔

''یہ سب کیسے ہوا؟'' میں نے کرائم رپورٹر سے سوال کیا۔

''کوئی نوجوان تھا جو چھت کے راستے گھر میں آیا تھا۔'' کرائم رپورٹر نے بتایا۔

''چھت کے راستے؟'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

''پولیس کا کہنا ہے کہ پچھلی گلی سے پائپ کے راستے چھت پر گیا اور چھت سے وہ اس کمرے میں گیا جہاں شیدا سو رہا تھا۔'' کرائم رپورٹر نے تفصیل بتائی۔

''اور اس کا باپ؟''

''گولیوں کی آواز سن کر سدو آیا تو نوجوان نے اسے بھی گولیاں ماری تھیں لیکن وہ صرف زخمی ہوا تھا۔'' اس نے مزید تفصیل بتائی۔

کرائم رپورٹر تو کسی نوجوان کا ذکر کر رہا تھا لیکن میرا ذہن نادرہ کی جانب جا رہا تھا۔ وہ نادرہ جس نے اپنا نام ستارہ بتایا تھا جو ملک کی ایک نامور ماڈل کے طور پر جانی جاتی تھی لیکن مرنے والا شیدا اسے اپنی رکھیل کہتا رہا تھا۔

''نوجوان پکڑا نہیں گیا؟'' کچھ دیر بعد میں نے سوال کیا۔

''شیدے کے اڈے کے لوگ تو اس کا چہرہ بھی نہیں دیکھ سکے تھے۔'' رپورٹر نے کہا۔

''کیا مطلب؟'' میں سوال کیے بنا نہیں رہ سکا۔

حیرت مجھے اس پر تھی کہ شیدے کے اڈے پر میں اس کے بہت سے حواری دیکھ چکا تھا، اتنے لوگوں میں وہاں کسی کا یوں آنا اور اپنا کام کر کے چلے جانا، حیرت کی ہی بات تھی۔

''صبح فجر کے وقت اڈے کے لوگ سو رہے تھے۔ گولیوں کی آواز سن کر ان میں سے کچھ لوگ دوڑے تھے لیکن اتنی دیر میں وہ نوجوان جس راستے سے آیا تھا وہیں سے واپس ہو گیا تھا۔'' اس نے تفصیل بتائی۔

''تو یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ کوئی نوجوان تھا؟'' میں نے ذہن کے اندیشوں کو الفاظ کا روپ دیا۔

''وہ لوگ صرف اتنا دیکھ سکے تھے کہ ہیلمٹ پہنے ہوئے ایک نوجوان جو جینز میں تھا، وہ موٹر سائیکل پر پچھلی گلی سے نکل رہا تھا۔'' کرائم رپورٹر نے اپنی کہانی مکمل کی۔

''پولیس کو کسی پر شبہ ہے؟'' میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ سوال کیا۔

''کچھ کہا نہیں جا سکتا ابھی تو ابتدا ہے۔'' اس نے جواب میں کہا۔

''شیدے جیسے لوگوں کی نہ جانے کس کس سے دشمنی ہوگی۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا اور اس نے بھی میری تائید کر دی۔

میں نے چاہا کہ گھر فون کر کے بتاؤں لیکن پھر میں نے خود کو روکا۔ پولیس سے اتنی تیزی کی توقع تو نہیں تھی لیکن میں نے پھر بھی احتیاط ضروری سمجھی تھی۔

وہ پورا دن میرا اسی الجھن میں گزرا تھا۔ بار بار میرا

ذہن اس کی جانب جاتا تھا لیکن پھر ذہن خود ہی اس کی تردید بھی کر دیتا۔ ''ایک کمزور سی لڑکی ایسا کیسے کر سکتی ہے؟'' تردید سے پہلے وہ تمام باتیں جو معلوم ہوئی تھیں، سوچنے کے بعد ذہن کہتا رہا۔

''پچھلی گلی میں داخل ہوتا...... پائپ کے راستے چھت پر پہنچنا اور پھر دوا فرار پر گولیاں چلانا۔''

''ستارہ یہ سب نہیں کر سکتی۔'' میں نتیجے پر پہنچا لیکن ذہن پھر بھٹک جاتا کہ جس طرح وہ شیدے کے یہاں سے فرار ہوئی تھی، وہ بھی کوئی معمولی کام نہیں تھا۔

اپنے معمول کے مطابق گھر پہنچا تو اس نے مسکراتے ہوئے میرا استقبال کیا۔ اس نے ہلکا سا میک اپ بھی کیا ہوا تھا اور کپڑے بھی تبدیل کیے تھے۔

''خیریت تو ہے؟'' میں نے اس کی مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دیتے ہوئے سوال کیا۔

''آئندہ کی زندگی کی ریہرسل کر رہی ہوں۔'' اس کا جواب تھا۔

''جانتی ہو کہ کسی نے شیدے کو ہلاک کر دیا ہے۔'' میں نے اطلاع دی لیکن اس کے لیے یہ خبر نئی نہیں تھی۔

''ایک گھنٹا پہلے سدو بھی مر گیا۔'' اس نے مجھے خبر دی۔

میں بہت کچھ جاننا چاہتا تھا لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں کوئی سوال کر سکتا پھر اسی نے خاموشی کا وقفہ ختم کیا۔

''ہم عید کی صبح روانہ ہوں گے۔'' اس نے کہا۔

''کہاں؟'' میں نے سوال کیا۔

''پہلے ہم دبئی جائیں گے پھر وہاں سے آگے کا پروگرام بنائیں گے۔'' اس نے جواب میں کہا۔

''لیکن دبئی کا ویزا وغیرہ؟'' میں نے سوال کیا۔

''ہم دونوں کے پاسپورٹ کل واپس مل جائیں گے، ویزا سمیت۔'' اس نے اعتماد سے جواب دیا تھا۔

''اگر میں کچھ پوچھنا چاہوں؟'' میں نے جھجکتے ہوئے سوال کیا۔

''کوئی سوال نہ بھی کرو تب بھی میں ہر بات سچ بتا دوں گی۔'' اس نے جواب میں کہا۔

''تو...... کیا......'' میں یہ دو لفظ ہی کہہ سکا تھا۔

''ان دونوں کو میں نے ہی مارا ہے۔'' اس نے اطمینان کے ساتھ جواب دیا۔

''جب تک تم نے وہ لفظ مجھ سے نہیں کہے تھے، میں بزدل تھی لیکن جب تمہارے لفظ میرے کانوں میں پڑے تو میں بہادر ہو گئی۔'' اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''لیکن وہ سب......'' میں ایک بار پھر تفصیل میں نہیں جا سکا تھا۔

''محبت سب کچھ کروا دیتی ہے۔'' اس نے کہا اور اس کے ساتھ ہی اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

''میں اکیلی تمام عمر بھاگ سکتی تھی شاید مار بھی دی جاتی لیکن یہ خطرہ تمہارے لیے نہیں لے سکتی تھی۔'' اس نے دوٹوک انداز میں کہا۔

میں نے اسے قریب کرنا چاہا تو خود بخود اس کا سر میرے سینے پر ٹک گیا۔ نہ جانے کتنی ہی دیر ہم اسی طرح رہے اور پھر اس کی سرگوشی میرے کانوں میں سنائی دی۔

''ایک طوائف زادی ایک قاتلہ اپنا ماضی دفن کرنا چاہتی ہے۔'' اس نے عجیب سے لہجے میں کہا اور میں نے اسے اور قریب کرلیا۔

''تم ستارہ تھیں اور ستارہ ہو۔'' میں نے کہا اور ہم ایک ہوتے چلے گئے۔

ستارہ تمام انتظامات کر چکی تھی۔ بہت سی چیزیں اس نے لاکر میں رکھیں اور بقیہ چیزیں اس نے فروخت کر دیں اور چھپائی ہوئی رقم کا انتظام بھی اس نے اس طرح کیا کہ رقم ہمیں دبئی میں مل جائے۔

شیدے اور سدو کے باقی رہ جانے والے ساتھی اس وقت کفن دفن کی تیاریوں میں مصروف ہوں گے جب ہم دبئی کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ ہر کام اسی طرح ہوا تھا جس طرح ستارہ چاہتی تھی۔ دبئی میں ہم پندرہ دن رہے تھے پھر رخشندہ کے مشورے پر ہم فلوریڈا چلے آئے تھے۔ امریکا سے ایک بار میں سال بھر بعد پاکستان آیا تھا اور واپسی پر ستارہ کے لاکر کی تمام چیزیں لے کر اور فلیٹ بیچ کر واپس چلا گیا تھا۔

سات برس پہلے ہم نے طے کیا تھا کہ 2015ء سے پہلے ہم پاکستان نہیں آئیں گے اور اب 2015ء کو ہم اپنے تینوں بچوں کے ساتھ واپس آرہے ہیں جہاں رخشندہ اور اس کی فیملی ہمارا انتظار کر رہی ہے۔ ہم 2014ء کی آخری رات کو یہاں سے چلیں گے اور 2015ء کی پہلی کرنوں کے ساتھ پاکستان پہنچیں گے جہاں رخشندہ نے ہماری پہلی بیٹی امید فاطمہ کی سالگرہ کا اہتمام کیا ہوگا۔ امید فاطمہ کی تاریخ پیدائش یکم جنوری ہے۔ ہم سب کی نئی زندگی کی علامت جو ہے۔

شامت اعمال

کاشف زبیر

کہا جاتا ہے کہ بہار کا موسم گانا گانے کے لیے موزوں... اور جاڑے کا موسم کہانی سنانے کے لیے... موسم اور کہانی کا لطف تبھی دوبالا ہوتا ہے جب دونوں من پسند ہوں... شامی اور تیمور کی ہمراہی میں شروع ہونے والے ایسے ہی سفر کی دلچسپ داستان... پہاڑی باشندوں کو اپنے راستوں کا خوب ادراک ہوتا ہے... کبھی کوئی سیدھا اور ہموار راستہ تباہی کی طرف لے جاتا ہے تو اس برعکس کٹھن اور خطرناک راستے کو اپنایا جائے تو ...اپنی منزل تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔ عقاب اور چڑیا کی مانند کرداروں کا منتخب کردہ کھیل... دونوں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوششوں میں تھے۔ جرم و جعل سازی اور درندگی کے ٹکراؤ سے لمحہ بہ لمحہ رنگ بدلتی داستان کے ہزار رنگ...

صبح کے پونے نو بجے سیاہ وین بینک اور پولیس اسٹیشن کے درمیان رکی۔ اس چھوٹے سے قصبے میں جو آبادی کے لحاظ سے بڑا نہیں تھا مگر یہاں گھر اور دوسری عمارتیں خاصی شاندار اور پوش قسم کی تھیں۔ یہاں ایک ہی بینک اور ایک ہی پولیس اسٹیشن تھا۔ نو بجے بینک کا عملہ آیا اور بینک کھل گیا۔ اس کے ساتھ ہی وین کے عقبی حصے میں موجود تین افراد حرکت میں آ گئے۔ انہوں نے شدید سردی کی مناسبت سے بھاری جیکٹیں، موٹی پتلونیں، ہاتھوں میں دستانے اور سروں پر بڑی اونی ٹوپیاں پہن رکھی تھیں جو فولڈ کی ہوئی تھیں۔ وہ وین سے اتر کر آگے بڑھے اور پولیس اسٹیشن کے دروازے پر آتے ہی انہوں نے ٹوپیاں کھینچ کر چہروں پر کر لیں۔ اب وہ نقاب پوش ہو گئے تھے۔ صرف آنکھوں والی جگہیں کھلی تھیں۔ پولیس اسٹیشن ایک احاطے میں موجود چند کمروں میں قائم تھا اور یہاں ایک وقت چھ سے زیادہ افراد کا عملہ نہیں ہوتا تھا۔ اندر گھستے ہی انہوں نے ہتھیار نکال لیے اور احاطے میں موجود سپاہی کو ہینڈز اپ کر لیا۔

''اندر کتنے اہلکار ہیں؟'' ایک نقاب پوش نے پوچھا اور سپاہی نے فرفر جواب دیا۔ سپاہی تنہا تھا۔ وہ اسے لے کر اندر گئے اور پانچ منٹ بعد نائٹ شفٹ کے انچارج سمیت چھ پولیس اہلکار تھانے کے لاک اپ میں دھکیل دیے گئے۔ ان کا اسلحہ الماری میں بند کر کے اسے تالا لگا دیا گیا تھا۔ لاک اپ ویسے ہی مقفل تھا۔ یہ کام کر کے وہ تینوں تھانے سے باہر آئے اور پولیس اسٹیشن کا گیٹ بند کر کے اس پر بھی تالا ڈال دیا۔ شدید سردی کی وجہ سے وہاں ویرانی تھی۔ اس لیے کسی نے ان کی کارروائی نہیں دیکھی یا دیکھی بھی تو اس میں دخل اندازی مناسب نہیں سمجھا۔ وہ اپنی وین میں واپس آئے۔ ایک نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور باقی دو عقبی حصے میں آ گئے۔

وین ریورس ہوئی جیسے واپس جانے کے لیے مڑ رہی ہو مگر وہ ریورس ہوتی ہوئی بینک کا شیشے کا دروازہ توڑتی ہوئی اندر گھس گئی۔ دروازے پر موجود واحد گارڈ وین کی ٹکر سے زخمی ہو کے ایک طرف جا پڑا تھا۔ وین کے رکتے ہی اس کے عقبی حصے سے دونوں نقاب پوش نکلے اور انہوں نے بینک میں موجود تمام افراد کو چھوٹے سے کھلے حصے میں آنے کا حکم دیا۔ بینک بھی زیادہ بڑا نہیں تھا اس کا عملہ آٹھ افراد پر مشتمل تھا اور ابھی صبح کوئی گاہک نہیں آیا تھا۔ جب سب افراد آ کر ہال میں لیٹ گئے تو ایک نقاب پوش نے پوچھا۔ ''منیجر کون ہے؟''

''میں ہوں۔'' سفید داڑھی والے شخص نے سر اٹھا کر کہا، اس نے سوٹ پہنا ہوا تھا۔ بولنے والے نقاب پوش نے اس کے کوٹ کا کالر پکڑ کر اسے اٹھایا۔

''ہمیں سیف روم تک لے چلو، جلدی۔''

اسی اثنا میں تیسرا جو ڈرائیونگ کر رہا تھا عقبی حصے میں آ گیا اور اس نے اپنی رائفل سے ہال میں لیٹے افراد کو کور کر لیا۔ منیجر ان دو نقاب پوشوں کے ساتھ عقبی حصے میں واقع سیف روم تک آیا۔ اس نے...... آہستہ سے کہا۔ ''تم لوگ بہت بڑی غلطی کر رہے ہو۔ کاؤنٹر پر پندرہ لاکھ کا کیش ہے وہ لو اور جاؤ۔''

''بکواس مت کرو۔'' اس کی گدی پکڑے نقاب پوش نے اسے دھکا دیا۔ ''سیف کھولو۔''

منیجر نے انکار کیا۔ ''میں نہیں کھول سکتا۔''

''دوسری صورت یہ ہے کہ ہم بم سے سیف اڑا دیں۔'' نقاب پوش نے سرد لہجے میں کہا۔ وہی بات کر رہا تھا، اس کے دونوں ساتھی اب تک بالکل خاموش تھے۔ ''مگر ہم کے ساتھ تمہیں بھی سیف سے باندھ دیں گے۔ بولو اب کیا کہتے ہو؟''

منیجر مرنا نہیں چاہتا تھا اس لیے مجبوراً اس نے سیف کھول دیا۔ یہ خاصا بڑا دیوار گیر سیف تھا۔ جب وہ کھلا تو اس میں کرنسی نوٹوں کے بنڈل دکھائی دیے۔ مقامی کرنسی زیادہ نہیں تھی مگر ڈالرز کی بہتات تھی جو اس چھوٹی سی شاخ میں حیران کن تھی۔ انہوں نے جیکٹوں سے نائلون کے مضبوط تھیلے نکالے اور ڈالرز کی گڈیاں ان میں بھرنے لگے۔ انہوں نے صرف ڈالرز بھرے تھے، مقامی کرنسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ ویسے بھی وہ دس بارہ لاکھ سے زیادہ نہیں تھی۔ منیجر نے کہا۔ ''اسے کیوں چھوڑ رہے ہو؟''

''تمہارے لیے۔ تم بے شک اس ڈکیتی کی رپورٹ کرا دینا۔ ان ڈالرز کے بارے میں تم ایک لفظ نہیں کہہ سکتے ہو۔'' یہ کہتے ہوئے نقاب پوش کا لہجہ سخت تیز ہو گیا۔

ڈالرز کی گڈیوں والے دونوں تھیلے اتنے وزنی تھے کہ وہ انہیں اٹھانے کے بجائے چکنے فرش پر کھینچتے ہوئے باہر لائے اور وین کے عقبی حصے میں ڈال دیا۔ وین میں سوار ہونے سے پہلے نقاب پوش نے اعلان کیا۔ ''دس منٹ تک کوئی باہر نہیں آئے ایسا کرنے والے کی جان کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ وہ اپنی موت کا خود ذمے دار ہوگا۔''

مگر جیسے ہی وین باہر نکلی منیجر اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف لپکا اس نے جاتے ہی اپنی دراز میں رکھا ہوا موبائل نکالا اور ایک نمبر ڈائل کیا، رابطہ ہوتے ہی اس نے کہا۔ ''فضل

سرورق کا بہترین رنگ...

نئے سال اور سالگرہ نمبر

کی دلفریب جیبوں کے سنگ

خان بات کررہا ہوں۔۔۔ تین آدمی آئے تھے، وہ ڈالرز لے گئے ہیں۔۔۔ ان میں یاسر بھی تھا۔۔۔ ہاں وہی یاسر جو تمہاری طرف سے آتا تھا۔۔۔ وہ سیاہ وین میں آئے تھے نمبر نوٹ کر لو۔۔۔'' فضل خان نے وین کا نمبر بتا کر کال کاٹ دی اور پھر اس نے پولیس کو اطلاع دی۔ پولیس تاخیر سے آئی تھی اور تب تک اس نے پوری اسٹوری تیار کر لی تھی۔ صرف تیار نہیں کی تھی بلکہ اپنے عملے کو بھی سمجھا دی تھی۔ انہوں نے پولیس کو بھی بیان دیا کہ ڈاکو بینک سے تقریباً اٹھائیس لاکھ روپے لوٹ کر لے گئے تھے۔ نقاب پوش کا کہنا درست ثابت ہوا تھا۔ منیجر نے ڈالرز کا ذکر بھی نہیں کیا تھا۔ اس نے مقامی کرنسی پولیس کی آمد سے پہلے غائب کر دی تھی اور اس کا مقصد ڈکیتی کے اصل مقصد کو چھپانا تھا۔ وہ کسی صورت ڈالرز کا ذکر نہیں کرسکتا تھا۔

☆☆☆

شامی نے اس بار بہت احتیاط سے کام لیا تھا۔ اول اس نے نواب صاحب سے صرف برف باری دیکھنے کی اجازت لی تھی، اس کی بھاپ بھی نہیں نکالی تھی کہ ان کا ارادہ کہاں جانے کا تھا، دوسرے جوجی کو قطعی بے خبر رکھا تھا۔ شامی کا کہنا تھا کہ اسے ایک دن پہلے بھی بتایا جاسکتا تھا۔ اگر وہ چلنے کے لیے تیار ہوتا تو ٹھیک تھا ورنہ وہ اور تیمور بھی جا سکتے تھے۔ شامی کسی صورت نوشی کو ساتھ لے جانے پر آمادہ نہیں تھا۔ کیونکہ وہ جہاں جا رہے تھے وہاں برف پر اسکیٹنگ کے لیے باہر سے لوگ آتے تھے اور جو لوگ باہر سے آتے تھے وہ آزادیٔ نسواں کے قائل تھے اس لیے آنے والوں کی نصف تعداد خواتین پر مشتمل ہوتی تھی۔ پچھلی بار اس نے نوشی کے ساتھ انجوائے کیا تھا مگر اب وہ نوشی کے ساتھ جانے کو تیار نہیں تھا۔ تیمور نے وجہ پوچھی۔

''پچھلی بار تو اس کے ساتھ خوشی خوشی گیا تھا؟''

''ہاں مگر اب صرف ہنی مون پر لے کر جاؤں گا۔'' شامی نے کہا۔ ''ویسے بھی وہ ذرا نستعلیق قسم کی محبوبہ ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''محبت تو پوری چاہتی ہے مگر اس کا عملی اظہار پسند نہیں کرتی۔''

''یہ تو شریف لڑکیوں کی نشانی ہے۔'' تیمور نے کہا۔ ''شادی کے بعد تو منع نہیں کرے گی۔''

''تب ہی تو شادی صرف نوشی سے کروں گا۔'' شامی نے دانت نکال کر کہا۔

''دادا جان کو کیا بتایا ہے؟''

''یہی کہ برف باری دیکھنے جارہے ہیں۔''

''جبکہ ہم اسکیٹنگ کرنے جارہے ہیں۔'' تیمور نے کہا۔ ''اسکیٹنگ کے دوران بعض اوقات ہڈی پسلی بھی برابر ہوجاتی ہے۔ اس صورت میں کیا کہا جائے گا؟''

''حادثہ تو راہ چلتے انسان کو بھی پیش آتا ہے۔'' شامی نے کہا۔ ''بس تیاری پکڑ لے۔ جانا پرسوں ہے اور جوجی کو کل بتائیں گے۔''

''تیاری ٹھیک سے کرنا ہوگی۔ شمال میں موسم بہت خراب ہے اور حالات بھی اچھے نہیں ہیں۔''

''فکر مت کر اس بار دادا جان نے خود کہا ہے کہ ان کے اسلحہ خانے سے بہترین ہتھیار ساتھ لے کر جائیں گے۔''

ہتھیار شامی نے خود چنے تھے۔ دو عدد پستول تھے اور ایک عدد شاٹ گن تھی۔ گاڑی لینڈ کروزر منتخب کی تھی مگر ساری تیاریاں نہایت خفیہ طریقے سے ہو رہی تھیں۔ کیونکہ نوشی کا ولا میں آنا جانا تھا اور وہ ملازموں سے بھی بے تکلف تھی اس لیے خبریں اس تک جاسکتی تھیں۔ اس کے باوجود شامی کو سب سے بڑا خطرہ جوجی سے تھا۔ وہ چوبیس گھنٹے پہلے بھی نوشی کو بتا دیتا تو وہ ان کے سر ہو سکتی تھی۔ کئی ناکامیوں کے بعد اس بار شامی بہر صورت کامیاب ہونا چاہتا تھا۔ اس نے روانگی سے صرف بارہ گھنٹے پہلے جوجی سے بات کی اور اس طرح کہ اس کے گھر پہنچ گیا۔ اس کے باپ سے اجازت لی اور پھر اس کا سامان باندھنے میں مدد کی اور آخر میں اس نے جو رہ گیا تھا، جوجی کو ساتھ لے جا کر وہ سب دلایا۔ اس دوران میں وہ اسے یاد دلاتا رہا کہ اگر اس نے اپنی نوشی باجی کو اس بارے میں ایک لفظ بھی بتایا تو شاید نوشی چلی جائے مگر وہ ہرگز نہیں جاسکے گا۔ جوجی نے اسے یقین دلایا کہ ایسا نہیں ہوگا۔

''میں سمجھ گیا ہوں جی نوشی باجی کو مجھ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ انہوں نے صرف آپ پر نظر رکھنے کے لیے مجھے اپنا چھوٹا بھائی بنایا ہے۔''

شامی خوش ہوگیا۔ ''میں تو تمہیں سمجھاتا تھا مگر تمہاری ناقص میرا مطلب ہے منی سے عقل میں بات نہیں آتی تھی۔ خیر چھوڑو یہ بتاؤ کہ رباب کیسی ہے؟''

''ٹھیک ہے۔ اس کے ابا نے اسے لاہور کے ایک کالج میں داخل کرا دیا ہے۔'' جوجی نے منہ لٹکا کر کہا۔

''لاہور کیوں؟'' شامی چونکا۔

جوجی اداس ہوگیا۔ ''مجھے تو لگتا ہے وہ اسے مجھ سے

دور کرنا چاہتے ہیں۔''

''اس کی یہ مجال۔'' شامی نے نواب صاحب کے سے لہجے میں کہا۔ ''ہمارے ہوتے ہوئے وہ اپنی بیٹی کی شادی کہیں نہیں کرسکتا۔''

''شامی بھائی۔'' جوجی نے احتجاج کیا۔

''ہمارا مطلب ہے کہ صرف تم سے کرسکتا ہے اور کسی سے نہیں۔'' شامی نے جلدی سے وضاحت کی اور پھر خفگی سے بولا۔ ''تم بھی اپنی باجی کی طرح کم عقل ہو۔ فوراً غلط مطلب نکال لیتے ہو۔''

جوجی پُرامید ہوگیا۔ ''آپ رباب سے میری شادی کرا دیں گے۔ مجھے تو اس کے ابا کے ساتھ اپنے ابا کا ارادہ بھی نہیں لگ رہا۔ دونوں اوپر اوپر سے دوست بنے ہوئے ہیں، اندر سے دشمن ہی ہیں۔''

''تم فکر مت کرو اگر تم نے نوشی کے سامنے اپنی زبان بند رکھی تو رباب کی شادی تم سے ضرور ہوگی لیکن تم نے زبان سے ایک لفظ بھی نکالا تو۔۔۔''

''بالکل نہیں نکالوں گا جی۔'' جوجی نے یقین دلایا۔

''بس تو سمجھ لو کہ یہ تمہاری زندگی کا ایک یادگار ٹرپ ہوگا۔'' شامی نے کہا اور اسے اس کے گھر کے پاس اتار کر روانہ ہوگیا۔ اگلی صبح جب وہ روانہ ہو رہے تھے تو سخت سردی کے باوجود نوشی آن موجود ہوئی۔ اسے یقیناً کسی ذریعے سے بھنک پڑ گئی تھی اور اس نے عین اس وقت چھاپا مارا جب وہ لینڈ کروزر میں سامان رکھ رہے تھے۔ نوشی نے آتے ہی تفتیشی لہجے میں پوچھا۔

''کہاں کی روانگی ہے؟''

''شمالی علاقے کی۔'' شامی نے آرام سے کہا۔

''کس لیے۔''

''انجوائے کے لیے۔''

''مجھے کیوں نہیں بتایا؟''

''تاکہ انجوائے کرسکوں۔'' شامی نے سلگانے والا جواب دیا۔ ویسے وہ خود اندر سے سلگ رہا تھا کہ نوشی نے آکر اس کا خوشگوار موڈ خراب کر دیا تھا۔ ''بائی دی وے کیا میرے یا ہمارے لیے لازمی ہے کہ کسی بھی پروگرام سے پہلے تمہیں مطلع کریں یا تم سے اجازت لیں یا تمہیں بھی ساتھ لے کر جائیں؟''

''میری طرف سے تم جہنم میں جاؤ۔'' نوشی برہمی سے بولی۔

''شکریہ اگر تم ساتھ جانے پر اصرار نہ کرو تو میں وہاں جانے پر بھی غور کرسکتا ہوں۔ اب ذرا جگہ دو تاکہ میں یہ بیگ رکھ دوں۔''

نوشی پاؤں پٹختی واپس چلی گئی اور تیمور نے اسے داد دی۔ ''تو نے مردوں کی لاج رکھ لی۔ ورنہ میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔''

''وہ تو میرے بھی پھول گئے تھے۔'' شامی نے اعتراف کیا۔ ''مگر مجھے غصہ آگیا تھا اس لیے کہہ گیا۔''

دونوں روانہ ہوئے اور جوجی کو اس کے گھر سے پک کرلیا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ برف زدہ پہاڑوں کے درمیان سفر کر رہے تھے اور ایف ایم پر موسم کا احوال سن رہے تھے جو مزید خرابی کی نوید سنا رہا تھا۔ وہ متفکر ہوگئے۔ انہیں خاصا دور جانا تھا اور موسم زیادہ خراب ہوتا تو وہ راستے میں بھی پھنس سکتے تھے۔ یہاں سردی زیادہ نہیں تھی۔ درجہ حرارت نقطۂ انجماد کے آس پاس تھا مگر آگے انہیں اس سے کہیں کم درجہ حرارت سے واسطہ پڑتا۔

☆☆☆

سیاہ وین میں سوار ڈاکو تیز رفتاری سے ایک ہائی وے پر جارہے تھے۔ انہوں نے جائے واردات سے کچھ دور نکلتے ہی اپنا حلیہ بدل لیا تھا۔ پتلون اور جیکٹ اتار کر وہ شلوار قمیص اور گرم سوئٹرز میں آگئے تھے۔ انہوں نے وین کی نمبر پلیٹ بھی بدل دی تھی۔ انہیں لمبا سفر کرنا تھا اور خطرہ تھا کہ انہیں ٹول پلازا پر نہ روک لیا جائے مگر ایسا نہیں ہوا۔ وہ صوبائی دارالحکومت سے آرام سے نکل کر اس ہائی وے پر آگئے جو شمال کی طرف جارہی تھی۔ بلندی بڑھنے کے بعد چاروں طرف برف نظر آنے لگی تھی۔ برف کی وجہ سے سڑک پر پھسلن تھی اور وہ احتیاط سے ڈرائیو کر رہے تھے۔ ڈرائیور ایک جوان اور خوش شکل آدمی تھا۔ وہ چہرے سے جرائم پیشہ کے بجائے پڑھا لکھا اور ملازمت پیشہ لگتا تھا۔ اس کا نام یاسر تھا اور وہی اس واردات کا سرغنہ تھا۔ اس کے دونوں ساتھی چہرے سے چھٹے ہوئے بدمعاش اور مجرم نظر آرہے تھے۔

ان میں سے جو پستہ قد اور کسی قدر بھاری جسم کا مالک تھا اس کا نام صبر خان تھا جبکہ دوسرا جو دبلا اور کسی قدر طویل قامت تھا، اس کا نام سمیر گل تھا۔ ان تینوں کا تعلق پڑوسی ملک سے تھا اور کچھ عرصے پہلے تک وہ ایک جنگجو سردار ملک سیف اللہ کے لیے کام کرتے رہے تھے۔ ملک سیف۔۔۔ ایک چالاک جرائم پیشہ تھا۔ اوائل جوانی سے وہ منشیات فروشی کرنے لگا تھا۔

یاسر اسی کا ایک کارندہ تھا۔ وہ اس کا سامان لے کر پڑوسی ملک آتا جاتا رہتا تھا۔ ملک سیف۔۔۔ نے ڈالرز کی

بھی گڑگا میں خوب ہاتھ دھوئے تھے۔ اس نے اپنے آدمیوں کو بھی نوازا تھا۔ یاسر کئی سال اس کے ساتھ رہا لیکن پھر الگ ہو گیا۔ صبر خان اور سمیر گل بھی ملک سیف..... کے لیے کام کرتے رہے تھے۔ بعد میں ان دونوں نے اپنا دھندا شروع کر دیا۔ کئی سال بعد یاسر نے ان سے رابطہ کیا اور ان کے سامنے اپنا منصوبہ رکھا۔ پہلے تو وہ جھجکے کیونکہ معاملہ ملک سیف... کا تھا اور وہ اب نہایت طاقتور جنگجو سرداروں میں شامل ہو گیا تھا۔ مگر یاسر نے انہیں قائل کر لیا کہ اس میں خطرہ نہیں ہے اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی کہ ڈالرز اڑا لے جانے والے کون لوگ تھے۔ جس جگہ کارروائی کرنی تھی وہاں سیکیورٹی نہ ہونے کے برابر تھی اور سامنے پولیس اسٹیشن بھی بس نام کا تھا۔

یاسر کا کہنا درست ثابت ہوا اور وہ نہایت آسانی سے تقریباً ایک کروڑ ڈالرز مالیت کی رقم لے اُڑے تھے۔ ایک زمانے میں یاسر، ملک سیف کی دولت اس چھوٹی سی بینک برانچ میں جمع کرانے آتا تھا اور اسی وجہ سے اس کے علم میں یہ بات تھی۔ ملک سیف کی یہ رقم غیر قانونی طور پر اور بینک منیجر کی ملی بھگت سے وہاں رکھی جاتی تھی۔ ممکن ہے اس میں مزید بینک حکام بھی ملوث ہوں مگر یاسر صرف منیجر فضل خان کو جانتا تھا۔ سمیر گل نے پوچھا۔ ”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

”ایک محفوظ ٹھکانے کی طرف۔“ یاسر نے جواب دیا۔ ”ہم وہاں سرما گزرنے تک رہیں گے اور اس وقت تک یہ معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا تب ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔“

”حصہ کب کرو گے؟“ صبر خان بولا۔ وہ سب سے بے صبرا ہو رہا تھا۔

”جب ہم ٹھکانے پر پہنچ جائیں گے۔“ یاسر نے کہا۔

”وہ کتنی دور ہے؟“

”ابھی لمبا سفر باقی ہے۔“ یاسر بولا۔ ”موسم بھی ٹھیک نہیں ہے۔“

وہ تمام بندوبست پہلے ہی کر چکے تھے۔ وین میں وافر مقدار میں کھانے پینے کا سامان موجود تھا۔ اس میں خشک راشن بھی تھا جس کی مدد سے وہ کئی مہینے تک گزارہ کر سکتے تھے۔ یہ سارا منصوبہ یاسر کا تھا اور وہ اس پر عمل کر رہے تھے۔ وین میں موجود ڈالرز کی گڈیوں سے بھرے بیگ ان کو یقین دلا رہے تھے کہ ان کا آنے والا کل بہت پُرتعیش ہو گا۔ ان میں طے ہوا تھا کہ پچاس فیصد یعنی نصف یاسر شاہ کا ہوگا اور باقی میں سے پچیس پچیس فیصد فی کس انہیں ملے گا۔ یہ رقم ایک ارب روپے سے اوپر بنتی تھی یعنی ان کے حصے میں چھبیس ستائیس کروڑ روپے آتے اور یہ اتنی دولت تھی جس کا انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ ملک سیف سے الگ ہونے کے بعد وہ اپنا کام کر رہے تھے مگر بس گزارے لائق ملتا تھا انہوں نے کچھ جمع نہیں کیا تھا۔ یہ اتنی رقم تھی کہ وہ اس سے اپنا کاروبار بھی کر سکتے تھے۔

☆☆☆

سفر کا ساتواں گھنٹا تھا جب انہیں برف باری سے واسطہ پڑا۔ اگرچہ برف دھیمی رفتار سے گر رہی تھی اور فی الحال تیز ہوائیں نہیں چل رہی تھیں مگر اس نرم برف کی وجہ سے سڑک پر کیچڑ کی ایک پھسلن آمیز تہ بنتی جا رہی تھی اور تیمور کو رفتار مزید کم کرنا پڑی تھی۔ وہ دونوں باری باری ایک گھنٹے کے لیے ڈرائیو کر رہے تھے تاکہ کوئی تھکے نہ اور پوری توجہ سے ڈرائیو کر سکے۔ جوجی فارغ تھا۔ پہلے وہ اپنے آئی فون پر گیم کھیلتا رہا۔ جہاں سگنل ملتے وہ رباب کو ایس ایم ایس یا وائس میسج کرتا تھا۔ پانچ گھنٹے بعد موبائل کی بیٹری جواب دینے لگی تو وہ پچھلی نشست پر لیٹ کر سو گیا۔ بعض جگہوں پر کسی قدر ٹریفک سے واسطہ پڑا مگر اکثر مقامات پر وہ اکیلے ہی ڈرائیو کر رہے ہوتے تھے۔ شاہی نے جو جگہ منتخب کی تھی وہ چند سال پہلے ہی اسکیٹنگ اسپاٹ بنی تھی اور یہاں چند ہوٹل تھے۔ مگر ان میں اصل رش گرمیوں میں ہوتا تھا۔ سردی میں وہاں اُلّو بولتے تھے۔ اب اسکیٹنگ کی وجہ سے لوگ سرما میں آنے لگے تھے مگر ان کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ عام حالات میں یہ بارہ گھنٹے کی ڈرائیو تھی مگر موجودہ رفتار سے وہ سولہ گھنٹے سے پہلے وہاں پہنچتے نظر نہیں آ رہے تھے۔ وہ صبح سات بجے نکلے تھے اور اب دوپہر کے تین بج رہے تھے۔ دو گھنٹے بعد سورج ڈوبتے ہی اندھیرا چھا جاتا اور اس کے بعد رفتار اور کم کرنا پڑتی۔ شاہی نے کہا۔

”شاید نصف رات تک ہی وہاں پہنچیں۔“

”نصف رات تک بھی پہنچ جائیں تو غنیمت ہے۔“ تیمور نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”کمرا تو مل جائے گا مگر کھانا شاید نہ ملے۔“

”ایسا نہیں ہے یار، کچھ نہ کچھ تو مل جائے گا۔“

”مجھے بھوک لگ رہی ہے۔“ عقب سے جوجی نے منمنا کر کہا۔ ”آپ لوگوں کے پروگرام میں کیا لنچ شامل نہیں ہے؟“

”ہم کر چکے ہیں برخوردار۔“ شاہی نے ڈیش بورڈ پر رکھا پزا اسے تھمایا۔ ”تم سو رہے تھے۔“

”تو جگا دیا ہوتا۔“ جوجی کھانے لگا۔ شاہی نے اپنے لیے تھرماس سے کافی نکالی۔ یہ آخری..... کافی تھی جو تقریباً ٹھنڈی ہو چلی تھی۔ باورچی نے کھانے کے لیے ان کی فرمائش پر پزا، چکن رول اور کلب سینڈوچز بنائے تھے۔ راستے میں باقاعدہ کھانے کا نہ وقت تھا اور نہ موڈ۔ ایک تھرماس میں کافی بھروائی تھی اور دوسرے میں چائے۔ چائے تیمور اور جوجی پہلے ہی ختم کر چکے تھے اور اب کافی کا بھی اختتام تھا۔ ہوٹل تک مزید کسی گرم چیز کی امید نہیں تھی۔ کافی ختم ہونے تک شاہی کی باری آ گئی۔ اسی اثنا میں وہ برف باری والے علاقے سے نکل گئے تھے اور آگے آسمان پر بادل ضرور تھے مگر برف نہیں گر رہی تھی۔ البتہ سڑک کے دونوں طرف گزشتہ برف باری کا ایک انبار ضرور جمع تھا۔ شاہی نے رفتار تیز کی۔ ڈیزل انجن نہ صرف طاقتور تھا بلکہ اس کا ہیٹر بھی خوب کام کر رہا تھا اور گاڑی اندر سے اتنی گرم تھی کہ انہیں فی الحال بھاری جیکٹوں کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

سورج ڈوبتے ہی اندھیرا ہو گیا اور اب ہوا بھی چلنے لگی تھی۔ بعض مقامات پر ہوا اتنی تیز ہو جاتی کہ وہ گاڑی پر باقاعدہ دباؤ ڈالتی اور ایسے میں انہیں اسٹیئرنگ سے لڑنا پڑتا۔ اسی کشتی میں سفر کٹا اور وہ اس چھوٹی سی وادی میں داخل ہوئے جس کے ایک طرف طویل ڈھلان تھی جو بہت اوپر تک چلی گئی تھی۔ بائیں طرف ترچھی چٹانیں تھیں۔ ہوٹل وادی کے آغاز میں ہی تھے۔ دائیں طرف صرف ایک ہوٹل تھا جبکہ بائیں طرف تین ہوٹل تھے۔ انہیں دائیں طرف کے ہوٹل میں جانا تھا۔ یہ ہوٹل خاصا بڑا اور دو منزلہ تھا۔ بلند ہوتی سطح تھی جس پر ہوٹل بنا ہوا تھا اور اس کے دو طرف بلند چٹانیں اور ایک طرف گہری کھائی تھی۔ صرف ایک طرف کسی قدر مناسب ڈھلان تھی اور اسی پر گھومتی سڑک اوپر جا رہی تھی۔ انہوں نے لینڈ کروزر اس پر ڈال دی۔ آخری حصے میں ایک چھوٹا سا پل نما تھا۔ پل کے دونوں طرف دھات کی مضبوط ریلنگ لگی تھی۔ اس سے گزر کر وہ ہوٹل میں داخل ہوئے۔

گیٹ کھلا ہوا تھا اور پارکنگ خالی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ فی الحال وہاں کوئی نہیں مقیم تھا۔ البتہ ہوٹل کے ریسپشن پر منیجر خود موجود تھا۔ شاہی نے پہلے ہی کمرے بک کرا لیے تھے۔ اس نے اپنا نام اور آئی ڈی کارڈ نمبر بتایا تو منیجر نے انہیں کمروں کی چابیاں دیں اور بیل بجا کر ایک ملازم کو طلب کیا۔ اس نے ان کا سامان اوپر پہنچایا۔ عملے کی کمی کی وجہ سے منیجر خود استقبالیہ پر موجود تھا۔ اس کے علاوہ صرف تین آدمی اور تھے۔ مگر حیرت انگیز طور پر انہیں رات گیارہ بجے بھی گرم اور تازہ کھانا مل گیا۔ کھانا آلو قیمہ اور چپاتی کے ساتھ ساتھ سادہ چاول پر مشتمل تھا اور اس کے بعد انہیں گرم چائے بھی ملی تھی۔ مزید خوش قسمتی سے ہوٹل کی بھٹی کام کر رہی تھی اور کمروں کو گرمائش کے ساتھ گرم پانی بھی فراہم کر رہی تھی۔ مگر یہ سہولت صرف نیچے کے چند کمروں اور انٹرنس لابی و کچن تک محدود تھی۔ اس لیے انہیں نیچے موجود کمرے دیے گئے تھے۔ جب وہ سونے کے لیے لیٹے تو بہت خوش اور مطمئن تھے۔ صرف جوجی کسی قدر نامطمئن تھا کیونکہ اسے بھی الگ کمرا ملا تھا اور وہ اکیلے سوتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ تیمور نے پوچھا۔ ”گھر میں بھی اکیلے سوتے ہو یا؟“

”اکیلے سوتا ہوں جی مگر وہ گھر ہوتا ہے یہ تو اجنبی جگہ ہے۔“

”فکر مت کرو تمہارے دائیں بائیں ہم ہوں گے۔“ شاہی نے اسے تسلی دی۔ تینوں کمرے گرائونڈ فلور پر ایک قطار میں تھے۔ جوجی کا کمرا وسط میں تھا۔

☆☆☆

ملک سیف نے کال سن کر موبائل رکھا تو اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ تقریباً ساٹھ برس کا لیکن تنومند اور بہترین صحت کا حامل شخص تھا۔ اس نے عیاشی کی تھی مگر ایک حد میں رہ کر۔ اس کی دو بیویاں اور ان سے سات بچے تھے مگر اس نے ان کو ایک وسط ایشیائی ملک میں رکھا ہوا تھا۔ ملک سیف نے وہاں وسیع و عریض زمین فارمنگ کے نام پر لی ہوئی تھی۔ زمین پر اس کا عالیشان محل نما مکان تھا۔ جس میں دنیا جہان کی سہولتیں اور آسائشیں تھیں۔ اس کی بیویاں اور بچے وہاں مزے سے رہ رہے تھے مگر وہ خود اپنے جنگ زدہ ملک میں تھا۔ اس کے خیال میں جب تک یہاں غیر ملکی افواج موجود تھیں، اس کے پاس کمائی کے مواقع تھے۔ دولت کئی طرف سے آ رہی تھی اور جب تک دولت آ رہی تھی وہ یہیں رہنا چاہتا تھا۔ ایک محفوظ قلعہ نما مکان میں اس کی رہائش تھی۔ اس نے ذاتی طور پر کئی لڑکیاں رکھی ہوئی تھیں اور آس پاس سے بھی لڑکیاں عورتیں اس کے پاس آتی رہتی تھیں۔ کچھ پیسے کے لیے آتی تھیں اور کچھ جبراً لائی جاتی تھیں۔ پتھر سے بنے اس قلعے میں بجلی سمیت جدید دنیا کی تمام سہولتیں دستیاب تھیں۔ ان میں جدید ترین انٹرنیٹ اور سیٹلائٹ ٹی وی سسٹم بھی تھا۔ کال سننے کے بعد وہ کچھ دیر ٹہلتا اور سوچتا رہا پھر اس نے کسی کو کال کی۔

”سرباز خان، ملک سیف اللہ بات کر رہا ہوں۔“

”حکم ملک صاحب؟“ دوسری طرف سے کہا۔

”تم یاسر کو جانتے ہو؟“

’’اچھی طرح جانتا ہوں، ایک زمانے میں آپ کا پلا ہوتا تھا۔‘‘

’’میرے ہاتھ کے پلے اس پلے نے آج ملک سیف اللہ کو کاٹا ہے۔‘‘ اس نے تلخ لہجے میں کہا۔

’’کیا ہوا ملک صاحب؟‘‘

ملک سیف بولتا رہا اور سرباز خان خاموشی سے سنتا رہا جب ملک سیف خاموش ہوا تو اس نے صرف ایک سوال کیا۔ ’’آپ کیا چاہتے ہیں؟‘‘

’’اپنی رقم کی واپسی اور زندہ یا مردہ یاسر۔‘‘ ملک سیف نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ’’اس صورت میں رقم کا بیس فیصد تمہارا ہوگا۔‘‘

’’جلد دونوں چیزیں آپ کے سامنے ہوں گی۔‘‘ سرباز نے کہا تو ملک سیف نے موبائل بند کر دیا۔ اب وہ کسی قدر مطمئن نظر آ رہا تھا۔

☆☆☆
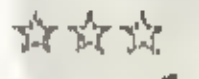
سرباز خان ان لوگوں میں سے تھا جو جرم کی دنیا میں پیدا ہوتے ہیں اور جرم کی دنیا میں مر جاتے ہیں۔ ان کی ساری زندگی جرم کے درمیان گزرتی ہے جیسے مچھلی پانی میں زندہ رہتی ہے اسی طرح یہ صرف جرم میں زندہ رہ سکتے تھے۔ اس کا باپ پڑوسی ملک سے یہاں آیا تھا اور وہ ملک سیف کے پرانے ساتھیوں میں سے تھا۔ اپنی موت تک وہ یہاں سیف کے ایجنٹ کے طور پر کام کرتا رہا۔ اس کے بعد سرباز نے اس کی جگہ سنبھال لی۔ پھر پڑوس میں غیر ملکی افواج آگئیں تو منشیات کے روٹس بدل گئے اور ان کا رخ مشرق کے بجائے مغرب کی طرف ہو گیا.... اس لیے سرباز اب ملک سیف کا آدمی نہیں رہا تھا، وہ اپنا کام کرتا تھا اور عیاشی سے زندگی گزار رہا تھا۔ چند سال پہلے تک وہ باہر سے آنے والی نام نہاد سیکیورٹی ایجنسیوں کے لیے بندے ہائر کرتا تھا۔ اسے فی بندہ خاصا بھاری بھرکم کمیشن ملتا تھا۔ ان دنوں اس نے بہت کمایا اور دوسرے فوائد بھی اٹھائے۔

اس کے دیے بندوں میں سے کئی بعد میں اسی کے پاس واپس آئے اور اب وہ تربیت یافتہ بھی تھے۔ سرباز ان سے کام لینے لگا۔ سرباز صوبائی دارالحکومت کے ایک پوش ترین علاقے میں شاندار کوٹھی میں رہتا تھا۔ ملک سیف کی کال آنے کے دس منٹ بعد وہ ہائی وے کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ اس کے صرف دو ساتھی تھے مگر وہ پوری طرح مسلح تھے۔ ٹول پلازا پر وہ لائن میں لگنے کے بجائے ایک طرف بنے دفتر تک آئے۔ اسے دیکھ کر دفتر کا انچارج خود باہر نکل آیا۔ اس نے گرم جوشی سے سرباز سے ہاتھ ملایا۔ ’’خان جی آپ نے زحمت کی، مجھے حکم دیا ہوتا یا کال کر دی ہوتی۔‘‘

’’میں نے مناسب سمجھا کہ خود آؤں۔‘‘ سرباز نے کہا۔ ’’صبح نو بجے کے بعد یہاں سے کوئی سیاہ وین گزری ہے۔ نمبر نوٹ کرا دو لیکن اس سے خاص فرق نہیں پڑے گا۔ مجھے وین کا معلوم کرنا ہے۔ ممکن ہے نمبر بدل دیا گیا ہو۔‘‘

اس وقت ساڑھے نو بج رہے تھے۔ انچارج اسے دفتر میں لے آیا اور چائے کا کہہ کر اس نے اپنے کمپیوٹر پر چیک کیا۔ دس منٹ میں اس نے مطلوبہ وین نکال لی۔ یہ ٹول پلازا کے کیمرے کے سامنے سے گزری تھی۔ اس نے سرباز کو ویڈیو دکھائی اور اسے یاسر کو شناخت کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی، وہ ڈرائیونگ سیٹ پر تھا اور اپنے اصل حلیے میں تھا۔ نمبر پلیٹ مختلف تھی مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ سرباز کو جو دیکھنا تھا، وہ دیکھ لیا تھا۔ سیاہ وین اس جگہ سے نو بج کر سات منٹ پر گزری تھی گویا وہ اب سے آدھے گھنٹے پہلے گزر چکی تھی۔ سرباز چائے ادھوری چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے جیب سے کچھ نوٹ نکال کر میز پر رکھے۔ ’’یہ انعام ہے۔‘‘

انچارج کے چہرے پر لالچ آمیز خوشامد پھیل گئی۔ ’’آپ کے خادم ہیں خان جی۔‘‘

سرباز عجلت میں واپس آیا اور اس نے ڈرائیونگ سیٹ پر موجود اپنے آدمی سے کہا۔ ’’جلدی چلو، ایک سیاہ وین آدھے گھنٹے پہلے یہاں سے نکلی ہے، اسے پکڑنا ہے۔‘‘

ڈرائیور نے فوری گاڑی چلا دی۔ ٹول پر موجود شخص نے انہیں رکنے کا اشارہ کیا مگر فوراً اسے انچارج کی طرف سے اشارہ ملا اور اس نے بیریئر ہٹا دیا۔ ہیلکس تیز رفتاری سے نکلی تھی۔ سرباز جانتا تھا کہ یاسر کہاں جا سکتا تھا۔ کوہستانی علاقے میں اس کا ایک ذاتی کیبن تھا۔ اتفاق سے ایک موقع پر یاسر نے اسے کیبن کے بارے میں بتایا تھا اور اسے شکار کی دعوت بھی دی تھی۔ اس نے یہ کیبن شکار کے لیے ہی رکھا تھا۔ روپوشی کے لیے یہ بہترین جگہ تھی اور وہ وہیں جا سکتا تھا۔ یاسر نے کچھ عرصے اس کے ساتھ بھی کام کیا تھا مگر پھر وہ الگ ہو گیا۔ سرباز کا آدمی تیز ڈرائیو کر رہا تھا مگر دو گھنٹے گزرنے کے بعد بھی سیاہ وین کے آثار نظر نہیں آئے تھے۔ ڈرائیور نے جھجک کر کہا۔ ’’خان جی ہم غلط راستے پر تو نہیں ہیں؟‘‘

’’ہم بالکل ٹھیک جا رہے ہیں۔‘‘ سرباز نے اطمینان سے جواب دیا۔ ’’وہ بہت اچھا ڈرائیور ہے۔ اگر ہماری

قسمت اچھی ہوئی تو اسے راستے میں پکڑ سکتے ہیں ورنہ اس کی منزل تو مجھے معلوم ہی ہے۔‘‘

ڈرائیور مطمئن ہو گیا ورنہ وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں اس پر عتاب نہ آئے کہ وہ سست روی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ اس علاقے میں اور اس موسم میں جو حد رفتار ہو سکتی تھی ڈرائیور اس سے کچھ اوپر ہی گاڑی چلا رہا تھا۔ راستے میں وہ ایک جگہ ڈیزل بھروانے کے لیے رکے۔ احتیاطاً سرباز نے ٹینک ہی فل نہیں کرایا تھا بلکہ پیچھے رکھے جیری کین بھی بھروا لیے تھے اس موسم میں شمالی علاقے میں پیٹرول ڈیزل کی قلت بھی ہو جاتی تھی۔ ان کے پاس پینے کا پانی تھا مگر کھانے کو کچھ نہیں تھا اس لیے مجبوراً ان کو ایک ہوٹل پر رکنا پڑا جہاں انہوں نے عجلت میں لنچ کیا اور راستے کے لیے کھانا پیک کروا لیا۔ چائے کافی کا اسے شوق نہیں تھا۔ پانی کے علاوہ وہ صرف شراب پیتا تھا۔ اس کی بوتلیں اس گاڑی میں بھی موجود تھیں۔ سردی سے بچنے اور جسم گرم رکھنے کے لیے وہ وقفے وقفے سے بوتل سے گھونٹ لے رہا تھا مگر صرف اتنی لی رہا تھا کہ حواس متاثر نہ ہوں۔ اس کے آدمی للچا رہے تھے مگر اس سے مانگ نہیں سکتے تھے۔ شام کے قریب اس نے خود ڈرائیونگ سنبھال لی کیونکہ یہاں سے آگے راستہ اسے معلوم تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے آدمی غلطی سے بھی کسی اور سڑک پر جا نکلیں۔ ورنہ واپسی تک دیر بھی ہو سکتی تھی۔ سورج ڈوبنے کے بعد بہت تیزی سے اندھیرا ہوا اور اب ہیلکس طاقتور ہیڈ لائٹس کی روشنی میں سفر کر رہی تھی۔ سرباز سوچ رہا تھا کہ یاسر نے بہت لمبا ہاتھ مارا تھا ایک کروڑ ڈالرز بہت بڑی رقم تھی۔

☆☆☆
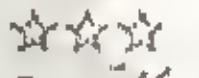
سیاہ وین رکی ہوئی تھی اور وہ تینوں سخت سردی میں باہر کھڑے تھے۔ سردی کی شدت سے بچنے کے لیے انہیں مجبوراً پینٹ، شرٹس اور جیکٹس پہننا پڑی تھیں۔ اس کے باوجود وہ کانپ رہے تھے۔ وین کا ایک ٹائر پنکچر ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے شام کے قریب انجن میں ذرا مسئلہ ہوا تھا مگر یاسر نے اسے ٹھیک کر لیا تھا، ایک وائر لوز ہو گیا تھا۔ اس دوران میں وین کا انجن بھی ٹھنڈا کر لیا تھا۔ اب ٹائر پنکچر ہو گیا تھا۔ دو عدد اسٹپنیاں تھیں اس لیے اس کا مسئلہ نہیں تھا۔ صبر خان اور سمیر گل جیک لگا کر ٹائر بدل رہے تھے۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے اور ابھی خاصا سفر باقی تھا۔ انہوں نے راستے میں ڈیزل بھروا لیا تھا اور اب وہ اس کی طرف سے بے فکر تھے۔ یاسر سگریٹ پی رہا تھا اور اس کے دھوئیں کی گرمی اپنے اندر اتار رہا تھا۔ وین ایک موڑ پر یوں کھڑی تھی کہ اس کا پچھلا حصہ دور سے آتی سڑک سے نظر آ رہا تھا اور بیشتر حصہ چھپا ہوا تھا۔ یاسر عقبی حصے میں تھا اور پیچھے سے آنے والی سڑک کی طرف دیکھ رہا تھا اچانک اسے دور کسی درمیانی گاڑی کی ہیڈ لائٹس نظر آئیں۔ اس نے مضطرب لہجے میں کہا۔

’’جلدی کرو، کوئی اس طرف آ رہا ہے۔‘‘

’’آنے دو۔‘‘ سمیر گل نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ’’کون سا ہمارے پیچھے آ رہا ہے؟‘‘

’’کچھ نہیں کہا جا سکتا۔‘‘ یاسر نے سگریٹ کا گہرا کش لیا۔ ’’انسان اپنے طور پر سمجھتا ہے کہ محفوظ ہے مگر موت دبے قدموں اس تک آ جاتی ہے۔‘‘

یاسر کی نظر گاڑی پر مرکوز تھیں، اس کے خیال میں یہ کوئی درمیانی قسم کی فور وہیل ڈرائیو تھی۔ اب وہ نصف کلومیٹر دور رہ گئی تھی اور اس سڑک پر سیدھا آ رہی تھی۔ جب فاصلہ دو سو گز سے کم رہ گیا تو اچانک گاڑی کی رفتار کم ہوئی اور وہ رک گئی۔ یاسر چوکنا ہو گیا اس نے سگریٹ پھینک کر جیکٹ سے پستول نکال لیا۔ گاڑی رک گئی تھی مگر اس کے اوپر لگی سرچ لائٹس آن ہو گئیں اور وہ روشنی میں نہا گئے تھے۔ یاسر آڑ میں ہوا اور وہ دونوں بھی چونک گئے تھے۔ صبر خان نے پوچھا۔ ’’کیا ہوا ہے؟‘‘

’’آنے والے رک گئے ہیں اور انہوں نے اوپر لگی تیز روشنیاں آن کر لی ہیں، وہ ہمیں دیکھ رہے ہیں۔‘‘

درحقیقت وہ وین کو دیکھ رہے تھے۔ کیونکہ یاسر بھی آڑ میں ہو گیا تھا۔ پھر گاڑی سست روی سے آگے آنے لگی۔ وہ ٹائر لگاتے ہوئے رک گئے تھے۔ یاسر نے تیز لہجے میں کہا۔ ’’جلدی ٹائر بدلو، مجھے خطرہ لگ رہا ہے۔‘‘

وہ دونوں پھرتی سے اپنے کام میں لگ گئے اور یاسر نے گاڑی کے تقریباً سو گز دور آنے پر آڑ سے وارننگ شاٹ فائر کیا۔ اس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ گاڑی رک گئی اور پھر تیزی سے ریورس میں گئی تقریباً دو سو گز دور جانے کے بعد اس سے کوئی نیچے اترا اور اس نے ان کی طرف خودکار رائفل کا برسٹ مارا۔ یاسر کو اس کی توقع نہیں تھی کہ ان پر براہِ راست فائرنگ کی جائے گی۔ گولیاں اس کے آس پاس سے گزریں اور ایک اس کے دائیں شانے سے ذرا نیچے لگی۔ وہ جھٹکے سے پلٹ کر گرا اور ان دونوں نے بیک وقت اسے سنبھالا۔ سمیر گل نے پوچھا۔ ’’کیا ہوا... کیا ہوا؟‘‘

’’گولی لگی ہے۔‘‘ یاسر نے تکلیف برداشت کرتے

ہوئے کہا۔ اس نے زخم کی جگہ ہاتھ رکھا تو اس کا ہاتھ خون سے بھر گیا تھا۔ اس نے ہمت کر کے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''اپنا کام کرو، یہ ہمارے پیچھے آئے ہیں۔''

انہوں نے ٹائر لگا دیا تھا اور اب اس کے نٹ بولٹ کس رہے تھے۔ سمیر گل نٹ کسنے لگا اور صبر خان نے جلدی سے پنکچر ٹائر اور دوسرا سامان وین میں ڈالا۔ اس دوران میں یاسر نے آڑ سے ہاتھ نکال کر الٹے ہاتھ سے اندھا دھند کئی فائر کیے۔ الٹے ہاتھ سے وہ کیا نشانہ لیتا مگر یہ اتفاق تھا کہ ایک گولی ٹن کی آواز کے ساتھ گاڑی کے بونٹ پر لگی۔

صبر خان نے سامان رکھ کر چادر کا ایک ٹکڑا پھاڑا اور اسے یاسر کے زخم پر گدی سی بنا کر رکھ دیا۔ تاکہ خون بہنے کی رفتار کم ہو جائے۔ پھر اس نے شاٹ گن نکالی اور آڑ سے گاڑی کی طرف کئی فائر کیے۔ شاٹ گن کی مار زیادہ نہیں تھی مگر اس کی گولی کی دہشت اور دھماکے کی آواز نے حملہ آوروں کو پسپائی پر مجبور کر دیا اور وہ اپنی گاڑی کو مزید پیچھے لے گئے تھے۔ انہوں نے موقع غنیمت جانا اور وہاں سے روانہ ہو گئے۔ اب سمیر گل ڈرائیو کر رہا تھا اور صبر خان پچھلے حصے میں یاسر کو دیکھ رہا تھا۔ چادر کا ٹکڑا کچھ دیر میں خون سے بھر گیا تھا۔ اس نے چادر پھاڑ کر دوسرا ٹکڑا رکھا۔ یاسر تکلیف برداشت کر رہا تھا۔ وہ ہوش میں تھا اس کا مطلب تھا کہ کسی اہم اعضا کو نقصان نہیں ہوا تھا لیکن خون روکنا ضروری تھا۔ باندھنے کے لیے کچھ نہیں تھا اس لیے صبر خان نے ہاتھ کے دباؤ سے کام لیا اور پٹی کو دبا لیا۔ اس نے یاسر سے کہا۔

''ہمیں کہیں رکنا ہوگا۔ گولی اندر رہی تو زہر پھیل جائے گا۔''

یاسر بھی یہ بات سمجھتا تھا۔ اسی لیے سمیر گل نے کہا۔

''وہ پیچھے آ رہے ہیں۔''

فوراً ہی عقب سے برسٹ چلا، وہ وین یا انہیں نشانہ بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ سمیر گل نے رفتار بڑھائی اور تعاقب میں آتی گاڑی سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر اس واحد سڑک پر وہ پیچھا کیسے چھڑاتا۔ وین کا ڈھائی ہزار سی سی کا انجن طاقتور تھا مگر عقب میں آنے والی ہیلکس کا انجن بھی کم طاقتور نہیں تھا اور اسے اپنے ریڈیل ٹائروں کا فائدہ تھا جو سڑک پر بہترین گرپ کر رہے تھے۔ ان کے لیے واحد مسئلہ جلدی جلدی آنے والے موڑ تھے جن کے بل کھانے سے پیچھے آنے والوں کو فائرنگ میں دشواری پیش آ رہی تھی۔ یاسر نے پانی پیا، وہ سوچ رہا تھا کہ آنے والے ملک سیف کے آدمی نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ یہاں اس کا سیٹ اپ نہیں تھا۔ یہ یقیناً مقامی لوگ تھے جو ملک نے ان کے پیچھے بھیجے تھے۔ کسی جگہ پناہ لینے سے پہلے ان سے پیچھا چھڑانا لازمی تھا۔ اس نے صبر خان سے کہا۔ ''پیچھے والا دروازہ کھول کر ان کو نشانہ بنانے کی کوشش کرو۔''

صبر خان کا نشانہ اچھا تھا مگر جب اس نے رائفل اٹھا کر دروازہ کھولا، وین کے بار بار گھومنے کی وجہ سے وہ کھل بند ہو رہا تھا اور ایسے میں درست نشانہ لینا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے صبر خان نے ایک دروازے کے اوپر لگا ہوا چھوٹا سا شیشہ توڑ دیا اور اس سے رائفل کی نال باہر نکال کر پہلا برسٹ مارا تو ہیلکس کا دایاں ٹائر دھماکے سے برسٹ ہوا تھا اور وہ لہرانے لگی۔ صبر خان نے قہقہہ مارا۔ ''وہ گیا۔''

اسی لمحے وین ایک موڑ مڑی اور عقب سے دھماکا سنائی دیا تھا۔ یاسر نے سکون کا سانس لیا۔ دشمن سے پیچھا چھوٹا تھا اب اسے اپنے زخم کی فکر تھی۔ صبر خان نے ٹھیک کہا تھا کہ اگر اس میں سے گولی نہ نکالی گئی تو اندر زہر پھیلنے لگے گا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کہاں جائے، جہاں یہ کام ہو سکے۔ اس کا کیبن ابھی بہت دور تھا۔ پھر اسے ایک جگہ کا خیال آیا اور اس نے سمیر گل سے کہا۔ ''چند کلومیٹر بعد دائیں طرف ایک راستہ آئے گا۔ ہمیں اس طرف جانا ہے۔''

''اس طرف کیا ہے؟'' صبر خان نے پوچھا۔ وہ ٹوٹے شیشے کی جگہ کپڑا اڑا رہا تھا تاکہ اندر آتی سرد ترین ہوا سے بچاؤ ہو سکے۔

''یہاں چند ہوٹلز ہیں لیکن اس وقت وہاں کوئی نہیں ہوگا۔'' یاسر نے جواب دیا۔ وہ اپنا زخم ٹٹول رہا تھا جس سے خون بہنا بند ہو گیا تھا۔ چند کلومیٹرز کے بعد وہ موڑ آ گیا جس پر انہیں دائیں طرف مڑنا تھا۔ یاسر نے اٹھ کر بڑی مشکل سے تصدیق کی۔ ''یہی ہے آگے چلو۔''

سمیر گل نے وین آگے بڑھائی۔ چند منٹ بعد وہ وادی میں داخل ہوئے۔ یہاں دائیں طرف بلندی پر ایک عمارت تھی۔ اس میں روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ اس نے یاسر سے پوچھا تو اس نے اسی طرف چلنے کو کہا۔ وین گھوم کر اوپر جانے لگی۔ یہ واحد ہوٹل تھا اگر انہیں یہاں زبردستی کرنا پڑتی تو آس پاس کوئی نہیں تھا۔ جب انہوں نے پل کراس کیا اور ہوٹل کی حد میں داخل ہوئے تو انہیں وہاں صرف ایک لینڈ کروزر نظر آئی تھی۔ سمیر گل نے پلٹ کر یاسر سے کہا۔ ''ہوٹل کھلا ہوا ہے کوئی ادھر آیا ہے۔''

''کوئی بات نہیں ہم سب کو دیکھ لیں گے۔'' صبر خان نے کہا۔ وہ دونوں نیچے اتر آئے اور یاسر کو سہارا دے کر

اندر لائے۔ گلاس ڈور سے اندر آتے ہی گرمائش کا احساس ہوا۔ کاؤنٹر پر اونگھتا ہوا منیجر سرفراز ملک چونکا پھر کاؤنٹر سے نکل کر ان کی طرف آیا۔ اندر آنے سے پہلے یاسر نے ان سے کہہ دیا تھا کہ انہیں خود کو عام مسافر ظاہر کرنا تھا۔ اس لیے انہوں نے اپنی جیکٹوں میں صرف چھوٹا اسلحہ رکھا تھا۔ بڑا اسلحہ اور رقم کے تھیلے وین میں چھوڑ دیے تھے۔ سمیر گل نے سرفراز ملک سے کہا۔ ''ہمیں مدد چاہیے ہمارا یہ ساتھی کسی شکاری کی گولی کا نشانہ بن گیا ہے۔''

سرفراز ملک پریشان ہو گیا۔ اس نے کہا۔ ''یہ ہوٹل ہے تم اسے کسی اسپتال لے جاؤ۔''

''یہاں اسپتال کہاں ہے؟'' سمیر گل بولا۔ ''وہاں جاتے جاتے یہ خون بہنے سے مر جائے گا۔''

''ایک منٹ، اسے یہاں لے آؤ۔'' سرفراز ملک نے لابی میں موجود لیدر کے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہاں ابتدائی طبی امداد کا سامان مل سکتا ہے لیکن گولی کے لیے تو باقاعدہ ڈاکٹر اور سرجری کے آلات درکار ہوں گے۔''

''تم وہی لے کر آؤ۔'' صمیر خان نے کہا۔

اس دوران میں سرفراز، سمیر گل اور صمیر خان کے انداز اور چہرے کے تاثرات سے کھٹکنے لگا تھا۔ وہ برسوں سے اس ہوٹل میں کام کر رہا تھا اور اسے انسانوں کو پرکھنا آتا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ آنے والے اچھے لوگ نہیں ہیں۔ ممکنہ طور پر وہ جرائم پیشہ تھے اور مزید یہ کہ ان کا ساتھی کسی شکاری کی گولی سے نہیں بلکہ کسی اور چکر میں زخمی ہوا تھا۔ اس موسم میں بھلا کون شکار کھیلتا ہے۔ مگر وہ یہ بات کہہ نہیں سکتا تھا۔ اول تو وہ اور اس کے تینوں ماتحت عام لوگ تھے۔ وہ لڑنے بھڑنے والے نہیں تھے اور دوسرے یہاں اسلحے کے نام پر صرف ایک پستول اور ایک چھوٹی سنگل شاٹ رائفل تھی۔ دونوں ہتھیار سیف میں بند تھے۔ مگر ابھی ان لوگوں نے اپنا رویہ بھی شریفانہ ہی رکھا تھا اس لیے سرفراز مجبوراً ان کے کام آ رہا تھا۔ وہ مرہم پٹی کا سامان لے آیا۔

☆☆☆

شامی خواب خرگوش کے مزے لے رہا تھا کہ اسے لگا جیسے کوئی موٹر کوڈ والے اسٹائل میں ٹک ٹک کر رہا ہو۔ وہ کچھ دیر سوتا رہا پھر اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ آواز سچ مچ آ رہی تھی اور دروازے کی طرف سے آ رہی تھی۔ وہ اٹھ کر دروازے تک آیا اور کیٹ آئی سے باہر جھانکا تو اسے... بجائے اس جوجی دکھائی دیا۔ وہ نائٹ سوٹ میں کھڑا ہوا تھا۔ شامی نے دروازہ کھولا تو اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھی اور جلدی سے اندر آ کر دروازہ بند کر لیا۔ شامی نے آہستہ سے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

''شامی بھائی یہاں کچھ مشکوک لوگ آ گئے ہیں۔'' جوجی نے اس کے کان میں گھس کر کہا۔

''مشکوک لوگ۔'' شامی نے کان میں انگلی گھمائی کیونکہ جوجی کی سرگوشی بھی اتنے پاس سے لاؤڈ اسپیکر کی طرح لگی تھی۔ ''تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''مجھے پیاس لگی تھی اور کمرے میں پانی نہیں تھا، میں لابی کی طرف گیا تو وہاں تین خطرناک نظر آنے والے لوگ موجود ہیں اور ان میں سے ایک زخمی ہے۔ منیجر ان کی مدد کر رہا ہے۔''

''یہ کون سی خاص بات ہے، ممکن ہے وہ سفر کے دوران کسی حادثے سے دوچار ہو گئے ہوں اور مدد کے لیے یہاں آئے ہوں۔''

''شامی بھائی وہ صورت سے چھٹے ہوئے بدمعاش لگ رہے ہیں۔ آپ جانتے ہیں میرے ابا کے آدمیوں کو؟ بس ویسے ہی کچھ لگ رہے ہیں۔ صرف زخمی کچھ شریف نظر آ رہا ہے۔''

اگرچہ اب بھی شامی کے خیال میں فکر کی کوئی بات نہیں تھی مگر وہ جوجی کی تسلی کے لیے دیکھنے کو تیار ہو گیا۔ ورنہ اس سے کچھ بعید نہیں کہ اسے بار بار جگاتا رہتا۔ اس نے اپنی جیکٹ پہنی اور باہر آیا۔ ان کے کمرے انٹرنس لابی کے بائیں طرف والی لائن میں تھے۔ ہوٹل میں اس طرف صرف رہائشی کمرے تھے اور ایک قطار میں آمنے سامنے دس دس کمرے تھے۔ انہیں آغاز کے تین کمرے ملے تھے۔ وہ اوپر جانے والی سیڑھیوں تک آئے، اس کے پاس لابی تھی۔ شامی نے آڑ سے جھانک کر دیکھا تو اسے لاؤنج کے وسط میں موجود صوفوں پر تین افراد دکھائی دیے اور جوجی کے مطابق وہ سچ مچ چھٹے ہوئے بدمعاش لگ رہے تھے۔ کم سے کم دو جو کھڑے یا بیٹھے ہوئے تھے۔ تیسرا صوفے پر دراز تھا اور چوتھا منیجر سرفراز تھا۔ وہ صوفے پر لیٹے آدمی کی مرہم پٹی کر رہا تھا۔ وہی زخمی تھا۔ جوجی نے سرگوشی میں کہا۔

''آپ دیکھ رہے ہیں ان لوگوں کو؟''

''ممکن ہے یہ بدمعاش ہوں لیکن اس وقت تو شریف بنے ہوئے ہیں۔''

''اگر یہ بدمعاش بن گئے تو؟'' جوجی نے نقطہ اٹھایا۔

''تب دیکھا جائے گا۔'' شامی نے جماہی لی۔ ''چلو

اب سوتے ہیں اور مجھے دوبارہ مت اٹھانا۔''

جوجی بادل ناخواستہ اس کے ساتھ واپس آیا تھا۔

☆☆☆

سرباز خان کو توقع نہیں تھی کہ وین کی طرف سے ایسا جواب ملے گا۔ اس نے خود یاسر پر گولی چلائی تھی اور اسے گرتے دیکھا تھا مگر اس کے بعد معاملہ خراب ہو گیا۔ ان کی طرف سے جواب دیا گیا۔ پھر وہ بھاگ نکلے اور آخر میں یہ ہوا کہ ان کی طرف سے جوابی کارروائی میں ان کی ہیلکس کا ٹائر برسٹ ہو گیا۔ گاڑی اس وقت شمل خان چلا رہا تھا۔ ٹائر برسٹ ہوتے ہی ہیلکس بے قابو ہوئی اور سڑک پر لہرانے لگی اور پھر ڈھلان پر چڑھ کر الٹ گئی۔ وہ سب اندر ہی الٹ پلٹ کر رہ گئے تھے۔ خیریت رہی کہ گاڑی صرف پہلو کے بل گرنے کے بعد کچھ دور تک گھسٹتی رہی اور پھر رک گئی۔ وہ کھائی کی طرف نہیں گئی اور نہ ہی کسی اور چیز سے ٹکرائی۔ گرنے کی وجہ سے ونڈ اسکرین اور سائیڈوں کے شیشے ٹوٹ گئے تھے۔

وہ سب معمولی زخمی ہوئے تھے مگر حادثے نے کچھ دیر کے لیے ان کے حواس گم کر دیے تھے پھر وہ ہوش میں آئے اور کسی نہ کسی طرح رینگتے ہوئے گاڑی سے نکل آئے۔ سرباز نے سب سے پہلے گاڑی کا جائزہ لیا۔ وہ اس طرح گری تھی کہ اس کے ٹائروں والا حصہ ڈھلان کی طرف تھا۔ اس طرف اسے سیدھا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پھر یہاں سڑک اتنی تنگ تھی کہ اگر اسے مخالف سمت پہلے چھت کے بل الٹا جاتا اور پھر سیدھا کیا جاتا تو وہ کھائی میں جا گرتی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ گاڑی اب بیکار ہو گئی تھی انہیں آگے پیدل ہی سفر کرنا تھا اور کوئی موقع ہوتا تو سرباز وہیں بیٹھ کر مدد کا انتظار کرنے کو ترجیح دیتا۔ چار پانچ افراد اور آ جاتے تو وہ سب مل کر گاڑی کو سیدھا کر سکتے تھے۔ مگر اس کے پاس وقت نہیں تھا، اس نے گاڑی سے تمام ضروری چیزیں اور اسلحہ نکالنے کا حکم دیا۔ شمل خان کے ساتھ مراد صادق نے مل کر سارا سامان اور اسلحہ نکالا۔ سامان انہوں نے دو حصوں میں کر کے بانٹ لیا اور سرباز نے صرف اسلحہ لیا تھا۔ اس کی شراب کی بوتل ٹوٹ گئی تھی اور وہ اس پر جھنجلایا ہوا تھا۔ شمل خان نے پوچھا۔

''خان، اب کیا کرنا ہے؟''

''ابھی پیدل چلو جب کوئی گاڑی نظر آئے گی تو ہم گاڑی حاصل کر لیں گے۔'' سرباز نے غرا کر کہا۔ وہ تینوں پیدل چل پڑے تھے۔ موسم حد سے زیادہ سرد تھا اور ہوائیں جیسے گرم کپڑوں سے گزر کر جسم چیر رہی تھیں۔ ایسے میں صرف چلنے سے کچھ گرمائش مل رہی تھی۔ سرباز نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''اگر کوئی آبادی یا گھر ملا تو ہم وہاں سے بھی گاڑی حاصل کر سکتے ہیں۔''

یہ سن کر شمل اور مراد فکرمند ہو گئے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس موسم میں انہیں ساری رات سفر کرنا تھا۔ گاڑی نہ ملتی تو پیدل سفر کرنا تھا اور انہیں کچھ علم نہیں تھا کہ انہیں یہ زحمت کیوں اٹھانی پڑ رہی تھی سوائے اس کے کہ یہ سرباز کا حکم تھا۔

سرباز سوچ رہا تھا کہ بے شک یاسر اور اس کے ساتھیوں کے پاس گاڑی بھی مگر وہ زخمی ہو گیا تھا اور اسے طبی مدد کی ضرورت تھی، وہ اب کیبن تک نہیں جا سکتا تھا گویا وہ راستے میں کہیں رکتا۔ شام کے بعد انہوں نے تیز ڈرائیونگ کی اور اسی وجہ سے وہ سیاہ وین تک پہنچنے میں کامیاب رہے تھے۔ وین جس طرح رکی تھی، اس سے لگ رہا تھا اس میں کوئی مسئلہ ہوا تھا مگر وہ ان کی آمد تک مسئلہ حل کر چکے تھے تبھی تو فرار میں کامیاب رہے۔ اب سرباز کو اپنی جلد بازی کا احساس ہو رہا تھا، اسے اتنی عجلت میں فائر نہیں کرنا چاہیے تھا اس کے بجائے وہ خاموشی سے ان سے آگے نکل جاتے اور پھر کسی جگہ گھات لگا کر انہیں روک لیتے۔ اس طرح ان پر قابو پانا آسان ہو جاتا۔ اب یاسر زخمی تھا مگر ساتھ ہی وہ چوکنا بھی ہو گئے تھے اور سب سے بڑھ کر انہوں نے ان کی گاڑی ناکارہ بنا دی تھی۔

رات کے بارہ بج چکے تھے اور وہ ویرانے میں سفر کر رہے تھے، انہیں پہاڑوں پر اکا دکا مکانات دکھائی دیے مگر وہاں جانا بیکار تھا کیونکہ انہیں گاڑی کی ضرورت تھی اور گاڑی یا تو سڑک پر مل سکتی تھی یا کسی آبادی میں۔ بدقسمتی سے اب تک کوئی گاڑی بھی دکھائی نہیں دی تھی، اس وقت تو کوئی لوڈنگ ٹرک مل جاتا تو وہ اسے بھی حاصل کر لیتے۔ کھلی فضا میں سردی میں ٹھٹھرنے سے تو بہتر ہی ہوتا۔ آنے والے دو گھنٹے بہت سخت تھے اور ان کی ہمت جواب دینے لگی تھی تب وہ اس وادی کے راستے تک آ پہنچے جہاں ہوٹل تھے اور ان کے بورڈز بھی سڑک پر لگے ہوئے تھے۔ سرباز نے سوچا کہ یہ بورڈ یقیناً یاسر اور اس کے ساتھیوں نے بھی دیکھے ہوں گے۔ ایک خیال کے تحت وہ وادی کی طرف مڑ گیا۔ پہلا ہوٹل اندر داخل ہوتے ہی دائیں ہاتھ پر اوپر تھا اور وہ جب اوپر پہنچے تو انہیں سیاہ وین ہوٹل کی پارکنگ میں کھڑی نظر آ گئی۔

☆☆☆

سرفراز ملک ان کے لیے چائے بنوانے گیا تھا، اس کے جاتے ہی یاسر اٹھ بیٹھا۔ اس کے زخم سے بہنے والا خون

رک گیا تھا مگر زخم کے آس پاس سوجن اور سرخی بڑھ گئی تھی لیکن یاسر کو اس کی فکر نہیں تھی۔ اس نے صبر خان اور سمیر گل سے کہا۔ ''جا کر ویگن سے رقم کے تھیلے اور اسلحہ لے آؤ۔''

''پر اس کے بارے میں ان کو کیا جواب دیں گے؟'' صبر خان نے پوچھا۔

''کوئی جواب نہیں دیں گے۔'' اس نے کہا۔ ''رقم ہم ہوٹل کے سیف میں رکھیں گے۔''

''اس کے لیے یہاں قبضہ کرنا ہوگا۔'' سمیر گل بولا۔

''تو میں اور کیا کہہ رہا ہوں۔'' یاسر نے انہیں گھورا تو وہ اٹھ کر باہر نکل گئے۔ چند منٹ میں وہ باہر سے رقم کے تھیلے اور اپنا اسلحہ لے آئے تھے۔ چند منٹ بعد سرفراز ملک چائے کی ٹرے لیے ڈائننگ روم سے باہر آیا تو انہیں مسلح دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ رقم کے تھیلے بھی سامنے رکھے تھے۔ اس نے چائے ان کے سامنے رکھی۔ یاسر نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولا۔

''ملک صاحب تم نے ہمارے ساتھ اچھا کیا مگر مجھے افسوس ہے۔''

''کس بات کا؟'' سرفراز نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

''یہی کہ اب یہاں میرا حکم چلے گا۔ سمجھ لو ہم کچھ وقت کے لیے ہوٹل پر قبضہ کر رہے ہیں۔''

تب سرفراز نے پہلی بار بالٹون کے تھیلے دیکھے اور گڈیوں کی ساخت تو بالکل واضح تھی۔ اس نے پوچھا۔ ''اس میں رقم ہے؟''

''ہاں اور اسے تمہارے ہوٹل کے سیف میں رکھنا ہے۔''

''سیف بند ہے اور اسے صرف مالک کھول سکتا ہے۔'' سرفراز نے جلدی سے بہانہ کیا۔

''بچوں کی سی بات مت کرو۔ مالک کی عدم موجودگی میں منیجر کو تمام اختیارات حاصل ہوتے ہیں اور ان میں سیف کا استعمال بھی شامل ہے۔'' یاسر نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ ''چل کر سیف کھولو۔''

سرفراز پریشان ہو گیا۔ ''میں ایسا نہیں کر سکتا، دیکھو اس میں ہوٹل کی رقم اور کاغذات ہیں۔''

''ہمیں تمہاری کسی چیز سے کوئی مطلب نہیں ہے۔'' یاسر بولا۔

''اس کے پاس اسلحہ ہوگا۔'' سمیر گل نے جیسے یاسر کو یاد دلایا تو وہ مسکرایا۔

''بالکل اور اسلحہ بھی سیف میں ہوگا۔''

کچھ دیر بعد وہ سرفراز کے کمرے میں تھے۔ سیف وہیں تھا یہ خاصا بڑا اور جدید سیف تھا جو نمبروں سے کھلتا اور بند ہوتا تھا۔ سرفراز نے نمبر ملا کر سیف کھولا تو اس میں موجود اسلحہ دیکھ کر یاسر مسکرانے لگا پھر اس نے سرفراز سے کہا۔ ''شکر کرو کہ تم نے اسے استعمال کرنے کا نہیں سوچا، یہ سیدھی سادی خودکشی ہوتی۔ میں اپنے وعدے پر قائم ہوں تمہیں یا ہوٹل کو کوئی نقصان نہیں ہوگا اور ہم جاتے ہوئے معاوضہ بھی دے کر جائیں گے۔''

سمیر گل اور صبر خان نے کسی نہ کسی طرح ڈالرز سے بھرے دونوں تھیلے سیف میں ٹھونس دیے۔ پھر یاسر نے اسے اپنا نمبر لگا کر بند کیا اور یہ کام اس نے اس طرح کیا کہ کوئی اور نمبر نہیں دیکھ سکا تھا۔ پھر اس نے سرفراز سے پوچھا۔ ''ہوٹل میں کتنے مسافر ہیں؟''

''تین ہیں اور صبح بھی کچھ مہمان آئیں گے۔''

''کوئی بات نہیں، ہم سے کسی کو نقصان نہیں ہوگا... بہ شرط کہ کوئی ہماری راہ میں نہ آئے۔''

وہ لاؤنج میں آ گئے۔ سرفراز نے ان کے لیے کمبل نکلوا دیے تھے۔ اس نے کمروں کی پیشکش بھی کی تھی مگر یاسر لاؤنج میں ہی رہنا چاہتا تھا البتہ اس نے انٹرنس کا دروازہ اندر سے بند کروا دیا تھا۔ اب باہر سے کوئی نہیں آ سکتا تھا۔ ہوٹل سے باہر آمد و رفت کے لیے یہی راستہ استعمال ہوتا تھا۔ صبر خان اور سمیر گل نے پورے ہوٹل کا معائنہ کیا۔ کچن اور ڈائننگ ہال کے بعد لائن سے پانچ پانچ کمرے اور تھے جبکہ اوپر چالیس کمرے تھے۔ یوں ستر کمروں کے ساتھ یہ خاصا بڑا ہوٹل بنتا تھا۔ ہوٹل کی عمارت پرانی اور بڑی تھی پھر موزوں جگہ ہونے کی وجہ سے اسے ہوٹل بنانے کا فیصلہ کیا اور معمولی سی تبدیلیوں کے ساتھ اسے بہترین قسم کے ہوٹل میں بدل دیا تھا۔

پہلے صرف گرمیوں میں کمائی ہوتی تھی مگر جب سے اسکیٹنگ کا آغاز ہوا تھا تو سردیوں میں بھی اچھا بزنس ہونے لگا تھا اور یہی وجہ تھی کہ ہوٹل اس وقت بھی کھلا ہوا تھا۔ اس کے لیے میدانوں کے آس پاس گرمیوں میں یہاں ایک درجن ملازمین کام کرتے تھے لیکن سردیوں میں اسٹاف سکڑ کر تین چار افراد پر مشتمل رہ جاتا تھا۔ اس وقت بھی تین آدمی تھے جن کی رہائش کچن کے ساتھ والے کمرے میں تھی۔ صبر خان اور سمیر گل نے اطمینان کر لیا تھا کہ یہاں سے باہر جانے کا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ تہ خانہ بھی بند تھا۔ یہاں

موبائل سروس نہیں تھی البتہ لینڈ لائن تھی اور کام بھی کر رہی تھی۔ یاسر کے اشارے پر اس کے آدمیوں نے اس کی لائن الگ کر دی تھی۔ وہ کوئی ایسا ذریعہ نہیں چھوڑ سکتے تھے جس سے یہاں سے باہر رابطہ کیا جائے۔ البتہ انہوں نے یہاں موجود مسافروں کو چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ یاسر نے درد کش اور اینٹی بایوٹک دوا لی تھی اور اسی وجہ سے اسے نیند آ گئی۔

☆☆☆

شامی صبح تک سوتا رہا تھا۔ اس بار اس کی آنکھ دروازہ بجانے سے کھلی۔ باہر تیمور تھا۔ شامی نے دروازہ کھولا تو اس نے کہا۔ ''سونے کے لیے آئے ہو کیا؟''

''اگر کچھ دیر سو لیا جائے تو کیا حرج ہے؟'' شامی نے جماہی لی۔ ''رات بھی جوجی نے نیند حرام کی تھی۔''

''بھوت دیکھ لیا ہوگا؟''

''نہیں یار رات کچھ مشکوک سے لوگ ہوٹل میں آئے تھے ان میں سے ایک زخمی ہے لیکن مجھے تشویش کی کوئی بات نظر نہیں آئی اس لیے واپس آ کر سو گیا۔''

''تو تیار ہو کر آ جا، میں جوجی کو جگاتا ہوں اور جا کر دیکھتا ہوں۔'' تیمور نے کہا۔ ''ہو سکتا ہے کوئی اچھی صورت بھی آ گئی ہو۔''

تیمور نے جوجی کے کمرے کا دروازہ بجایا اور اس نے بہ مشکل کھولا۔ وہ خوف زدہ تھا۔ ''کیا ہوا؟''

''لٹنے کے لیے تیار ہو جاؤ، ہوٹل میں ڈاکو آ گئے ہیں۔'' تیمور کو شرارت سوجھی تھی۔ ''ہو سکتا ہے وہ تاوان کے لیے تمہیں ساتھ لے جائیں۔''

''مجھے پہلے ہی پتا تھا۔'' جوجی نے رو دینے والے لہجے میں کہا اور دروازہ بند کر لیا۔ تیمور مسکراتا ہوا لاؤنج کی طرف بڑھ گیا۔ وہ بر وقت وہاں پہنچا کیونکہ عین اس وقت وہاں ایک فیملی آئی تھی۔ اس میں دو عدد ماما پاپا، دو عدد نوجوان لڑکیاں اور دو عدد نو عمر لڑکے تھے۔ لڑکیاں بائیس چوبیس برس کی تھیں جبکہ لڑکے تیرہ اور پندرہ سال کے تھے۔ یہ فیملی ایک بڑی سی لگژری فور وہیل ڈرائیو میں آئی تھی اور اس پر لدا سامان بتا رہا تھا کہ وہ بھی اسکیٹنگ کے ارادے سے آئے تھے۔ ایک طرف صوفوں پر یاسر، صبر اور سمیر موجود تھے۔ ان لوگوں کی آمد پر انہوں نے دروازے کھول دیے تھے اور ان کے اندر آتے ہی دوبارہ مقفل کر دیے تھے۔ سرفراز فکر مندی کے ساتھ ان کا استقبال کر رہا تھا۔ یاسر نے اسے پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ وہ حالات کو معمول کے مطابق ظاہر کرے گا۔ اگر اس نے آنے والوں کو کوئی ایسا اشارہ دیا جس سے وہ سمجھیں کہ یہاں خطرہ ہے تو اس کے بعد ہونے والے حالات کی ذمے داری اسی پر عائد ہو گی۔

سرفراز کی فکر مندی اسی حوالے سے تھی کہ یہاں کچھ ہوا تو اس کی نوکری جائے گی اور وہ اس نوکری کو گنوانا نہیں چاہتا تھا جس میں اس کے مزے تھے۔ بہترین تنخواہ تھی اور اچھی کارکردگی پر اسے بونس بھی ملتا تھا۔ ساتھ ہی سیزن میں وہ آنے والے سیاحوں سے اضافی آمدنی بھی حاصل کر لیتا تھا۔

یاسر کی حالت ٹھیک نہیں تھی، وہ رات میں سو تو گیا تھا مگر جب صبح اٹھا تو زخم میں تکلیف اور سوجن بہت بڑھ گئی تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ اندر موجود گولی انفیکشن کا باعث بن رہی ہے اور اس کا جلد از جلد نکالا جانا ضروری تھا۔ آنے والے مہمانوں کو کمرے میں بھیجنے کے بعد سرفراز، یاسر کی طرف آیا اور اس سے کہا۔ ''دیکھو اگر بات کھل گئی تو میں بھی اسے دبا نہیں سکوں گا اس لیے اب تم لوگ چلے جاؤ۔ میں اور میرے آدمی کسی سے ذکر نہیں کریں گے۔ تمہارے لیے یہاں رکنا بیکار ہے تمہیں فوری ڈاکٹر اور آپریشن کی ضرورت ہے۔''

یاسر بھی یہی سوچ رہا تھا کہ اب انہیں یہاں سے چلے جانا چاہیے۔ اس نے پوچھا۔ ''آس پاس کوئی ڈاکٹر ملے گا؟''

''یہاں سے کچھ آگے ایک چھوٹا قصبہ ہے وہاں ڈاکٹر ملے گا۔'' سرفراز نے بتایا۔ ''سننے میں آیا ہے کہ شہر میں کمپاؤنڈر تھا اور یہاں آ کر ڈاکٹر بن گیا مگر اپنا کام خوب کرتا ہے۔''

یاسر نے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے ہم یہاں سے جا رہے ہیں لیکن پہلے ناشتا دے دو۔''

''کیوں نہیں۔'' سرفراز نے اطمینان کا سانس لیا۔ ''اور میں تم سے کوئی چارج نہیں لوں گا۔''

''میں مفت میں کسی سے کچھ نہیں لیتا ہوں۔'' یاسر نے کھردرے لہجے میں جواب دیا۔ ''تم نے جو کیا ہے، اس کا معاوضہ مل جائے گا۔''

سرفراز اس کے لہجے پر ڈر گیا۔ ''جیسے تمہاری مرضی۔''

ملازمین اٹھ گئے تھے۔ باورچی ناشتا بنا رہا تھا اور باقی دو آنے والوں کو ان کے کمرے تک لے گئے تھے۔

تیمور لاؤنج میں ایک طرف ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ یہاں سیٹلائیٹ ٹی وی تھا اور خاصا بڑا ایل ای ڈی لگا ہوا تھا۔ اسے منیجر اور ان مشکوک افراد کی گفتگو تو سنائی نہیں دی تھی مگر اسے لگا کہ منیجر کچھ سہما ہوا تھا اور زخمی شخص سے گفتگو کے بعد وہ کسی قدر مطمئن نظر آنے لگا۔ زخمی کے دونوں ساتھی ایک طرف چوکس سے انداز میں بیٹھے تھے مگر انہوں نے تیمور یا کسی اور کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔

☆☆☆

''خان جی یہ تو وہی وین ہے۔'' شمل خان نے کہا۔

''وہ اندر ہی ہیں۔'' مراد بولا۔

''موقع اچھا ہے۔'' شمل پُرجوش لہجے میں بولا۔

''خاموش۔'' سرباز نے انہیں جھڑکا۔ ''وہ اندر اور محفوظ ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے انہوں نے دوسروں کے لیے راستہ کھلا رکھا ہوگا۔''

''کیا مطلب خان جی؟'' مراد نے پوچھا۔

''وہ ہوٹل پر قبضہ کر چکے ہیں۔'' سرباز نے کہا۔ ''اندر وہ کسی کو آنے نہیں دیں اور اگر ہم نے اس وقت گھسنے کی کوشش کی تو وہ چوکنا ہو جائیں گے اور پھر ان پر قابو پانا مشکل ہو جائے گا۔''

''تب ہم کیا کریں؟'' شمل خان نے مایوسی سے پوچھا۔ اس کا خیال تھا کہ اب کھیل ختم ہو جائے گا اور وہ باقی رات سکون سے گزار سکیں گے۔

''ہمیں صبح اور ان کے باہر آنے کا انتظار کرنا ہوگا۔''

''یہاں باہر اور اس ٹھنڈ میں؟'' مراد نے بے یقینی سے کہا۔

''نہیں ہم دوسرے ہوٹل تک جائیں گے اور وہاں سے کوئی گاڑی بھی حاصل کریں گے۔''

''گاڑی تو یہ بھی ہے۔'' مراد نے لینڈ کروزر کی طرف اشارہ کیا۔

''احمق اس کا مالک بھی اندر ہے اور چابی اسی کے پاس ہوگی۔ کیا چابی لینے تم اندر جاؤ گے۔'' سرباز نے اسے جھڑکا تو وہ کھسیا گیا۔

''یہ تو میں نے سوچا نہیں۔''

''کیونکہ اس کے لیے جو چیز چاہیے ہوتی ہے، وہ تمہارے پاس ہے کہاں؟'' سرباز نے اس کی مزید بے عزتی کی تو اس نے پھر چپ رہنے میں عافیت سمجھی۔ البتہ شمل خان نے عقلمندی کی بات کی۔

''خان جی اگر ہم دوسرے ہوٹل میں ہوئے اور یہ نکل گئے تو ہمیں پھر پیچھا کرنا پڑے گا۔''

''تم نے اچھا یاد دلایا۔'' سرباز نے کہا اور انہیں وہیں رکنے کا کہہ کر وہ وین کی طرف بڑھا۔ باہر اب چند ایک روشنیاں جل رہی تھیں۔ وہ پودوں اور درختوں کی آڑ لیتا ہوا وین تک آیا اور ماچس کی تیلی سے اس کے سامنے والے ٹائر کی ہوا نکالنے لگا۔ وہ یہ کام سست روی سے کر رہا تھا کیونکہ سناٹے میں آواز خاصی بلند ہوتی، اس کی کوشش تھی کہ اندر موجود افراد تک یہ آواز نہ جائے۔ چند منٹ میں ٹائر بیٹھ گیا' اب وہ اسے تبدیل کیے بغیر یہاں سے نہیں جا سکتے تھے۔ اس کے بعد وہ واپس آیا اور وہ ڈھلان سے نیچے آکر دوسرے ہوٹل تک آئے جو اس ہوٹل سے مخالف سمت میں دوسری ڈھلان کی بلندی پر کوئی ڈھائی سو گز کے فاصلے پر تھا۔ جب وہ چڑھ کر اوپر پہنچے تو ایک تو انہیں یہاں سے دوسرا ہوٹل صاف دکھائی دے رہا تھا اور دوسرے یہاں کسی قدر پرانے ماڈل کی ایک ہڈ والی جیپ موجود تھی۔ ان کی باچھیں کھل گئی تھیں۔ ہوٹل بند تھا اور یہاں صرف ایک نگران تھا۔ اسے قابو کرنا ان کے لیے زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا تھا۔

☆☆☆

جوجی اور شاہی تیار ہو کر لاؤنج میں آئے تو یاسر اور صبر خان سرفراز کے ساتھ اس کے کمرے میں جا چکے تھے جبکہ سمیر گل باہر وین دیکھنے گیا تھا۔ جوجی بہ مشکل کمرے سے نکلا تھا۔ شاہی نے اسے یقین دلایا کہ تیمور نے اس سے مذاق کیا تھا اور اسے اطمینان سے ٹی وی دیکھتے پا کر جوجی جل کر رہ گیا۔ ''اچھا مذاق کیا آپ نے، میری تو جان نکال دی۔''

''کوئی بات نہیں کبھی کبھی آدمی کو جان نکلنے کی پریکٹس کر لینی چاہیے تاکہ جب ملک الموت سچ مچ آئیں تو پریشانی نہ ہو۔''

جوجی نے بہتر سمجھا کہ ڈائننگ ہال کی طرف جائے۔ اس کے جاتے ہی تیمور سرگوشی میں شاہی کو اس فیملی کے بارے میں بتانے لگا جس میں دو عدد لڑکیاں بھی تھیں۔ شاہی کی باچھیں کھل گئیں۔ ''سچ میں کیسی ہیں؟''

''بس مناسب ہیں۔'' تیمور نے کہا۔ ''دوست اس پر توجہ رکھو کہ لڑکیاں ہیں اور دیکھنے میں ماڈرن لگ رہی ہیں۔ دونوں نے جینز کے ساتھ جیکٹ پہنی ہوئی تھی۔''

''یہ تو یہاں سب کو پہننی پڑتی ہے۔'' شاہی نے سرد آہ بھری۔ ''مجھے بھوک لگ رہی ہے۔''

''ڈائننگ ہال چلتے ہیں۔'' تیمور کھڑا ہو گیا۔

وہ ڈائننگ ہال کی طرف گئے تھے کہ اسی لمحے باہر جانے والا سمیر گل تیزی سے اندر آیا اور سرفراز کے کمرے کی طرف لپکا۔ وہاں سیف سے رقم کے تھیلے نکال لیے گئے تھے۔ سمیر گل نے کہا۔ ''وین کا ایک ٹائر اور پنکچر ہو گیا ہے، اسے تبدیل کرنا ہوگا۔''

یاسر نے صبر خان سے کہا۔ ''تم یہیں رکو۔''

وہ باہر آئے تو یاسر... نے جھک کر وین کا ٹائر دیکھا اور پھر اسے جوتے سے دبایا۔ پھر پاس پڑی ماچس کی تیلی اٹھائی' یہ سلامت تھی صرف اس کا سرا اچھل گیا تھا۔ ''یہ پنکچر نہیں ہے۔ کسی نے ہوا نکال دی ہے۔''

''کس نے؟'' سمیر گل چوکنا ہو گیا۔

یاسر نے آس پاس دیکھا۔ پھر اس کی نظر مخالف ڈھلان پر واقع ہوٹل تک گئی۔ اس کی اوپری منزل کی ایک کھڑکی کا پردہ ہٹا ہوا تھا جیسے ہی یاسر نے اس طرف دیکھا، پردہ برابر ہو گیا۔ اس کی چھٹی حس نے خبردار کیا کہ آس پاس خطرہ ہے۔ شاید پیچھا کرنے والے یہاں تک آگئے تھے۔ اس نے آہستہ سے سمیر گل سے کہا۔ ''اندر چلو ابھی ہم نہیں نکل سکتے۔''

''ٹائر دو منٹ میں بدل جائے گا۔'' وہ بولا۔

''تم دوسرا ٹائر اور سامان نکال دو، یہ کام ہوٹل کے ملازمین کریں گے۔'' یاسر نے حکم دیا اور اندر آیا۔ سرفراز پریشان تھا اور مزید پریشان ہو گیا جب یاسر نے اس سے سوال کیا۔ ''سامنے والا ہوٹل کھلا ہے؟''

''نہیں یہ بند ہے، اس کے بعد والے دو ہوٹل کھلے ہیں۔''

''وہاں کوئی تو ہوگا؟''

''نگران یا چوکیدار ہے شمروز نام ہے۔ میری اس سے بات ہے کوئی گاہک آتا ہے تو وہ ہماری طرف بھیج دیتا ہے، میں اسے کمیشن دیتا ہوں۔''

''تم کسی کو بھیج کر معلوم کراؤ کہ وہاں شمروز کے علاوہ تو کوئی نہیں ہے؟'' یاسر نے کہا۔ ''اپنے دو آدمی بھیجو وین کے ٹائر کی کسی نے ہوا نکال دی ہے۔ ٹائر بدلنا ہے۔''

''اس وقت سب ناشتے میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کو بلایا تو سب چونک جائیں گے۔'' سرفراز نے کہا۔ ''میں چلا جاتا ہوں۔''

''تم خود نہیں جاؤ گے۔'' یاسر نے انکار کیا۔ ''تم ٹائر تبدیل کراؤ اور ہاں تمہارے پاس کوئی دوربین ہے؟''

سرفراز کے پاس دوربین تھی۔ وہ اس نے یاسر کو دے دی۔ ساتھ ہی اس نے اوپری منزل کے کونے کے کمرے کی چابی بھی لے لی تھی۔ یاسر دوسری منزل پر آیا۔ اس نے کمرا کھولا اور اندر آکر کھڑکی سے پردہ ذرا سرکایا۔ پھر اس نے دوربین لگا کر دوسرے ہوٹل کا جائزہ لیا۔ فوراً اس کی توجہ پارکنگ میں موجود ہڈ والی جیپ کے ساتھ کھڑے ان دونوں افراد پر گئی۔ اس نے دوربین ان پر مرکوز کی اور گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اس نے انہیں شناخت کر لیا تھا۔ وہ سرباز خان کے آدمی تھے اور یاسر ایک زمانے میں خود سرباز کے لیے کام کر چکا تھا۔ جب وہ ملک سیف کو چھوڑ کر یہاں آیا تھا تو کچھ سال تک وہ سرباز کے ساتھ رہا تھا۔ گویا اس کے پیچھے سرباز آیا تھا اور ساتھ ہی اس کی سمجھ میں یہ بھی آگیا کہ وہ کیوں آیا تھا؟ اسے یاد آیا کہ اس نے سرباز سے اپنے شکاری کیبن کا ذکر کیا تھا اور سرباز اب بھی ملک سیف کے لیے کام کر رہا تھا۔ جب اس نے سرباز کو پیچھے لگایا تو وہ سیدھا کیبن کی طرف آیا اور اتفاق سے اس تک پہنچ بھی گیا۔ مگر وہ یہ نہیں سمجھ سکا تھا کہ ملک سیف کو کیسے پتا چلا کہ یہ اس کا کام ہے۔ وہ اور اس کے دونوں ساتھی نقاب میں تھے۔ بہرحال اس کا راز فاش ہو گیا تھا۔ اسے اب ملک سیف سے بھی بچنا تھا مگر اولین مرحلہ سرباز سے بچنے کا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سرباز نہایت خطرناک اور سفاک آدمی ہے؛ اس کے نزدیک انسان کی مچھر، مکھی سے زیادہ اہمیت نہیں تھی۔

اگر یاسر زخمی نہ ہوتا تو اسے اتنی فکر نہ ہوتی مگر اس حالت میں صرف دو آدمیوں کے ساتھ وہ سرباز جیسے شخص کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے دو آدمی تو سامنے تھے اور نہ جانے کتنے آس پاس موجود تھے۔ وہ جس گاڑی میں تھا، اس میں سات آٹھ افراد آرام سے آسکتے تھے۔ یاسر باقی ہوٹل کا جائزہ لینے لگا مگر تمام کھڑکیاں پردوں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ نیچے پارکنگ میں موجود سرباز کے آدمیوں کا اطمینان بتا رہا تھا، انہوں نے یاسر اور اس کے ساتھیوں کو گھیر لیا ہے۔ اب وہ اس کے ہوٹل سے باہر نیچے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ گویا وہ جب تک ہوٹل میں تھے، محفوظ تھے اس کے بعد وہ محفوظ نہ رہتے۔ یاسر کو لگا کہ اس کا جسم گرم ہو رہا ہے اور زخم والی جگہ پھوڑے کی طرح دکھ رہی تھی۔ اس کا علاج یہاں سے نکلنے پر ہو سکتا تھا اور اس وقت یہاں سے نکلنا ممکن نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ نیچے آیا تو سرفراز، سمیر گل کے ساتھ ٹائر بدل کر آگیا تھا اور اب اس کی دلی خواہش تھی کہ یہ لوگ یہاں سے رخصت ہو جائیں مگر یاسر

نے اس کی امیدوں پر یہ کہہ کر پانی پھیر دیا کہ وہ فی الحال نہیں جا رہے اور وہ رقم واپس سیف میں رکھ دے۔

☆☆☆

تیمور، جوجی اور شامی بہت خوش تھے۔ تیمور اور شامی یوں خوش تھے کہ نئی آنے والی فیملی اور خاص طور سے لڑکیاں ان سے فوراً بے تکلف ہوگئی تھیں۔ جبکہ لڑکے جوجی سے بے تکلف ہوگئے تھے۔ ان کے ماما پاپا یوں خوش تھے کہ بچوں نے اپنی دلچسپی خود تلاش کرلی تھی اور وہ انجوائے کرنے کے لیے آزاد تھے۔ اصل کام نواب صاحب کے حوالے سے تعارف نے کیا۔ پاپا کا نام ضیاالدین شاہ تھا اور وہ وفاقی حکومت میں انیس گریڈ کے سرکاری افسر تھے۔ ان کی بیگم کو تمام بیگمات کی طرح شاپنگ اور تفریح کا شوق تھا۔ میاں جی کی ملازمت کے طفیل ان کے یہ دونوں شوق بہ خوبی پورے ہو رہے تھے۔

تیمور، شامی، روبین اور شرمین ایک ہی میز پر آگئے تھے جبکہ جوجی ان کے بھائیوں فراز اور اسد کے ساتھ دوسری میز پر تھا۔ جبکہ ضیاالدین بیگم کے ہمراہ الگ میز پر تھے۔ یہاں تمام میزیں چار افراد کے لیے تھیں اس لیے وہ ایک جگہ بیٹھ نہیں سکتے تھے۔ روبین تیمور کے ساتھ بیٹھی تھی۔ وہ معصوم سی اور گول چہرے والی کسی قدر شوخ لڑکی تھی۔ اس نے باب کٹ بال رکھے تھے جبکہ شرمین تیکھے نقوش اور بڑی آنکھوں والی کسی قدر ہلکی رنگت کی حامل تھی۔ اس نے اپنے بالوں کو جوڑے کی صورت میں پیچھے باندھ رکھا تھا اور ہلکے میک اپ میں دلکش لگ رہی تھی۔ وہ شامی کے ساتھ بیٹھی تھی۔ وہ بھی یہاں اسکیٹنگ کے ارادے سے آئے تھے اگرچہ انہوں نے پہلے کبھی اسکیٹنگ کی نہیں تھی۔ شامی نے آفر کی کہ وہ انہیں اسکیٹنگ سکھائے گا۔ شرمین خوش ہوگئی۔

"تھینک گاڈ ورنہ میں سوچ رہی تھی کہ بس دیکھ کر چلی جاؤں گی۔"

تیمور نے کہا۔ "ہم ناشتا کر کے نکلتے ہیں۔ ویسے تم لوگ کتنے دن کے لیے آئے ہو؟"

"تین دن کے لیے۔" روبین دکھ سے بولی۔ "میں نے پاپا سے کہا کہ ایک ہفتہ تو رکیں مگر ان کی ڈیوٹی کا مسئلہ ہے۔"

کچن سے گرما گرم ناشتا آ رہا تھا اور وہ اس سے انصاف کر رہے تھے۔ اس سے بے خبر کہ ان کے اردگرد کیا کھیل چل رہا ہے۔

☆☆☆

سرباز بہت خوش تھا کیونکہ انہیں صرف ایک ٹھکانا اور ہوٹل پر نظر رکھنے کے لیے ایک چیک پوسٹ ہی نہیں ملی تھی بلکہ اسے یہاں بنتِ انگور بھی مل گئی تھی۔ وہ بڑی شدت سے اس کی طلب محسوس کر رہا تھا۔ سب سے بڑھ کر اسے یہاں فون مل گیا تھا اس علاقے میں موبائل سروس نہیں تھی۔ اس نے سب سے پہلے کال کر کے اپنے اسلحہ بردار آدمیوں کو طلب کر لیا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ ان کے آنے کے بعد وہ ہوٹل پر دھاوا بول دیں گے۔ وہ اس ہوٹل کی اوپری منزل کی ایک کھڑکی کے سامنے بیٹھا تھا اور سامنے والے ہوٹل کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے یاسر اور اس کے آدمی کو باہر آتے دیکھا۔ اس کا آدمی پہلے بھی آیا تھا اور وین کا ٹائر پنکچر دیکھ کر اندر گیا تھا۔ اس کی بدحواسی دیکھ کر سرباز کو ہنسی آ رہی تھی۔ یاسر نے باہر آ کر معائنہ کیا، اس نے زمین سے کچھ اٹھایا اور پھر آس پاس دیکھتے ہوئے اس کی نظر کھڑکی کی طرف آئی تھی۔ سرباز نے بے ساختہ پردہ چھوڑ دیا۔ اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا اتنی دور سے اسے دیکھنا ناممکن تھا مگر اس نے پردہ چھوڑ کر خود بتا دیا کہ یہاں کوئی تھا اور یاسر کو دیکھ رہا تھا۔

سرباز سوچ رہا تھا کہ جس طرح اس نے اپنے آدمیوں کو طلب کیا تھا اسی طرح یاسر بھی مدد بلوا سکتا تھا اور اسے مدد کی ضرورت بھی تھی۔ وہ جس طرح سے واپس اندر گیا تھا ایسا لگ رہا تھا کہ وہ صورتِ حال بھانپ گیا ہے اور اب شاید فوری یہاں سے روانہ نہ ہو۔ سرباز نیچے آیا اور اس نے شمل خان کو حکم دیا کہ وہ آگے جائے اور جہاں سے فون کی تار وادی میں آ رہی ہے اسے کاٹ دے۔ شمل خان فوری روانہ ہوگیا۔ وہ ہڈ والی جیپ لے گیا تھا، یہ ہوٹل کی تھی اور کسی ہنگامی صورتِ حال کے لیے یہاں رکھی ہوئی تھی۔ اسے باہر جانے والے راستے سے ذرا اوپر ڈھلان پر فون کی تاریں درختوں کے ساتھ چلتی نظر آئیں۔ وہ کٹر لے کر اوپر آیا اور اس نے تمام تاریں دونوں طرف سے کاٹ دیں اور کٹی تاریں ساتھ لے کر واپس روانہ ہوگیا۔ اب وادی سے کوئی باہر رابطہ نہیں کر سکتا تھا۔

☆☆☆

عین اس وقت یاسر سوچ رہا تھا کہ وہ فون کر کے اپنے کچھ ساتھی بلوا لے۔ اس کے پاس زیادہ آدمی نہیں تھے مگر جو تھے وہ سب کام کے تھے۔ دوسری طرف سرفراز کا کہنا تھا کہ پولیس کو کال کی جائے مگر یاسر خود ڈاکا مار کر آیا تھا وہ پولیس کو کیسے کال کرتا۔ اسی بحث میں کچھ وقت لگا اور جب

یاسر نے تار لگا کر فون کا ریسیور اٹھایا تو اس سے ٹون نہیں آ رہی تھی۔ اس نے سرفراز سے پوچھا۔ "اسے کیا ہوا؟"

"مجھے کیا معلوم؟ تمہارے ساتھی نے تار نکالا تھا۔" جلد علم ہوگیا کہ لائن پیچھے سے بے جان تھی۔ سرفراز نے کہا۔ "اس علاقے میں یہ مصیبت ہے۔ آئے دن تاریں ٹوٹتی ہیں۔"

مگر یاسر کچھ اور سوچ رہا تھا۔ اس نے صبر خان کو سامنے والے ہوٹل کی نگرانی پر لگایا ہوا تھا۔ اس سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ ایک آدمی ہڈ والی جیپ لے کر کہیں گیا ہے۔ یاسر کو فوراً یقین ہوگیا کہ اس نے فون وائر کاٹ دی تھی۔ سرباز اسے باہر رابطہ کر کے مدد منگوانے سے روک رہا تھا جبکہ وہ خود مدد طلب کر چکا ہوگا۔ صورتِ حال یاسر کے اندازے سے زیادہ خراب ہو رہی تھی۔ اس نے سرفراز سے کہا۔ "اب ہوٹل سے کوئی باہر نہیں جائے گا اور نہ ہی کوئی اندر آئے گا۔"

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ تمہارے سامنے دو پارٹیاں آ چکی ہیں اور آج ہی شاید کچھ لوگ اور آئیں۔ یہاں...... سیزن کا آغاز ہونے والا ہے۔"

"فی الحال یہاں مار ماری کے سیزن کا آغاز ہونے والا ہے۔" یاسر نے کہا۔ "میرے جو دشمن پیچھے ہیں، وہ بہت سفاک اور عادی قاتل ہیں۔ اگر وہ یہاں آگئے تو تم اور تمہاری پارٹیوں سمیت کوئی زندہ نہیں بچے گا۔"

سرفراز کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ "وہ تمہارے پیچھے آئے ہیں؟"

"ہاں اگر ہم یہاں سے نکل سکتے تو نکل جاتے مگر ابھی ہم یہاں سے نکل بھی نہیں سکتے۔ ہوٹل کا باہر والا گیٹ بھی بند کروا دو۔"

سرفراز خوفزدہ ہوگیا۔ وہ خود گیا اور اس نے گیٹ بند کر دیا۔ اتفاق سے شامی جو شرمین کے ساتھ لاؤنج میں تھا، وہ یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اس نے سرفراز سے پوچھا۔ "مسٹر منیجر یہ گیٹ کیوں بند کیا ہے؟"

"یہاں کچھ خطرہ ہے۔" سرفراز نے مبہم انداز میں کہا۔ "سنا ہے یہاں کچھ جرائم پیشہ افراد آگئے ہیں، آپ لوگوں کی حفاظت کے لیے گیٹ بند کیا ہے، ابھی کوئی باہر نہیں جا سکتا۔"

"کرمنلز....!" شرمین سہم گئی۔ "سچ میں۔"

"ڈرو مت ہم تمہارے ساتھ ہیں۔" شامی نے اسے تسلی دی۔ اسی لمحے اندر سے سمیر گل دوڑتا ہوا آیا اور اس نے سرفراز سے کہا۔

"خان جی بے ہوش ہوگیا ہے۔"

شامی چونکا۔ "کون خان جی... وہی جو زخمی ہے؟"

سرفراز نے سر ہلایا۔ "اسے گولی لگی ہے۔ یہاں آنے والے خطرناک لوگ انہی کے پیچھے آئے ہیں۔"

شامی مزید چونکا۔ "گولی لگی ہے۔"

سمیر گل نے سر ہلایا۔ "راستے میں حملہ ہوا تھا ہم پر۔"

"مگر کیوں؟" شامی نے کہا۔ "مجھے تو تم لوگ بھی

شریف نظر نہیں آتے۔“

اس تبصرے پر سمیر گل کے تاثرات بگڑے تھے مگر اس وقت اسے مدد کی ضرورت تھی۔ اس لیے اس نے اظہار نہیں کیا۔ شامی نے تیمور کو آواز دی اور وہ سرفراز کے کمرے میں آئے جہاں یاسر صوفے پر نیم غشی کی حالت میں تھا۔ شامی کو اس سے زیادہ باہر موجود افراد کی فکر تھی۔ اس نے سمیر گل سے پوچھا۔ ”یہ لوگ کون ہیں؟“

”ہمارے دشمن۔“ اس نے جامع جواب دیا۔

”اور تم لوگ کون ہو؟“

”ہم ان کے دشمن ہیں۔“

”تمہاری آپس کی دشمنی میں کہیں ہم نہ مارے جائیں۔“

اسی لمحے یاسر ہوش میں آ گیا۔ اس نے ان لوگوں کو دیکھا اور اٹھنے کی کوشش کی مگر شامی نے اسے روک دیا۔ ”تمہاری حالت ٹھیک نہیں ہے تمہیں فوری آپریٹ کی ضرورت ہے۔“

”مجھے تم لوگوں کی فکر ہے۔“ یاسر نے آہستہ سے کہا۔ ”سرباز اور اس کے ساتھی بہت خطرناک ہیں۔“

”یہ سرباز کون ہے؟“ شامی نے اس کی شرٹ ہٹا کر زخم کا معائنہ کرتے ہوئے پوچھا۔ جواب میں یاسر نے سرباز کے بارے میں مختصراً بتایا تو شامی نے تسلیم کیا کہ وہ خطرناک ہے۔ ”مگر سوال یہ ہے کہ وہ تمہارے پیچھے کیوں ہے؟“

”ان کے پاس بہت بڑی رقم ہے۔“ سرفراز نے انکشاف کیا۔

یاسر نے سرفراز کو گھورا اور مجبوراً سر ہلایا۔ ”وہ اسی کے پیچھے آئے ہیں مگر مجھے اور میرے ساتھیوں کو مارے بغیر نہیں جائیں گے۔ ہمارے ساتھ اور جو لوگ ہیں، ان کو بھی نہیں چھوڑیں گے، یہ عینی گواہ چھوڑنے والے لوگ نہیں ہیں۔“

شامی، تیمور کو لے کر ایک طرف آیا۔ ”لے بھائی ایڈونچر شامل ہو گیا اپنی تفریح میں۔“

”میں نے تو پچھلے کئی سالوں سے نہیں دیکھا کہ ہم نے صرف تفریح کی ہو اور ساتھ میں ایڈونچر نہ ہوا ہو۔“ تیمور نے سر ہلایا۔ ”ہمارے لیے بہتر یہی ہے کہ یہاں سے فوری روانہ ہو جائیں۔ ورنہ گڑبڑ ہوئی تو نواب صاحب کو جواب دینا مشکل ہو جائے گا۔“

”روانہ ہو جائیں ان لوگوں کو چھوڑ کر۔“ شامی کا اشارہ شرمین اور اس کے گھر والوں کی طرف تھا۔

”ان سے بات کرتے ہیں۔“ تیمور نے کہا۔

”ٹھیک ہے تب تک میں ذرا اسے دیکھ لوں۔“ شامی نے یاسر کی طرف اشارہ کیا۔

”چھوڑ یار انہیں کیا؟“

”یہ لوگ مسلح ہیں اور بدمعاش ہیں مگر یہاں انہوں نے بدمعاشی نہیں دکھائی ہے اس لیے ہمیں بھی خیال رکھنا ہوگا۔“

شامی نے ابتدائی طبی امداد کا کورس کیا تھا۔ اسے گولی نکالنے کا تجربہ بھی تھا۔ اس نے گرم پانی اور جراثیم کش دوا کے ساتھ آپریشن شروع کیا۔ شامی کو زیادہ چیر پھاڑ نہیں کرنی پڑی اور اس نے آسانی سے تلاش کر کے گولی نکال لی۔ خون دوبارہ بہنے لگا تھا مگر گولی نکل جانے سے یاسر کو بڑا سکون ملا تھا۔ دوا سے زخم کا اوپری حصہ صاف کر کے شامی نے اس پر خشک کرنے والا پاؤڈر چھڑک کر، اس پر چکنی پٹی رکھ کر اوپر سے ٹیپ کر دیا۔ یاسر گہرے سانس لے رہا تھا اور تکلیف سے اس کا رنگ سفید پڑ گیا تھا۔ مگر وہ ہمت سے برداشت کر رہا تھا۔ اسے گرم دودھ کے ساتھ پین کلر اور اینٹی بائیوٹک دی گئیں تو چند منٹ میں اس کی حالت خاصی بہتر نظر آنے لگی۔ اس دوران میں تیمور ضیا اینڈ فیملی سے بات کر کے واپس آ گیا اور اس نے شامی کو اشارہ کیا۔

”وہ تیار ہیں۔“ اس نے سرگوشی میں کہا۔ ”ہمیں نکل جانا چاہیے۔“

شامی نے سر ہلایا۔ یاسر اٹھ بیٹھا تھا اور اس نے جیکٹ پہن لی تھی۔ شامی اس کی طرف آیا۔ ”ہم یہاں سے جا رہے ہیں۔“

یاسر نے نفی میں سر ہلایا۔ ”تم نہیں جا سکتے۔“

”ہمیں تمہاری اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔“ شامی نے کھردرے لہجے میں کہا۔

”میں اپنی بات نہیں کر رہا۔ میرا اشارہ سرباز کی طرف ہے اس کے آدمی باہر گھات لگا کر بیٹھے ہوں گے۔ وہ یہاں سے کسی کو نہیں جانے دیں گے۔“

”ہمارا تم سے تعلق نہیں ہے۔“

”ہاں مگر وہ شک کریں گے کہ نکلنے والی گاڑی میں ہم اور رقم ہے۔ وہ اسے روکنے کی پوری کوشش کریں گے۔ چاہے اس کے لیے کچھ بھی کرنا ہو۔“

شامی سوچ میں پڑ گیا۔ پیدل وہ جا نہیں سکتے تھے۔ اگر یاسر کی بات درست تھی تو وہ صحیح سلامت یہاں سے نہیں نکل سکتے تھے۔ یاسر اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔

”میری اپنی بھی یہی خواہش ہے کہ ہمارے آپس کے جھگڑے میں کوئی بے گناہ لپیٹ میں نہ آئے مگر سرباز جیسے لوگ ان باتوں کی پروا نہیں کرتے ہیں۔“

ان کا اسلحہ لینڈ کروزر میں تھا۔ شامی نے تیمور سے کہا کہ وہ اسلحہ نکال لائے۔ وہ جوجی کے ساتھ گیا اور اسلحہ لے آیا۔ ضیا اینڈ فیملی لاؤنج میں بیٹھے تھے اور پریشان تھے۔ تیمور اسلحہ لایا تو وہ مزید پریشان ہو گئے۔ ضیا الدین اٹھ کر تیمور کے پاس آیا۔ ”یہ کیا چکر ہے؟“

تیمور نے اسے مختصر الفاظ میں بتایا کہ کیا چکر ہے تو اس نے کہا۔ ”ہم پولیس بلا لیتے ہیں۔“

”ہوٹل کی فون لائن کام نہیں کر رہی ہے اور یہاں موبائل سروس بھی نہیں ہے۔“ تیمور نے اسلحہ دکھایا۔ ”ہمیں اپنے زورِ بازو پر بھروسا کرنا پڑے گا۔ آپ کے پاس کوئی ہتھیار ہے؟“

”ہاں ایک پستول ہے لیکن وہ گاڑی میں ہے۔“

”میرے ساتھ چل کر نکال لیں۔ اس وقت سب کا مسلح ہونا لازمی ہے۔“

ضیا، تیمور کے ساتھ جا کر اپنی شاندار گاڑی میں رکھا ہوا پسٹل نکال لایا۔ شامی نے سمیر گل اور صبر خان کو ہوٹل کی اوپری منزل پر نگرانی پر لگا دیا تھا کہ اگر کوئی اس طرف آنے کی کوشش کرے تو وہ فوراً انہیں خبردار کریں۔ تیمور اندر آیا اور اس نے شامی سے کہا۔ ”ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا، ہمارے پاس اسلحہ ہے اگر کسی نے راستہ روکا تو ہم نمٹ لیں گے۔“

”یہ خطرناک ہو سکتا ہے۔“ شامی نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ہمارے ساتھ عورتیں اور بچے بھی ہوں گے۔ اسلحہ ہم دو استعمال کر سکتے ہیں باقی تو اس معاملے میں کورے ہیں۔ اس نے جو بتایا ہے اس کے مطابق سرباز اور اس کے ساتھی چھٹے ہوئے بدمعاش اور قاتل ہیں۔“

”تب یہاں بیٹھنا بھی تو مسئلے کا حل نہیں ہے۔“ تیمور نے کہا۔ ”ہمیں باہر سے رابطہ کر کے مدد حاصل کرنی ہوگی۔“

”باہر سے مدد خود آ سکتی ہے۔“ شامی نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”اسکیٹنگ سیزن کا آغاز ہے اور جلد یہاں باہر سے لوگ آنا شروع ہو جائیں گے اور اس صورت میں یہ زیادہ دیر گھیرا ڈال کر بیٹھ نہیں سکتے۔“

”تیری مرضی۔“ تیمور نے شانے اچکائے۔ ”سچی بات ہے فی الحال میری سمجھ اس معاملے میں کام نہیں کر رہی ہے۔“

”ممی! میں بھی تالاب میں نہا لوں؟“
صاحب زادے نے اپنی مغرب زدہ ماں سے پوچھا۔
”نہیں سویٹی، تالاب بہت گہرا ہے۔“ ماں نے جواب دیا۔
”مگر ابو بھی تو......“
”اوہ! بیٹے ان کی تو انشورنس ہو چکی ہے۔“ ماں نے جواب دیا۔

”ناکارہ چیز نہیں اس وقت جواب دے جاتی ہے جب اس کی ضرورت ہو۔“ شامی نے سنجیدگی سے کہا۔ ”تو میری جیتی جاگتی اور وقت پر کام آنے والی عقل پر بھروسا کر سکتا ہے۔“

تیمور نے اسے گھورا مگر کچھ کہا نہیں۔ اس کے بجائے وہ کچھ اور سوچ رہا تھا۔ وہ اندر آئے تو یاسر صوفے پر دراز تھا اور دوا کے اثر میں لگ رہا تھا۔ تیمور نے سرفراز سے کہا۔ ”کیا یہاں کسی قسم کا نیٹ ورک بھی نہیں ہے؟“

”آرمی کا نیٹ ورک ہے جو اس علاقے میں کام کرتا ہے مگر اتفاق سے ہمارے پاس جو سم تھی، وہ خراب ہو گئی ہے۔ اس علاقے میں صرف یہی ایک سم کام کرتی ہے۔“

”کسی اور کے پاس یہ سم نہیں ہے؟“

”ممکن ہے دوسرے ہوٹلز والوں کے پاس ہو۔“ سرفراز نے کہا۔ ”مگر اس کے لیے ضروری ہے وہاں جا کر رابطہ کیا جائے۔“

یہاں سے نکلنا ہی تو مسئلہ تھا۔ اسی وقت اوپر سے صبر خان آیا اور اس نے اطلاع دی۔ ”دو گاڑیاں وادی میں آئی ہیں مگر وہ آگے گئی ہیں۔“

شامی اور تیمور اس کے ساتھ اوپر آئے۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک بڑی جیپ سامنے والے ہوٹل کے احاطے میں رکی تھی اور اس سے کوئی نصف درجن مسلح افراد برآمد ہو رہے تھے۔ انہوں نے دوربین استعمال کی تو وہ سب حلیے اور صورتوں سے چھٹے ہوئے بدمعاش نظر آ رہے تھے۔ دوسری گاڑی جو لگژری قسم کی کار تھی، وہ اس سے آگے والے ہوٹل پر رکی اور اس سے ایک جوڑا اتر کر ہوٹل میں گیا، ان کے سوٹ کیس بیل بوائے لینے آیا تھا۔ وہ یقیناً سیاح تھے۔ ان کی توجہ کا اصل مرکز سامنے والے ہوٹل میں آنے والے مسلح افراد تھے۔ وہ یقیناً سرباز کے آدمی تھے۔ یاسر، سمیر گل اور صبر خان بہتر طور پر مسلح تھے۔ ان کے پاس دو عدد خودکار

رائفلیں، ایک سنگل شاٹ لیکن دور مار رائفل اور دو عدد پستول مع وافر ایمونیشن کے تھے۔ سرفراز کے پاس رائفل اور پستول تھا جبکہ ضیا کے پاس بھی پستول تھا اس طرح اسلحے کی کمی نہیں تھی مگر ان کو ڈھنگ سے استعمال کرنے والے صرف چار پانچ افراد تھے۔ تیمور کو اوپر چھوڑ کر شامی نیچے آیا۔ اس نے سب کو لاؤنج میں جمع کیا اور صورت حال بیان کی۔ ضیا اینڈ فیملی اور جوجی کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ خاص طور سے یہ جان کر کہ مزید مسلح افراد آگئے ہیں۔ شامی نے کہا۔

''ہمیں اپنا دفاع کرنا ہے اب یہ بتاؤ کہ کون کون ہتھیار استعمال کرنا جانتا ہے۔''

''مجھے پستول چلانا آتا ہے۔'' ضیا الدین نے کہا۔ ''مگر نشانہ اچھا نہیں ہے۔''

''کوئی بات نہیں چلے گا۔''

''مجھے پستول اور رائفل دونوں استعمال کرنی آتی ہیں۔'' سرفراز نے کہا۔

''اپنے ملازموں سے پوچھو۔''

ملازموں میں سے مجید اور سلطان کو پستول چلانے آتے تھے۔ شامی نے ان کو بیک اپ میں رکھا اور سب سے پہلے اوپر والے حصے میں سمیر گل اور صبیر خان کی مستقل ڈیوٹی لگا دی۔ ان کے ساتھ باری باری تیمور اور سرفراز ہوتے جبکہ خود شامی اور ضیا الدین نیچے ہوتے۔ یاسر کی حالت اس قابل نہیں تھی کہ فی الحال وہ کوئی ذمے داری اٹھا سکتا۔ شامی نے داخلی حصوں کا معائنہ کیا۔ ہوٹل میں صرف گیٹ سے داخلہ ممکن تھا اور اس کے پیچھے نہ صرف بلند و بالا چٹانیں تھیں بلکہ عقب سے اندر آنے کا بھی کوئی راستہ نہیں تھا۔ بائیں طرف بہت گہری اور تقریباً دیوار کی طرف سیدھی کھائی تھی۔ سامنے کی طرف پل تھا اور اس کے سامنے گیٹ تھا۔ ہوٹل کا اچھی طرح معائنہ کر کے وہ اندر آیا تو ضیا الدین اور ان کی بیگم آپس میں سر جوڑے سرگوشیاں کر رہے تھے پھر ضیا الدین شامی کی طرف آیا۔

''نوابزادے آپ کچھ زیادہ ہی ری ایکٹ نہیں کر رہے ہیں؟''

شامی نے اسے گھورا۔ ''کیا مطلب؟''

''پاپا ٹھیک کر رہے ہیں۔'' شرمین نے مداخلت کی۔

''شٹ اپ۔'' ضیا الدین نے خراب لہجے میں کہا۔ ''تم چپ رہو۔ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔''

''میں بتا چکا ہوں کہ ابھی مزید مسلح افراد یہاں پہنچے ہیں اور ہم اسی ہوٹل میں محفوظ ہیں۔''

''میں ایسا نہیں سمجھتا۔'' ضیا الدین نے کہا۔ ''ہم یہاں سے جا رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کوئی ہمیں نہیں روکے گا۔''

شامی نے ان کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ پہلے ہی بیگم کے کہنے میں آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے فیصلہ کرلیا کہ انہیں جانا ہے۔ انہوں نے کمروں سے اپنا سامان سمیٹ کر ہوٹل کے ملازموں سے گاڑی میں رکھوایا۔ شامی ان کے ساتھ لگا ہوا تھا اور سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ شرمین اس کے ساتھ تھی مگر باپ کے آگے مجبور تھی۔ تیمور کو پتا چلا تو وہ بھی آگیا اور جب اس نے ضیا الدین کا رویہ دیکھا تو شامی سے کہا۔ ''چھوڑ یار خود بھگتیں گے۔''

''مجھے لڑکیوں کی فکر ہے۔'' شامی نے کہا۔

''لڑکیاں اس کی ہیں یار۔''

کچھ دیر بعد ضیا اینڈ فیملی اپنی گاڑی میں ہوٹل سے نکل رہے تھے۔ شامی اور تیمور گیٹ کے پاس تھے۔ وہ نیچے اترتی گاڑی کو دیکھ رہے تھے۔ تیمور نے کہا۔ ''اگر یہ صحیح سلامت نکل گئے تو ہم بھی ان کے پیچھے...''

ابھی اس کے الفاظ منہ میں تھے کہ ایک فائر ہوا اور ضیا الدین کی گاڑی لہرا کر نیچے جانے والے راستے کے ساتھ موجود ایک درخت سے ٹکرائی۔ اس کے بعد بھی کئی فائر ہوئے اور یہ سامنے والے ہوٹل کی چھت سے ہو رہے تھے۔ شامی نے سنگل شاٹ رائفل سے چھت پر موجود مسلح شخص کو نشانہ بنایا جو گاڑی پر فائرنگ کر رہا تھا۔ وادی گولیوں کی آواز سے گونج رہی تھی۔ شامی کا نشانہ اچھا تھا۔ اس کی چلائی دوسری گولی اس آدمی کو لگی۔ وہ جھٹکے سے پیچھے گیا۔ اس دوران میں ضیا اینڈ فیملی کار سے نکل کر اندھا دھند اوپر کی طرف دوڑ رہے تھے اور تیمور چلا چلا کر انہیں جلدی آنے کو کہہ رہا تھا۔ ہوٹل کی چھت... پر موجود آدمی اب آڑ میں ہو گیا تھا مگر وہ فائرنگ کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔ ایک منٹ کے اندر وہ سب دوبارہ ہوٹل کے احاطے میں تھے۔ ضیا الدین کی حالت خراب تھی اور بیگم تو باقاعدہ رو رہی تھیں۔ البتہ لڑکیوں اور لڑکوں نے خود کو سنبھالا ہوا تھا، وہ ماں باپ کو بھی سہارا دے کر لائے تھے۔ ان کے آتے ہی انہوں نے گیٹ بند کیا اور وہ دوبارہ ہوٹل میں آگئے۔ پانی پی کر ان کے حواس قابو میں آئے تو ضیا الدین نے پانپتے

ہوئے کہا۔ ''تمہاری بات ٹھیک تھی۔ میرے خدا اگر بائیں کے بجائے دایاں ٹائر برسٹ ہوتا تو گاڑی ڈھلان پر اتر جاتی۔''

''اللہ نے محفوظ رکھا۔'' تیمور نے اسے تسلی دی۔ ''لیکن اس واقعے سے یہ ثابت ہو گیا کہ ہوٹل سے باہر جانا نہایت خطرناک ہو سکتا تھا۔''

''ہم نہ جائیں تب بھی تو وہ یہاں آئیں گے۔'' بیگم ضیا نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ ''ایسے خطرناک لوگوں کو کون روک سکتا ہے۔''

''ہم روک سکتے ہیں۔'' شامی نے کہا۔ ''فائرنگ سے بات کھل گئی ہے اور جلد کوئی نہ کوئی پولیس سے رابطہ کرے گا۔''

''مشکل ہے۔'' سرفراز نے کہا۔ ''یہاں سب کاروباری لوگ ہیں اور کوئی اس وقت تک پولیس کو کال نہیں کرے گا جب تک خود اس پر مصیبت نہ پڑے۔ باقی دو ہوٹل والے محفوظ ہیں اس لیے وہ کال نہیں کریں گے۔''

''کال بھی وہ اس صورت میں کریں گے جب لائن محفوظ ہو۔'' شامی نے کہا۔ ''ان لوگوں نے صرف ہماری نہیں بلکہ تمام لائنیں کاٹ دی ہوں گی۔''

''بالکل ایسا ہی کیا ہوگا۔'' سرفراز نے اس کی تائید کی۔

کچھ دیر میں باورچی نے لنچ تیار ہونے کی اطلاع دی مگر کسی کو بھوک نہیں تھی۔ جوجی نے شامی سے کہا۔ ''زندگی میں پہلی بار میری بھوک مر گئی ہے جی۔''

''آخری وقت میں آدمی ایسا ہی محسوس کرتا ہے۔'' شامی نے تائید کی۔ ''بہتر ہوگا کہ اس وقت اپنے اعمال یاد کر کے خدا سے معافی مانگو، ہو سکتا ہے جلد تمہیں اس کے پاس جانا پڑے۔''

''شامی بھائی آپ منہ سے اچھی بات نہیں نکال سکتے۔'' جوجی نے خفگی سے کہا۔ ''آپ ہمیشہ مجھے مصیبت میں ڈالتے ہیں۔''

''مگر تم باز پھر بھی نہیں آتے۔ جب دعوت دو فوراً راضی ہو جاتے ہو۔''

''آپ کے بغیر مزہ نہیں آتا ہے اور دوسرے میں جاتا ہی کہاں ہوں؟ یہی سال میں دو تین بار آپ کے ساتھ نکلتا ہوں تو اس میں موت منہ کھولے آجاتی ہے۔''

شامی نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''تم تو بڑے شستہ لہجے میں بات کر رہے ہو۔''

''وہ میں تارڑ صاحب کو پڑھ رہا ہوں۔'' جوجی نے شرما کر کہا۔ ''مجھے ان کے سفرنامے اچھے لگتے ہیں۔''

تیمور اوپر چلا گیا اور کچھ دیر بعد رومین بھی خاموشی سے اس کے پیچھے سرک گئی۔ شرمین، شامی کے پاس چلی آئی۔ جوجی اسے گھورتا ہوا وہاں سے اٹھ گیا۔ غالباً اسے اپنی باجی کا خیال آرہا تھا۔ شرمین نے آہستہ سے پوچھا۔ ''اب کیا ہوگا؟''

''پتا نہیں فی الحال تو ہم ایسی پوزیشن میں پھنسے ہوئے ہیں جس سے نکلنے کا راستہ نظر نہیں آرہا ہے۔''

''دیکھو مسئلہ ان لوگوں کی وجہ سے ہوا ہے اور کچھ رقم کا بھی چکر ہے۔''

''ہاں باہر موجود لوگ رقم کے چکر میں بھی ہیں۔''

''تب اس سے کہو کہ رقم دے دے۔ ہو سکتا ہے یہ جان چھوڑ دیں اور یہاں سے چلے جائیں۔'' شرمین نے کہا تو شامی چونک گیا۔

''بات تو تم نے اچھی کی ہے لیکن یہ مانے تو بات بنے گی۔''

''تم بات کر کے دیکھو۔'' شرمین نے مشورہ دیا۔ شامی سرفراز کے کمرے میں آیا، یاسر نے وہیں ڈیرا ڈال لیا تھا۔ ویسے بھی رقم وہیں تھی اور اسی لیے تو وہ اس حال کو پہنچا تھا۔ یاسر اٹھ کر بیٹھ گیا تھا اور اس وقت چکن کارن سوپ پی رہا تھا۔ اسے دواؤں کے ساتھ طاقتور غذاؤں کی بھی ضرورت تھی۔ سوپ میں چکن کے موٹے پیس تیر رہے تھے۔ شامی ایسے سوپ کو قورمہ قرار دیتا تھا۔ شامی نے اس سے رقم کی بات کی تو اس نے کہا۔

''مسئلہ رقم کا نہیں ہے، یہ جس شخص کی رقم ہے وہ میرے اور میرے ساتھیوں کی لاشوں سے کم پر راضی نہیں ہوگا۔ ہمارے لیے یہ بہت بڑی رقم ہے اس کے لیے اس کی انا اس سے کہیں زیادہ بڑی ہے۔''

''تمہارا اشارہ سرباز کی طرف ہے؟''

''نہیں سرباز تو اس کا معمولی سا آدمی ہے جو اب بھی اس کے ایک اشارے پر میرے پیچھے دوڑا آیا۔'' یاسر نے کہا۔ ''تم اچھے آدمی ہو اور اس معاملے میں زیادہ مت الجھو جو بعد میں تمہارے لیے مسئلہ بن جائے۔''

''تب اس مسئلے کا کیا حل ہوگا۔ باہر اب کم سے کم دس مسلح افراد موجود ہیں۔ ضیا الدین نے جانے کی کوشش کی تھی تو اس کی گاڑی کا ٹائر برسٹ کر دیا گیا۔ ان کی جان بچ گئی ورنہ سامنے والے ہوٹل سے ان پر براہِ راست فائرنگ کی

گئی تھی۔''

یاسر نے سر ہلایا۔ ''صبر خان نے بتایا کہ تم نے نشانچی کو ہٹ کیا تمہارا نشانہ اچھا ہے۔ بہر حال اب میں بہتر محسوس کر رہا ہوں۔ جلد ہی میں کوئی حل نکال لوں گا۔ تم فکر مت کرو تم لوگوں پر آنچ نہیں آئے گی۔ آخری آپشن کے طور پر ہمیں یہاں سے فرار ہونا پڑا تو ہم اس کی بھی کوشش کریں گے۔ یہ ہمارے پیچھے آئیں گے اور تمہاری جان چھوٹ جائے گی۔''

شامی نے اطمینان کا سانس لیا۔ ''تم کب تک فیصلہ کر لو گے؟''

''آج شام تک اور تم فکر مت کرو، یہ رات سے پہلے کوئی کارروائی نہیں کریں گے۔''

''رات تک کیوں؟''

''رات تک یہ یہاں کے باقی ہوٹلوں کو بھی اپنے قبضے میں کریں گے تاکہ کوئی باہر رابطہ نہ کر سکے۔''

''باہر رابطہ تو ویسے بھی ممکن نہیں ہے۔''

''کوئی خود سے تو جا سکتا ہے اب فائرنگ کے بعد بات کھل گئی ہے۔''

☆☆☆
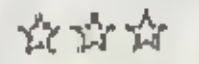
یاسر کا کہنا درست ثابت ہوا تھا۔ اس وقت سرباز کے آدمی باقی دو ہوٹلوں پر قبضہ کر رہے تھے وہاں مجموعی طور پر سات مسافر اور عملے کے آٹھ افراد تھے۔ ان سب کو درمیان والے ہوٹل میں جمع کیا گیا اور انہیں چند کمروں تک محدود کر دیا گیا تھا اور دو آدمی ان کی نگرانی کر رہے تھے۔ ضیاالدین کی ناکام کوشش کے نتیجے میں سرباز کا ایک ماہر نشانچی زخمی ہوا تھا اور اس کے دائیں بازو پر گولی لگی تھی۔ اس زخم کے نتیجے میں وہ بیکار ہو گیا تھا۔ ہوٹل کی طرف سے جس طرح مزاحمت ہوئی تھی، اس سے سرباز کے خدشات بڑھ گئے تھے۔ وہاں یقیناً یاسر اور اس کے آدمیوں کے علاوہ بھی کچھ لوگ تھے۔ اس کے زخمی آدمی نے بتایا تھا کہ اس پر فائرنگ کرنے والے دو نوجوان تھے جو یاسر اور اس کے آدمیوں سے بالکل مختلف تھے۔

سرباز سامنے والے ہوٹل میں موجود تھا اور پینے کے دوران میں ٹہلتے ہوئے وقفے وقفے سے کھڑکی سے مخالف سمت میں ہوٹل کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس کے آدمی پر فائرنگ کرنے والے یاسر کے آدمی تھے یا پھر ہوٹل میں پہلے سے موجود افراد تھے۔ پھر اس نے فیصلہ کیا کہ آج رات ہی کارروائی کرنی ہے۔ اس سے پہلے کہ بات باہر نکلے یا پھر کوئی اور مشکل کھڑی ہو جائے۔ اگر اسے یہاں موجود سب افراد کو قتل کرنا پڑتا تو وہ اس کے لیے بھی راضی تھا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو بلایا اور انہیں ہوٹل کے آس پاس دیکھنے کا حکم دیا کہ کہیں فرار کا کوئی اور راستہ نہ ہو لیکن ایک گھنٹے بعد اسے رپورٹ ملی کہ ہوٹل سے فرار کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ آمدورفت کے لیے صرف ایک ہی راستہ ہے۔

☆☆☆
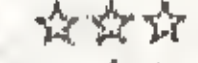
''یہاں سے نکلنے کا کوئی اور راستہ ہے؟'' شامی نے لنچ سے فارغ ہو کر سرفراز سے سوال کیا۔ اس نے بس پیٹ بھرا تھا جبکہ بھوک فوت ہونے کا اعلان کرنے کے باوجود جوجی نے ڈٹ کر کھایا تھا۔ شامی کے توجہ دلانے پر اس نے کہا۔

''بھوکے پیٹ مرنے سے کیا فائدہ، آدمی کھا پی کر مرے۔''

''شکر ہے تم مرنے کو تو تیار ہوئے۔'' شامی نے کہا۔

سرفراز جوان کی نوک جھونک سن کر مسکرا رہا تھا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہاں سے باہر جانے کا صرف ایک راستہ ہے۔''

''یہاں بائیں طرف جو ڈھلان ہے؟''

''اس سے صرف ماہر کوہ پیما ہی اتر سکتے ہیں وہ بھی رسی کی مدد سے۔'' سرفراز نے کہا۔ ''ابھی گرمیوں میں میں نے یہاں نئے سال کے عدد ترشوائے تھے۔ ایک منٹ، میں... اس کی تصاویر دکھاتا ہوں۔ ابھی تو برف پڑی ہے لیکن گرمیوں میں جب ان پر چمکیلا پینٹ کیا جائے گا تو یہ بہت دور سے نظر آئیں گے۔''

سرفراز ایک البم لے آیا جس میں چٹانوں کے ساتھ تراشے ہوئے دو ہزار پندرہ کے اعداد کی تصاویر تھیں۔ ان میں ایک تصویر میں ایک شخص بھی تھا۔ جو صرف نیکر اور ایک سرخ رنگ کی پھٹی ہوئی پورے آستین کی جرسی میں تھا۔ وہ زخمی اور خون خون ہو رہا تھا۔ شامی نے اس کا پوچھا۔ ''یہ کیا ہے، کوئی حادثہ ہوا تھا؟''

''ارے نہیں، جب میں نے چٹانیں ترشوائیں تو ایک واقف کار سیڈ یا ڈائریکٹر کو یہ لوکیشن پسند آئی اور اس نے اپنے ایڈ کا یہاں شوٹ کیا تھا، یہ اسی کی ایک تصویر ہے۔''

''کیا تم مجھے لوکیشن دکھا سکتے ہو؟'' شامی نے کہا تو سرفراز پریشان ہو گیا۔

''اس وقت باہر جانا خطرے سے خالی نہیں ہے۔''

یہ ہوٹل مغرب کی طرف تھا اور دو بجے ہی یہ اوپر موجود چٹانوں کے سائے میں آ گیا تھا جبکہ باقی تین ہوٹل اس وقت تیز دھوپ میں نہائے ہوئے تھے۔ شامی نے کہا۔ ''ہم آڑ میں جائیں گے اور اس وقت یہاں سایہ ہے، سامنے سے کوئی ہمیں اتنی آسانی سے نہیں دیکھ سکے گا۔''

بہ مشکل سرفراز باہر جانے پر آمادہ ہوا۔ وہ باہر نکلے اور فوراً ہی لان کی روش کے ساتھ لگے پودوں کی آڑ میں ہو گئے اگرچہ یہ آرائشی پودے اس وقت پتوں سے محروم تھے مگر ان کی ٹہنیاں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ سورج نکلا ہوا تھا مگر ساتھ ہی نہایت سرد برفیلی ہوا چل رہی تھی۔ وہ دونوں گرم کپڑوں میں بھی ٹھٹھر رہے تھے۔ وہ ہوٹل کی اس طرف والی دیوار کے ساتھ آئے دیوار مشکل سے چار فٹ اونچی تھی اور اس سے نیچے جھانکا جا سکتا تھا۔ شامی نے نیچے دیکھا تو تقریباً سو فٹ تک بالکل سیدھی پتھریلی دیوار تھی اور یہ سیدھی بھی نہیں تھی بلکہ اس میں جابجا بڑے بڑے پتھر باہر کو نکلے ہوئے تھے ایک ایسے ہی پتھر کو تراش کر دو ہزار پندرہ کے اعداد بنائے گئے تھے مگر یہ یہاں سے نظر نہیں آ رہے تھے۔

شامی نے ایک کوہ پیما کے نقطۂ نظر سے دیکھا تو اسے محسوس ہوا کہ یہ چٹانیں اتنی خطرناک نہیں ہیں جتنی کہ نظر آتی ہیں۔ اگر کوشش کی جائے تو یہاں سے نیچے اترا جا سکتا تھا مگر اسی لمحے اس نے دیکھا کہ دو مسلح افراد نیچے گھوم رہے تھے۔ ان کو دیکھتے ہی شامی اور سرفراز آڑ میں ہو گئے۔ سرفراز نے کہا۔ ''ان کو بھی اندازہ ہے کہ اس طرف سے اترنے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ وہ اس طرف کی نگرانی کر رہے ہیں۔''

''وہ اس لیے نگرانی نہیں کر رہے ہیں بلکہ یقینی بنا رہے ہیں کہ رات تک ہم یہیں ہوں گے جب وہ دھاوا بولیں گے۔''

سرفراز کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ ''یہ رات کو حملہ کریں گے؟''

''بالکل یہ تاریکی چھانے کا انتظار کر رہے ہیں۔'' شامی نے کہا۔ وہ واپس اندر آئے اور شامی نے یاسر کو باہر کی صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

''میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ وہ رات میں حملہ کریں گے۔''

''تم نے کیا سوچا؟''

''پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے جو جگہ دیکھی ہے، اس کے بارے میں کیا خیال ہے، نیچے اتر سکتے ہو؟''

''میں اور میرا کزن اتر سکتے ہیں۔'' شامی نے کہا۔

''صبر خان بھی اتر سکتا ہے۔'' یاسر بولا۔ ''میرے ذہن میں ایک خیال آ رہا ہے لیکن ابھی مجھے اس بارے میں اور سوچنے دو پھر میں بتاؤں گا۔''

شامی باہر آیا تو اس نے تیمور کو غائب پایا۔ صرف وہی نہیں رومین بھی غائب تھی۔ وہ دونوں اس وقت ہوٹل کی چھت پر تھے۔ یہاں برف صاف کر دی گئی تھی البتہ کونے کھدروں میں کچھ برف پڑی تھی۔ فراٹے کی ہوا چل رہی تھی اور وہ سروں پر ٹوپی اور کانوں پر مفلر لپیٹے ہوئے تھے۔ رومین تیمور کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ ''جب تم انگلینڈ جا سکتے ہو تو یہاں کیوں رکے ہو؟''

''شامی کی وجہ سے۔'' تیمور نے کہا۔ ''تمہیں اندازہ ہو گیا ہوگا کہ کزنز سے زیادہ دوست ہیں۔ وہ میرے بغیر اور میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔''

''یہ تو ابھی کی بات ہے۔'' رومین کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔ ''لیکن جب تمہاری شادی ہو گی تب تو تمہیں الگ ہونا پڑے گا۔''

''تب کی تب دیکھی جائے گی۔'' تیمور نے ٹالنے کے انداز میں کہا۔ اس نے محسوس کیا کہ رومین حالات سے زیادہ اس میں دلچسپی لے رہی تھی اور جب سے وہ واپس آئی تھی مستقل اس کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ اس کے ماں باپ کو بھی اس پر اعتراض نہیں تھا کہ وہ اس کے ساتھ اکثر تنہائی میں کیوں ہوتی ہے؟ جیسا کہ اس وقت بھی وہ یہاں اکیلے تھے۔ سورج تیزی سے ڈھل رہا تھا اور کچھ دیر میں اندھیرا ہو جاتا۔ تیمور نیچے جا کر شامی سے تازہ ترین صورتِ حال جاننا چاہتا تھا مگر رومین اس کی جان نہیں چھوڑ رہی تھی۔ اس وقت بھی وہ جانے کا سوچ رہا تھا کہ رومین نے دور برفانی ڈھلان کی طرف اشارہ کیا۔ ''کتنا حسین منظر ہے کاش آج ہم وہاں جا سکتے؟''

''فی الحال تم باہر موجود ان خطرناک لوگوں کے بارے میں سوچو جنہوں نے تمہاری گاڑی پر فائرنگ کی ہے۔''

رومین کانپ اٹھی اور اسی بہانے تیمور کے نزدیک آ گئی۔ ''شکر ہے تم لوگ تھے ورنہ نہ جانے ہمارا کیا ہوتا۔''

اس کی قربت سے تیمور کو اس موسم میں بھی گرمی سی لگنے لگی اور اس نے بہتر سمجھا کہ نیچے کا رخ کرے مگر اس سے پہلے کہ وہ رومین سے دور ہوتا شامی اوپر آ گیا۔ رومین جلدی

سے پیچھے ہٹی مگر شامی نے دیکھ لیا تھا۔ وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ”تو بھائی صاحب یہاں فطرت کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔“

تیمور جھینپ گیا اور روبین کا چہرہ بھی سرخ ہو گیا۔ تیمور نے جلدی سے کہا۔ ”وہ ہم نیچے کی نگرانی کر رہے تھے۔“

”اس طرف سے پیٹھ کر کے۔“ شامی سادگی سے بولا۔ ”بائی دی وے حالات اچھے نہیں ہیں۔ یاسر اور میرا بھی خیال ہے کہ وہ تاریکی چھانے کے بعد حملہ کریں گے۔“

”کون؟“ روبین گھبرا گئی۔

”وہی جنہوں نے تمہاری گاڑی پر فائر کیا تھا۔“ شامی نے کہا اور پلٹ گیا۔ تیمور اس کے پیچھے لپکا۔

”تب کیا سوچا تو نے؟“

”میں اسی لیے تمہیں تلاش کر رہا ہوں۔“ شامی نے کہا اور وہ نیچے آئے۔ شامی نے تیمور کو باہر لے جا کر ڈھلان دکھائی اور بتایا کہ یاسر کے ذہن میں اس حوالے سے کوئی پلان ہے۔

”کیا ہم اس پر اعتبار کر سکتے ہیں؟ ہے تو وہ بھی جرائم پیشہ۔“

”تو ٹھیک کہہ رہا ہے لیکن اس کے علاوہ ہمارے پاس راستہ کیا ہے۔ اس سے زبردستی نہیں کر سکتے، وہ اور اس کے ساتھی مسلح ہیں۔ ہم اکیلے بھی نہیں نکل سکتے۔ ضیا الدین اینڈ فیملی کی قسمت اچھی تھی کہ وہ بچ کر واپس آ گئے۔“

وہ یاسر کے پاس آئے۔ اس نے خون آلود شرٹ بدل لی تھی اور اب پتلون اور موٹی جرسی کے ساتھ جیکٹ میں تھا۔ اس نے دوسری بار اینٹی بایوٹک اور پین کلرز لی تھیں اور نتیجے میں اس کی حالت خاصی بہتر ہوئی تھی۔ شامی کے پاس طاقتور اینٹی بایوٹک تھیں اس نے وہی یاسر کو دی تھیں۔ شامی نے پوچھا۔ ”کچھ سوچا؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”ہاں میں نے سوچ لیا ہے تاریکی چھانے کے بعد ہم یہاں سے نکلیں گے اور لازمی بات ہے کہ یہ ہمارا پیچھا کریں گے۔ جب یہ ہمارے پیچھے نکلیں تو تم لوگ محفوظ ہو جاؤ گے۔ اگر ایک دو بندے پیچھے رہ جائیں تو تم ان سے نمٹ لینا۔“

شامی اور تیمور خوش ہو گئے۔ وہ بھی یہی چاہتے تھے کہ یہ لوگ یہاں سے نکل جائیں تو باقی سب کی بچت ہو جائے۔ پھر شامی کو خیال آیا۔ ”تمہارا کیا ہوگا؟ کیا تم لوگ اتنے آدمیوں سے نمٹ لو گے؟“

یاسر پھیکے انداز میں مسکرایا۔ ”ہمارا مقدر... جس قسم کے کام کرتے ہیں، اس میں ایسا ہی ہوتا ہے یا تو آدمی پار ہو جاتا ہے یا پھر اس کے وارے نیارے ہو جاتے ہیں۔ جب میں نے یہ کام کیا تو دونوں باتوں کا سوچ لیا تھا۔“

نہ جانے کیوں شامی کا دل بوجھل ہو گیا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کوئی بالکل اجنبی شخص جو آپ کی فطرت اور طبقے سے بالکل الگ ہوتا ہے، آپ کے دل کو بھا جاتا ہے۔ یاسر بھی ایسا ہی شخص تھا۔ وہ مجرم تھا اور اس وقت بھی جرم کر کے بھاگا تھا۔ اس کے باوجود شامی اس کے لیے دل میں ہمدردی محسوس کر رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ اس کا اور اس کے ساتھیوں کا رقم سمیت یہاں سے چلے جانا ہی بہتر تھا تاکہ دوسرے محفوظ رہیں۔ یاسر نے اپنے ساتھیوں کو بلا لیا تھا اور انہیں تیار ہونے کا حکم دیا۔ وہ فکر مند ہو گئے تھے۔ صبر خان نے کہا۔ ”باہر دشمن بہت زیادہ ہیں۔“

”لیکن ہم ہمیشہ کے لیے یہاں نہیں رک سکتے۔“ یاسر بولا۔ ”ہمیں نکلنا ہے اور اس کے لیے بس آج رات کا وقت ہے۔“

”جیسا حکم خان۔“ صبر خان بولا۔ میر گل خاموش تھا، وہ حکم کی تعمیل کرنے والا شخص تھا۔ ”کب نکلنا ہے؟“

”کسی وقت بھی۔“ یاسر نے کہا اور سیف کی طرف بڑھا۔ اس نے اس کا نمبر ملا کر کھولا اور اندر سے تھیلے باہر نکالنے کو کہا۔ صبر خان اور میر گل نے تھیلے باہر نکال لیے۔ شامی اور تیمور حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ شامی نے پوچھا۔

”کیا کسی بینک میں ڈاکا مارا ہے؟“

یاسر مسکرایا۔ ”ڈاکا تو بینک میں مارا ہے لیکن رقم بینک کی نہیں ہے۔“

وہ حیران ہوئے۔ ”کیا مطلب؟“

”اس میں ایک منشیات فروش کی کالی کمائی تھی۔ ڈالرز کی صورت میں۔“

”تب اس کا تعلق پڑوسی ملک سے ہوگا؟“ شامی نے بے ساختہ کہا۔

”تم نے ٹھیک پہچانا۔“ یاسر بولا۔ ”خود میرا تعلق بھی پڑوسی ملک سے ہی ہے۔“

”مجھے پہلے ہی شبہ تھا۔“ تیمور بولا۔ ”جب تم آپس میں اپنی زبان میں بات کرتے تو تمہارا لہجہ مختلف ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں یہ زبان بولنے والے ذرا دوسری طرح بولتے ہیں۔“

”میں اسی سردار کے ایک معمولی کارندے کے طور پر کام کرتا تھا اور جس بینک سے یہ رقم نکالی ہے وہاں کئی بار میں خود رقم جمع کرانے آیا تھا۔“

”بینک والوں نے تمہیں پہچان لیا ہوگا؟“

”نہیں... میں نے اور میرے ساتھیوں نے نقاب پہنے ہوئے تھے۔“

”آواز سے۔“ شامی بولا۔ ”کیا تم نے وہاں بات کی تھی؟“

”ہاں میں ہی بات کر رہا تھا۔“

”بس تو آواز سے تمہارے بارے میں جان لیا اور یہ مصیبت تمہارے پیچھے لگ گئی۔“

یاسر نے سوچا اور سر ہلایا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں نے آواز کا خیال نہیں رکھا تھا۔ میں بہت بار وہاں گیا اور منیجر سے بات کی تھی اسی نے مجھے شناخت کیا ہوگا۔“

تیمور تھیلے دیکھ کر اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس میں کتنی رقم ہے۔ اس نے کہا۔ ”میرا خیال ہے یہ پچاس لاکھ ڈالرز سے زیادہ کی رقم ہے۔“

”ایک کروڑ ڈالرز۔“ یاسر نے تصحیح کی۔ ”کم سے کم۔“

وہ حیران ہوئے۔ ”یہ تو بہت زیادہ رقم ہے۔“

”بالکل اسی لیے تو میں نے اور ان دونوں نے اتنا بڑا چانس لیا ورنہ یہ جس شخص کی رقم ہے وہ جرم کی دنیا کا مگرمچھ نہیں بلکہ ڈائناسور ہے۔“

”اب وہ جان گیا ہے کہ رقم تم نے چرائی ہے تو تم اگر یہاں سے نکل بھی گئے تب بھی وہ تمہارا پیچھا تو کرے گا۔“

”ہاں یہ تو ہے لیکن فوری مسئلہ یہاں سے نکلنے کا ہے۔“

”سنو تم ایسے نہیں جا سکتے۔ یقین کرو اس صورت میں تم اس وادی سے باہر بھی نہیں جا سکو گے۔“ شامی نے کہا تو یاسر نے پوچھا۔

”پھر کیا کرنا ہے؟“

”کچھ ایسا کرنا ہوگا کہ وہ... تمہارا پیچھا کرنے سے باز رہیں۔“ شامی نے سوچتے ہوئے کہا۔

”وہ بہر صورت ہمارے پیچھے آئیں گے۔“ یاسر نے کہا۔ ”دوسرے اگر وہ ہمارے پیچھے نہ آسکے تو لازمی یہاں آئیں گے۔“

”یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ تیمور نے کہا۔ ”یہ اسی لیے یہاں سے جا رہا ہے کہ ہم محفوظ رہیں۔ ان سب کا یہاں سے نکل جانا ضروری ہے۔“

شامی کچھ سوچ رہا تھا۔ اس نے سرفراز سے کہا۔ ”ہوٹل میں یقیناً مرمت کا کچھ سامان اور ٹولز ہوں گے؟“

”بالکل، اس کی یہاں ضرورت ہوتی ہے۔“

اسٹور چھت پر تھا۔ سرفراز، شامی کو وہاں لایا۔ اس نے سب سے پہلے لکڑی دیکھی اور اسے مطلب کی لکڑی مل گئی، یہ ایک انچ قطر کی گول اور لمبی لکڑی تھی۔ شامی نے دو انچ لمبی اسٹیل کی کیلیں لیں۔ ایک ہتھوڑی اور آری لی۔ وہ نیچے آئے۔ شامی نے پہلے لکڑی کو آری سے چار چار انچ کے ٹکڑوں میں تقسیم کیا اور پھر ان میں اس طرح کیلیں ٹھونکیں کہ وہ اس کے چاروں طرف سے نکل آئیں۔ تیمور دیکھ رہا تھا، وہ سمجھ گیا اور بولا۔ ”ٹائر کلرز۔“

”بالکل پیچھا کرنے والے کو بعض رکھنے کا سب سے آسان طریقہ۔“

”لیکن ضروری نہیں ہے کہ ہم کامیاب بھی ہوں۔“

”ضرور ہوں گے۔“ شامی نے کہا۔ ”اب ہمیں ایک کام اور کرنا ہوگا۔“

”وہ کیا؟“

”باہر موجود گاڑیوں کو ناکارہ بنانا ہوگا، صرف ایک گاڑی ٹھیک رہے جس میں یہ یہاں سے ان کا پیچھا کر سکیں۔“

”تمہارا دماغ درست ہے، گاڑیاں کون ناکارہ کرے گا؟“

”میں اور میرے ساتھ صبر خان جائے گا۔ ہم چٹانوں سے اتر سکتے ہیں۔“

”چٹانوں سے کیسے اترو گے؟“

”تم بھول رہے ہو ہمارے پاس کوہ پیمائی کا مکمل سامان ہے اس کے ہوتے ہوئے یہ چٹان تو حلوہ ہیں۔“

تیمور خاموش ہو گیا مگر وہ مطمئن نہیں تھا پھر اس نے کہا۔ ”میں بھی چلوں گا۔“

”نہیں یہاں کسی کا ہونا ضروری ہے۔“ شامی نے انکار کیا۔

باہر اندھیرا چھا چکا تھا اور شامی جانے کی تیاری کرنے لگا اس نے سیاہ لباس پہنا۔ یہ سیاہ گرم ٹراؤزر اور سیاہ ہائی نیک جرسی پر مشتمل تھا، سر پہ سیاہ ٹوپی تھی۔ پاؤں میں سیاہ جوتے پہن کر وہ سرتاپا سیاہ پوش ہو گیا بس اس کا گورا منہ جھلک رہا تھا۔ شرمین نے سنا تو دوڑی آئی۔ ”تم باہر جا رہے ہو؟“

"ہاں۔"

"مگر کیوں؟" وہ بے چین اور رونے والی ہو گئی۔

"وہ لوگ بہت خطرناک ہیں۔"

شامی نے اس کی طرف دیکھا۔ "میں جانتا ہوں لیکن تم اور تمہاری فیملی سمیت یہاں بہت سے عام لوگ ہیں۔ ان کو بچانے کے لیے یہ سب ضروری ہے۔"

"ہم یہاں محفوظ ہیں۔"

"بالکل محفوظ نہیں ہیں۔ دیکھو یہ جرائم پیشہ ہیں لیکن ہماری خاطر یہاں سے نکلنے پر آمادہ ہیں۔ حالانکہ باہر موجود ان کی جان کے دشمن ہیں۔ مجھے شرم آ رہی ہے کہ یہ ہمارا خیال کر رہے ہیں اور میں صرف اپنے مفاد میں انہیں موت کے منہ میں جاتا دیکھوں۔"

"لیکن تم عام آدمی ہو۔"

"میں عام آدمی ہی تو نہیں ہوں۔" شامی نے کہا۔ "تمہیں کیا پتا اس سے پہلے ایسے کتنے ہی کھیل دیکھ چکا ہوں اور خود بھی اس میں حصہ لے چکا ہوں۔"

"تم یہ سب کیسے کرو گے؟"

"بس دیکھتی جاؤ۔"

صبر خان پہلے ہی سیاہ پوش تھا۔ انہوں نے کوہ پیمائی میں استعمال ہونے والی بیلٹ اور کلپس باندھے اور اپنی رسیاں ان سے منسلک کیں۔ اوپر رسیاں دیوار کے ساتھ لگے درختوں کے تنوں سے باندھی گئی تھیں۔ شامی نے زیادہ افراد کو باہر آنے سے منع کر دیا تھا اور احتیاطاً ہوٹلز کی بجلی لائٹس بھی بند کروا دی تھیں۔ پہلے شامی نیچے گیا، اس کے پاس ایک پستول اور شاٹ گن تھی جو اس کی کمر سے لگی تھی۔ پستول سامنے بیلٹ میں تھا۔ صبر خان خودکار رائفل سے مسلح تھا۔ رسے اور کلپس کی مدد سے سچ مچ چٹانیں بہت آسان ثابت ہوئیں اور وہ پانچ منٹ میں نیچے پہنچ گئے تھے۔ رسی سے آزاد ہو کر شامی نے صبر خان سے کہا۔ "ہمیں پہلے ان دو ہوٹلوں تک جانا ہے اور وہاں موجود گاڑیوں کو ناکارہ کرنا ہے۔"

"کیسے؟"

"آؤ میں بتاتا ہوں۔" شامی نے کہا۔ وہ درختوں اور پتھروں کی آڑ لیتے ہوئے پہلے سڑک تک آئے اور اسے ایک تاریک گوشے سے عبور کر کے وہ دوسری طرف آ گئے۔ یہاں بھی درخت تھے جن کی آڑ میں انہیں اوپر ہوٹلوں تک پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ آخری ہوٹل خالی تھا وہاں صرف ایک آلٹو کار کھڑی تھی اور اس کا بونٹ کھول کر اندر سے ڈسٹری بیوٹر کی کیپ اتاری ساتھ ہی تاریں بھی کھینچ لیں۔ اس نے صبر خان سے کہا۔ "اب یہ ناکارہ ہو گئی ہے کسی صورت اسٹارٹ نہیں ہو گی۔"

"میں سمجھ گیا۔" صبر خان بولا۔

یہاں کوئی نہیں تھا اس لیے انہیں دشواری پیش نہیں آئی مگر دوسرے ہوٹل میں برفانی اور سرباز کے آدمی موجود تھے اور اتفاق سے وہ سامنے والے حصے میں تھے اس لیے شامی نے فیصلہ کیا کہ وہ خود جائے گا۔ اس نے صبر خان کو ایک جگہ چھوڑا اور خود زمین سے تقریباً لگ کر پارکنگ میں کھڑی ہوئی تین گاڑیوں تک پہنچا۔ یہ سب ہوٹلوں اور مسافروں کی تھیں۔ ایک گاڑی کا بونٹ آرام سے کھل گیا اور شامی نے اس کے ساتھ بھی وہی کارروائی کی۔ دوسری دو گاڑیوں کے ساتھ اس نے الگ کام کیا۔ اس نے ان کے چاروں ٹائروں سے ہوا نکال دی۔ اگرچہ اس میں خاصا وقت لگا تھا مگر اس نے صبر سے کام لے کر اسے مکمل کر ہی لیا۔ صبر خان اس کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ وہاں سے تیسرے ہوٹل کی طرف بڑھے جہاں سرباز اور اس کے بیشتر آدمی موجود تھے۔ وہاں دو گاڑیاں تھیں ایک بڑی جیپ جس میں سرباز کے دوسرے آدمی آئے تھے اور دوسری ہوٹل کی ہڈ والی چھوٹی جیپ۔ جب وہ وہاں پہنچے تو پارکنگ میں سرباز اور اس کے ساتھی موجود تھے اور وہ پوری طرح اسلحہ بدست تھے۔ ان کی تیاریوں سے لگ رہا تھا کہ وہ کہیں جا رہے تھے۔ شامی چونکا، اس نے صبر خان سے کہا۔

"خطرہ، یہ لوگ ہوٹل کی طرف جا رہے ہیں۔"

"تم کو کیسے پتا؟"

"تو اور کہاں جانا ہے انہوں نے۔" شامی بولا۔

"واپس چلو۔"

"ادھر چٹانوں سے۔" وہ فکر مند ہو گیا۔ "اترنا آسان تھا چڑھنا مشکل ہو گا۔"

"بالکل مشکل نہیں ہو گا۔ تم کلپ کی مدد سے رسی ٹائٹ کرتے ہوئے آرام سے اوپر چڑھ سکو گے، سامنے سے جانا بہت خطرناک ہے سارا راستہ ان لوگوں کے نشانے پر ہے۔"

بات صبر خان کی سمجھ میں آ گئی اور وہ بادلِ ناخواستہ راضی ہوا۔ وہ واپس روانہ ہوئے اور درختوں سے ہوتے ہوئے چٹانوں تک آئے۔ اس وقت سامنے والے ہوٹل سے ہڈ والی جیپ نکل کر سڑک پر آئی تھی۔ شامی نے رسی کو کلپ سے لگاتے ہوئے صبر خان سے کہا۔ "جلدی کرنا ہو گا

ورنہ وہ اوپر پہنچ جائیں گے۔"

"میں تیار ہوں۔" صبر خان نے رسی اپنے کلپ سے لگائی اور وہ دونوں اوپر چڑھنے لگے۔

☆☆☆

یاسر اوپری منزل پر کھڑکی سے لگا ہوا اور آنکھوں سے دوربین لگائے ہوئے شامی اور صبر خان کی کارروائی دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے دوربین کا رخ سامنے والے ہوٹل کی طرف کیا تو چونکا۔ وہاں پر سرباز اپنے آدمیوں سمیت باہر آ گیا تھا اور وہ سب پوری طرح مسلح تھے۔ سرباز خالص کوہستانی نقوش اور وحشی چہرے والا شخص تھا۔ جب وہ کسی پریشانی میں ہوتا تو اس کے دانت نمایاں ہو جاتے تھے اس وقت بھی وہ بلاوجہ دانتوں کی نمائش کر رہا تھا۔ یاسر نے پاس موجود تیمور سے کہا۔ "میرا خیال ہے وہ اس طرف آ رہے ہیں۔"

"یعنی پہلے گھوڑا پھونک مارنے جا رہا ہے۔" تیمور بولا۔

"کیا مطلب؟"

حالات کی سنگینی کے باوجود تیمور نے اسے قصہ سنایا جس میں مالک گھوڑے کو نلکی میں دوائی ڈال کر پلا رہا ہوتا ہے اور گھوڑا پہلے پھونک مار دیتا ہے۔ یاسر مسکرایا۔ "ایسا ہی قصہ ہمارے علاقے میں زدو (گائے اور یاک کے ملاپ سے پیدا ہونے والا جانور) کے بارے میں مشہور ہے۔"

وہ نیچے آئے اور ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا۔ ضیاالدین کی بیگم، لڑکیوں اور لڑکوں کو ایک اندرونی کمرے میں بھیج دیا گیا تھا۔ حیرت انگیز طور پر جوجی نے اندر جانے سے انکار کر دیا۔ "میں آپ لوگوں کے ساتھ رہوں گا۔" اس نے کہا۔

سب میں اسلحہ تقسیم کر دیا گیا تھا۔ سرفراز، اس کے دو ملازمین، ضیا، سمیر گل، تیمور اور یاسر ملا کر کل سات افراد تھے۔ یہ تعداد تسلی بخش تھی مگر ان کے پاس اسلحہ زیادہ نہیں تھا۔ دو خودکار رائفلیں تھیں جن میں سے ایک صبر خان کے پاس تھی۔ ایک رائفل یہاں سمیر گل کے پاس تھی۔ اس کے علاوہ دو سنگل شاٹ رائفلیں اور باقی پستول تھے۔ ایک رائفل تیمور نے لے لی اور دوسری سرفراز کے پاس تھی۔ اس نے کہا۔ "اندھا دھند فائرنگ نہیں کرنی ہے کیونکہ ایمونیشن محدود ہے۔ یہ ختم ہو گیا تو وہ آسانی سے اندر گھس آئیں گے۔"

اسی لمحے ہوٹل کی طرف آنے والے راستے پر روشنی لہرائی تھی۔ وہ سب مختلف آڑ میں ہو گئے۔ تیمور اور سمیر گل لان کے سامنے کی طرف والے ایک کمرے میں آئے اور یہاں کھڑکی کے دونوں طرف پوزیشن سنبھال لی۔ یہ جگہ گیٹ کے بالکل سامنے پڑتی تھی اور یہاں سے وہ آنے والوں سے بہتر طور پر نمٹ سکتے تھے۔ گیٹ پر نمودار ہونے والی روشنی بہت تیز تھی اور وہ بہت تیزی سے گیٹ تک آئی تھی۔ ایک دھماکا ہوا اور گیٹ اکھڑ کر اندر آ گرا۔ ہڈ والی جیپ دندناتی ہوئی اندر آئی مگر وہ رکی نہیں بلکہ دوڑتی ہوئی سیدھی ہوٹل کی عمارت کی طرف آئی۔ برف کو روندتے اور خشک جھاڑیوں کو کچلتے ہوئے وہ دیوار سے ٹکرائی تو اس کی رفتار نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ سمیر گل فائر کرنے جا رہا تھا کہ تیمور نے اسے روک دیا۔ "جیپ خالی ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"اگر کوئی اسٹیئرنگ پر ہوتا تو جیپ اس طرح دوڑتی ہوئی دیوار سے نہ ٹکراتی۔"

اسی لمحے ٹوٹے دروازے کی طرف سے پہلا فائر ہوا۔ اس کا نشانہ لاؤنج کے شیشے کا دروازہ تھا۔ چھناکے کی آواز کے ساتھ شیشہ بکھر گیا۔ تیمور نے شعلوں کی رہنمائی میں جوابی فائر کیا اور اس کے بعد گولیوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ فائرنگ کرنے والے کم سے کم نصف درجن افراد تھے۔ ان کا نشانہ بیک وقت یہ کھڑکی بھی تھی اور لاؤنج بھی۔ چند لمحے بعد جب فائرنگ کی شدت کم ہوئی تو سمیر گل نے رائفل باہر نکال کر گرے گیٹ کی طرف برسٹ مارا۔ اس برسٹ نے کام کیا کیونکہ ایک چیخ سنائی دی تھی۔ تیمور نے کہا۔ "تم نے کام کر دیا۔"

حملہ آور اب دیوار کے ساتھ ساتھ پھیل رہے تھے اور اس کے پیچھے رہ کر ہوٹل کی طرف فائرنگ کر رہے تھے ان کا خصوصی نشانہ لاؤنج تھا۔ وہاں شیشے کی ہر چیز ٹوٹ گئی تھی۔ لاؤنج کی طرف سے بھی جواب دیا جا رہا تھا مگر وہاں معمولی ہتھیار تھے۔ تیمور نے رائفل کا رخ دیوار کی طرف کیا۔ وہاں سے کوئی رہ رہ کر لاؤنج کی طرف برسٹ مار رہا تھا۔ جب شعلے چمکتے تو اسے اس شخص کا ہیولا دکھائی دیتا تھا۔ تیمور نے سانس روکی اور ایک بار اس طرف سے برسٹ چلا تو اس نے فائر کیا اور برسٹ کا رخ اوپر کی طرف گیا اور وہ شخص پیچھے گرا تھا۔ سمیر گل ہنسا۔ "ایک تم نے بھی گرا دیا۔"

اپنے دو آدمی مارے جانے پر ان لوگوں نے پاگلوں کی طرح فائرنگ شروع کر دی۔ گولیاں اتنے تواتر سے آ رہی تھیں کہ انہیں جواب دینے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔

تیمور اور تیمر گل دیوار کی آڑ میں دبکے ہوئے تھے۔ لاؤنج کا حال اس سے بھی برا تھا۔ سامنے کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جو گولیوں سے بچاتی اس لیے مجبوراً وہ استقبالیہ کاؤنٹر کے عقب میں آگئے۔ یہ پختہ کنکریٹ کا بنا ہوا تھا اور اس پر ٹائلز لگے تھے جو گولیوں سے بچا رہے تھے۔ صرف یاسر سب سے آگے ایک ستون کی آڑ میں تھا۔ یہ دو فٹ موٹا ستون اسے گولیوں سے تحفظ دے رہا تھا۔ وہ خود کو خطرے میں ڈالے ہوئے تھا مگر یہ ضروری تھا ورنہ وہ دروازے تک آسکتے تھے۔ یاسر کو یقین تھا کہ اب وہ دیوار پھلانگ کر اندر آئیں گے۔ کیونکہ وہ فائرنگ کرتے ہوئے دیوار کے ساتھ ساتھ پھیل گئے تھے۔ اس طرف کی عمارت اور دیوار کے درمیان تھوڑی سی جگہ تھی اور وہ وہاں سے اندر آسکتے تھے۔ یاسر نے مڑ کر کاؤنٹر کی طرف دیکھا اور سرفراز کو اشارہ کیا کہ وہ اس طرف جا رہا ہے۔ وہ سامنے کا خیال رکھے۔ سرفراز نے سر ہلایا۔

فائرنگ میں جیسے ہی وقفہ آیا، یاسر تیزی سے ڈائننگ روم کی طرف بھاگا۔ عقب سے فائر ہوئے مگر وہ محفوظ رہا تھا۔ ڈائننگ روم سے گزرتے ہوئے وہ سیڑھیوں سے آگے راہداری میں آیا جہاں دونوں طرف کمرے تھے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ کسی کمرے کی کھڑکی اس طرف کھل رہی تھی یا نہیں مگر اسے راہداری کے آخری سرے پر ہی کھڑکی نظر آگئی۔ یہ ٹھیک اسی مختصر سے حصے میں کھل رہی تھی جس کے بارے میں یاسر کو خدشہ تھا کہ سرباز کے آدمی وہاں سے نہ گھس آئیں۔ اس نے کھڑکی سے پردہ سرکا کر باہر دیکھا اور فوراً ہی اسے تاریکی میں ایک ہیولا دیوار پر نظر آیا۔ یاسر نے شیشے کے عقب سے پستول کا رخ اس کی طرف کر کے لگاتار تین گولیاں چلائیں اور ہیولا جھٹکے سے واپس گیا اور غائب ہو گیا۔ فائر کرتے ہی یاسر آڑ میں ہو گیا اور اسی وجہ سے بچا بھی تھا ورنہ باہر سے آنے والے برسٹ نے پوری کھڑکی چھلنی کر دی تھی۔

☆☆☆

سرباز غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ پہلے اس کا ایک اچھا نشانے باز زخمی ہوا اور وہ ہوٹل میں موجود تھا۔ اس کے علاوہ اس کے پاس آٹھ آدمی اور تھے۔ ان میں سے دو یرغمالیوں کی نگرانی کر رہے تھے اور وہ یہاں چھ افراد کے ساتھ آیا تھا۔ اس کے ایک آدمی نے جیپ دوڑا کر خود اس سے چھلانگ لگا دی اور جیپ نے گیٹ توڑ دیا۔ یہاں سرباز نے چالاکی سے کام لیا تھا۔ جیپ کے عقبی حصے میں اس کے دو آدمی چھپے ہوئے تھے اور اب وہ ہوٹل کی عمارت کی دیوار کے ساتھ ساتھ لگے آگے بڑھ رہے تھے۔ باہر سرباز کے ساتھ چار آدمی تھے اور ان میں سے تین مارے جا چکے تھے۔ اب وہ باہر صرف ایک آدمی کے ساتھ تھا۔ وہ دیوار کی مختلف پوزیشنوں سے فائرنگ کر کے یہ تاثر دے رہا تھا کہ حملہ آور زیادہ ہیں۔ مگر اس کی یہ حکمت عملی زیادہ کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ اندر والے کامیابی سے اپنا دفاع کر رہے تھے۔ اس کے ساتھ کا تیسرا آدمی اندر گھستے ہوئے مارا گیا اور اس بار سرباز غصے سے پاگل ہو گیا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اندر گھس کر ان لوگوں کو اپنے ہاتھ سے قتل کر دے۔ اب اس کی ساری امیدیں ان دو افراد سے تھیں جو آگے بڑھ رہے تھے۔ وہ اس کھڑکی سے کچھ دور تھے جس سے مزاحمت کی جا رہی تھی اور وہیں سے ہونے والی فائرنگ سے سرباز کا ایک آدمی گیٹ پر مارا گیا تھا۔ پھر وہ اس کھڑکی تک پہنچے اور انہوں نے پہلے دائیں بائیں پوزیشن سنبھالی اور پھر بیک وقت اپنی رائفلیں اوپر کر کے اندر کی طرف برسٹ مارے تھے۔ وہ تال گھما کر اس طرح فائرنگ کر رہے تھے کہ اندر موجود کوئی فرد بچ نہ سکے۔

☆☆☆

شامی تیزی سے رسی کو کھینچتے ہوئے اوپر کی طرف جا رہا تھا۔ صبر خان اس سے کچھ نیچے تھا۔ ابھی وہ نصف راستے میں تھے کہ اوپر سے پہلے ایک دھماکے اور پھر تیز فائرنگ کی آواز آنے لگی۔ شامی کا دل ایک لمحے کو رکا پھر وہ تیزی سے اوپر جانے لگا۔ سرباز اور اس کے آدمی توقع سے زیادہ تیزی سے حرکت میں آئے تھے۔ شامی دھماکے کی نوعیت سمجھنے سے قاصر تھا کیونکہ یہ بم کا دھماکا نہیں لگ رہا تھا۔ اس میں کچھ آہنی جھنکار بھی شامل ہوئی تھی۔ اوپر جاتے ہوئے وہ رسی کھینچ رہے تھے اس لیے رفتار وہ نہیں تھی جو نیچے آتے ہوئے تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ انہیں رسی کو پکڑنا نہیں پڑ رہا تھا اور ان کے ہاتھ خود کو اوپر کھینچنے کے لیے آزاد تھے۔ انہیں اوپر پہنچنے میں چند منٹ لگے تھے مگر شامی نے عجلت سے گریز کیا۔ اس نے سب سے پہلے جھانک کر دیکھا تو اسے نزدیک ہی بڑ والی جیپ ہوٹل کی عمارت سے ٹکی نظر آئی اور ہوٹل کا گیٹ گرا ہوا تھا۔ دھماکا اس کے گیٹ سے ٹکرانے سے ہوا تھا۔ جیپ کی وجہ سے وہ دیوار سے چپک کر آگے بڑھتے آدمیوں کو دیکھنے سے قاصر تھا۔ ہوٹل کی چار دیواری کے عقب سے رہ رہ کر شعلے چمک رہے تھے اور ان کا ہدف لاؤنج اور ایک کمرے کی کھڑکی تھی۔ شامی نے صبر خان کے

اوپر تک آنے کا انتظار کیا اور جب وہ بھی دیوار تک پہنچ گیا تو شامی نے آہستہ سے کہا۔

’’مجھے کور دینا۔‘‘

صبر خان نے رائفل سنبھالی تو شامی اوپر چڑھا اور اندر کود گیا تب اس نے دیوار کے ساتھ موجود افراد کو آگے بڑھتے دیکھا۔ شامی نے درخت کی آڑ میں پوزیشن سنبھالی اور صبر خان کو اوپر آنے کو کہا۔ وہ دیوار پر چڑھ کر اندر آ گیا۔ اسی لمحے دیوار کے ساتھ ساتھ جانے والے افراد نے اچانک ایک کھڑکی پر اپنی رائفلیں بلند کیں اور اندر گولیاں برسانے لگے جہاں سے مزاحمت کی جا رہی تھی۔ ایک چیخ سنائی دی اور شامی کا دل حلق میں آ گیا اسے لگا جیسے آواز تیمور کی ہو۔ اس نے اور صبر خان نے بیک وقت ان دو افراد کو نشانہ بنایا تھا۔ مگر اس سے پہلے وہ اندر پورا برسٹ چلا چکے تھے۔ نہ جانے کس کی گولیاں انہیں لگی تھیں مگر وہ دونوں گر گئے۔

☆☆☆

تیمور اور سمیر گل محسوس کر رہے تھے کہ اب سامنے کی طرف سے مزاحمت کم ہو گئی تھی۔ تیمور نے سمیر گل سے کہا۔

’’میں لاؤنج کی طرف دیکھ کر آتا ہوں تم ہوشیار رہنا۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔‘‘ اس نے سر ہلایا۔ تیمور باہر نکلا اور لاؤنج کی طرف بڑھا۔ اس نے لاؤنج میں جھانکا تو اسے سامنے کوئی نظر نہیں آیا، اس نے آہستہ سے آواز دی تو سیڑھیوں کے دوسری طرف واقع کاؤنٹر سے سرفراز کا جواب آیا۔

’’ابھی تو ٹھیک ہے، یاسر دوسری طرف گیا ہے اور اب اس طرف سے بھی فائرنگ کی آواز آئی تھی۔‘‘

’’ہم نے دو حملہ آور مار گرائے ہیں۔‘‘

اسی لمحے یاسر لاؤنج میں دوسری طرف سے نمودار ہوا اور اس نے انگلیوں سے وکٹری کا نشان بنایا تھا۔ اچانک تیمور کو کمرے کی طرف سے شدید فائرنگ سنائی دی۔ اس میں ایک چیخ بھی شامل تھی۔ تیمور واپس پلٹا اور کمرے کی طرف بھاگا۔ اندر گھستے ہی اس نے دیکھا کہ سمیر گل اپنے خون میں لت پت پڑا ہوا تھا۔ اسے بے شمار گولیاں لگی تھیں اور وہ شاید فوراً ہی مر گیا تھا۔ تیمور نے اس کی خودکار رائفل اٹھائی اور احتیاط سے کھڑکی سے باہر جھانکا تو اسے دو افراد نیچے پڑے دکھائی دیے، وہ حیران ہوا کہ انہیں کس نے نشانہ بنایا ہے۔ پھر اسے شامی اور صبر خان کا خیال آیا۔ وہ یقیناً آ گئے تھے مگر وہ لاؤنج کی طرف آتے تو چار دیواری کے پیچھے موجود افراد کا آسان نشانہ بن جاتے۔ تیمور آخری کمرے کی طرف بھاگا اور اس کی کھڑکی سے باہر جھانکا تو اسے شامی اور صبر خان نظر آ گئے۔ اس نے آواز دی۔

’’شامی... ادھر۔‘‘

شامی اس کی طرف آیا اور مسرت سے بولا۔ ’’تو ٹھیک ہے چیخ سن کر مجھے لگا تیری آواز تھی۔‘‘

’’نہیں یار سمیر گل تھا، وہ مارا گیا۔‘‘ تیمور نے افسوس سے کہا۔ ’’لیکن یہاں سے نکلنا مت... ابھی خطرہ ہے۔‘‘

’’اسی لیے میں یہاں رکا نہیں آنے میں بس ایک منٹ کی دیر ہوئی ورنہ...‘‘ اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر افسوس سے سر ہلایا۔

’’نہیں وہ۔‘‘ تیمور نے کہا۔ ’’ان لوگوں کو نقصان ہوا ہے اور اس کے بعد یہ پاگل ہو رہے ہیں۔‘‘

تیمور واپس آیا تو یاسر لاؤنج میں ستون کی آڑ میں اپنی جگہ سنبھال چکا تھا۔ دوسری طرف اب خاموشی تھی۔ تیمور نے اس سے صورت حال کا پوچھا تو اس نے کہا۔ ’’وہ پیچھے کی طرف سے گھسنے کی کوشش کر رہے تھے، میں نے ایک کو مار گرایا۔ یہاں کیا ہوا ہے؟‘‘

’’جیپ کے ساتھ دو بندے اندر آئے تھے۔‘‘ تیمور نے کہا اور پھر اسے سمیر گل کے بارے میں بتایا تو یاسر ایک لمحے کو شاک رہ گیا تھا۔

’’میرے خدا اس کے دو چھوٹے بچے ہیں۔‘‘

’’میں اوپر جا رہا ہوں وہاں سے باہر کا جائزہ لیتا ہوں۔ سرفراز باہر کی تمام لائٹس آن کر دو۔‘‘

تیمور اوپر آیا اور اس نے چھت سے دوربین لگا کر نیچے دیکھا۔ ہوٹل کی تمام بیرونی روشنیاں جلا دی گئی تھیں اور اسے چار دیواری کے آس پاس کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے نیچے سڑک اور سامنے ہوٹل کا معائنہ کیا تو اسے دو آدمی ہوٹل میں داخل ہوتے دکھائی دیے۔ اس نے اوپر سے شامی کو آواز دی۔ ’’راستہ صاف ہے اندر آ جاؤ دشمن پسپا ہو کر واپس چلا گیا ہے۔‘‘

شامی اور صبر خان اندر آ گئے۔ تیمور کچھ دیر اور اوپر سے باہر کا معائنہ کرتا رہا۔ وہ نیچے آیا تو یاسر نکلنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اپنے ایک ساتھی کی موت پر اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ اس مارا ماری نے وہاں موجود سب ہی افراد کو افسردہ کیا تھا مگر یاسر سب سے زیادہ دکھی لگ رہا تھا۔ تیمور نے اسے رپورٹ دی۔ ’’وہ پسپا ہو کر ہوٹل تک جا چکے ہیں۔ صرف دو آدمی تھے۔‘‘

’’شاید دو تین پیچھے بھی ہوں گے۔‘‘ یاسر نے کہا۔ ’’یعنی اس کے پاس ابھی چار یا پانچ آدمی ہیں۔‘‘

’’تم اب دو ہو۔‘‘ شامی نے کہا۔ ’’کیا تم ان لوگوں سے نمٹ لو گے؟‘‘

یاسر پھیکے انداز میں مسکرایا۔ ’’کیا کہہ سکتے ہیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے تک ہم تین تھے اور اب دو رہ گئے ہیں، ہو سکتا ہے کہ وہ دو بھی نہ رہیں۔‘‘

’’تم اب بھی یہ رقم سرباز کو دے کر جان چھڑا سکتے ہو۔‘‘ شامی نے اصرار کیا۔

’’اگر سمیر زندہ ہوتا تو میں یہی کرتا مگر اس رقم میں اس کا حصہ بھی ہے جو اب اس کی بیوی اور بچوں کے لیے ہے۔ میں اپنا اور صبر خان کا حصہ دے دوں تب بھی وہ پورے نہیں ہوں گے۔‘‘

صبر خان خاموش تھا اور اس کا چہرہ بھی ستا ہوا تھا۔ شامی نے سر ہلایا۔ ’’جیسی تمہاری مرضی۔‘‘

یاسر نے اس سے ہاتھ ملایا۔ ’’تم تو ابزادے ہو اور میں ایک معمولی جرائم پیشہ شخص ہوں لیکن تم نے جس طرح میرا ساتھ دیا، میں اس کا احسان ساری عمر نہیں اتار سکوں گا۔‘‘

’’کیونکہ ہم دونوں انسان بھی ہیں۔‘‘ شامی نے جواب دیا۔ ’’یہ رشتہ ہمیں ایک بناتا ہے۔ میری دعا ہے کہ تم کامیاب رہو اور یہاں سے بچ کر نکل جاؤ۔‘‘

’’اس وقت ہمیں دعاؤں کی ضرورت ہے۔‘‘ یاسر نے سر ہلایا اور صبر خان سے کہا۔ ’’تھیلے ویگن میں رکھو۔‘‘

صبر خان تھیلے اٹھا کر لے جانے لگا اور یاسر اپنا اسلحہ چیک کر رہا تھا کہ اب ایمونیشن کتنا رہ گیا ہے؟

☆☆☆

سرباز واپس ہوٹل پہنچا تو اب اس کا غصہ خوف میں بدل گیا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ یاسر اور اس کے ساتھیوں کی طرف سے ایسی مزاحمت کی جائے گی کہ وہ اپنے پانچ آدمیوں سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ یہ سب اس کے آزمودہ اور تجربہ کار آدمی تھے۔ وہ ان کی لاشیں بھی وہیں چھوڑ کر پسپائی پر مجبور ہو گیا تھا۔ جواب میں وہ یاسر کا کچھ بھی بگاڑنے میں ناکام رہا تھا۔ اس نے آتے ہی دوسرے ہوٹل میں قیدیوں کی نگرانی کرنے والے دونوں افراد کو بھی بلوا لیا اور ان سے کہا۔ ’’ہمیں مزید گاڑیوں کی ضرورت ہے۔ دونوں ہوٹلوں میں جو بھی گاڑیاں کھڑی ہیں، انہیں لے آؤ۔‘‘

وہ گاڑیاں لینے چلے گئے۔ سرباز نے دو آدمیوں کی ڈیوٹی سامنے لگائی کہ اگر یاسر اور اس کے آدمی نکلنے کی کوشش کریں تو وہ انہیں روکیں۔ وہ خود آتے ہی پینے میں لگ گیا تھا......... اس کے پاس اب چار آدمی رہ گئے تھے۔ وہ اب بھی یاسر کے مقابلے میں زیادہ افرادی قوت رکھتا تھا۔ مگر پانچ آدمیوں کی محرومی نے اسے خوفزدہ کر دیا تھا۔ جب ملک سیف نے اسے یہ کام سونپا تھا تو اس وقت اس نے رقم کے بارے میں نہیں سوچا تھا مگر اپنے پانچ آدمی گنوانے کے بعد اسے خیال آ رہا تھا کہ وہ اس رقم کا زیادہ حقدار ہے۔ ابھی اسے مرنے والوں کے لواحقین کو بھی رقم ادا کرنی تھی اور اس کا اپنا نقصان بھی ہوا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ خیال اس کے اندر جڑ پکڑ رہا تھا کہ وہ رقم اپنے لیے حاصل کرے اور ملک سیف سے کہہ دے کہ وہ یاسر کو پکڑنے میں ناکام رہا ہے۔ وہ اس کے آدمیوں کو قتل کر کے نکل گیا ہے۔ یہ سب سوچتے ہوئے اس کے چہرے پر سفاک سی مسکراہٹ آ گئی۔

☆☆☆

رات کے آٹھ بج رہے تھے مگر ایسا لگ رہا تھا جیسے نصف رات سے زیادہ کا وقت ہو گیا ہو۔ لاؤنج کے شیشے ٹوٹنے سے وہاں سردی گھس آئی تھی اور اس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا تھا اس لیے وہ ڈائننگ ہال میں آ گئے اور اس کا دروازہ بند کر لیا تھا۔ یاسر اور صبر خان نے کچھ کھانے سے انکار کر دیا تھا، انہوں نے سرفراز کو سمیر گل کا پتا بتایا۔ اس کی بیوی اور بچے صوبائی دارالحکومت میں رہتے تھے۔ سمیر گل نے انہیں الگ رکھا ہوا تھا تاکہ اس کے پیشے کی آنچ ان پر نہ آئے۔ وہ خود کبھی کبھی جا کر ان سے مل آتا تھا۔ اب وہ مر چکا تھا اور اس کی بیوی بچے اس کا انتظار ہی کرتے رہتے۔ تیمور اور شامی اوپر ہوٹل کی ایک کھڑکی سے سامنے والے ہوٹل میں ہونے والی سرگرمیوں کا جائزہ لے رہے تھے۔ سرباز اور اس کے ساتھی سخت سردی میں بھی باہر موجود تھے اور ان کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ اب باہر بیٹھ کر انتظار کریں گے۔ ان کو معلوم تھا کہ یاسر اور اس کے ساتھی غیر معینہ مدت کے لیے اندر نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ وہ خود بھی مجرم تھے اور پولیس کی آمد ان کے لیے بھی مشکل کا باعث بنتی۔ وہ باہر نکلتے اور یہاں سے فرار کی کوشش کرتے۔ سرباز اسی وقت کا منتظر تھا۔

’’یہ تو پوری طرح تیار ہیں۔‘‘ شامی نے کہا۔

’’مجھے بھی لگ رہا ہے کہ یاسر اور صبر خان کا بچ کر نکلنا مشکل ہے۔‘‘ تیمور نے تائید کی۔

’’ہمیں ان کی مدد کرنا ہو گی۔‘‘

تیمور نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ہم ان کی جتنی مدد کر سکتے تھے کر دی۔“

”یار وہ ہم نے اپنی مدد کی ہے ان کی نہیں۔“ شامی نے حقیقت پسندی سے کہا۔ ”اگر سرباز جیسے بدمعاش یہاں گھس آتے تو تو سوچ سکتا ہے کہ وہ ہمارے ساتھ کیا کر سکتے تھے۔ یہاں عورتیں بھی ہیں۔ ایسے بدمعاش عورتوں کا احترام بھی کہاں کرتے ہیں؟“

تیمور نے سوچا اور سر ہلایا۔ ”تو ٹھیک کہہ رہا ہے لیکن یہاں سے نکلنے کے بعد ہمارا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں رہے گا۔ پھر یاسر جانے اور سرباز جانے۔“

”ایک چکر اور ہے اگر یاسر ان لوگوں کے ہاتھ آ گیا اور اس نے ہمارے بارے میں بتا دیا تو یہ بدمعاش ہمارے پیچھے بھی آ سکتے ہیں۔ آخر اس کے پانچ آدمی مارے گئے ہیں اور پلان ناکام ہوا ہے، یہ اس بات کو اتنی آسانی سے فراموش نہیں کرے گا۔“

”تیرا مطلب ہے یہ ہمارے گھر تک پہنچ سکتا ہے؟“

شامی نے سر ہلایا۔ ”بے شک ہم عام لوگ نہیں ہیں مگر آج کل قانون نافذ کرنے والوں کی طرف سے قانون شکنوں کو کھلی چھوٹ ملی ہوئی ہے۔ یہ دن دہاڑے محفوظ ترین جگہوں پر اپنا کام کر جاتے ہیں اور انہیں کسی کا خوف نہیں ہوتا ہے۔ اس لیے ہمیں یاسر کا ساتھ دینا ہوگا کہ وہ سرباز کے ہاتھ نہ آئے۔ کم سے کم تو ری ہاتھ نہ آئیں۔“

”تیرے ذہن میں کیا ہے؟“

”میں اس کے ساتھ جاؤں گا۔“ شامی نے کہا تو تیمور اچھل پڑا۔

”تیرا دماغ درست ہے؟“

”بالکل درست ہے تبھی تو کام کر رہا ہے۔“

”یہ کام کر رہا ہے کہ جناب موت کے منہ میں جانے کی بات کر رہے ہیں۔“ تیمور نے جل کر کہا۔

مگر شامی فیصلہ کر چکا تھا۔ اس نے کسی نہ کسی طرح تیمور کو بھی قائل کر لیا کہ وہ یاسر اور صبر خان کے ساتھ نکلے گا اور سرباز اینڈ کمپنی سے چھٹکارے کے بعد وہ واپس آ جائے گا۔ تیمور نیچے آنے تک اس کی مخالفت کرتا رہا مگر جب اس نے یاسر سے کہہ دیا تو مجبوراً اسے خاموش ہونا پڑا۔ یاسر نے بھی انکار کیا۔ ”میں کسی اور کی جان خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔“

”میں خود اپنی مرضی سے تمہارے ساتھ چل رہا ہوں۔“ شامی نے اصرار کیا۔ ”اب یہ ہماری جنگ بھی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر سرباز نے تم پر قابو پا لیا تو وہ ہمارے پیچھے آئے گا۔“

یاسر سوچ میں پڑ گیا۔ ”کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو، سرباز سانپ سے زیادہ کینہ پرور ہے۔“

”اسی لیے میں تمہارے ساتھ جانا چاہتا ہوں۔“ شامی نے کہا۔ ”ایک آدمی ڈرائیو کرے گا اور پیچھے دونوں تو ان سے پیچھا چھڑانا آسان ہو جائے گا۔“

اس بار یاسر نے انکار نہیں کیا البتہ یہ ضرور کہا۔ ”تب تم اپنی ذمے داری پر چلو گے۔“

”مجھے منظور ہے۔“

تیمور کے خیال میں شامی کو ایڈونچر کا کیڑا کاٹ رہا تھا مگر اب سب طے ہو گیا تھا۔ شامی نے سنگل شاٹ لی تھی۔ یاسر اور صبر خان خود کار رائفلوں اور پستولوں سے مسلح تھے۔ شامی کے پاس اپنا پستول بھی تھا مگر وہ اس نے تیمور کے حوالے کر دیا۔ وہ اپنا کوئی اسلحہ نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ رقم کے تھیلے وین میں رکھ دیے گئے تھے۔ شامی نے وہاں موجود سامان کا جائزہ لیا اور یاسر سے کہا۔ ”یہ سامان اتار دو، اس کی وجہ سے ہمیں مشکل ہوگی۔“

یاسر نے کھانے پینے کا سامان اور خشک راشن اتار دیا۔ ویسے بھی اب اس کی ضرورت نہیں تھی، انہیں کیبن کی طرف نہیں جانا تھا۔ اس کی جگہ یاسر ایک اور جگہ کا رخ کرتا وہاں اسے ان چیزوں کی ضرورت نہیں تھی۔ سامان اتارنے سے وین کے پچھلے حصے میں خاصی جگہ بن گئی تھی۔ صبر خان نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ تیمور کے ساتھ سرفراز، جو جی اور شرمین بھی باہر آئے تھے۔ شرمین کی آنکھوں میں آنسو تھے، اس نے جذباتی لہجے میں شامی سے کہا۔ ”پلیز اپنا خیال رکھنا میری خاطر۔“

اس پر جو جی نے اسے گھورا اور بولا۔ ”ہاں شامی بھائی اپنا خیال رکھنا نوشی باجی کے لیے۔“

شرمین چونکی۔ ”نوشی کون؟“

”اس کی باجی ہیں۔“ شامی نے جلدی سے کہا۔ ”میری بھی بہت فکر کرتی ہیں۔ ان کی عمر بھی فکر والی ہے۔“

شرمین نے اطمینان کا سانس لیا۔ ”او اچھا۔“

تیمور نے اس کا ہاتھ پکڑا۔ ”تو نہیں مانے گا مجھے بھی ساتھ لے چل۔“

”یہ تو بالکل نہیں مان سکتا۔“ شامی نے اس کے گلے لگ کر کہا۔ ”کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ یہاں پیچھے کسی کو چھوڑ جائے۔ یہاں تم لوگ ہوشیار رہنا۔“

سرفراز نے باہر کی بیشتر روشنیاں بند کر دی تھیں۔ صبر

خان نے گاڑی کی ہیڈ لائٹس آف کر دیں اب جب تک وین نیچے نہیں پہنچ جاتی، ان لوگوں کو پتا نہیں چلتا۔ شامی اور یاسر پچھلے حصے میں آ گئے۔ یاسر کی حالت بتا رہی تھی کہ اس کا زخم بہتر ہو رہا تھا۔ اس نے روانگی سے پہلے اینٹی بایوٹک اور پین کلر کا تیسرا ڈوز بھی لے لیا تھا۔ شامی نے پوچھا۔ ”اگر وہ پیچھے آئے تو ہمیں کیا کرنا ہوگا؟“

”فوری حملہ۔“ یاسر بولا۔ ”ہم ان کی گاڑی کو ناکارہ بنانے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔“

صبر خان نے وین اسٹارٹ کی اور آگے بڑھا دی۔ تاریکی میں راستہ ذرا مشکل سے نظر آ رہا تھا... اس لیے اس نے رفتار کم رکھی۔ وین کا سیاہ رنگ اسے چھپا رہا تھا اور رفتار کم ہونے سے انجن کی آواز نہیں تھی۔ اس لیے جب تک وین نیچے سڑک تک نہیں پہنچ گئی، سرباز اور اس کے ساتھیوں کو اس کی آمد کا علم نہیں ہوا۔ نیچے آتے ہی صبر خان نے ہیڈ لائٹس آن کیں اور انجن کو ریس دی۔ وین جست لگا کر آگے بڑھی اور چند سیکنڈ میں اس کی رفتار چالیس کلومیٹر فی گھنٹا ہو گئی۔ فوراً ہی دوسرے ہوٹل کی طرف سے ہلچل مچی اور ایک منٹ سے بھی پہلے بڑی جیپ نکل کر سڑک پر آ گئی۔ اس وقت تک وین درّے کے پاس پہنچ گئی تھی۔ شامی پیچھے دیکھ رہا تھا، اس نے صبر خان اور یاسر کو آگاہ کیا۔ ”وہ پیچھے آ رہے ہیں۔“

یاسر نے رائفل کا بولٹ چڑھایا۔ ”میں تیار ہوں۔“

”صبر صبر۔“ شامی نے کہا۔ ”اتنی عجلت کی ضرورت نہیں ہے، پہلے ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔“

”ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن اگر انہوں نے پہل کی تو؟“

”مشکل ہے، ابھی وہ خاصے پیچھے ہیں۔“ شامی بدستور عقبی شیشے سے باہر جھانک رہا تھا۔ ذرا دیر میں وین درّے سے نکل آئی اور یاسر نے پہلے ہی صبر خان سے دائیں طرف مڑنے کو کہہ دیا تھا، یہ راستہ آگے مزید پیچیدہ ہوتا اونچائی کی طرف جا رہا تھا۔ شامی اپنے ساتھ تیار کیے ہوئے ٹائر کلر بھی لایا تھا۔ مگر ابھی ان کا استعمال مشکل تھا کیونکہ سڑک سیدھی تھی اور دشمن عین پیچھے تھا۔ شامی چاہتا تھا کہ جب وہ ٹائر کلرز باہر پھینکے تو ان لوگوں کو خبر نہ ہو۔ لکڑی کی سفیدی انہیں ہوشیار کر سکتی تھی اور وہ بچ کر نکل جاتے۔ پہلا موڑ آیا اور شامی نے چند ٹائر کلرز دروازہ کھول کر باہر اچھال دیے۔ اس نے کل ایک درجن تیار کیے تھے اور ان میں سے چار باہر پھینکے۔ اب انہیں نتیجے کا انتظار تھا۔ اس موڑ

کے بعد ایک موڑ اور تھا اور پھر ذرا چڑھائی تھی۔ وین اس چڑھائی تک پہنچی تو جیپ اس موڑ تک آ گئی تھی۔ شامی منتظر تھا کہ ابھی دھماکا ہوگا اور جیپ کی روشنی لہرائے گی مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ جیپ اس موڑ سے گزر کر دوسرے موڑ تک آ گئی۔

”بچ گئے۔“ شامی نے یاسر کو بتایا۔ ”لیکن ابھی ہمارے پاس موقع ہے۔“

سرباز کی گاڑی عجلت کا مظاہرہ کر رہی تھی تاکہ جلد از جلد وین کے پاس آ سکے۔ شامی کو امید تھی کہ اگر ایسے میں اس کا ٹائر برسٹ ہوا تو حادثہ شدید بھی ہو سکتا تھا۔ اگر جیپ کھائی میں گرتی تو اس میں موجود افراد کا بچنا ناممکن تھا۔ چند منٹ بعد پھر ایک موڑ آیا اور شامی نے دروازہ کھول کر چار عدد ٹائر کلرز باہر پھینک دیے۔ اس نے اس بار انہیں ذرا کنارے کی طرف پھینکا تھا کیونکہ موڑ کاٹتے ہوئے جیپ اسی طرف آ جاتی اور اس کے ٹائروں کا ٹائر کلرز پر چڑھنے کا امکان زیادہ ہوتا۔ اس موڑ کے بعد سڑک سیدھی تھی۔ یاسر بھی اٹھ کر کھڑکی تک آ گیا اور وہ دیکھ رہا تھا۔ جیپ نمودار ہوئی تو شامی اور وہ پرامید ہو گئے کہ شاید اس بار ٹائر کلرز کام کر جائیں۔ مگر جب جیپ سیدھی چلتی رہی تو وہ مایوس ہو گئے تھے۔ شامی نے نفرت سے کہا۔ ”پھر بچ گئے۔“

”ایسا لگ رہا ہے کہ ان سے کام لینا پڑے گا۔“ یاسر نے رائفل کی طرف اشارہ کیا اور اسی لمحے عقب سے فائر ہوا۔ گولی سنسناتی ہوئی وین کے پاس سے گزری تھی۔ شامی اور یاسر بیک وقت کھڑکیوں کے پاس آئے۔ شامی نے دوسرا شیشہ بھی توڑ دیا اور دونوں نے رائفلیں باہر نکال کر جوابی فائر کیا۔ جیپ جو نزدیک آ گئی تھی، ان کی طرف سے جوابی کارروائی کے بعد تیزی سے پیچھے ہوئی۔ شامی نے بچے ہوئے ٹائر کلرز دیکھے، یہ چار رہ گئے تھے۔ اس نے یاسر سے کہا۔

”بس یہ آخری موقع ہے اس کے بعد ہمیں اسلحے سے ہی کام لینا پڑے گا۔“

یاسر نے سر ہلایا اور صبر خان کو رفتار تیز کرنے کو کہا۔ اس نے رفتار تیز کی تو جیپ کی رفتار بھی بڑھی تھی۔ ایک موڑ آتے ہی شامی نے باقی رہ جانے والے ٹائر کلرز سڑک پر اچھال دیے۔ پھر اس نے کہا۔ ”وین روک دو۔“

یاسر نے صبر خان سے وین روکنے کو کہا تو اس نے وین روک دی تھی۔ وہ موڑ سے مشکل سے پچاس گز دور تھے۔ شامی نے یاسر سے کہا۔ ”اگر اس بار بھی ٹائر کلرز کام کریں یا نہ کریں ہم ہتھیار استعمال کریں گے۔ دونوں کنارے والی

طرف کے ٹائر کو نشانہ بنانے کی کوشش کریں گے۔"

یاسر نے سر ہلایا اور جیپ موڑ پر نمودار ہوئی۔ انہوں نے رائفلیں سیدھی کیں اور پھر فائرنگ شروع کردی ان کا نشانہ جیپ کا فرنٹ وہیل تھا پھر ایک دھماکا ہوا۔ نہ جانے ان کی کوئی گولی کارآمد ثابت ہوئی تھی یا پھر کسی ٹائر نکلر نے کام کیا۔ جیپ کا ٹائر دھماکے سے برسٹ ہوا۔ تقریباً تیس میل فی گھنٹے کی رفتار سے وہ لہرائی اور کنارے کی طرف بڑھی۔ ڈرائیور نے اسے نیچے اترنے سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کی مگر وہ ناکام رہا، جیپ نیچے گئی اور کچھ نیچے جاکر تیزی ہوکر قلابازیاں کھانے لگی اور آخر وہ... خاصی بلندی سے کھائی کی تہ میں جا گری تھی۔ اس بار ہونے والا دھماکا خاصا بلند اور انسانی چیخوں کے ساتھ تھا۔ شامی اور یاسر دین سے اتر کر کنارے تک آئے تو انہیں بہت نیچے شعلے اٹھتے دکھائی دے رہے تھے۔ انہیں دیکھتے ہوئے یقین سے کہا جاسکتا تھا کہ جیپ میں موجود کسی فرد کے بچنے کا امکان بہت کم تھا۔ یاسر نے شامی کا شانہ تھپکا۔

"تو ابز ادے تم نے کام کردیا۔"

"اللہ کا شکر ہے ان لوگوں سے نجات ملی۔" شامی نے گہری سانس لے کر کہا۔ "اب مہربانی کرکے مجھے واپس ہوٹل چھوڑ دو۔"

"کیوں نہیں۔" یاسر دین کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ آدھے گھنٹے بعد شامی ہوٹل کے نیچے والی سڑک پر اترا۔ اس نے یاسر سے دین وہیں رکوائی تھی اور نیچے اتر کر اس سے اور صبر خان سے ہاتھ ملایا۔

"دوست بھول جانا کہ ہم کبھی ملے تھے میرا مطلب ہے کسی سے اس کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"میں سمجھتا ہوں۔" یاسر نے سنجیدگی سے کہا۔ "لیکن دل میں تم لوگوں کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔"

دین کا دروازہ بند ہوا اور وہ مڑ کر واپس درے کی طرف چلی گئی اور شامی اوپر کی طرف بڑھا۔ تیمور اور جوجی اسے راستے میں مل گئے۔ وہ آکر اس سے لپٹ گئے۔ تیمور نے پوچھا۔ "تو ٹھیک ہے نا؟"

"بالکل ٹھیک اوپر چلو یہاں تو بہت سردی ہے۔"

کچھ دیر بعد وہ ہوٹل کے ایک گرم کمرے میں کافی سے خود کو گرم کر رہا تھا اور ان لوگوں کو ایڈونچر سنا رہا تھا۔ سرفراز بھی ان میں شامل تھا۔ شامی نے کہا۔ "ہمیں یہاں سے جانا ہوگا۔"

"کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ ہمارا نام کہیں نہ آئے؟" تیمور نے سرفراز سے کہا۔ اس نے سوچا اور سر ہلایا۔

"ہاں ایسا ہوسکتا ہے۔"

"بس تو ہم کل صبح یہاں سے روانہ ہوجائیں گے۔"

"پولیس کے پاس صبح ہی آدمی جاسکے گا۔" سرفراز نے کہا۔ "میں نے دوسرے ہوٹل میں موجود افراد کو آزاد کرا لیا ہے۔"

"یہ تم نے اچھا کیا۔" شامی اٹھتے ہوئے بولا۔ "اب میں آرام کروں گا۔"

☆☆☆

ملک سیف سخت مضطرب تھا لیکن اس کے اضطراب کا تعلق چند گھنٹے پہلے پڑوسی ملک سے آنے والی کال سے نہیں تھا جس میں اسے اطلاع دی گئی تھی کہ نہ صرف رقم اور یاسر نہیں ملے تھے بلکہ سرباز بھی اپنے ساتھیوں سمیت ایک حادثے میں مارا گیا تھا۔ اس کے اضطراب کا تعلق کسی اور بات سے تھا۔ اچانک نزدیکی پہاڑیوں سے ایک میزائل آکر اس کے قلعے کے صحن میں گرا اور دھماکے سے اس کا ایک حصہ تباہ ہوگیا۔ دھماکے کی آواز سن کر ملک سیف کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ اس نے اب تک جو کیا تھا، اس کا یوم حساب آگیا تھا۔ پہلے میزائل کے فوراً بعد دوسرا، تیسرا اور چوتھا میزائل آکر گرا اور پورا قلعہ ملبے کا ڈھیر بن گیا۔

☆☆☆

یاسر سامان لیے گھر میں آیا تو زرینہ نے اس کا استقبال کیا۔ وہ تقریباً پچیس برس کی نہایت حسین عورت تھی اور وہ کبیر گل کی بیوہ تھی۔ عدت پوری ہونے کے بعد یاسر نے اس کا رشتہ بھیجا جو قبول ہوگیا۔ شادی کے بعد یاسر اسے اور بچوں کو ایک بڑے شہر میں لے آیا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ سب پرانے دھندے چھوڑ دے گا اور اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ علاقہ ہی چھوڑ دے اس لیے وہ اس دور دراز اور بڑے شہر تک چلا آیا تھا۔ اسے امید تھی کہ یہاں اس کی جان پہچان والا کوئی فرد نہیں ہوگا۔ اس کے پاس رقم کی کمی نہیں تھی، وہ چاہتا تو برسوں بیٹھ کر کھا سکتا تھا۔ لیکن اس کا ارادہ تھا کہ کچھ عرصے آرام سے بیٹھ کر حالات کا جائزہ لے گا اور پھر فیصلہ کرے گا۔ اگر اسے یہاں کے حالات ٹھیک نہ لگتے تو وہ باہر ملک بھی جاسکتا تھا اس نے اپنا، زرینہ اور بچوں کا پاسپورٹ بھی بنوا لیا تھا۔ اس نے ایک پوش علاقے میں چھوٹا سا مکان خرید لیا تھا اور یہاں خاموشی سے زرینہ کے ساتھ خوش رہ رہا تھا۔

☆